رجزِ مومن

مجھے سودا نہیں سود و زیاں کا — یقیں بندہ نہیں وہم و گماں کا
اسے کہتے ہیں شانِ ذوقِ پرواز — کہ مٹ جائے تصوّر آشیاں کا
مری رفعت پسندی ہے بلا کی — میں عنقا ہوں فضائے لامکاں کا
مری آزادیوں کا ہے یہ عالم — کہ زنجیری نہیں ہوں این و آں کا
میں اپنی ذات میں سارا جہاں ہوں — کہ دل میں درد ہے سارے جہاں کا
مرے دل کی تڑپ ہے رشکِ صد برق — نہیں یونہی تحیّر آسماں کا
چمن والو! اٹھو میرے قدم لو — پیامی ہوں بہارِ جاوداں کا

عناصر تختۂ مشقِ خیالم
زند پہلو بہ طوبیٰ نونہالم

صبائے گلشنِ ایجاد ہوں میں — کہاں پابندِ گل؟ آزاد ہوں میں
مرے نالے نہیں شعلے ہیں شعلے — زبانِ شمع کی فریاد ہوں میں
غلط سمجھا مجھے جو صید سمجھا — قسم ہے دشت کی صیّاد ہوں میں
مجھے سونپی گئی ہے خدمتِ داد — ازل سے دشمنِ بیداد ہوں میں
مرا مخدوم ہے مظلوم۔ لیکن — حقِ ظالم میں اک جلّاد ہوں میں
بشر کے ارتقائے اتّقا کی — حقیقت آشنا روداد ہوں میں
فقیری میں شہنشاہی مرا کام — امیں! اللہ کا ارشاد ہوں میں

مئے نابِ خودی در جام کردند
چنیں نعمت بہ من انعام کردند!!

امین حزیں سیالکوٹی

پاک دامن رضیہ اور مورخین

سلطان رضیہ پہلی اور آخری مسلمان خاتون ہے جس نے ساڑھے تین برس نہایت جاہ وجلال کے ساتھ دہلی کی سلطنت پر فرمانروائی کی۔ وہ دہلی کے نامور بادشاہ سلطان شمس الدین التمش کی بیٹی تھی اور ان تمام صفات کی مالک تھی جو اس زمانے میں ایک بادشاہ کے لئے ضروری سمجھی جاتی تھیں۔ ہمعصر مورخ، منہاج سراج کے بقول وہ "بادشاہِ بزرگ وعاقل وعادل وکریم وعالم نواز وعدل گستر ورعیت پرور ولشکر کش" تھی۔

اس کی قابلیت کی بنا پر سلطان شمس الدین نے اُسے باضابطہ طور پر اپنا ولی عہد مقرر کر دیا تھا۔ اُمرائے دربار نے جب پوچھا کہ بیٹوں کے ہوتے ہوئے بیٹی کو ولی عہد مقرر کرنے میں حضور کی کیا مصلحت ہے تو بادشاہ نے جواب دیا کہ میرے بیٹے عیش وعشرت کے بندے ہیں، سلطنت کا انتظام اُن کے بس کا نہیں۔ میرے مرنے کے بعد تمہیں معلوم ہو جائیگا کہ ولی عہد کے لئے رضیہ سے زیادہ لائق اور کوئی نہیں۔ اور واقعہ بھی یہی تھا لیکن سلطان شمس الدین التمش کی وفات کے بعد اعیانِ سلطنت نے اس کے بیٹے رُکن الدین فیروز شاہ کو تخت پر بٹھایا۔ یہ واقعہ ۲۱ شعبان ۶۳۳ھ کا ہے۔

رُکن الدین فیروز شاہ نے دل کھول کر عیش وعشرت کی داد دی۔ چھ مہینے ۲۸ دن حکومت کرکے معزول ہوا اور سلطان رضیہ اُس کی جگہ سریر سلطنت پر متمکن ہوئی۔ (۱۸ ربیع الاول ۶۳۴ھ) حکومت کی باگ ڈور لیتے ہی رضیہ نے حکومت کے شیرازے کو منظم کیا۔ بغاوتیں فرو ہوگئیں اور رعیت خوشحالی اور اطمینان کی زندگی بسر کرنے لگی۔ تقریباً ڈیڑھ سال اس طرح گذر گیا۔ اس اثناء میں امیر جمال الدین یاقوت حبشی کو جو امیر آخور کے عہدے پر مامور تھا سلطان رضیہ کے حضور میں بہت تقرب حاصل ہوگیا۔ اُمرائے ترک یاقوت کے اس تقرب سے جلنے لگے۔ اسی زمانہ میں سلطان رضیہ نے پردہ چھوڑ دیا۔ زنانہ لباس کی جگہ قبا اور کلاہ پہن کر دربار کرتی اور ہاتھی پر سوار ہوکر نکلتی تھی۔

۶۳۷ھ میں لاہور کا گورنر ملک عزالدین باغی ہوگیا۔ رضیہ نے خود لشکر کشی کی اور اس فتنہ کو فرو کیا۔ اس مہم سے فارغ ہوکر رضیہ دہلی واپس آئی ہی تھی کہ تبرہندہ کے گورنر ملک التونیہ کی بغاوت کی خبر آئی۔ بعض اُمرائے دربار خفیہ طور پر ملک التونیہ سے ملے ہوئے تھے۔ رضیہ پھر فوجیں لیکر چلی جس وقت تبرہندہ کے قریب پہونچی اُس کے ہمراہی ترک اُمرا نے بغاوت کردی۔ امیر جمال الدین یاقوت حبشی کو قتل کر ڈالا۔ سلطان رضیہ کو گرفتار کرکے تبرہندہ کے قلعے میں محبوس کر دیا اور اس کے بھائی سلطان معزالدین بہرام شاہ کو دہلی کے تخت پر بٹھایا۔ تبرہندہ کے گورنر ملک التونیہ نے رضیہ کو قید سے نکال کر اس کے ساتھ شادی کرلی۔ اب دونوں میاں بیوی فوجیں جمع کرکے دہلی پر حملہ آور ہوئے، مگر قسمت نے ساتھ نہ دیا۔ رضیہ کی فوج شکست کھا گئی اور شکست کھانے کے بعد خود رضیہ سے باغی ہوگئی۔ رضیہ اور التونیہ دونوں بمقام کیتھل ہندوؤں کے ہاتھ میں گرفتار ہوئے اور دونوں مار ڈالے گئے۔

رضیہ کے ہم عصر اور معتبر مورخ، منہاج سراج، صاحب طبقات ناصری کے مذکورِ بالا بیان سے ایسی کوئی بات ثابت نہیں ہوتی جس کی بنا پر سلطان رضیہ کی پاکدامنی میں شبہ کیا جا سکے لیکن متاخرین میں سے بعض نے رضیہ کی آلودہ دامنی کو اس کے زوال کا سبب ٹھہرایا ہے اور کھلم کھلا اُس پر یاقوت حبشی سے ناجائز تعلقات رکھنے کا الزام لگایا ہے۔ انگریزی تاریخ نویسوں کے اس گروہ میں مسٹر ٹامس سب سے پیش پیش ہیں۔ انہوں نے اپنی تاریخ "دہلی کے پٹھان بادشاہ" میں لکھا ہے:۔

"رضیہ کے حالات سازگار رہے یہاں تک کہ اُس کی جنسی کمزوری نے ظہور کیا۔ یہ بات نہ تھی کہ ایک ناکتخدا ملکہ کو محبت کرنے کی ممانعت ہو رضیہ کسی فرمانبردار شہزادے شوہر کے ساتھ خوب رنگ رلیاں منا سکتی تھی یا اپنے محل کے اندر حرم کے تاریک گوشوں میں تقریباً بلا روک ٹوک دل کھول کے ہوس پرستی کر سکتی تھی لیکن اُس کی خود سر محبت نے اُسے غلط جانب متوجہ کیا اور اُس کی نظر انتخاب اپنے ایک درباری پر پڑی جو نسلاً حبشی تھا حبشی پر رضیہ کی یہ عنایت دیکھ کر تمام اُمرائے ترک بگڑ گئے"

مسٹر [illegible] اپنی تاریخ ہند میں فرماتے ہیں کہ "دربار کے ترک اُمرا رضیہ سے بگڑ گئے کیونکہ ایک حبشی غلام سے اُس کے بہت گہرے تعلقات (—— intimacy) تھے۔ اور رضیہ نے اُسے اپنا کمانڈر انچیف بنایا تھا"

مسٹر اُپندر ناتھ پال ـــ Medieval India میں لکھتے ہیں کہ "فرمانروائے دہلی ہونے کی حیثیت سے رضیہ کو یہ آزادی حاصل نہ تھی کہ وہ ایک حبشی سے محبت کرے۔ اگر وہ کسی حد تک ضبطِ نفس سے کام لیتی تو ایک بہترین فرمانروا ثابت ہوتی"۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مذکورالصدر مورّخین نے تعصب کی بنا پر سلطان رضیہ پر "ناپارسائی" کا الزام لگایا ہے لیکن راقم الحروف کو اس رائے سے اتفاق نہیں کیونکہ انہوں نے جو کچھ لکھا ہے کہیں نہ کہیں سے اخذ کر کے لکھا ہے۔ خود کوئی روایت ایجاد نہیں کی۔ یہ اور بات ہے کہ رضیہ کے حالات لکھتے وقت اُنہوں نے معاصرانہ شہادت کے مقابلے میں متاخرین کے بیان کو ترجیح دی۔ بہرحال اب دیکھنا یہ ہے کہ آخر اس فساد کا سرچشمہ کہاں ہے؟

گذشتہ ساٹھ ستّر سال میں اسلامی ہند کی جو تاریخیں انگریزی میں لکھی گئیں ان کا ماخذ عام طور پر اکبری دور کی تاریخیں ہیں یعنی نظام الدین بخشی کی طبقاتِ اکبری، مُلّا عبدالقادر بدایونی کی منتخب التواریخ اور محمد قاسم فرشتہ کی گلشن ابراہیمی جو عام طور پر تاریخ فرشتہ کے نام سے مشہور ہے۔ طبقاتِ اکبری کا مصنّف، فرشتہ اور بدایونی کے مقابلے میں زیادہ سنجیدہ، محتاط اور معقول پسند ہے اور واقعات کے بیان کرنے میں حتی المقدور صحت کا خیال رکھتا ہے۔ وہ لکھتا ہے:۔

"جمال الدین یاقوت حبشی کہ میر آخور بود در سلطنت سلطان رضیہ تقرب تمام پیدا کرد و محسود امرا گشت و بمرتبہ صاحب نسبت شد کہ در وقت سواری سلطان رضیہ را دست در زیر بغل کردہ سوار ساختے"۔

(جمال الدین یاقوت حبشی جو کہ امیر آخور تھا سلطان رضیہ کے عہدِ حکومت میں اس درجہ مقرب ہوگیا کہ دوسرے اُمرا اُس سے حسد کرنے لگے اور اس کا تقرّب اتنا بڑھا کہ سواری کے وقت وہ سلطان رضیہ کی بغل میں ہاتھ دے کر اُسے سوار کراتا تھا۔)

فرشتہ کا بیان ہے کہ "جمال الدین یاقوت حبشی کہ امیر آخور بود در خدمت سلطان رضیہ تقرب تمام پیدا کرد و امیر الامرا گشت و بمرتبہ صاحب نسبت شد کہ در وقت سواری سلطان رضیہ را دست در زیر بغل کردہ (بر اسپ) سوار ساختے"۔

فرشتہ نے صاحب طبقاتِ اکبری کے بیان میں دو باتوں کا اضافہ کیا۔ ایک تو یاقوت کو امیر الامرا بنایا۔ دوسرے سواری کے ضمن میں گھوڑے کا ذکر کیا۔ واضح ہو کہ تاریخ فرشتہ کے بعض نسخوں میں لفظ "بر اسپ" موجود نہیں۔

مُلّا عبدالقادر بدایونی لکھتے ہیں کہ "جمال الدین یاقوت حبشی کہ میر آخور بود معتمد علیہ و صاحب نسبت گشت بمرتبہ کہ سلطان رضیہ در وقت سواری فیل و اسپ تکیہ بر بغل و بازوئے او می کرد۔ محسود امرا شد"۔

بدایونی اور فرشتے کا بیان تقریباً یکساں ہے۔ البتہ بدایونی نے سواری کے ذکر میں گھوڑے کے ساتھ ہاتھی کو بھی شامل کر لیا ہے۔ رضیہ جس وقت تبرہندہ کے گورنر ملک التونیہ کی سرکوبی کے لئے لشکر لے کر دہلی سے چلی ہے اس کے ذکر میں بدایونی صاحب لکھتے ہیں کہ "در اثنائے راہ امرائے ترک اداہائے ناپارسایانہ ازو دیدہ خروج کردند و سلطان رضیہ را با جمال الدین یاقوت حبشی کہ امیر الامرا شدہ بود گرفتہ در قلعہ تبرہندہ محبوس ساختند" (اثنائے راہ میں ترک امرا رضیہ کی ناپارسایانہ حرکتیں دیکھ کر باغی ہو گئے اور سلطان رضیہ اور جمال الدین یاقوت حبشی کو جو امیر الامرا ہو گیا تھا، گرفتار کر کے تبرہندہ کے قلعے میں قید کر دیا۔)

مُلّا بدایونی صاحب نے تو صریح طور پر رضیہ کی عدم پارسائی کا فتویٰ دے دیا۔ مگر خدا جانے مُلّا صاحب کو یہ خبر کہاں سے ملی کہ یاقوت کو بھی رضیہ کے ساتھ تبرہندہ کے قلعہ میں قید کر دیا گیا تھا۔ یاقوت تو رضیہ کے قید ہونے سے پہلے ہی قتل ہو چکا تھا۔

مذکورہ بالا اقتباسات سے کم سے کم اتنا تو ثابت ہو گیا کہ ٹامس، ہاول اور پال وغیرہ نے از راہ تعصب رضیہ کو بدنام کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ اپنے لفظوں میں وہی کہا جو اُن کے پیشرو بدایونی اور فرشتہ کہہ گئے تھے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر نظام الدین بخشی فرشتہ، اور بدایونی کو یہ روایت ملی کہاں سے؟ ان مورّخین کے ماخذوں میں سے ایک یحییٰ سرہندی کی "تاریخ مبارک شاہی" بھی ہے جو ۸۳۸ھ میں یعنی ان تاریخوں سے تقریباً ڈیڑھ سو برس پہلے لکھی گئی۔

سرہندی کا بیان ہے کہ "ملک جمال الدین یاقوت حبشی را عہدۂ امیر آخوری داد و بحضرت خود مقرب گردانید، چنانچہ اُمرا و ملوک دیگر را غیرت آمد ...... و چوں سوار شدے بالائے پیل سوار شدے" (ملک جمال الدین یاقوت حبشی کو امیر آخور کا عہدہ دیا اور اپنی خدمت میں بہت مقرب

بنالیا جس سے دوسرے امرا و ملوک کو غیرت آتی . . . جب وہ سوار ہوتی تھی تو ہاتھی پر سوار ہوتی تھی ۔)

سرہندی نے نہ تو یاقوت کی امیرالامرائی کا ذکر کیا نہ رضیہ کے گھوڑے پر سوار ہونے کا۔ نہ یہ کہ یاقوت، رضیہ کی بغل میں ہاتھ دیکر اُسے گھوڑے پر سوار کراتا تھا۔ اُس نے بتصریح بتا دیا کہ رضیہ جب نکلتی تو ہاتھی پر سوار ہو کر نکلتی تھی۔ دراصل سرہندی نے منہاج سراج کے بیان کو دُہرا دیا ہے اور ظاہر ہے کہ رضیہ کے حالات کے لئے منہاجِ سراج سے زیادہ معتبر راوی اور کون ہو سکتا ہے کیونکہ یہ سب واقعات اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے۔

نظام الدین بخشی وغیرہ نے بعض ایسی کتابوں سے بھی استفادہ کیا ہے جو تاریخی نقطۂ نظر سے نہایت غیر معتبر ہیں۔ ان ساقط الاعتبار ماخذوں میں سے ایک عصامی کی "فتوح السلاطین" ہے۔ فتوح السلاطین شاہنامہ کی بحر میں ایک مثنوی ہے جو ۷۵۰ھ ۱۳۵۰ء میں دکن میں لکھی گئی۔ سلطان محمد تغلق نے جن لوگوں کو زبردستی دہلی سے دولت آباد روانہ کیا تھا اُن میں عصامی کا دادا بھی تھا۔ دادا کے ساتھ پوتے کو بھی دکن جانا پڑا۔ اس وقت عصامی کی عمر ۱۶ برس کی تھی۔ تقریباً ۴۰ سال کے سن میں عصامی نے فتوح السلاطین تصنیف کی۔ محمود غزنوی کے زمانے سے لیکر تاریخ تصنیف تک ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کی تاریخ بیان کی ہے۔ لیکن مستند اور معتبر تاریخوں کے بجائے عصامی نے زبانی روایتوں پر اپنی کتاب کی بُنیاد رکھی ہے۔ اور لازمی طور پر بہت سی ایسی بے سروپا اور بے بنیاد باتیں بیان کی ہیں جو چانڈو خانے کی گپ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں۔ بدقسمتی سے عصامی کے بعد آنے والے مؤرخین نے فتوح السلاطین کو تاریخ کی ایک معتبر کتاب سمجھا اور اس کی بیان کی ہوئی بے بنیاد روایتوں کو جو بازاری افواہوں کی طرح ساقط الاعتبار ہیں اپنی تصانیف میں داخل کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے واقعات غلط مشہور ہو گئے۔ اس کی ایک مثال رضیہ کی مظنون آلودہ دامنی ہے۔

سلطان شمس الدین التمش کی وفات کے بعد جو واقعات رونما ہوئے اُن کا تذکرہ عصامی کی زبان سے سُنئیے:-

بگفتند پس ہمہ یک زباں   کہ داریم پس شمع زاں دودماں   سب اُمرائے متفق اللفظ ہو کر کہا کہ خاندان شمسی کے متعدد افراد موجود ہیں
دو پور و یکے دخترِ شہریار   دریں ملک ماندست زو یادگار   دو بیٹے اور ایک بیٹی بادشاہ کی یادگار ہیں۔

الغرض باہمی مشورت کے بعد انہوں نے رکن الدین فیروز شاہ کو تخت پر بٹھادیا اور کچھ دنوں بعد اُسے معزول کر کے رضیہ کو بادشاہ بنایا۔

چو از عہدِ رضیہ برآمد سہ سال   دگر سکہ زد عالمِ بدسگال   جب رضیہ کو حکومت کرتے تین سال گذر گئے تو بداندیش زمانے نے ایک نئی چال چلی۔
شنیدم کہ از پردہ بیروں فتاد   گذشت از حیا دل بہ شوخی نہاد   میں نے سُنا کہ وہ پردے سے نکل آئی اور حیا ترک کر کے شوخی پر آمادہ ہوئی
بپوشید روزے قبا و کلاہ   برفت آمد از کاخ کیواں پناہ   ایک دن وہ قبا اور کلاہ پہن کر محل سے آ گئی
شد آنگاہ بر پشت پیلے سوار   ہمی گشت در ہر طرف آشکار   پھر ہاتھی پر سوار ہوئی اور بے پردہ ہر طرف گھومتی تھی۔
ازاں پس شنیدم مہے شش دگر   ہماں دخترِ خسروِ نامور   میں نے سنا کہ اس واقعہ کے چھ مہینے بعد
بدادے پس از ہفتہ بارِ عام   شدے خاص و عام از رُخش شادکام   اُسنے ہفتہ وار دربارِ عام شروع کر دیا اور ساری دُنیا اُسکے دیدار سے مسرور ہوتی تھی
سواری بکردے پس از یک دو ماہ   رکابش برفتند اہلِ کلاہ   مہینے دو مہینے کے بعد وہ سواری کرتی تھی اور اُمرا اُسکے ہم رکاب ہوتے تھے۔
چو شش ماہ زیں قصہ کامل گذشت   بد و بدگماں عام تا خاص گشت   اس بات کو جب چھ مہینے گذر گئے تو خاص و عام سب اس سے بدگمان ہو گئے
شنیدم غلامے ز جنسِ حبش   بُدے در سواری بر مرکبش   میں نے سنا کہ اسکا ایک حبشی غلام تھا جو اُسکی گھوڑے کی سواری کے وقت موجود رہتا تھا
گرفتے بیک دست و بازوئے او   بدادے سوارش بے گفتگو   وہ ایک ہاتھ سے اس کا بازو تھام کر اس کو سوار کراتا تھا
بداں مرد شاہ جہاں را غلام   شہش کردہ بوداست یاقوت نام   وہ شخص بادشاہ کا غلام تھا اور بادشاہ نے اس کا نام یاقوت رکھا تھا۔
امیرِ آخورِ شاہ و شہزادہ بود   بفرمانِ رضیہ رضا دادہ بود   وہ بادشاہ اور شاہزادی کا امیر آخور تھا اور رضیہ کا تابع فرمان۔
چو ارکانِ دولت دراں روزگار   بدیدند گستاخیش آشکار   ارکانِ دولت نے جب اس کی کھلم کھلا گستاخی دیکھی
ببردند غیرت ازاں ماجرا   بگفتند بایک دگر در جُدا   اور اس واقعہ سے انکو غیرت آئی اور انہوں نے پوشیدہ طور پر آپس میں مشورت کی
گزیں گونہ کیں بود در ملکِ جم   مسخر تر آمد ز جملہ خدم   اور کہا کہ ملک سلیمان میں یہ یوں تمام خدام سے زیادہ اس طرح تابع فرمان ہے کہ

عجب نے کہ گر دست یابد گہے ۔ پے فصّ خاتم بگیرد رہے ۔ اگر کبھی اس کو موقع مل جائے اور وہ انگوٹھی کا نگینہ اڑا لینے کی کوشش کرے تو کچھ تعجب نہیں

زناں جملہ در دام اہرمن اند ۔ بخلوت ہمہ کار شیطاں کنند ۔ عورتیں تو سبھی شیطان کے پھندے میں پھنسی ہوتی ہیں اور سبھی خلوت میں بدکاری کرتی ہیں

چو شورید نفسِ زنِ پارسا ۔ بخلوت دہد با سگے ہم رضا ۔ پارسا عورت پر بھی جب نفس کا غلبہ ہوتا ہے تو وہ کتّے سے ہم صحبت ہونے کیلئے بھی آمادہ ہو جاتی ہے

نہ زیبد بزن تاج و تختِ شہاں ۔ کہ شد مملکت قسم کار آگہاں ۔ تخت و تاج شاہی عورت کو زیب نہیں دیتا کیونکہ سلطنت تو کار آگاہ لوگوں کا حصّہ ہے

جہاں داری از زن نیاید نکو ۔ کہ در اصل ناقص شد است عقل او ۔ عورت کبھی اچھی طرح حکمرانی نہیں کر سکتی کیونکہ وہ ناقص العقل ہوتی ہے۔

زنے کو طرب جوید و جاہ ہم ۔ زشہوت تواند بُد آزاد کم ۔ جو عورت عیش و عشرت اور جاہ و منزلت کی طالب ہوتی ہے وہ شہوت پرستی سے نہیں بچ سکتی

(اسی قسم کے بہت سے اشعار عورتوں کی مذمّت میں ہیں۔)

زمردی نباشد کہ پیشِ زنے ۔ نہیم از سرِ غافلی گردنے ۔ یہ امر ہماری مردانگی سے بعید ہے کہ از راہِ غفلت ایک عورت کے سامنے سرِ اطاعت جھکا دیں

خصوصاً ازیں پس کہ اہلِ جہاں ۔ بگشتند در حق او بدگماں ۔ خصوصاً ایسی حالت میں کہ ساری دنیا اس سے بدگمان ہو چکی ہے۔

اس مشورے کے بعد دوسرے دن جب رضیہ دربار میں آئی تو

شنیدم ہماں روز یاقوت را ۔ بکشتند یکسر دراں بار جا ۔ میں نے سُنا ہے کہ اسی دن یاقوت کو سرِ دربار قتل کر ڈالا۔

گرفتند پس رضیہ را بے درنگ ۔ نہادند بندش بپا بے درنگ ۔ اور فوراً رضیہ کو قید کر کے اُسے بیڑیاں پہنا دیں

وزاں پس ابا بندہائے گراں ۔ بہ تبرندہ کردند او را رواں ۔ پھر بھاری زنجیروں میں جکڑ کر اُسے تبرندہ روانہ کر دیا۔

اور رضیہ کے بعد معزالدین کو بادشاہ بنایا۔

”رضیہ جب تبرہندہ میں قید تھی اور اس واقعہ کو ڈیڑھ برس گذر گیا تو میں نے سُنا کہ ایک تُرک جس کا نام لاطونہ تھا اور جنگلوں جنگلوں در ملکوں ملکوں اپنی تھوڑی سی فوج لئے لوٹ مار کرتا پھرتا تھا اتفاق سے تبرندہ آپہنچا اور اچانک اس قلعہ کو فتح کر لیا۔ اُس نے رضیہ کو قید سے نکالا اور جب رضیہ کو اپنے ساتھ شادی کرنے پر آمادہ دیکھا تو اس سے عقد کر لیا۔ ایک دن رضیہ نے خلوت میں اُسے بتایا:۔

کہ من دخترِ شاہِ جہاں پرورم ۔ سہ سال و سہ مہ تاج بد بر سرم ۔ کہ میں بادشاہ کی بیٹی ہوں اور سوا تین برس بادشاہی کر چکی ہوں۔

بوحشت زمن بندگانِ پدر ۔ ربودند تاجِ کیانی زسر ۔ میرے باپ کے غلاموں نے میرا تخت و تاج مجھ سے چھین لیا

اور مجھے یہاں قید کر دیا۔ اتفاق سے تم ادھر آنکلے اور مجھے قید سے چھڑا دیا۔ چلو اب ہم تم دونوں مل کر دہلی پر لشکر کشی کریں۔ چنانچہ رضیہ نے دہلی پر چڑھائی کی اور شکست کھائی۔ چند ماہ کے بعد فوجیں مرتب کر کے پھر حملہ کیا اور پھر شکست کھائی اور رضیہ اور لاطونہ دونوں مارے گئے۔“

اب شُبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں کہ فرشتہ اور بدایونی وغیرہ نے یہ روایت فتوح السلاطین سے لی ہے کہ (۱) یاقوت ایک حبشی غلام تھا۔ (۲) وہ رضیہ کی بغل میں ہاتھ دے کر اُسے گھوڑے پر سوار کرایا کرتا تھا۔ (۳) رضیہ کے اور اس کے تعلقات نے وہ نوعیت اختیار کر لی تھی کہ ساری دُنیا رضیہ سے بدگمان ہو گئی اور اُمرا کو یہ ڈر ہوا کہ کہیں یاقوت موقع پا کر رضیہ پر دست تصرّف نہ دراز کر بیٹھے۔

عصامی کا یہ پورا بیان زبانی روایتوں اور بازاری افواہوں پر مبنی ہے اور کسی طرح قابل تسلیم نہیں۔ فتوح السلاطین جس وقت لکھی گئی رضیہ کی وفات کو سَو برس سے زیادہ گذر چکے تھے۔ اوّل تو یوں بھی سَو برس گذر جانے کے بعد زبانی روایتوں میں واقعات کی صورت مسخ ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ عصامی کے راوی نہایت غیر معتبر ہیں۔ اسی دَور کے چند اور واقعات جنہیں عصامی نے بیان کیا ہے تاریخ کی روشنی میں دیکھئے تو معلوم ہو جائے گا کہ عصامی کس حد تک ناقابلِ اعتبار ہے۔ طبقات ناصری سے ثابت ہے کہ سلطان شمس الدین التمش نے چھ اولادیں چھوڑی تھیں۔ پانچ بیٹے یعنی رکن الدین، جلال الدین، معزالدین، قطب الدین، ناصرالدین، اور ایک بیٹی رضیہ۔ عصامی کو صرف دو بیٹوں اور ایک بیٹی ہی کا علم تھا، چنانچہ کہتا ہے:۔

دو پور و یکے دخترِ شہریار ۔ دریں ملک ماند است زنشہ یادگار

ملک التونیہ کو (جس کا صحیح نام تک عصامی کو معلوم نہیں اور لاطونہ کہتا ہے) ایک جہاں گرد لٹیرا سردار بتایا ہے حالانکہ وہ تبرہندہ کا گورنر تھا۔ پھر ملک التونیہ کو اس طرح پیش کیا ہے کہ گویا وہ رضیہ کے متعلق کچھ جانتا ہی نہیں۔ رضیہ نے بتایا تو اُسے معلوم ہوا کہ رضیہ سلطان شمس الدین

التتمش کی بیٹی تھی اور خود بھی سوا تین برس حکومت کر چکی تھی۔ اس سے زیادہ مہمل بات اور کیا ہوسکتی ہے۔ یاقوت کا سرِ دربار قتل ہونا بیان کیا ہے حالانکہ وہ اُس وقت مارا گیا جب تبرہندہ کے قریب پہونچ کر رضیہ کے ہمراہی اُمرائے بغاوت کی تھی۔ رضیہ کے متعلق لکھتا ہے کہ اس نے تین برس کے بعد پردہ چھوڑا حالانکہ وہ تخت نشینی کے سال بھر بعد ہی نقاب اُتار کر پھینک چکی تھی۔ عصامی کے بقول رضیہ نے بادشاہ ہونے کے تین سال بعد پردہ چھوڑا پھر چھ مہینے بعد دربارِ عام شروع کیا۔ اس کے چھ مہینے بعد لوگ اس سے بدگمان ہوئے۔ اس طرح گویا کم سے کم چار برس رضیہ نے حکومت کی مگر آگے چلکر خود ہی رضیہ کی مدّتِ حکومت سوا تین سال بیان کرتا ہے۔ "دروغ گورا حافظہ نباشد" والا معاملہ معلوم ہوتا ہے۔

طبقاتِ ناصری سے معلوم ہوتا ہے کہ سلطان شمس الدین التتمش کے بڑے بیٹے کا نام ناصرالدین محمود تھا۔ وہ باپ کی زندگی میں بنگالے کا گورنر تھا اور باپ کی زندگی ہی میں اُس نے وفات پائی۔ اسکے مرنیکے بعد شمس الدین کے یہاں ایک اور بیٹا پیدا ہوا۔ بادشاہ نے اپنے مرحوم بیٹے کے نام پر اس کا نام بھی ناصرالدین محمود رکھا۔ یہی ناصرالدین محمود ہے جس نے تقریباً بیس برس دہلی کی سلطنت پر فرمانروائی کی۔ عصامی اس ناصرالدین محمود کو ناصرالدین محمود گورنر بنگال کا بیٹا بتاتا ہے حالانکہ وہ دونوں بھائی تھے اور دونوں سلطان شمس الدین التتمش کے بیٹے تھے۔ عصامی کی تاریخ دانی کا اس سے بڑھکر ثبوت اور کیا ہوگا۔ رضیہ کے سّو برس بعد جن راویوں نے رضیہ کے زمانے کے واقعات کے متعلق اتنی بے سر و پا باتیں بیان کی ہوں کیا رضیہ کی عدم پارسائی کے بارے میں اُن کا قول قابل تسلیم ہوسکتا ہے؟

سلطان رضیہ کو بدنام کرنے میں عصامی کے علاوہ آٹھویں صدی ہجری کے مشہور سیّاح ابن بطوطہ کا بھی ہاتھ ہے۔ وہ عصامی کا ہمعصر ہے اور واقعاتِ ماضی کے بیان کرنے میں اتنا ہی مہمل گو ہے جتنا عصامی۔ ابن بطوطہ ۷۳۴ھ ۱۳۳۳ء میں سلطان محمد تغلق کے زمانے میں ہندوستان آیا۔ اور آٹھ برس دہلی میں عہدۂ قضا پر مامور رہا۔ اُس نے اپنے سفرنامے میں شاہانِ ماضی کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ کسی مستند تاریخ سے ماخوذ نہیں بلکہ بازاری افواہوں اور سُنی سُنائی روایتوں اور حکایتوں کا مجموعہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ جب ہم اسکے بیانات کو تاریخ کی روشنی میں دیکھتے ہیں تو خرافات کا ایک پلندہ معلوم ہوتا ہے۔ اتنے زمانے تک دہلی میں رہنے کے باوجود اس نیک بخت کو اتنا تحقیق نہ ہوسکا کہ سلطان شمس الدین کا صحیح نام کیا تھا چنانچہ التتمش کے بجائے للمش لکھا ہے اور اعراب بھی بیان کر دئے ہیں تاکہ کوئی غلط نہ پڑھے۔ (وضبط اسمہ بفتح الام الاولی وسکون الثانیہ وکسر المیم وشین معجم)

آیئے لگے ہاتھوں سفرنامۂ ابن بطوطہ کی بھی سیر کر لیجئے۔

"جب سلطان شمس الدین کا انتقال ہوا تو اُس نے تین بیٹے چھوڑے۔ رکن الدین جو اس کے بعد بادشاہ ہوا۔ معز الدین اور ناصر الدین اور ایک بیٹی جس کا نام رضیہ تھا۔ جب رکن الدین بادشاہ ہوا تو اُس نے اپنے بھائی معز الدین کو قتل کر ڈالا۔ رضیہ اپنے بھائی معز الدین کے قتل سے برافروختہ ہوئی اس لئے رکن الدین نے اُسے بھی قتل کرنا چاہا۔ ایک روز جمعہ کے دن رکن الدین نماز کے لئے باہر نکلا۔ رضیہ مظلوموں کے کپڑے پہن کر پرانے قلعہ کی چھت پر چڑھ گئی جو جامع مسجد کے پہلو میں تھا اور لوگوں سے کہا کہ میرے بھائی نے اپنے بھائی کو مار ڈالا اور اب مجھے بھی قتل کرنا چاہتا ہے۔ اور انہیں اپنے باپ شمس الدین کا زمانہ اور اسکی نیکیاں اور احسانات یاد دلائے۔ پس لوگوں نے اسی وقت وہاں سے جاکر مسجد ہی میں رکن الدین کو گرفتار کر لیا اور بھائی کے قصاص میں قتل کر دیا۔ رضیہ کا بھائی ناصر الدین چونکہ بچّہ تھا اس لئے رضیہ کو بادشاہ بنا لیا۔

ولما قتل رکن الدین اجتمعت العساکر علی تولیتہ اختہ رضیتہ الملک۔ فولوہا واستقلت بالملک اربع سنین وکانت ترکب بالقوس والترکش کما یرکب الرجال ولا تستر وجہہا ثم انہا اتہمت بعبد لہا من الحبشہ فاتفق الناس علی خلعہا وتزویجہا۔ فخلعت وزوجت من بعض اقاربہا وولی الملک اخوہا ناصر الدین۔

رکن الدین کے قتل ہونے کے بعد فوجیں اسکی بہن رضیہ کی بادشاہی پر متفق ہوگئیں۔ اور اسکو بادشاہ بنا لیا اور چار برس تک اس نے حکمرانی کی۔ وہ کمان اور ترکش لیکر مردوں کی طرح سواری کرتی تھی اور اپنا منہ نہیں چھپاتی تھی پھر وہ اپنے ایک حبشی غلام کے ساتھ بدنام ہوئی۔ لوگوں نے اس امر پر اتفاق کیا کہ اُسے معزول کردیں اور اسکی شادی کردیں۔ بس اُسے تخت سے اُتار دیا اور اُسکے ایک رشتہ دار سے اسکی شادی کر دی۔ اور اس کا بھائی ناصر الدین بادشاہ ہوا۔

جیسا کہ ہم پیشتر بیان کر چکے ہیں سلطان شمس الدین کی وفات کے بعد اُسکے پانچ بیٹے زندہ تھے لیکن ابن بطوطہ صرف تین بیٹے بیان کرتا ہے۔ یہ بھی سراسر غلط ہے کہ رکن الدین نے تخت پر بیٹھتے ہی معز الدین کو قتل کر ڈالا۔ رکن الدین کے بعد رضیہ بادشاہ ہوئی اور رضیہ کی معزولی کے بعد معز الدین تخت پر بیٹھا اور دو برس تک حکومت کی۔ معز الدین کے بعد اس کا بھتیجا علاء الدین مسعود شاہ بن رکن الدین تخت نشین ہوا۔ چار برس اُس نے بھی فرمانروائی

کی۔ اس کے بعد تخت و تاج ناصرالدین کے قبضے میں آیا۔ ابن بطوطہ رضیہ کے بعد براہِ راست ناصرالدین محمود ہی کو بادشاہ بنا دیتا ہے کیونکہ معزالدین کو تو وہ رکن الدین کے ہاتھوں پہلے ہی قتل کرا چکا ہے، اسکے حساب سے اب صرف ناصرالدین ہی باقی تھا لہذا اُسی کو تخت پر بٹھا دیا۔ ابن بطوطہ کے بیان کے مطابق رضیہ کی شادی اُسکے ایک رشتہ دار سے ہوئی جو سراسر غلط ہے۔ ملک التونیہ گورنر تبرہندہ کا اُس نے کوئی ذکر نہیں کیا۔

مذکورِ بالا اقتباسات سے ظاہر ہے کہ عصامی کی طرح ابن بطوطہ کا بیان بھی خرافات کا مجموعہ ہے اور کسی طرح قابل قبول نہیں۔ عصامی اور ابن بطوطہ دونوں نے یاقوت کو غلام کہا ہے۔ لفظ غلام سے ناواقف لوگ اس شبہ میں پڑ جاتے ہیں کہ اگر رضیہ کو یاقوت سے کوئی دلی لگاؤ نہ تھا تو اُس نے ایک غلام کو اتنا اونچا درجہ کیوں دیا کہ امرائے دربار اُس سے جلنے لگے۔ اوّل تو کسی مستند تاریخی شہادت سے یاقوت کا غلام ہونا ثابت نہیں۔ بالفرض اگر اُسے غلام مان بھی لیا جائے تو وہ اسی قسم کا غلام تھا جس قسم کے سلطان قطب الدین ایبک، سلطان شمس الدین التمش، سلطان غیاث الدین بلبن اور دوسرے اُمرائے ترک تھے۔

یورپین مورخین بھی جنہوں نے واقعات کی جانچ پرتال کی ہے رضیہ کی پاکدامنی کے قائل ہیں۔ چنانچہ الفنسٹن (Elphinstone) اپنی تاریخ ہند میں لکھتا ہے:-

It does not appear that her fondness was criminal.

"یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ یاقوت پر رضیہ کا التفات مجرمانہ تھا"

کیمبرج ہسٹری آف انڈیا:

There appears to have been no impropriety in her relations with him.

"رضیہ اور یاقوت کے تعلقات میں کوئی نازیبا بات نظر نہیں آتی"

لین پول:-

Her preference for the Abysinian Yakut, though perfectly innocent so far as any evidence goes —

"یاقوتِ حبشی کی جانب رضیہ کا رجحان، جہاں تک ثبوت ملتا ہے، بالکل معصومانہ تھا"

ریورٹی (مترجم طبقات ناصری):-

I think the character of this princess has been assailed without just cause

"میرا خیال ہے کہ اس ملکہ کے کیرکٹر پر بغیر کسی معقول وجہ کے حملہ کیا گیا ہے"

ان لوگوں کے علاوہ مارش مین (Marshman) ہنٹر (Hunter) کین (Keen) ٹیلر (Taylor) وغیرہ نے جنہوں نے ہندوستان کی تاریخیں لکھی ہیں، کسی نے بھی رضیہ کی پاکدامنی پر شبہ کا اظہار نہیں کیا۔

الغرض رضیہ کو عدم پارسائی کا مجرم گردانا سراسر ناانصافی ہے۔ اُمرائے ترک نے رضیہ سے اس لئے ہرگز بغاوت نہیں کی تھی کہ اُس کے اطوار اخلاقی نقطۂ نظر سے قابلِ گرفت تھے بلکہ اُن کی بغاوت کے اسباب دوسرے تھے۔ اوّل تو آٹھویں صدی ہجری کی ذہنیت آج کی ذہنیت سے بالکل مختلف تھی۔ اُس زمانے میں عورت ہرگز اس قابل نہیں سمجھی جاتی تھی کہ مردوں پر حکومت کرے۔ اس دور میں عورتوں کے متعلق مردوں کے جو خیالات تھے اُن کا خلاصہ عصامی کی زبان سے آپ سُن چکے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ شمس الدین کی وفات کے بعد باوجودیکہ رضیہ ہر طرح تاجِ شاہی پہننے کی اہل تھی اور سلطان شمس الدین اُسے اپنا ولی عہد بھی مقرر کر چکا تھا۔ پھر بھی امرائے سلطنت نے نااہل رکن الدین کو بادشاہ بنانا پسند کیا اور رضیہ کی قابلیت اور اس کے حقوق کو نظر انداز کر دیا کیونکہ وہ ایک عورت تھی۔ اس کے علاوہ اُمرائے ترک اپنے نسل کے غرور کی بنا پر ایک حبشی کا عروج برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ یہ اُن کی انتہائی توہین تھی کہ ایک حبشی اُن کا ہم رتبہ قرار پائے۔ رضیہ کے بجائے اگر کسی مرد بادشاہ کے دربار میں یاقوتِ حبشی کو یہ تقرب حاصل ہوا ہوتا تب بھی اُمرائے ترک اسی طرح بغاوت کرتے جس طرح انہوں نے رضیہ کے خلاف کی۔

عندلیب شادانی

ساقی نامہ

ساقیا! دے مجھکو ایسی مے کا جام
عکس میں اُس کے نہاں ہو یہ اثر
رنگ و بو در کار ہے وہ خوشگوار
آشنا لب سے اگر وہ جام ہو
ساقیا! دے ساتگینِ مے ادھر
شام سے بیٹھا ہوں پیاسا سامنے
ملتفت پاتا نہیں اب تک تجھے
نام سائل سن کے تو مفلس جان
جرعۂ مے اک پلا کر دیکھ لے
ڈر نہ صرفِ مایۂ خمار سے
ساقیا! دے بادۂ ریحاں صفت
سحر کی تاثیر جس میں ہو بھری
وہ پری جو جس کے سر پہ ہو سوار
پیکے ہو کالائے تن سے بے خبر
ساقیا! دے بھر کے ایسا جامِ مے
دودھ کا ہو رنگ شربت کا مزا
محتسب کو تا نہ ہو پینے میں باک
حلق سے نیچے اُتر کر ایک گھونٹ
ساقیِ خورشید طلعت ماہوش!
تجھکو خود بینی سے کب ہوگا فراغ
کب گلے کے نیچے اُترے گی وہ شے؟
کب یہ میکش آئیں گے اوسان میں؟
کب ٹھکانے آئیں گے انکے حواس؟
کب دعا لے گا پلا کر ان کو تو؟
ساقیِ شیریں سخن، گل پیرہن!
خشتِ خم کو خم کے منہ پر کیوں دھری؟
سوچتے پھولے بیٹھے ہیں کیوں بادہ خوار؟
کیوں بدل ڈالا گیا آئینِ شام؟
ساقیِ سحر کرم [illegible]
بھر دے اک جام لگا دے خشک لب
طے بکل ہوگا نہیں مجھ سے سلوک

فرش ہو پر تو سے جسکے لعل فام
جھومتے آئیں نظر دیوار و در
ہو بلا گردانِ میخانہ بہار
محترم تر جم سے میرا نام ہو
تشنہ کاموں پر بھی کرتا رہ نظر
لب سے مس اب تک نہیں کی جام نے
جو نہ کہنا تھا پڑا کہنا مجھے
کنزِ معنی ہے مرے منہ میں زبان
در کشادہ گنجِ معنی خیز کے
تول کر دونگا دُرِ شہوار سے
دے پلٹ دے تائبِ مے کی جو مت
سامنے شیشہ ہو شیشے میں پری
وہ پڑھا جن جس کا تقویٰ پر مدار
جائے بالیں کفشِ پا ہو زیرِ سر
ہو جو محسوسِ نظر کچھ اور شے
بو میں عود و مشک و عنبر سے سوا
ہو کے تر دامن بھی سمجھا جائے پاک
پینے والے کو نچائے چار کھونٹ
تک رہے ہیں تیری صورت بادہ کش
کب مئے صافی سے پُر ہونگے ایاغ
جو دھری خم میں، بھری شیشوں میں تھی
کب پڑے گی جان انکی جان میں؟
پہنچیں گے کب انکی ہونٹوں تک گلاس؟
کب یہ ہونگے تر دماغ و تر گلو؟
سرد کیوں ہے آج تیری انجمن؟
ترک کیوں کر دی ہو میکش پروری؟
بن گئی ہے کیوں خزاں انکی بہار؟
کیوں صراحی خشک ہے، سوکھے ہیں جام؟
ٹپکے مینا سے مئے کلفت زدا
ورنہ کر بہرِ خدا میری طلب
کوک سازِ طبع نوش آہنگ کوک

سُن ترانے عندلیبِ باغ کے
یادگارِ بلبلِ ہندوستان
رو نہ کیجو ایسے سائل کا سوال
اس صفت کا مانگنے والا کوئی
کیوں نظر انداز ہو اسکی طلب
وہ طلب ہونے لگی کیوں رائیگاں
میں پیوں گا بادۂ تقویٰ شکن
سادہ طبعی سے مری فطرت ہی غیر
مقتدیِ پیرِ میخانہ ہوں میں
انگلیاں اُٹھتی ہیں ہستی پر مری
مے کے پینے سے نہیں منہ موڑتا
آبِ آتش خاصہ ہے میری روح
چوم کر ساغر کے لب، رخسار کو
موجزن ہے وہ ہوائے میکشی
کرتا رہتا ہوں بطِ مے کا شکار
یا بدستِ ساقیِ گلپوش ہو
ہو یہ ہمت ظرفِ صہبا نوش کی
پُر خمِ گردوں میں گر ہوتی شراب
مہر و مہ دو بیش قیمت جام ہیں
صافیاں بنتی انہیں کی روشنی
صحنِ میخانہ بنے گر آسمان
مست ہوں جب لوٹنے کی جا ملے
قلزم آسا تلخ ہو حوضِ شراب
کاسہ ہائے سر نظر آئیں حباب
قطرہ قطرہ آب کا ہو جائے مے
ہو صدائے رعد پر قلقل کا شک
چلنے لگ جائے اگر ٹھنڈی ہوا
تشنہ کیوں رکھے گی ساقی کی نوال
کیوں گنہگاری کا اندیشہ کریں
مے رہے مستی رہے دنیا رہے

لطف آئیں گے کلامِ داغ کے
نامور مرزا سراج الدین خاں
متصف ہو جو باوصافِ نوال
ملنگے جُز مے کے بھلا شے کونسی
یاد ہوں حسنِ طلب کے جس کو ڈھب
ہو بہا میں جس کی گنجِ شائیگاں
مجھکو کاغذ پر کھلاتے ہیں چمن
بے نمک باتون لوگوں سے ہی سیر
نام کا ساقی کے دیوانہ ہوں میں
منکشف ہے وضع بستی پر مری
دُرد تک خم میں نہیں میں چھوڑتا
پیرِ میخانہ سے ہوتے ہیں فتوح
دل سے دیتا ہوں دعا خمار کو
گھٹتی ہی مستی تو بڑھتی ہے غشی
ہو کے پُر کیوں جامِ مے پائے قرار
یا شناسائے لبِ مے نوش ہو
بات بیہوشی میں کہدی ہوش کی
تو ہمیں پینے کو ملتی بے حساب
ان سے لیتے کام، وقفِ عام ہیں
صاف کتنی ہوتی مے ان کی چھنی
تو بھی میخواروں کے کام آئے جہاں
نشہ کھلنا چاہیے جس درجہ کھلے
اپنے ہم مشرب بنیں ماہیِ آب
شیخ پائے خشک طبعی کا عذاب
غیرِ مے کوئی نہ ہو سیال شے
برق کی چشمک ہو شیشے کی چمک
دامنِ ساقی کو جانیں ہل گیا
اُس سے دنیا جب کرے مے کا سوال
پیشِ حق جب عاجزی پیشہ کریں
تا قیامت بس یہی دھندا رہے

ابو المعظم سائل دہلوی

اکسیون بادشاہ تھسلی کا عرش پر پہونچنا

اور دیبی جونو کے حالات

بادل گرجا، ہوا کا غل ہوا، مینہ بھی موسلا دھار برسنے لگا۔ اور زمین پر ہر طرف گھپ اندھیرا چھا گیا۔

آسمان پر بجلیاں خاردار شاخوں کی شکل میں چمکیں۔ منظر کسی قدر روشن ہوا۔ دیکھا تو ایک چھوٹے سے سبزہ زار کے بیچ میں دروسی وضع کا ایک مندر کھڑا ہے، اور اُس کے چاروں طرف جنگل کے ہرے بھرے درخت لہلہا رہے ہیں۔ ہوا پانی سے بچنے کے لئے ایک آوارہ گرد مسافر نے اپنے تئیں چادر میں خوب لپیٹ لیا۔ اور کہنے لگا کہ "جوپیٹر حقیقت میں میرا سچا دوست اور ہمدرد ہے۔ اگر اس وقت اُس کے مندر کی یہ عمارت نہ ہوتی تو میری چاہنے والی بیوی اور میری غمخوار رعایا نے تو میرا کام ہی تمام کر دیا ہوتا۔"

بادل کا گرجنا بند ہوا۔ ہوا کا شور جاتا رہا۔ خاموشی چھائی اور مینہ برسنا بھی موقوف ہوا۔ بادل جب پھٹے تو چڑھتے چاند کا ہلال نظر آیا۔ اور آسمان سے ایک کڑکتی گرجتی آواز یہ کہتی سُنائی دی۔

"تو کون ہے جو جوپیٹر کے سوا اپنا دوست و دردمند کسی کو نہیں سمجھتا۔ جوپیٹر تو وُہ ہے جسے ساری دُنیا ملعون و مردود سمجھتی ہو۔ کیا تو کوئی فلسفی ہے؟"

"اگر فلسفی سے مُراد مصیبتوں کا جھیلنے والا ہو تو مجھے بھی فلسفی سمجھئے۔ باقی احوال یہ ہے کہ کچھ زمانہ ہوا کہ میں بادشاہی کرتا تھا مگر اب ایک خانہ برباد بے نوا ہوں۔"

"تیرا نام کیا ہے؟"

"مجھے اکسیون کہتے ہیں، میں تھسلی کا بادشاہ تھا۔"

"ہائیں۔ ہم تو سمجھتے تھے کہ تھسلی کا بادشاہ اکسیون بڑا خوش قسمت آدمی ہے۔ اور ہم نے یہ بھی سُنا تھا کہ حال میں اس نے شادی کی ہے۔"

"اے دیوتاؤں اور منشوں کے باپ۔ میں تو حضور کو ایسا ہی سمجھتا ہوں تھسلی، اولمپس[1] نہیں۔ شادی کی خوشی صرف غیر فانی ہستیوں کے لئے مخصوص ہے۔"

"تو کیا تیری بیوی دیا کی طبیعت میں رشک تھا۔ جلاپا تو عورتوں میں ایک عام بات ہے۔ اور شوہر سے بیوفائی کرنا عام تر مرض ہے۔ اور ان دونوں باتوں کا ہونا عام ترین دستور ہے۔"

"ممکن ہے کہ یہ کچھ نہ ہو۔ بات کچھ ایسی نہ تھی کہ وہ مجھ سے بگڑ جاتی۔ جب آپس میں ہمدردی نہ ہو تو پھر ایک تنکے پر بھی ایسی لڑائیاں ٹھن جاتی ہیں کہ گھر میں بیٹھنا دشوار ہو جائے اور نہایت خراب نتیجے پیدا ہوتے رہیں۔ مجھ میں احتیاط نہ تھی، لوگ کہتے تھے کہ میں منھٹا ہوں۔ بیوی بالکل سرد مہر تھی، مگر لوگ اُسے بڑے دل والی بیوی کہتے تھے۔ سب کی رائے اس کی نسبت اچھی تھی۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ میاں بیوی کے معاملے میں میں دوسروں کی دست اندازی پسند نہ کرتا تھا۔ دیا ہر بات میں دوسروں کا صلاح مشورہ لیتی تھی اور دُنیا بھی کہتی تھی کہ دیا حق بجانب ہے۔ مگر زندگی پھر زندگی ہے۔ خواہ محلوں میں گذرے خواہ کسی پہاڑ کے غار میں۔ میں حضور کا ممنون ہوا کہ بادل کا گرجنا آپ نے بند کر دیا۔"

"عجیب مُردہ دل ٹھنڈی طبیعت کا آدمی ہے۔ تو کیا دیا نے تجھے چھوڑ دیا؟"

"جی نہیں۔ میں نے دیا کو چھوڑ دیا۔"

"کیسا احمق عقل کا دُشمن ہے۔"

"بالکل تو احمق نہ سمجھئے۔ میرا قصہ دراز ہے۔ میں از سر تا قدم قرضے میں غرق ہو چکا تھا۔"

"یہ کہو نا۔ اس سے سارا حال خود بخود کھُل جاتا ہے۔ مگر تم دُنیا والے فانی انسان تو بڑے قسمت ور ہو۔ تمہیں تو مرنے کے بعد قرضہ ادا کرنے کے وعدے پر قرضہ مل جاتا ہے۔ مگر ہم غیر فانی ہستیوں کو یہ بات کہاں نصیب۔ مجھے تو اپنے باپ کے خلاف بغاوت کرنی پڑی تھی۔ کیونکہ وہ مجھے ہمیشہ تنگدست رکھتا تھا اور مرتا بھی نہ تھا ——— تو تم نے دولت کی خاطر شادی کی؟"

---

[1] دیبیوں اور دیوتاؤں کے رہنے کا مقام۔

"حضور کیا تو یہی۔ اُس زمانے میں عورتوں کی اتنی کمی تھی کہ موقع کا ملنا مشکل ہوگیا۔ صرف پارکائی والی عورتیں تھیں مگر ان سب نے شادی سے قسم کھا رکھی تھی۔ اور کوئی ان میں دولت مند بھی نہ تھی۔ سوائے میری بڑھیا دادی ترا کے، جس کے پاس البتہ پیسہ تھا۔ بات یہی ہے جتنی بڑھیا ہو اتنی ہی اچھی۔ بہرکیف دیا سے میں نے شادی کرلی۔ وہ بیٹی تھی دیونیوس کی، اور اُسے باپ سے بڑی دولت ملنے والی تھی۔ بڈھے دیونیوس نے بیٹی کو جہیز میں دینے کو ایک بڑی رقم مخصوص کی تھی۔ مگر اب اس رقم کے دینے پر یہ شرط لگائی کہ میں گھوڑوں کا شوق چھوڑ کر اپنا اصطبل خالی کردوں۔ خیال فرمائیے اس سے بدتر کیا شرط ہوسکتی تھی۔ اس وقت میں نے اپنا غصہ ظاہر نہ ہونے دیا۔ کیونکہ جن سوداگروں سے میں چیزیں مول لیا کرتا تھا اُنہوں نے یہ دیکھکر کہ میری شادی بڑی جگہ ہونے والی ہے، مجھے سودا دینا بند نہ کیا۔ اور جو چیزیں میں طلب کرتا وہ مجھے دیتے رہے۔ لیکن کچھ دنوں بعد اُنہیں بھی کسی طرح خبر لگ گئی۔ اور اب اُنہوں نے مجھ پر تقاضے شروع کردئے۔ میں نے چاہا کہ میری بیوی دیا بیچ میں پڑکر کچھ فیصلہ کرادے۔ مگر وہ اپنے باپ کی قابلِ رشک بیٹی تھی اور ہمیشہ اپنے باپ کی حمایت کرتی تھی۔ اگر وہ شوہر کی اطاعت کرتی تو پھر اُس سے بہتر عورت دُنیا میں نہ ہوتی۔ آخرکار ایک دن میں نے اپنے خسر دیونیوس کو لاریسہ کی گھوڑدوڑ دیکھنے بلایا۔ خیال ہوا تھا کہ اس موقع پر خسرے داماد میں ملاپ ہوجائیگا۔ لیکن اس بڈھے نے یہ غضب کیا کہ جس گھوڑے پر میں نے اس اُمید میں بازی لگائی تھی کہ اگر جیت گیا تو کل قرضے ادا ہوجائیں گے، اُس گھوڑے کو خریدکر اپنے گھر پہونچا دیا۔ اس طرح میری بازی کا منصوبہ غارت کرادیا۔ اس مرتبہ بھی میں نے اپنا غصہ کسی پر ظاہر نہ ہونے دیا۔ اب میں نے باغ میں ایک گڑھا کھودا اور اس میں خوب دہکتے ہوئے کوئلے بھردئے۔ کھانا کھانے کے بعد جب یہ میرے بڈھے خسر چہل قدمی کے لئے نکلے تو گڑھے میں گرکر مر گئے۔ گو اُن کا گرنا اور مرنا محض اتفاقی تھا لیکن دیا نے مجھے اپنے باپ کا قاتل ہونا مشہور کردیا۔ اور اپنا دل ٹھنڈا کرنے کے لئے اپنی رعایا کو حکم دیا کہ وہ میرا سر قلم کردیں۔ اس میں شک نہیں کہ بیٹیوں میں دیا کی کوئی برابری نہ کرسکتا تھا۔ عامیوں کا حال یہ ہے کہ ان کی رائے میں استقامت کہاں؟ رعایا میں سے چند آدمیوں نے میری غضبناک بیوی کے کہنے میں آکر میرے محل کو گھیر لیا۔ میں ننگی تلوار ہاتھ میں لئے اِن میلے کچیلے آدمیوں میں سے رستہ نکالتا ہوا باہر آگیا۔ قریب ہی ایک عدالت تھی، وہاں پہونچا۔ یہاں کے حکام عدالت سب صاحب تخت و تاج تھے۔ میں نے اُنہیں اپنی برادری کا آدمی سمجھکر چاہا کہ وہ قتل کے جرم سے میری صفائی کردیں۔

لیکن انہوں نے کچھ نہ کیا۔ اگر میں کسی رعیت کو قتل کردیتا تو رعایا کے مقابلے میں وہ میری حمایت پر کھڑے ہوجاتے۔ لیکن یہاں مضمون دوسرا تھا۔ مجھ پر ایک بادشاہ کو جان سے مار ڈالنے کا الزام تھا۔ اس لئے انہوں نے صاف کہدیا کہ تم ایک بادشاہ کے داماد ہو۔ ہم تمہاری حمایت کچھ نہیں کرسکتے۔ غرض سخت پریشاں حالی اور آوارہ گردی کے بعد جب کہ میرے ہی ہم جنسوں نے مجھ سے پہلو تہی کی تھی، میں یہاں آگیا۔ اور اب اے عالی انتساب و حشم جوپیٹر میں آپ کے ظلِ عاطفت میں ہوں۔ جس کا وہم و گمان بھی مجھے پہلے نہ تھا۔"

جوپیٹر نے کہا "تم بہت صاف اور سچے آدمی معلوم ہوتے ہو۔ اور فی الحقیقت سخت مشکل میں مبتلا ہو۔ دیوتا اُن پر رحم کرتے ہیں جن پر انسان کو رحم نہیں آتا۔"

"اے معظم و مکرم جوپیٹر، میں اس قابل نہیں کہ آج تیرے اس کرم کے بدلے سو بیل قربانی کردوں۔ صرف شکریہ قبول ہو۔ آپ حقیقت میں دیوتا ہیں۔"

"مجھے علم نہیں کہ جس طرح آسمان پر ہم اپنی زندگی بسر کرتے ہیں وہ طریقہ تم پسند کروگے۔ کھانا ہم آفتاب غروب ہوتے ہی کھاتے ہیں۔ کیونکہ اپولو[1] کو کام میں اتنا مصروف رہتا ہے کہ اس سے پہلے اُسے فرصت نہیں ہوتی۔ اور جب تک وہ کھانے میں شریک نہ ہو کھانے کا لطف نہیں۔ لیکن صبح کا وقت آپ کا ہے جس طرح چاہے اُسے بسر کریں، اور جس طرح چاہے اس سے محظوظ ہوں۔ اس وقت دیبی دیانہ[2] آپ کو کھیل تماشوں میں لے جائیگی۔ آپ کو تیراندازی کا شوق ہے؟"

"جی ہاں۔ میرا تیر تو مرگِ مفاجات سے کم نہیں ہوتا۔ انجوکوس[3]، حضور میری طرف سے بالکل اطمینان رکھیں۔ میں ہر جگہ اپنا دل بہلاسکتا ہوں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ میں عرش پر آپ کے پاس کیونکر پہونچوں۔"

"میں آسمانوں کے قاصد مرکیوری کو بھیجتا ہوں۔ اس کے برابر سفر میں کوئی رفیق نہیں۔ اے میرے شاہین[4] تو کہاں ہے؟"

بادل پھر اُمنڈ آئے۔ زمین پر ہر طرف اندھیرا ہوگیا۔

۲

"اتنی تیزی نہ کرو، ہولے ہولے قدم بڑھیں۔ کیا مزاج ناساز ہوگیا"

"جی ہاں، کچھ امتلا معلوم ہوتا ہے۔ مگر کچھ نہیں۔"

"رفتار کی تیزی کی وجہ سے ایسا محسوس ہوتا ہے۔ اس کا

---

[1] سورج کا دیوتا؛ [2] چاند کی دیبی؛ [3] جوپیٹر کا دوسرا نام ہے؛ [4] جوپیٹر اپنے کاسہ بردار کو اسی نام سے پکارتا ہے؛

علاج سوائے بیف اسٹیک[1] کے دوسرا نہیں۔ ہم تارس میں قیام کرینگے وہاں یہ چیز اچھی ملے گی۔"

"مرکیوری آپ نے تو بڑی سیاحی کی ہے۔"

"جی ہاں دُنیا دیکھی ہے۔"

"واہ کیا خوب نظارہ ہوگا۔ مجھے بھی سیر و سفر کا بہت شوق رہا ہے۔ مگر کچھ نہیں، ایک ہی چیز کو بار بار دیکھنے میں لُطف نہیں۔ ندرت کچھ نہیں محض جگہ بدلنی تصوّر فرمائیں۔"

"میں تو سفر کرتے کرتے اب بالکل ہار گیا ہوں۔ اگر پنشن مل جاتی تو آرام سے گھر بیٹھتا۔"

"لیکن سفر سے عقل بڑھتی ہے۔"

"افکار البتہ کچھ دُور ہو جاتے ہیں چیزیں زیادہ دیکھنے سے احساس میں کمی ہوتی ہے۔ مگر یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ بڑے بڑے معاملات جن کی فکر میں رات دن گھلے جاتے تھے بے حقیقت ہوتے ہیں۔"

"یہی حال میرا بھی سمجھئے۔ جب اس ہوائے لطیف میں اڑتا ہوں تو مجھے اپنی بیوی کی کچھ حقیقت نہیں معلوم ہوتی۔ اور یہ گندی دُنیا بالکل ہیچ نظر آتی ہے۔ اور دُشمن جو ہمیشہ درپئے آزار رہتے ہیں چیونٹیوں سے زیادہ نہیں معلوم ہوتے۔ خود اپنے قرضے بھی جن سے سخت آزار پہونچے ہیں، عزت، بے عزتی، دولت، گداگری، ان سب پر ہنسی آتی ہے۔"

"اکسیون، میں دیکھتا ہوں کہ آپ بہت شگفتہ خاطر ہوتے جاتے ہیں۔ آپ بہت جلد دُنیا میں بڑے آدمی ہو جائیں گے۔ ہاں ذرا اِس ستارے سے بچکر نکلئے۔"

"اس ستارے میں کون رہتا ہے۔"

اس کا حال تو تقدیر کی دیبی کو معلوم ہوگا۔ مجھے علم نہیں۔ کچھ ادنیٰ ذلیل سے آدمی وہاں رہتے ہونگے جن کی بڑی تمنّا یہ ہوگی کہ دوسروں کی آنکھوں میں جچ سکیں۔ یہ ستارہ ایک نو دولت سیارہ ہے اور اسی صدی میں اس کا آسمان پر نمودار ہونا تحقیق ہوا ہے۔ ہم وہاں کے رہنے والوں سے ملتے جلتے نہیں۔"

"اُن کی یہ حالت قابلِ افسوس ہے۔ اس وقت بُھوک بے مجھے شدّت کی معلوم ہو رہی ہے۔"

"ہم اب کھانے کی پہلی گھنٹی ہوتے ہی عرش پر پہونچ جائینگے۔ گھبرائیے نہیں، غیر کے مکان پر پہونچنے کا وقت اس سے بہتر دوسرا نہیں۔ کھانے سے پہلے صرف اتنا وقت مل سکیگا کہ کپڑے بدل لے جائیں۔"

[1] گوشت کے پارچے جو مسالہ لگا کر تلے جاتے ہیں۔

سہ پہر کا ناشتہ بُھوک بگاڑ دیتا ہے۔ جوپیٹر کے پاس آجکل ایک باورچی اپنے کام میں بڑا ہوشیار موجود ہے۔"

"میں نے سُنا ہے کہ جوپیٹر کے مطبخ میں شراب طہورا اور امرت بکثرت موجود رہتا ہے۔"

"لاحول ولا۔ اب تو کوئی اُنہیں ہاتھ تک نہیں لگاتا۔ یہ تو پُرانی قسم کی آسمانی غذائیں تھیں۔ اب انہیں کون پوچھتا ہے۔ اتنا ضرور ہوتا ہے کہ کھانے کی میز سے کچھ دُور ایک میز پر وہ چُن دی جاتی ہیں۔ اب تو عرش پر سوائے باورچی گری کے کسی بات کی قدر نہیں۔ ہمارا باورچی تو پروسرپینی[2] کے پاس سے آیا ہوا ہے۔"

"کیا آپ کبھی جہنّم میں گئے ہیں۔"

"جی بارہا اتفاق ہوا ہے۔ اب تو اولمپس والوں کا یہی طریقہ ہے کہ جاڑا جہنّم میں بسر کرتے ہیں۔"

"تو کیا آجکل عرش پر موسم بہار کا ہے۔"

"یہ آپ کی خوش قسمتی ہے۔ آجکل تو عرش پر اتنے لوگ آئے ہوئے ہیں کہ تل رکھنے کو جگہ نہیں رہی۔"

"جوپیٹر کی بڑی نوازش تھی کہ مجھے ایسے موقع پر مدعو کیا۔"

"درست ہے، جوپیٹر میں جہاں کچھ اچھی باتیں ہیں وہاں کچھ بُری بھی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ آجکل آپ پر اس کا التفات ہے۔ اور یہی اچھا بھی ہے۔ لیکن آپ کو ہوشیار رہنا چاہیئے۔ جوپیٹر کے پاس سب کچھ ہے مگر دل نہیں۔ وہ جس قدر مطلق العنان ہے اتنا ہی طبیعت میں تلوّن بھی رکھتا ہے۔"

"مگر آسمان کے دیوتا مجھ پر اتنے نامہربان نہیں ہو سکتے جسقدر کہ انسان بے مروّت ثابت ہوا ہے۔"

"درست ہے۔ جن لوگوں کو دوسروں سے کوئی آزار پہونچا ہے وہ یہی سمجھتے ہیں کہ اس سے بڑھکر آزار ممکن نہیں۔ لیکن اب تو آپ ترقی کی راہ پر ہیں۔ اس لئے کوئی فکر کی بات نہیں۔ ہم میں کچھ لوگ خوش باش اور زندہ دل بھی ہیں۔ آپ بڈھے نپتیون[3] سے ملکر بہت خوش ہونگے۔"

"کیا وہ آجکل یہیں ہیں۔"

"جی ہاں۔ وہ اکثر بہار کا موسم ہمارے ہی پاس رہا کرتے ہیں کیونکہ اس زمانے میں سمندر پر کچھ کام نہیں ہوتا۔"

"مجھے تو مارس[4] سے ملنے کا بیحد اشتیاق ہے۔"

[2] پروسرپینی ایک دیوی تھی جسے جہنم کا دیوتا اٹھا کر جہنم میں لے گیا تھا۔
[3] سمندر کا دیوتا۔ [4] لڑائی کا دیوتا۔

"واہ آپ نے بھی کس جانور کا نام لیا۔ وہ سُورما نہیں ہے اُسے تو بڑا سانڈ سمجھئے۔ ہمارے بہترین احباب کے حلقے میں اس کا شمار نہیں۔ مگر آجکل تو اولمپس میں اپنی مونچھوں پر تاؤ دینے والوں کا زور ہے۔ رہیں عورتیں تو انہیں تصنیف و تالیف سے کہاں فرصت۔ منروا[1] نے تو دیبی وینس[2] کی بھی کچھ ہستی نہیں رکھی۔ آپ ذرا منروا کی آخیر تصنیف تو ملاحظہ کریں۔"

"مجھے تو پڑھنے سے نفرت ہے۔ میرے پاس اتنا وقت کہاں۔ زیادہ سے زیادہ کبھی اخبار پر چلتی سی نظر ڈال لیتا ہوں۔"

"پڑھنا لکھنا، کام کاج کرنا کبھی یکجا نہیں ہوتے۔"

"میں سمجھتا ہوں کہ دیبیاں تو بہت ہی مغرور ہونگی۔"

"جی ہاں، اُن کا بھی وہی حال ہے جو دُنیا کی سب عورتوں کا ہے۔ مزاج گو مختلف ہوتے ہیں لیکن غرض و غایت سب کی ایک ہی ہوتی ہے۔ وینس کو سوائے ہنسنے مذاق کرنے کے دوسری بات نہیں۔ منروا کے مزاج میں ذرا احتیاط ہے۔ مگر وہ سمجھتی ہے کہ اس کے برابر کسی کا مذاق صحیح اور سلیم نہیں۔ رہی جونو تو اُسے سیاسی دھندوں سے کہاں فرصت۔ باقی رہیں اور تو وہی مثل ہے کہ دل کا مگر حسینوں پر قابو نہیں پاتا۔ اسے محض دوستانہ نصیحت سمجھیے گا۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔"

"مجھے کسی بات کا خوف نہیں۔ میرا دل تو صرف دولت سے اُبھرتا ہے۔ اب تو ہم بادلوں سے بھی زیادہ بلند ہیں۔ جب نیچے دیکھتے ہیں تو اُفق کے کنارے غروب آفتاب کے وقت ایک سپید برف کا ملک نظر آتا ہے۔ اور طوفانی سمندر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی فوق العادت قوت نے کہر اور غبار کی مدد سے اُسے منجمد کر کے ایک شکل دیدی ہے۔ دیکھئے سروں پر کیسی خوشگوار ہوا چل رہی ہے۔ اور خوشبو سے کیسی مہک رہی ہے۔ میں سانس لیتا نہیں معلوم ہوتا مگر میری نبضیں ایک نوجوان کی نبضوں کی طرح چل رہی ہیں مشکل سے محسوس کرتا ہوں کہ مجھ میں جان ہے لیکن آپ کی معیت میں کچھ عجیب شان ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت آپ دیوتا معلوم ہوتے ہیں۔ کیا میں بھی آپ کو ایسا ہی معلوم ہوتا ہوں واقعی یہ عرش ہے، جنت ہے۔"

(۳)

دونوں مسافر یعنی مرکیوری اور اکسیون اب لاجورد کی سیڑھیوں تک پہونچ گئے۔ سیڑھیاں دُور تک گئی تھیں۔ اوپر پہونچتے ہی دونوں پُر فضا باغوں میں داخل ہوئے۔ یہاں پاکیزہ روشیں پیچ و خم کھاتی دیکھیں۔ سبزہ پاؤں پڑتے ہی دبتا تھا اور اُس سے ایک خوشبو پیدا ہوتی۔ اور پاؤں خود بخود اس طرح اُٹھتا تھا کہ رفتار میں تیزی ہو جاتی۔ ہر طرف جھاڑیوں میں نہایت خوش رنگ پھول کھلے تھے۔ اور اُن کے رنگ آن آن میں کچھ کے کچھ ہو جاتے تھے۔ اُونچے اُونچے درختوں کے جھنڈ کھڑے تھے۔ اُن میں طرح طرح کے خوش رنگ پرندے چہک رہے تھے۔ یا پتیوں کے جھرمٹ میں چپ چاپ بسیرا لیتے تھے۔ فوّارے چھُٹ رہے تھے اور اُنکے پانی میں عطر و گلاب کی خوشبو تھی۔

سامنے ایک عالیشان محل سونے کا تھا۔ یہ نہ معلوم ہوتا تھا کہ کہاں سے شروع ہوا ہے اور کہاں ختم ہوتا ہے۔ اُسکے حسین بُرجوں پر موتی جڑے تھے اور لمبی لمبی کھڑکیاں بلّور کی تھیں۔ لعل و یاقوت کے پُر تکلّف دروازے کے سامنے بہت سے جنّات شانوں پر اُونچے اونچے پر لگائے پہرا دے رہے تھے۔ مرکیوری نے کہا کہ "دیوتاؤں کا باپ اس وقت لباس بدل رہا ہے۔ میں وہیں جاتا ہوں اور آپ کے آنے کی اطلاع کرتا ہوں۔ یہ کمرے آپکے قیام کے لئے ہیں اور کھانا آدھے گھنٹے میں تیار ہوا جاتا ہے میں آپ کو اطلاع کرنے پھر آؤں گا۔ شام کو باضابطہ طریقے سے آپ کا تعارف جوپیٹر سے کیا جائے گا۔ آپ اس وقت کچھ تو بادۂ ناب کے سرور میں اور کچھ بانسریوں کی دلکش صدائیں سُنکر تمام دُنیا سے اتفاق کرینگے کہ جوپیٹر فی الواقع عرش پر خدائی کرتا ہے۔"

(۴)

"اچھا اکسیون آپ تیار ہیں۔"

"ہاں تیار ہوں۔ جوپیٹر کا کیا ارشاد ہے۔"

"جوپیٹر مسکرایا مگر کچھ جواب نہ دیا۔"

اِس وقت وہ ایک نئی پوشاک کے پہننے میں مصروف تھا غرض لباس پہن وہ اپنے تخت پر بیٹھا۔ ذرا بادل کی گرج سُنو۔ آگے بڑھو۔ اب جوپیٹر ایک بڑے ایوان میں جس کی چھت ایک خوشنما بُرج تھا، آیا۔ یہاں عاج اور سونے کی کرسیاں ایک میز کے گرد آراستہ تھیں اور ان پر جنگہائے ماتی تن کی تصویریں کندہ کر کے بڑی کاری گری سے اس میں چاندی کی میناکاری کی تھی۔ ولکن[3] نے اپنی شادی کے موقع پر یہ نادر و نفیس چیزیں بطور تحفے کے جوپیٹر کو پیش کی تھیں۔ اکسیون نے جب ٹھوس سونے کے برتن کھانے کے دیکھے تو جس قدر خیالات شاہی تکلّفات کے اس کے ذہن میں تھے اُن پر تاریکی چھا گئی۔ سب سے بڑی سونے کی قاب میں ستاروں کا اقتران دکھایا تھا۔ اکسیون نے سب دیوتاؤں کے باپ جوپیٹر کو دلچسپی کے ساتھ دیکھا۔ مگر ابوالارباب نے اکسیون کا کچھ خیال نہ کیا۔ اکسیون نے

---

[1] عقل و دانش کی دیبی، [2] عشق و محبت کی دیوی۔

[3] آگ کا دیوتا۔

جوپیٹر کے چہرے کی شان اور دبدبے کو محسوس کیا جس کی ذراسی جنبشِ لب پر سارا اولمپس لرز اُٹھتا تھا۔ توانائی اور تندرستی جوپیٹر پر نثار تھی۔ چہرے پر مسرت کے آثار تھے۔ کمر سے سینے کی اُٹھان اور اُس کی چوڑائی حقیقت میں اس بات کی دلیل تھی کہ لڑنے میں یہ دیوتا لاثانی ہے۔ وقت اور زمانے کا اس پر عمل نہ تھا۔ عنبریں زلفیں حلقہ درحلقہ رخساروں پر بکھری تھیں اور اُن میں دستِ قدرت نے مانگ نکالی تھی۔ رخسار سدا بہار جوانی میں سُرخ اور چمکتے تھے۔

مغرور ومتکبر دیبی جونو بائیں طرف اور کیریز[1] داہنی طرف بیٹھی تھیں۔ باقی جلیسوں میں سمندر کا دیوتا نپٹیون، لاتونہ[2]، منروا اور اپولو تھے۔ غرض جب مرکیوری اور اکسیون اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے تو ایک کرسی پھر بھی خالی رہی۔

"جوپیٹر نے پیشانی پر بل ڈال کر پوچھا" دیانہ کہاں ہے؟"

اپولو نے عرض کیا کہ "میری بہن اس وقت شکار کھیلنے گئی ہوئی ہے ـــ"

"کھانے کے وقت ہمیشہ دیر کرکے آتی ہے۔ یہ عادت ایک دیبی کو ہرگز زیبا نہیں"۔

جونو نے طنزاً کہا۔ "دیوتائی مشاغل میں مصروفیت سے یہ لازم نہیں آتا کہ طبیعت میں دیوتاؤں کے سے اوصاف بھی پیدا ہوجائیں"۔

لاتونہ نے آہستہ سے کہا۔ "میں سمجھتی ہوں کہ دیبی دیانہ ابھی آتی ہوں گی"۔

لاتونہ کی بات سُنکر جوپیٹر کو اطمینان ہوا اور وہ مہمان بھی جو اس وقت تک غیر حاضر تھا حاضر ہوگیا۔

نپٹیون بولا۔ "کہو دیانہ، آج کا شکار کیسا رہا"؟

"چچا جان شکار خوب رہا"۔ اب جونو کی بہن دیانہ نے جونو سے مخاطب ہوکر کہا۔ "اماں، میں آپ کے لئے ایک مور لائی ہوں"۔ (دیانہ جب جونو کو خوش کرنا چاہتی تھی تو اُسے "اماں" کہتی تھی)

جونو کو پالتو جانوروں کا بیحد شوق تھا۔ وہ طاؤس کا تحفہ لیکر بہت خوش ہوئی۔ جوپیٹر نے کہا۔ "مرکیوری، بیکس[3] نے آج شراب پر بڑا غل مچایا۔ مگر اسکی شکایت بلاوجہ تھی۔ تمہارا کیا خیال ہے"؟

"مجھے تو شراب اچھی معلوم ہوتی ہے۔ مگر میں تھکا ہوا ہوں اور تھکن میں تو سب ہی شرابیں اچھی ہوتی ہیں"۔

کڑکتے گرجتے جوپیٹر نے کہا۔ "سفر بھی تمہیں بہت لمبا کرنا پڑا۔ اکسیون تم سے مل کر میں بہت خوش ہوا"۔

منروا نے اکسیون سے پوچھا۔ "کیا جناب والا آج ہی تشریف لائے ہیں"؟

اکسیون کی نشست منروا کے قریب ہی تھی۔

"میں اسی گھنٹے میں یہاں آیا ہوں"۔

منروا مُسکرا کر بولی۔ "یہاں آپ وقت یا گھنٹوں کا ذکر نہ کریں۔ فرمایئے یونان کی کوئی نئی خبر"۔

"میں تو کچھ عرصہ سے وہاں کسی سے ملتا ملاتا نہ تھا"۔

"ہومر کی کوئی نئی اشاعت ہوئی یا نہیں۔ میں تو اس شاعر کے کلام کی بہت ہی مدّاح ہوں"۔

اپولو خوشرو جوان تھا مگر چہرے پر بجائے خوش دلی کے غم اور افسردگی کے آثار تھے۔ قمیص کا گریبان کھول کر کالر پیچھے کو ڈالے رکھتا تھا۔ اور گھونگر والے بال کچھ عجیب انداز میں سر پر بکھرے تھے۔ "یونان کی یہ بات مجھے بہت دلچسپ معلوم ہوتی ہے کہ وہاں کوئی بات دلفریبی سے خالی نہیں۔ میں نے تو یونان کو ہمیشہ اپنی ذاتی جائداد سمجھا۔ بہترین اشعار میں نے وہیں دلفائی کے مندر میں بیٹھ کر کہے تھے۔ یونان کی سیر میں نے بہت ہی نوعمری میں کی تھی۔ مجھے تو بنی نوع انسان کی حالت قابلِ رشک معلوم ہوتی ہے"۔

اکسیون بولا۔ "کیا واقعی"؟

"جی ہاں، کم سے کم انسان میں یہ قدرت تو ہے کہ خوش رہتے رہتے جب زندگی دوبھر ہوجائے تو اُسے ختم تو کرسکتا ہے۔ لیکن ہم آسمانی ہستیوں کی توقعات سے یہ بات خارج ہے۔ کہنے کو تو جو جس کا جی چاہے کہے لیکن ہمارا یہ 'بقائے دوام' تو بلائے جان ہوگیا ہے"۔

دیبی کیریز بولی۔ "اپولو تم کچھ کھاتے نہیں ہو"۔

نپٹیون نے کہا۔ "اور کچھ پیتے بھی نہیں"۔

"کھانا پینا کیا ہے۔ یہ محض زندہ رہنے کے لئے ہے۔ اور زندگی کیا ہے موت ہے۔ بشرطیکہ اُسے ناقابلِ برداشت سمجھکر انسان اس سے گریز نہ کریں۔ میں تو صرف سوڈا واٹر پیکر اور ایک آدھ بسکٹ کھاکر تازہ دم ہوجاتا ہوں۔ گنی میڈ[4] سوڈا واٹر اور بسکٹ ہو تو کچھ دو"۔

اب سُنیئے کہ گو اولمپس اپنے کھانوں کے خوش ذائقہ ہونے میں شہرہ آفاق تھا۔ مگر اس شاعرِ بےکس ونامراد کی بدقسمتی تھی کہ اس نے یہی دو چیزیں اپنے لئے مخصوص کر رکھی تھیں جس کا عرش کے مودی خانوں میں پتا نہ تھا۔ بھلا عرش پر سوڈا واٹر اور بسکٹ کہاں۔ غرض بڑی گڑبڑ مچی۔

---

[1] اناج کی دیبی۔ [2] آگ کی دیبی کا نام۔ [3] خدائے خمر۔

[4] جوپیٹر کا حسین کاسہ بردار۔

آخر کار شاعر نے جسے اپنی شہرت کا ایسا ہی خیال تھا جیسے موٹے ہو جانے کا خوف۔ ایک بطِ مسلّم کا کباب کھا کر اور ایک بوتل تیز شراب کی پی کر اپنے معدے کو تسکین دی۔

منروا نے اپولو سے دریافت کیا کہ ہومر کی نسبت آپ کا کیا خیال ہے۔ اس بارے میں مَیں آپ کی رائے معلوم کرنا چاہتی ہوں۔"

"تو پھر آپ نے مجھے اپنی رائے پہلے نہ بتائی ہوتی کیونکہ آپ کا ذوقِ سخن ایسا نازک و لطیف ہے کہ میں آپ سے اختلاف نہیں کر سکتا۔"

"میں سمجھتی ہوں کہ آپ کا میلانِ خاطر بدعت وانکار کی طرف ہے۔"

اپولو نے جواب دیا "واقعہ یہ ہے کہ میں ہومر کو کچھ زیادہ خیال نہیں کرتا۔ خود اپنے زمانے میں ہومر کی کچھ قدر نہ تھی۔ اور ظاہر ہے کہ ہمارے معاصر ہی ہمارے کلام کے بہترین مبصر اور نقاد ہو سکتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ بہت کم لوگ مذاقِ سخن کے متعلق کسی بات کا فیصلہ کرنے کی قابلیت رکھتے ہیں۔ بعض لوگ خاص وجوہ کی بنا پر ارادہ کر لیتے ہیں کہ کسی شاعر کی تعریف میں مبالغہ کرینگے۔ باقی لوگ اُن ہی کی پیروی کرتے ہیں۔ مگر یہ سب لغویات ہیں۔ اور فی زمانہ جو ہومر کی تعریف کی جاتی ہے اس کو بھی لغویات میں سمجھئے۔ لوگ کہتے ہیں کہ مَیں ہومر کا خوشہ چین ہوں۔ مگر بات یہ ہے کہ لڑکپن کے سوا میں نے ہومر کو پھر اُٹھا کر نہیں پڑھا اور جو خیال میرا اس وقت تھا وہی اب تک ہے۔ اس میں شک نہیں کہ کلام میں ایک وحشیانہ قوتِ بیان ضرور ہے۔ مگر مذاق کچھ نہیں۔ جیسا مَیں ابھی عرض کر چکا ہوں اس کا یقین فرمائیں کہ ہمارے معاصر ہی ہمارے کلام کے بُرے بھلے ہونے کا فیصلہ کر سکتے ہیں۔ اور ہومر کے ہم زمانہ لوگوں نے اس کے کلام کے متعلق خود فیصلہ کر دیا تھا۔ لیکن کسی بڑے شاعر کے کلام کو کوئی دبا نہیں سکتا۔ خود میرا حال ملاحظہ کریں۔ جب میرا پہلا دیوان شائع ہوا تو مرسیاس نے کہا کہ "ایک دیوتا کے لئے اتنی شاعری خاصی ہے۔" میں نے اس کے جواب میں مرسیاس کی ہجو لکھی۔ یا یوں سمجھئے کہ زندہ مرسیاس کی کھال کھینچ کر اُس میں بھُس بھر دیا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ شاعری چیز کیا ہے۔ اس پر نقد کرنا کس چیز کا نام ہے۔ اور یہ زندگی کیا ہے۔ بس سب کو ہوا سمجھئے۔ مگر ہوا کیا ہے۔ آپ کو اس کا علم ہو تو ہو مجھے علم نہیں۔ وہ ایک رازِ سربستہ ہے اور باقی سب تاریکی ہے۔ اور اسی تاریکی میں سے بادل پھٹ کر ایک ستارہ نظر آتا ہے جو چمکتا ہے اور وہی ستارہ شاعری ہے۔"

منروا بے اختیار کہنے لگی "واہ کیا خوب فرمایا ہے۔"

ہیلیون نے کہا "اپولو میں آپ کا مطلب بالکل نہیں سمجھا۔"

جوپیٹر نے وینس کیریز سے پوچھا "کہو حال میں کچھ تم نے پروسرپینا کی بھی خیر خبر سُنی؟"

وینس کیریز بولی "جی ہاں کل خط آیا تھا۔ پروسرپینا[۱] اور پلوتو نے یہاں آنے کو لکھا ہے۔ پلوتو تو آجکل بالکل عدیم الفرصت ہے کیونکہ لڑائیاں بکثرت ہو رہی ہیں۔ مجھے تو خوف ہے کہ پروسرپینا کے ساتھ پلوتو کا آنا مشکل ہے۔"

جونو نے ایک اشارہ کیا۔ گویا تار برقی دوڑا دیا۔ جتنی دیبیاں وہاں تھیں وہ سب اُٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔

اب جوپیٹر نے بالکل مخلع بالطبع ہو کر اپنی شان و تمکنت کو خیرباد کہا اور بولا "کہو یار اکسیون، میں تو اس وقت تمہارا جامِ صحت نوش کرتا ہوں۔ اپولو تمہاری شعر شاعری پر لعنت۔ مرکیوری کوئی اچھی سی کہانی سُناؤ۔"

(۵)

جونو پوچھنے لگی "اکسیون کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟"

منروا بولی "طبیعت اچھی پائی ہے۔"

جونو نے کہا "واہ یہ کہو آنکھیں بہت خوبصورت ہیں۔"

منروا بولی "بڑا ہی خاموش شریف نوجوان ہے۔"

جونو کہنے لگی "یوں کیوں نہیں کہتیں کہ سب سے بڑھ کر دلفریب اور دلکش نوجوان ہے۔"

دیانہ بولی "یہاں تو اُسے بہت کچھ اجنبیت محسوس ہوتی ہوگی۔"

(۶)

ہرکیولیز[۲] مع اپنی بیوی ہیبی کے داخل ہوا۔ اُسکے آتے ہی خیر و برکت، عفو اور رحم کی دیبیاں جو آپس میں بہنیں تھیں، آئیں۔ یہ تینوں بہنیں شام کے وقت دوستوں کی صحبت میں بہت ہی دلآویز، دلکش سمجھی جاتی تھیں۔ نہ صرف دلکش و دلآویز بلکہ ان کی صحبت مفید اور وہ خود ہر کام کے لئے تیار اور آمادہ سمجھی جاتی تھیں۔ ان کے بعد شادی اور موسیقی کی دیبیاں آئیں۔ ان میں تھالیہ، ملپونی وغیرہ وغیرہ تھیں۔ انہیں مثلیں کہنے کی بڑی مشق تھی۔ جوپیٹر شام کے وقت ہمیشہ پُر لطف صحبت چاہتا تھا۔ بیکس[۳] آیا۔ مگر یہ تو سمجھ ہی گیا تھا کہ شراب نوشی سے لوگ فارغ ہی ہو چکے ہونگے، محض بازدید کے لئے اندر چلا آیا۔

گنی میڈ[۴] نے آکر اطلاع دی کہ جونو کے کمرے میں قہوہ تیار ہے۔

جوپیٹر اس وقت بہت ہی خوش و مسرور تھا۔ اور دنیا کا سب سے

۱؎ جہنم کے دیوتا پلوتو کی بیوی تھی۔ ۲؎ طاقت کا دیوتا۔ ۳؎ شراب کا دیوتا۔
۴؎ یہ ایک خوبصورت نوجوان تھا جو جوپیٹر کا کاسہ بردار تھا۔

والا فانی انسان اس وقت مہمان تھا، اس کی صحبت سے بہت ہی خوش تھا۔ اور اُس نے کہانیوں میں سے ایک کہانی جو دیبی لیدا کے ساتھ پیش آئی تھی نہایت شستہ الفاظ میں بیان کی۔ گو رکاکت اس میں کم تھی مگر دلچسپ بہت تھی۔

نیپچون بولا: "وہ زمانہ بھی کیا خوب تھا۔"

جوپیٹر ایک آنکھ جھپکا کر بولا: "آجکل کے نوجوانوں کے لئے تو بہت ہی خشک و بے لطف زمانہ آگیا ہے۔ اب حسین عورتیں کہاں نظر آتی ہیں۔ اکسیون میں تمہاری بیوی کا جام صحت پیتا ہوں۔"

"بسر و چشم۔ مگر تمنا یہی ہے کہ جو بُعد و فاصلہ ہم دونوں میں اس وقت ہے وہ کم نہ ہو۔"

"بخدا بہت درست کہا۔ اپولو سہارے کے لئے اپنا ہاتھ دو۔ خواتین!" اتنا کہہ جوپیٹر گانے لگتا ہے۔

جوپیٹر آسمان پر کڑک بجلیاں چمکانے والا دیوتا، جونو کے کمرے میں اس طریقے سے سب کو تعظیم دیتا ہے کہ کسی اور دیوتا سے ممکن نہیں۔ حاضرین سب کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور عرش معلی کا تاجدار دیبی کیریز اور لاتونہ کے بیچ میں بیٹھ جاتا ہے۔ اپولو غمزدہ افسردہ دل الگ کھڑا ہے۔ منروا اُسے نیوسینی کے گھر جہاں صحبت احباب خوب گرم ہے لے جاتی ہے۔

یہاں آسمانوں کا قاصد مرکیوری خیر و برکت کی دیبیوں میں تینوں بہنوں سے باتیں کرتا گزرتا ہے۔ بیکس، دیانہ سے باتوں میں مصروف ہے۔ شاعری اور موسیقی کی تینوں حسین دیبیوں نے اپنا گانا سُنا کر محفل گرم کی۔ اور ملکہ عرش (جونو) اکسیون کے پاس آن بیٹھی۔

جونو کسی قدر چیں بجبیں ہو کر اکسیون سے پوچھنے لگی: "کیا آپکو ناچنے کا شوق ہے؟"

"مجھے تو دُنیا میں بھی ایسے مشاغل کا شوق نہ تھا۔ اب عرش پر کیا ناچوں گا۔"

"آپ کی زندگی بھی کچھ عجیب قماش کی گذری ہے۔ آپکے سیر و سفر کا حال میں نے سُنا ہے۔"

"جس بادشاہ کے سر سے تاج اتر جائے اُسے کم سے کم دُنیا کا تجربہ تو ضرور کچھ نہ کچھ ہو ہی جاتا ہے۔"

"آپ عزم و ارادے کے بہت پختہ ہیں۔"

"مجھے بڑی بڑی مُصیبتوں کا سامنا ہوا ہے۔ اب یا دہ مصیبتیں اٹھانے کی ہمت نہیں۔ میں دُنیا میں آوارہ گرد رہا اور معلوم ہوتا تھا کہ آفات و مصائب کے جتنے بے رحم و غارتگر طوفان ہیں وہ میرے ہی سر پر ٹوٹنے والے ہیں۔ مگر جب تک جسم میں جان ہے اُمید قائم ہے۔ جو تعدد پر ہنستا ہے وہ دولت پاتا ہے۔ اگر اس وقت کا لطف برقرار رہے تو میں تو گذشتہ مُصیبتوں کو پھر جھیلنے کے لئے تیار ہوں۔ مگر یہ خیال کسی طرح دُور نہیں ہوتا کہ میں اپنی بیوی کا قرضدار ہوں۔ گو یہ سچ ہے کہ اگر وہ نہ ہوتی تو آپ کا دیدار کب نصیب ہوتا۔"

"یہ تو کوئی دیدار نہیں۔ اگر اسی پر بس ہے تو میری خواہش ہے کہ آگے چل کر آپ زیادہ خوش قسمت ہیں۔"

"تب مجھے بھی اس سے زیادہ کی تمنا نہیں۔"

"آپ کی طبیعت میں اعتدال زیادہ ہے۔"

"میں اتنا کم عقل ہوں کہ آپ کے تصوّر میں نہیں آسکتا۔"

"کیا واقعی؟"

دونوں کی نظریں ملیں۔ مگر دیبی کی پُر فریب نظر کے سامنے بادشاہ تھسلی کی سیاہ آنکھیں نہ جھپکیں۔ جونو کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ اور پشت پھیر وہاں سے چلی گئی۔

حصہ دوم

"کوئی کہتا ہے کہ وہ محض ایک بادل تھا"

۱

قصر اولمپس کے ایک دوسرے کمرے میں مرکیوری اور گنی میڈ کوچ پر بیٹھے باتیں کرتے ہیں۔

مرکیوری نے جمائی لیکر کہا: "خیریت ہے؟"

جوپیٹر کے کاسہ بردار گنی میڈ نے ٹانگیں پھیلا کر کہا: "مگر یقین نہیں آتا کہ ایک فانی آدم زاد اور آدم زاد بھی کون تھسلی کا بادشاہ۔ مُصیبت زدہ آوارہ حال ہو کر اتنی ہمت کر جائے۔ اور وہ بھی فریگیا کی حسینہ کے ساتھ۔ نین دن بھی تو نہیں ہوئے کہ یہی آدمی اپنی بدذات نسل میں برادری سے خارج کیا گیا تھا۔ اور آج وہ ہم سب پر حکومت چلاتا ہے۔"

مرکیوری بولا: "مجھ پر کوئی حکم نہیں چلا سکتا۔"

یارانِ بزم اپنی اپنی کوچوں پر سے اُٹھے۔ اور ہنسنے کی ایک خفیف سی آواز سننے میں آئی۔ جوب صنوبر کے کواڑ کھلے اور اکسیون بڑی بے پروائی کے انداز سے داخل ہوا۔ صبح کی ڈھیلی ڈھالی عبا پہنے تھا۔

اور کوچ پہ بیٹھتے ہی پاؤں سے سلیپر نکال آگے کھسکا دیا۔

اکسیون بولا "میں تو اس وقت تم دونوں سے ملنا چاہتا تھا۔ گنی میڈ تھوڑا سا امرت تو لاؤ اور مرکیوری تم دوڑ کر جوپیٹر سے جا کہو کہ ہم آج محل میں کھانا نہ کھائیں گے۔"

مرکیوری اور گنی میڈ نے ایک دوسرے کو ایسی نظروں سے دیکھا جن میں غصہ بھرا تھا۔

اکسیون نے کہا "کیوں جاتے کیوں نہیں۔ کس بات کا تذبذب ہے۔" یہ جملہ اکسیون نے اس وقت کہا جب کہ وہ آئینہ کے سامنے کھڑا اپنے بال درست کرتا تھا۔

مرکیوری اور گنی میڈ چلے گئے۔

دیا کے شوہر اکسیون نے کوچ پر بیٹھکر کہا "اچھا۔ یہ عرش ہے اور اس میں شک نہیں کہ بڑا پرفضا مقام ہے۔ یہ غیر فانی ہستیاں چاہتی ہیں کہ ان کی طبیعتوں سے پردے اٹھ جائیں۔ یہ کام یقین ہے کہ میں نے واقعی انجام دیدیا۔ وہ چاہتے تھے کہ مجھے اپنے بے لطف پرانے طور طریقوں سے ابھرنے نہ دیں۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ میں نے ان کی ذہنیت [illegible] ہے۔ اگر عرش تک پہونچنا ہے تو حکومت لازم ہے۔ یہ غیر فانی ہستیاں اپنی ہی خود آفریں طبیعت کی ایجادوں میں محو رہتی ہیں۔ خود جوپیٹر اپنی ذات سے ایک پرانا شخص ہے۔ اور کچھ خیالات بھی رکھتا ہے۔ میں آج کل اس کا منظور نظر ہوں۔ اور میری برابر جوپیٹر کی وجہ سے کوئی دوسرا ہر کام میں اتنا با اختیار نہیں۔ ہر بات میں کسی حسینہ کے چال چلن سے لیکر ایک گھوڑے کی نسل معلوم کرنے میں یا لباس کی بیونت یا کھانے کے ذائقہ کو پہچاننے میں میرے سوا کوئی اس کا صلاح کار نہیں۔"

گنی میڈ جو اب اکسیون کا ملازم تھا امرت لایا۔ امرت اسکے ہاتھ سے لیکر اکسیون نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ اور کہا "میں آپ کی خوش حالی اور اقبال کے لئے یہ امرت کا جام پیتا ہوں۔ واہ واہ۔ اس امرت نے تو حلق سے اترتے ہی مجھے غیر فانی بنا دیا۔ دیکھئے تو میرے کانوں میں تو موسیقی کی صدائیں گونجنے لگی ہیں۔ غالباً موسیقی والے ایوان میں یہ گانا ہو رہا ہے۔"

"حضور، اس وقت دیبیاں ایک نئی چیز کی جس کی دھن تو انتورپی اور الفاظ اپولو نے مہیا کئے ہیں، مشق کر رہی ہیں۔ راگ بہت اچھا ہے۔ غالباً عام لوگ بھی اسے پسند کرینگے۔ کیونکہ اس میں شباب اور زندگی کے آلام اور مصائب کے سوا کسی بات کا ذکر نہیں۔ مجھے تو اس بات کا پورا یقین ہے۔"

گنی میڈ پوچھنے لگا "کیا حضور کو شعر کا شوق ہے۔"

اکسیون بولا "مطلق نہیں۔"

گنی میڈ کہنے لگا "اپولو بڑا صاحب کمال ہے۔ لیکن مرسیاس نے اس کی نسبت کہا ہے کہ وہ شاعر نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہ دیوتا ہے، اور دل نہیں رکھتا۔ کیا حضور کا بھی یہی خیال ہے کہ شاعر کے لئے دل کا ہونا ضروری ہے۔"

"میں اس بارے میں واقعی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ لیکن خوب یاد ہے کہ میری بیوی مجھ سے کہا کرتی تھی کہ "تمہارا دل بڑا ہے"۔ مگر بقسم عرض کرتا ہوں کہ میں کبھی نہ سمجھا کہ اس کہنے سے اس کا کیا مطلب تھا۔"

"منروا چاہتی ہے کہ آپ اپنے ہاتھ سے اسکی البم میں کچھ لکھدیں جو بطور آپ کی نشانی کے اسکے پاس رہے۔"

"کیا واقعی منروا کی یہ خواہش ہے، یہ سنکر مجھے واقعی افسوس ہوا کیونکہ لکھنا تو کجا میں تو مشکل سے الٹے سیدھے دستخط کر لیتا ہوں میں سمجھتا ہوں کہ خود جوپیٹر کو ان لغویات سے کچھ بحث نہیں۔"

لطائف و ظرائف جوپیٹر بہت پسند کرتا ہے۔ لیکن اپولو کے کلام کی اسے قدر نہیں۔ وہ تو پرانے کلاسیکل خیالات کا دلدادہ ہے۔ ہجو اور مذمت کو بہت پسند کرتا ہے مگر اس شرط کے ساتھ کہ ان میں بادشاہوں اور دیوتاؤں کا نام نہ آئے۔

"بالکل درست ہے، مجھے اس سے اتفاق ہے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ لاریسا میں ایک بڑا ہی احمق شاعر تھا۔ اس نے یہ ثابت کیا تھا کہ میرا خاندان طوفان سے پہلے کا ہے۔ اس کے بعد اس نے چاہا کہ میں اس کا وظیفہ کر دوں۔ میں نے وظیفہ دینے سے انکار کیا تو اس نے ایک نظم لکھی جس میں بیان کیا کہ میری اصل ان پتھروں سے ہے جو دیو کالیون نے دنیا کو پھر آباد کرنے کیلئے پھینکے تھے۔ اور یہ کہ ان پتھروں میں میرے بزرگوں کے کل اوصاف موجود تھے۔"

"ہاہاہا۔ بادل گرجا۔ سنو۔ مجھے اس وقت جوپیٹر کے پاس دوڑ کر جانا چاہیئے۔ ایوانِ موسیقی سے گانے والے نکلتے ہیں۔ ادھر سے تشریف لے جائیے۔ میں سمجھتا ہوں کہ صحیح راستہ یہی ہے۔"

"لعل و یاقوت والا زینہ چڑھ کر جب دائیں ہاتھ کو مڑیئے گا تو جواہرات والے ایوان میں داخل ہو جائیگا۔ اچھا۔ رخصت۔"

"سلام۔ تم بڑے ہی خلیق اور خوش مزاج نوجوان ہو۔"

۲

تھسلی کا بادشاہ موسیقی والے ایوان میں آیا۔ دلبرایں اسکی

سونے کی تھیلیں اور چھت بلّور کی تھی۔ عرش کی ملکہ (جونو) آرام کرسی پر بیٹھی کاغذ کے مورکتر رہی تھی۔ ایک کاغذ پر کچھ موسیقی تحریر تھی۔ اسی کاغذ پر منروا پنسل سے کچھ لکھتی تھی۔ اپولو الگ کھڑا اس کی ظریفانہ نکتہ چینیوں کو سنتا تھا۔ عرش کی ایک اور خاتون یوترپی اس کے پاس کھڑی تھی اور یوترپی خود عود کا موسیقی آلہ سامنے رکھے بیٹھی تھی۔ جب اکسیون داخل ہوا تو یوترپی نے نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں اور اس کے دیکھنے کا انداز دیکھتے ہی اکسیون کو معلوم ہو گیا کہ یہ تو حسن وجمال کی دیبی ہے۔

جونو نے اکسیون کے آنے پر سر کی خفیف حرکت سے اُسے عزت بخشی۔ اور پھر جو کام کر رہی تھی اُسی میں مصروف ہو گئی۔ منروا نے جو ترمیم موسیقی میں کی تھی جونو نے اکسیون سے اسکے متعلق رائے پوچھی اکسیون نے منروا کی اصلاحوں کو بہت پسند کیا۔

اپولو نے افسردگی کے ساتھ اکسیون کو سلام کیا۔ اور بادشاہ تھسلی کو اُسکے آدم زاد ہونے پر مبارکباد دی۔

عشق کی دیبی وینس نے اولمپس میں اکسیون کے آنے پر اظہار خوشنودی اور اس کی ملاقات پر لطف و مسرت ظاہر کیا۔

وینس نے برق افگن تبسّم کے ساتھ نہایت شیریں آواز میں دریافت کیا کہ "عرش کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے۔ کیسی جگہ ہے؟"

اکسیون نے جواب دیا "عرش مجھے کبھی ایسا دلکش نہ معلوم ہوا تھا جیسا کہ اسوقت آپ کی صحبت میں محسوس ہو رہا ہے۔"

"میرے لئے بالخصوص یہ مقام کسی قدر بے لطف ہے۔ میں تو اکثر نی دوس میں رہتی ہوں۔ وہاں آکر کبھی ملاقات کریں۔ دُنیا میں اس سے زیادہ پُرلطف اور پُرفضا دوسرا مقام نہیں۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ ہمارے ہاں کی پیاز بھی دوسری جگہ کے گلابوں سے کم نہیں۔ وہاں ہم آپ کو ہر طرح کا آرام پہونچائیں گے۔ اگر آپ کی بیوی بھی ساتھ ہوئیں تو اُنہیں بھی کسی طرح کی تکلیف نہ ہوگی۔"

"جی اس کا مطلق خوف نہیں۔ وہ تو ہمیشہ گھر میں بیٹھی گھر کے کام دھندوں میں لگی رہتی ہیں۔ جسکے معنی یہ ہوتے کہ کبھی چٹنی اچار تیار کر رہی ہیں اور کبھی شوہر سے لڑائی ہو رہی ہے۔"

"اچھا! میں سمجھی آپ کے مزاج میں ظرافت بھی ہے۔ عمدہ چیز ہے۔ خود میرا تو یہ حال ہے کہ جہاں پانی کے قدرتی چشمے ہوں جیسے کہ نی دوس، پافوس، کیتھرا کے مقامات پر ہیں بس میں تو وہیں زندگی بسر کرنی بہتر سمجھتی ہوں۔ اگر آپ نے ملنے کی کوشش کی تو آپ مجھے انہی مقامات میں سے کسی مقام پر پائیں گے۔ مکروہاتِ زندگی کو بغیر سوچے سمجھے کہ کیا نتیجہ ہو میں انہی خوشنما مقامات میں برداشت کرنا چاہتی ہوں۔ ان پُرفضا مقامات میں رہ کر آپ کی افسردہ و مُردہ دل نسل سے مجھے بہت ہمدردی ہوتی جاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ محنت مشقت قانون اور اخلاق کے ساتھ زندگی بسر کرنے کی زنجیروں کو توڑ کر بالکل آزاد ہونا چاہتے ہیں۔ مجھے اس بات کا فخر حاصل ہے کہ میں قدرتی چشموں کی دیبی تسلیم کی جاتی ہوں۔ آپ ضرور نیدوس میں تشریف لاکر مجھ سے ملاقات کریں۔"

"اس دعوت کو مکرر پیش کرنے کی ضرورت نہیں کیا نیدوس ایسا مقام ہے جسے آپ بہت ہی پسند کرتی ہیں؟"

"مقام تو ایسا ہی ہے مگر کچھ عرصے سے ایشیا اور ایران کے بیمار وہاں بڑی کثرت سے آنے لگے ہیں۔ مگر اس کے ساتھ ہی بڑے بڑے خوشرو لوگ اپنی بیٹیوں کی نگہداشت کے لئے وہاں اتنے بھر جاتے ہیں کہ بیماروں کی زرد صورتیں اور کمزور ہاتھ پاؤں دیکھنے سے جو تکلیف ہوتی ہے اُسکی تلافی ہو جاتی ہے۔ نیدوس نہیں، میں تو پافوس کو بہتر مقام سمجھتی ہوں۔"

"میں نے بھی وہاں کی خوبیاں بہت سنی ہیں۔"

"نہایت ہی پُرفضا مقام ہے۔ شہر سے باہر دیہات کی زندگی کا لُطف وہیں نصیب ہوتا ہے۔ جب قبرص میں گرمی زیادہ پڑنے لگے تو آپ دوڑ کر پافوس میں سمندر کی تازی ہوا کھانے جا سکتے ہیں، اور پھر وہاں آپ تمام ایسے لوگوں سے ملتے ہیں جن کی ملاقات لائقِ تمنّا نہیں۔ پریشان کرنے والے قدرتی طور پر قبرص ہی میں رہ جاتے ہیں۔"

"بجا ہے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ جب میں نے اپنی شادی کی تو ہم دونوں میاں بیوی شادی کے بعد کچھ زمانہ کاتھیرا میں بسر کرنے کا ذکر کیا کرتے تھے۔ مگر دیانے یہ حرکت کی گاڑی میں ایک تو ماما کو بٹھایا اور پھر اسکے ساتھ ایک بڑا سا صندوق بھی وہیں رکھوا دیا۔ جب گاڑی گھوڑے بدلنے کے لئے چوکی پر رُکی تو میں گاڑی سے اُتر سیدھا گھر چلا آیا۔ اور سبکو جہاں وہ تھے وہیں چھوڑا۔"

"آپ نے یہ بہت ٹھیک کہا۔ مجھے بھی ان بڑے بڑے کاغذی صندوقوں سے سخت نفرت ہے۔ سفر میں وہ تو عذاب جان ہو جاتا۔ تاہم اگر آپ کے دل میں ذرا بھی عشق ہوتا تو آپ کاتھیرا کو بہت پسند کرتے۔ اُونچے اُونچے چٹان، جگہ جگہ سرسبز درختوں کے جھنڈ۔ جنگل میں گھنے درختوں کے سائے میں تنہائی میں بیٹھنے کے قدرتی گوشے پیچ و خم کھاتی روشیں اور پھر غروب آفتاب کا محو کن نظارہ۔ کچھ عرصے سے میرا وہاں جانا کم ہو گیا ہے۔" یہ کہ کر تقریر دیبی نے بہت ہی غمگین اور متین لہجے میں

کی۔ کیونکہ دیبی نہیں چاہتی تھی کہ نفیس و نازک خیالات اکسیون کے سامنے بیان کرے۔

اکسیون بولا: "کیا آپ نے مجھے بالکل ہی بچہ سمجھ لیا ہے؟"

"ہاں"

"غالباً آپ کا خیال بالکل بجا ہے۔ کیونکہ سنتا ہوں کہ ہم فانی انسان کچھ ایسے بے حس ہو جاتے ہیں کہ کسی بات کا بھی اثر قبول نہیں کرتے۔ کیسی نامعقول بات ہے" میں نے اتنا کہا تھا کہ دیبی آگے بڑھی اور دیوتا مارس کو اُس نے تعظیم دی جو سب سے آخر میں ایوان میں داخل ہوا تھا۔

اکسیون کا تعارف خدائے جنگ مارس سے کیا گیا۔ مارس کی صورت پر وحشت برس رہی تھی۔ سلام کے جواب میں وہ بہت ہی تکلیف کے ساتھ کسی قدر جھکا۔ اب بادشاہ تھسلی وہاں سے چلتا بنا۔ منروا نے اپنا دستخطوں والا البم کھولا۔ اور اکسیون سے کہا کہ "اس میں آپ اشعار کا کوئی بند تحریر کر دیں۔"

اکسیون بولا کہ "اے عقل و دانش کی دیبی تاوقتیکہ آپ مجھ میں کوئی خاص بات پیدا نہ کر دیں اُس وقت تک یہ کورا صفحہ آپ کے البم کا ایسا ہی پاک صاف اور کورا رہے گا جیسے کہ آپ خود ہیں۔ کیونکہ مجھ میں اتنی لیاقت کہاں کہ میں اپنے کسی فرمان پر بھی دستخط کر سکوں۔"

"کیا یہ بات تھسلی کے اکسیون کی زبان سے نکل رہی ہے جنہوں نے دُنیا دیکھی ہے۔ اور اگر میں غلطی پر نہیں ہوں تو کہہ سکتی ہوں کہ انہوں نے دُنیا بہت کچھ دیکھی ہے اور اس کی باتوں پر غور کیا ہے۔ میں یہ بات آسانی سے سمجھ سکتی ہوں کہ کیوں وہ اپنی نقل و حرکت کو عوام سے پوشیدہ رکھتے ہیں۔ لیکن کرم فرما کر وہ منروا پہ اتنی عنایت کریں کہ جو قاعدہ انہوں نے اس بارے میں وضع کیا ہے اس سے مجھے مستثنےٰ کر دیں۔"

"مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی آواز نہیں بلکہ ایک روح پرور صدائے موسیقی سُن رہا ہوں۔ ایک قلم عنایت ہو۔"

"قلم حاضر ہے۔ یہ پر کا قلم بوم مقدس کے بازو سے اکھیڑا گیا تھا۔"

"لیجئے میں نے آپ کے فرمانے کے مطابق کچھ لکھدیا ہے۔ کیا یہ کافی ہوگا؟"

منروا نے جو کچھ اکسیون نے لکھا تھا اُسے بہ آواز بلند پڑھا۔ تحریر تھا کہ:۔

"میں نے دُنیا دیکھی ہے۔ دُنیا کے علاوہ ایک اور عالم بھی میری نظر سے گذرا ہے۔ میں نے انسان کے دل کا مطالعہ کیا ہے اور اب میں غیر فانی ہستیوں میں بود و باش رکھتا ہوں۔ میرے شجرِ علم سے پھل توڑ لیا گیا ہے

اور وہ یہ ہے:۔

"آفاقیت آفاقیوں کے مقصد میں ہے۔"

یہ مضمون اکسیون نے منروا کی کتاب میں عرش پر تحریر کیا۔

دیبی منروا بہت ہی غور و خوض کے بعد بولی: "یہ مضمون گو مختصر ہے مگر اس میں بہت سے مطالب بھرے ہیں۔ اکسیون آپ کی ہمت عالی اور آپکی طبیعت جدت پسند ہے۔"

"بجا ہے۔ ہمت تو میں نے بہت کی لیکن اس ہمت سے جو کچھ پیدا ہو اُسے اب دیکھنا ہے۔"

منروا بولی: "اس وقت مجھے جوپیٹر کے پاس مجلس مشورت میں جانا ہے۔ پھر ملاقات ہوگی۔ اکسیون خدا حافظ۔"

"خدا حافظ منروا!"

بادشاہ تھسلی اور مہمانوں سے علیحدہ کھڑا تھا۔ پیشانی پر غور و فکر کے آثار تھے، اور دونوں ہاتھ سینے پر رکھے ایک ستون کے سہارے جس پر مقیش لپٹا تھا سخت متردد و فکر مند کھڑا تھا۔ خدائے جنگ مارس اسوقت وینس سے باتیں کرتا تھا۔ مگر انداز کچھ ایسا تھا کہ دیبی وینس کے عشق میں بالکل محو ہے۔ دیبی ٹیرپی ان کی آپس کی تقریر کے مطابق راگ اور راگنیوں کا شغل کر رہی تھی۔ ملکہ عرش جونو کو کاغذ کے مور کترنے سے بالکل فرصت نہ تھی۔

اکسیون آگے بڑھکر جونو کے قریب ایک کوچ پر بیٹھ گیا۔ اب اکسیون میں پہلی سی بیباکی اور ہر چیز کی طرف سے سرد مہری باقی نہ تھی۔ ان ہی باتوں کے لئے وہ عرش پر مشہور ہو چلا تھا۔ بلکہ اس وقت وہ کسی قدر پریشان نظر آرہا تھا۔ بات چیت بھی اب پہلے کی طرح زیادہ نہ کرتا تھا آخر کار کہنے لگا: "کیا ملکہ سلامت نے اس مور کا ذکر سنا ہے جو موسولوتایہ کی ملکہ کے پاس ہے۔"

جونو بولی: "نہیں۔" اور پھر کچھ ایسی بے پروائی ظاہر کی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ جونو کو اس مور کے حالات معلوم کرنے کا کچھ زیادہ شوق نہیں ہے۔ مگر اتنا ضرور دریافت کیا کہ "کیا ملکہ موسولوتایہ کے مور میں کوئی خاص بات ہے۔"

"حضور، سینہ اس مور کا چاندی کا ہے۔ پر سونے کے ہیں۔ آنکھیں یاقوت کی ہیں اور پنجے پکھراج کے۔"

جونو نے بہت ہی بیقرار ہو کر پوچھا: "اور دُم اسکی؟"

اکسیون نے جواب دیا: "یہ ایک رازِ سربستہ ہے اور دُم ہی سب سے زیادہ عجیب چیز اس مور کی ہے۔"

"مہربان۔ ضرور بتاؤ وہ کاہے کی ہے؟"

"کچھ یاد نہیں آتا۔"

جولو نے بہت ہی مضطرب ہوکر کہا۔ "یاد نہ آنے کی بھی خوب کہی۔ یہ کیونکر ممکن ہے۔ سچ ہے یہ آدم زاد جتنے ہوتے ہیں سب ستانے پریشان کرنے والے ہوتے ہیں۔ میں بہت ہی عاجزی سے پوچھتی ہوں کہ اُس مور کی دُم کاہے کی تھی۔ ابھی بتانا ہوگا۔"

"ایک خاص وجہ ہے جو دُم کا حال بتانے میں مانع ہے۔"

"آخر وہ ہے کیا۔ نہ بتلانے کی وجہ کیسے ممکن نہیں۔ اچھا بس اب بتا ہی دو کہ دُم کاہے کی ہے۔ بس یونہی سمجھو کہ میرے حال پر مہربانی کر رہے ہو۔ بس بتادو کہ اس مور کی دُم کاہے کی ہے۔"

"کیا عرض کروں، دُم کا حال نہ بتلانے کی وجہ کیونکر بیان کروں۔ وہ دُم بھی عجب ہے اور اسکے نہ بتانے کی وجہ بھی عجب ہے۔ دونوں باتوں میں سے صرف ایک بات عرض کرسکتا ہوں۔"

"یہ آدم زاد بھی کیسی ستانے والی مخلوق ہے۔ وجہ چاہے نہ بتاؤ مگر اتنا بتادو کہ دُم کاہے کی ہے۔ اچھا ٹھیرو۔ ہمیں دونوں ہی باتیں بتادو۔ تمہاری بڑی مہربانی ہوگی۔ آخر بتاؤ نا کہ دُم کاہے کی ہے۔ اور اسکے نہ بتانے کی وجہ کیا ہوسکتی ہے۔ اس انتظار میں میری تو جان نکلی جاتی ہے۔"

اکسیون نے کہا۔ "حضور نے یہ کاغذ کا مور بالکل غلط کترا ہے اسکی شکل تو مَنروا کے اُلووں کی سی معلوم ہوتی ہے۔"

"ان کاغذ کے کترے ہوئے موروں کا پوچھنے والا کون ہے۔ موسو پوتا یہ کی ملکہ کے مور کے سامنے ان کی قدر کون کرے گا۔ اس کا مور تو عجیب ہے۔" جولو نے اتنا کہہ صبح سے لیکر اب تک جتنے کاغذ کے مور کترے تھے اُن سب کے پُرزے پُرزے کر توڑ مروڑ پھینک دئے۔ جولو سخت پریشان تھی۔ "اچھا اب بتانے میں دیر کیوں کرتے ہو۔ اگر تمہیں میرا ذرا بھی خیال ہے تو جلدی بتاؤ کہ اس مور کی دُم کاہے کی تھی جس چیز سے وہ بنائی تھی۔"

اکسیون بولا۔ "تو پھر نہ بتانے کی وجہ آپ دریافت کرنا نہیں چاہتیں؟"

"وجہ بعد کو پوچھ لی جائے گی۔ میرے کان تو تمہارے مُنہ کی طرف لگے ہیں۔"

اس موقع پر گنی میڈ اندر آیا۔ اور جولو کے کان میں اُسنے کچھ کہا۔ جولو پریشان ہوکر اُٹھی اور جوپیٹر کے پاس چلی گئی۔

(۳)

تھسلی کا بادشاہ موسیقی کے کمرے سے بہت ہی پریشان اور دلگیر اُٹھا۔ لیکن پھر بھی طبیعت پر ایک وحشیانہ جذبے کا اثر تھا۔ اولمپس کے باغوں میں چہل قدمی کرنے لگا۔ پھرتے پھراتے ایک نہایت ہی پُرفضا سبزہ زار میں آ گیا۔ سبزہ زار کے گرد اُونچے اُونچے سرو کے درخت لگے تھے۔ ان درختوں کا گھیر اور بلندی اتنی تھی کہ ابتدائے آفرینش سے وہ یہیں موجود معلوم ہوتے تھے۔ ان میں تازگی اور طراوت اتنی تھی کہ گویا کائنات کے سب سے پہلے موسم بہار کی شبنم ان پر پڑی ہے۔ پاؤں کے نیچے سبزے کا فرش ایسا نرم تھا کہ ریشم کے لچھے معلوم ہوتے تھے اور جب پاؤں اس پر پڑتا تھا تو ایک شمیم جاں پرور اس سے پیدا ہوتی تھی۔ یہ بہار اور سبزہ دیکھکر اکسیون قدرت کے اس فرش پر ایک ہاتھ سر کے نیچے رکھکر دراز ہوگیا۔ اور کسی فکر میں غرق ہوا۔

اس حال میں گھنٹے گذرنے لگے۔ پہاڑیاں اور وادیاں جو دُور نظر آتی تھیں اُن پر دھوپ ہلکی پڑکر تاریکی ہونے لگی۔

ایک آواز دہشت خیز مگر شیریں اور دل پر اثر کرنے والی سُنائی دی۔ بادشاہ تھسلی چونکا اور اس طرح چونکا جیسے کوئی پریشان خیال آدمی خواب دیکھکر ہوشیار ہو۔ یا دل کے کسی دلچسپ راز کو سوچتے سوچتے چونک پڑے۔ چہرہ سُرخ ہوگیا۔ آنکھوں سے آگ سی نکلنے لگی۔ اور پیشانی پر بل پر بل پڑنے لگے۔ اور سر کے بال ہوا کے جھونکوں سے پریشان ہوئے۔ اکسیون نے نظر اُٹھا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ ایک نہایت ہی حسین نوعمر سامنے کھڑا ہے۔ یہ نوعمر خوبرو شخص سن بلوغ کو پہونچ چکا تھا مگر اپنی عمر کے لحاظ سے اس کا قد زیادہ اُونچا تھا۔ تناسب اعضا بےحد تھا اور سارا ڈیل سانچے میں ڈھلا معلوم ہوتا تھا۔ بھرے بھرے رخسار جن کا رنگ صبح کی ہلکی روشنی میں گلاب کی پتیوں کا سا نظر آتا تھا۔ عارض گلگوں میں موہنیاں[1] پڑکر اس طرح چمکتی تھیں جیسے آسمان پر تارے چمکیں۔ آنکھیں نیلگوں جوش انبساط میں درخشاں۔ مگر لبوں پر شوخی و شرارت ایسی تھی جو چھپائے نہ چھپتی تھی۔ عنبریں کاکل پیشانی کے دونوں طرف گھونگھر بل کھا رہے تھے۔ گردن اور پُشت پر بالوں کی لٹیں اس طرح چھوٹی تھیں جیسے پہاڑ سے پانی کی رَو اُترتی ہو۔ شانوں پر اس خوشرو نوجوان کے دو پر لگے ہوئے تھے جو لرز رہے تھے۔ پروں کا رنگ وہی تھا جو غروب کے وقت شفق کا ہوتا ہے۔ آن آن میں یہ رنگ بدلتے تھے۔ ان کی شوخی اور نیرنگی کیا بتاؤں۔ کبھی بنفشی ہیں تو کبھی لالہ رنگ۔ کبھی سونے کا ڈلا ہیں تو

[1] موہنیاں، رُخساروں میں گڑھے۔

اُجلے اُجلے پروں کا ڈھیر۔ ان رنگوں میں کہیں لاجوردی کہیں نارنجی پٹیاں سی چمک اُٹھتی ہیں۔ چمک اُن میں ایسی تھی جیسے پھولوں پر اوس کی بوندیں چمکیں۔ کبھی وہ آسمان کے تاروں کی طرح سُرخ و سبز رنگ اور کبھی ہیروں کی طرح دمک دمک کر مختلف رنگوں کی جھلک دکھاتیں۔ اس خوش رُو جوان کے کندھے پر ایک ترکش لٹک رہا تھا۔ اور اپنی کمان پر جھکا وہ کھڑا تھا۔

یہ دیکھکر اکسیون چیخ اُٹھا۔ "مہاتما۔ تیرے دیوتا ہونے میں کسے کلام ہی۔ کیا میں اسوقت خدائے عشق کے حضور میں ہوں؟"

نوجوان نے جواب دیا "ہاں میں کیوپڈ ہوں اور میں یہ دریافت کرنے آیا تھا کہ اکسیون کے دل میں اس وقت کیا بات ہے اور وہ کیوں اس قدر فکر مند ہے؟"

"تخیل، قوتِ گویائی سے زیادہ قوی ہوتا ہی۔"

"میں غیب کے رازوں سے واقف ہوں۔ تو فانی انسان ہے۔ میرا اعتبار کر مجھ سے خوف نہ کر، مجھے پورا یقین ہے کہ تجھے میری مدد کی ضرورت ہوگی؟"

کون ہے جوانِ سایہ دار درختوں کے نیچے سبزے پر کھڑا کسی خیال میں غرق ہو اور وہ کیوپڈ کا محتاج نہ ہو۔ بس تم ہمیں اپنا خیال صاف صاف بتاؤ۔ تمہارا محبوب کون ہے۔ کیا وہ عشق کی بیمار کوئی پری ہے۔ جسے کہیں دُور زمین پر چھوڑ آئے ہو، یا کوئی مکار عورت ہے جس کی بیہودگیاں اسکے حُسن کے مقابلے میں جلد فراموش کر دی جاتی ہیں۔ اس معاملے کے نازک ہونے میں ذرا شک نہیں۔ کہیں تمہاری معشوقہ تمہاری بیوی تو نہیں ہی؟"

اکسیون نے فوراً کہا "نہیں ہرگز نہیں"

"تو کیا دوسرے کی بیوی ہے؟"

"نہیں"

"کیا کوئی ضدی مزاج دوشیزہ ہی؟"

اکسیون نے سر ہلا کر کہا "نہیں"

کیوپڈ بولا "معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بیوہ ہے۔ بھلا کسی بیوہ کی نسبت بھی ایسا قصّہ سنا ہوگا؟"

اکسیون زمین سے اُٹھکر چیخا "کیوپڈ مجھ پر رحم کر" اور اتنا کہکر وہ کیوپڈ کے قدموں پر گرا۔ اور کہا "آپ تمام عالم میں انسان کے دوست اور دستگیر ہیں۔ اور دُنیا کی تمام قومیں ایک ہی طریقے سے آپ کے بتکدوں میں نذریں چڑھاتی ہیں۔ آپ کی قدرت اور اختیار تمیزی نے کبھی کسی کو دھوکا نہیں دیا۔ میں تو کسی کے عشق میں بُری طرح مبتلا ہوں۔ اس کے عشق میں دیوانہ ہوں، مرنے تک نوبت پہونچی ہے۔ میرا محلِ عشق نہ میری بیوی ہی اور نہ کسی اور کی بیوی۔ جو کچھ کہا گیا اور جن باتوں پر قسمیں کھائی گئیں اُنہیں چھوڑئیے۔ بہرکیف میں سوسائٹی میں اخلاقی حیثیت رکھتا ہوں۔ وہ نہ کوئی دوشیزہ ہے اور نہ بیوہ ہے۔ وہ تو......"

کیوپڈ نے بے صبر ہوکر پوچھا "یہ کیا کہا۔ کیا کہا؟"

اکسیون بولا "وہ ایک دیبی ہی جس سے مجھے عشق ہے"

کیوپڈ متعجب ہوکر کہنے لگا کہ "کہیں میری شریر اماں[۱] نے ہنسی مذاق میں بالکل معصومیت کے ساتھ آپسے لگاوٹ کی باتیں تو نہیں کیں؟"

"بجا ہی۔ مگر انکی باتوں کا میرے دل پر کچھ اثر نہیں ہوا"

"تو پھر تمہارا دل مضبوط ہے۔ کہیں منروا کے ساتھ تم شعر شاعری تو نہیں کرنے لگے تھے۔ اور عشق افلاطونی کے جو پھندے اُس نے لگا رکھے ہیں اُن میں تو نہیں پھنس گئے؟"

"پھندا اُس نے ضرور لگایا تھا مگر میں اُسے توڑ کر صحیح سالم نکل آیا"

"ٹانگوں کے بھی مضبوط ہو۔ لیکن عاشق کسی کے ہوئے ہو۔ آخر کچھ بتاؤ گے بھی یا نہیں۔ کیا ہیبی پر جان دینے لگے۔ دیانہ کے ساتھ عشق کرنا تو ممکن نہیں۔ وہ بڑی ہی سنگدل اور سرد مہر ہے۔ تو کیا وہ شاعری کی دیبی ہے یا اُن بہنوں میں سے کوئی دیبی ہے جن کے ہاتھ میں انسان کی تقدیر ہے؟"

اکسیون نے سر ہلایا جس سے مراد تھی کہ نہیں۔

کیوپڈ نے بہت بے تکلف ہوکر کہا "یار عزیز تو نے اتنی باتیں بتا دی ہیں کہ اصل بات کو نہ کھولنا اب تصنع سمجھا جائے گا۔ تم اپنے دل کو تسلّی دو اگر میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں تو میری کوشش پر بھروسا رکھو؟"

اکسیون نے بہ آوازِ بلند کہا "اے احسان و کرم کرنے والے دیوتا۔ اگر کبھی ٹریسا میں واپسی کا اتفاق ہوا تو یونان میں سب سے عالیشان بتکدہ تیرے نام کا تعمیر کراؤں گا اور وہاں ایک سچے پرستار کی طرح صفائی قلب سے تیری پرستش کروں گا۔ بس سُن لے، میرے خواب و خیال کی محبوبہ ملکۂ عرش سے درجہ میں کم نہیں"

کیوپڈ بولا "کیا جونو سے مطلب ہی؟"

اتنے میں بڑی شاہانہ اور پُر رعب آواز آئی "میں یہاں موجود ہوں" اور اس آواز کے ساتھ ہی درختوں کے ایک جھرمٹ سے ملکۂ عرش جونو باہر نکلی۔ اکسیون کی نظر نیچی تھی۔ چہرہ تمتمایا تھا۔ دل دھڑک رہا تھا۔ جونو بھی بالکل بیحس و حرکت کھڑی تھی۔ صورت پر زردی تھی اور بے حد

---

[۱] یعنی وینس دیبی۔

مترددو پریشان تھی۔

عشق کے دیوتا کیوپڈ نے ایک زور کا قہقہہ لگایا۔ پر پھڑپھڑاتا دونوں کے بیچ میں کچھ دیر جا کر کاٹنتا رہا اور پھر کہنے لگا "واہ کیا خوب جوڑا ہے۔ کہیں میں آپ دونوں میں مخل تو نہیں ہوا۔ اچھا بس خدا حافظ میں جاتا ہوں" زبان پر تو خدا حافظ تھا مگر فوراً ہی اپنے ترکش سے دو تیر نکالے۔ ایک تیر بادشاہ تھسلی اور دوسرا تیر ملکہ عرش کے سینے پر لگایا۔

۴

ادلمپس کی ہلکی ہلکی روشنی ماند پڑتے پڑتے بالکل محو ہوگئی۔ آسمان پر ستارے مختلف رنگوں میں چمکنے لگے۔ اکسیون اور جونو دونوں محل میں چلے آئے۔ جونو بادشاہ تھسلی کے ہاتھ پر سہارا لئے تھی۔ ملکہ عرش کی نظریں نیچی تھیں۔ اور عالیشان قصر سامنے تھا۔ جونو نے ابھی تک کوئی بات نہ کی تھی۔ اور اکسیون بھی چپ تھا، اور تارے بھرے آسمان کی طرف ٹکٹکی باندھے تھا۔ ایک عالمِ بیخودی اس پر طاری تھی۔ جب محل کا دروازہ سو قدم رہ گیا تو جونو چلتے چلتے رُکی، اور اکسیون کے چہرے کو دیکھکر بے اختیار ہنسی "مجھے یقین نہیں کہ اب اُس بات کے بتانے سے آپ انکار کرینگے۔ یعنی موسوپوتامیہ کی ملکہ کے پاس جو مور ہے اُسکی دُم کس چیز کی ہے"

اکسیون بولا "اب اس سوال کا جواب دینے سے انکار کرنا یقینی غیر ممکن ہے۔ اے حسین دیبی سُن کہ موسوپوتامیہ والے مور کی دُم کے پر وہی ہیں جو کیوپڈ کے پروں میں سے چُرا کر لگا دئے گئے ہیں"

"اچھا۔ کیا وجہ تھی کہ تم نے ابتک یہ بات نہ بتائی تھی"

اکسیون بولا "حسین جونو۔ میرے مزاج میں اتنی احتیاط ہے کہ دوسرے کسی انسان میں نہیں۔ آپ دیکھیں کہ مجھے ایک خاتون کے راز کو اپنے ہی تک رکھنے کا کس درجہ خیال ہے"

جونو بولی "میں یہ بات سُنکر بہت خوش ہوئی" اور اب دونوں ہاتھ میں ہاتھ دئے محل میں داخل ہوئے۔

۵

جونو اور اکسیون سے مرکیوری اس راستہ میں ملا جو ضیافت کے بڑے ایوان کو جاتا تھا۔

مرکیوری نے سر کو جنبش دیکر کہا "میں تو آپ کو تلاش کرنے ہی جا رہا تھا۔ جوپیٹر کا مزاج اس وقت شدت سے برہم ہے۔ کھانا گھنٹہ بھر سے تیار ہے اور کسی کا پتہ نہیں"

بادشاہ تھسلی اور ملکہ عرش نے ایک دوسرے کی طرف پریشان ہو کر دیکھا اور دونوں ضیافت کے کمرے میں داخل ہوئے۔ جوپیٹر کی پیشانی پرُ غبار تھا کہ معلوم ہوتا تھا بادل گرجنے کو ہے۔ مگر اُس نے اپنے قہر و عتاب کی بجلی گرانے کی کسی کو عزت نہ بخشی۔ کبھی اوپر دیکھتا تھا کبھی نیچے۔ جس وقت جوپیٹر نے اُش پینی شروع کی ہے تو سارا اولمپس لرزہ براندام تھا۔ مہمان بھی سب خوفزدہ تھے۔ سب خاموش تھے۔ مگر کیوپڈ اس سے مستثنیٰ تھا۔ جوپیٹر سے عرض کرنے لگا "حضور کو آج خاصہ تناول کرنے میں کچھ دیر ہوگئی"

جونو بولی "ہاں آج اپولو کی آخری نظم پڑھتے پڑھتے میں درختوں کے جھرمٹ میں سوگئی تھی۔ خوش نصیبی سے اس غفلت کی حالت میں ایک ساتھی مل گیا"

"اکسیون تم کہاں تھے"

کیوپڈ نے شرارت سے کہا "ملکہ سلامت حضور امرت کا ایک جام نوش کریں۔ غالباً اکسیون بھی آپ کا ساتھ دیں"

آج کی ضیافت ایسی دھوم دھام کی تھی کہ شاید ہی کبھی پہلے عرش پر ہوئی ہو۔ لیکن کوئی شخص بھی خوش نہ تھا۔ اور کوئی بھی ایسا نہ تھا کہ جس کی طبیعت بے لطف نہ ہو۔ جوپیٹر بات کرتا تھا مگر بہت مختصر۔ غصہ تھا مگر ظاہر نہ ہونے دیتا تھا۔ اپولو نے منروا سے سرگوشی کی۔ مرکیوری نے لبوں کو جنبش تک نہ دی۔ لیکن کبھی کبھی گنی میڈ سے آنکھوں ہی آنکھوں میں بات چیت ہو جاتی تھی۔ خدائے جنگ مارس بھی چپ تھا مگر اس کی تلافی کبھی کبھی وینس دیوی کی طرف متوجہ ہونے سے کر دیتا تھا۔ کیوپڈ اس مجمع میں ایسے سوالات کرتا تھا جو سب کو ناگوار تھے۔ آخر کار دیبیاں کھانے کے کمرے سے اُٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔ مرکیوری نے جوپیٹر کو خوش کرنے کی کوشش کی۔ داستانیں، کہانیاں کہنی شروع کیں۔ مگر اس گرج اور کڑک والے دیوتا کے چہرے پر تبسم کی کوئی علامت ظاہر نہ ہوئی۔ مارس دانتوں میں خلال کرنے لگا۔ اور اپولو اپنے کاکل کے حلقوں میں انگلیاں ڈال کر اُن سے کھیلنے لگا۔ اکسیون اپنے کسی خیال میں بالکل گم تھا۔

اتنے میں گنی میڈ کا سربردار یہ کہنے آیا کہ آپ سب پھر ضیافت کے کمرے میں تشریف لے چلیں۔ یہ سُنکر سب کو اطمینان ہوا۔

منروا اکسیون سے کہنے لگی "آپ نے میرے البم میں جو کچھ تحریر کیا تھا اس پر میں نے ایک تنقید لکھی ہے۔ اس تنقید پر میں آپ کی رائے دریافت کرنا چاہتی ہوں"

اکسیون اتنا کہکر کہ "میں تو بڑا ہی ناقص نقاد ہوں" وہ منروا کے پاس سے ہٹ گیا۔ منروا، اکسیون کو دُور ہی سے دیکھکر مسکرائی جب

اکسیون اس کے پاس سے گذرا تو اُس نے کہا: "آؤ، میرے پاس بیٹھ جاؤ۔ اور کچھ بات کرو۔"

اکسیون کا چہرہ سُرخ ہوگیا۔ ہکلا ہکلا کر کچھ عذر کیا اور جونو کے پاس جا بیٹھا۔ منروا جو خلیق اور نیک دِل بی بی تھی، اکسیون کی اس حرکت پر اُسے تعجب ہوا۔

اکسیون جس کے چہرے پر اُداسی برس رہی تھی، جونو کے پاس بیٹھتے ہی خوش اور بشاش ہوگیا۔

وینس نے کہا: "کیا بات ہوئی ہے؟"

منروا بولی: "ہاں، بہن بات یونہی ہے۔"

کیوپڈ زور سے ہنسا۔

جوپیٹر، مرکیوری کے ساتھ تاش کی بازی کھیلنے میں مصروف تھا۔ عرش کے بادشاہ نے کہا: "معلوم نہیں کیا بات ہے۔ آج جو بات ہوتی ہے اُلٹی ہی ہوتی ہے۔ ہر چیز میں کوئی نہ کوئی خرابی پیدا ہو۔ تاش بھی اس وقت ناگوار معلوم ہوتے ہیں۔ کھانے کا بھی آج بہت انتظار کرنا پڑا اور وہ بھی ایک فانی آدم زاد کی وجہ سے۔"

نیک دل مرکیوری نے کہا: "جہاں پناہ کو تعجب نہ کرنا چاہیئے۔" مرکیوری کو اکسیون سے چشمک تھی: "اس فانی انسان کی خفیف حرکتوں پر حضور کو حیرت نہ ہونی چاہیئے۔ بس اتنا ہی خیال فرمائیں کہ وہ کیا ہے اور کہاں کا ہے۔ مجھے تو اسی پر تعجب ہے کہ جتنا سر اُس کا پھرا ہو اُس سے زیادہ کیوں نہ پھرا۔ وہ آدم ہے جو مٹی گارے سے بنایا گیا تھا۔ مگر اس وقت وہ عرش پر ہے۔ خیال فرمانے کا مقام ہے۔ کیا یہ باتیں وہ نہیں ہیں کہ ایک خاک کے پتلے کا دماغ سڑا دیں۔ اس میں شک نہیں کہ خداوند نعمت نے اتنی دیر تک کھانے پر اس کا انتظار کیا۔ اور اُس نے حضور کو انتظار میں رکھا۔ یہ حرکت تو انسانی جرائم میں سے بدترین جرم ہے۔ فی الواقع میں نہ سمجھتا تھا کہ وہ بات بات پر مجھ پر اس طرح حکم چلائیگا۔ اور گنی میڈ یعنی حضور کے کاسہ بردار کو تو وہ اپنے ذاتی ملازموں میں سمجھنے لگا ہے۔ لیکن ایک آدم زاد سے جسے عرش پر آنے کی عزت بخشی گئی ہو اُس سے اور کیا توقع ہوسکتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اب تو اُسے حضور کا لحاظ اور شرم بھی نہیں رہی ہے۔ اور یہ ضروری چیزیں بھی اُسنے ترک کر دی ہیں۔"

جوپیٹر نے پوچھا: "مرکیوری کیا یہ آدم زاد تم پر بھی حکم چلاتا ہے۔ ہمارا پتا حکم کا تھا۔"

مرکیوری بولا: "حضور کیا عرض کروں، اُسکی باتوں پر تو ہنسی آتی ہے جیسے جیسے حکم یہ بدذات تو دولت آدم زاد نہیں دیتا ہے خداوند نعمت نے بھی کبھی نہ دیئے تھے۔"

"سب تقدیر کی باتیں ہیں۔ یہ ٹرک[1] میرا ہے اور گنی میڈ کا۔" یہ جملہ خوبصورت نوجوان کاسہ بردار گنی میڈ نے جوپیٹر کی کرسی کے ڈنڈے پر جھک کر کہا تھا۔ جس سے معلوم ہوتا تھا کہ آقا کا بہت ہی منہ چڑھا ہے۔ "بندگانِ عالی۔ بات یہ ہے کہ اگر یہی حالت رہی تو یا تو وہ یہاں نہ رہیگا یا میں نہ رہونگا۔"

جوپیٹر بولا: "کیا نوبت بہ اینجا رسید۔ وہ آدم زاد جو ہمیں کھانے پر انتظار میں رکھے اُس کی نسبت تو جو کچھ کہو گے میں باور کر لوں گا۔ دُوا اور تین پانچ ہوئے۔"[2]

گنی میڈ کہنے لگا: "حضور کی ملکہ سلامت اسکی اور ہمت بڑھاتی ہیں۔ بہت ہی دلیر کر دیا ہے۔"

"کیا جونو ایسا کرتی ہے۔"

گنی میڈ بولا: "حضور سب جانتے ہیں۔"

مرکیوری کہنے لگا: "حضور کچھ نہ کچھ تو سب ہی جانتے ہیں۔"

جوپیٹر بولا: "ایسے شخص کو ہماری ملکہ سے بات کرنے کی کیسے جرأت ہوئی محض فانی انسان اور وہ بھی مصیبت کا مارا۔ چال آپکی ہے۔ میں نے بھی اس نامعقول کے متعلق کیسا دھوکا کھایا ہے۔ بھلا کون خیال کر سکتا تھا کہ میرے اتنے احسانات پر بھی یہ بدبخت مجھے کھانے پر انتظار کرائے گا۔"

گنی میڈ بولا: "وہ تو اس وقت جونو کے ساتھ چہل قدمی کرتا ہے۔ یہ کہنا بالکل لغو تھا کہ دونوں کی ملاقات اتفاقیہ ہوگئی تھی۔ خود کیوپڈ نے انہیں دیکھا۔"

جوپیٹر کا چہرہ اتنا سُنکر زرد پڑ گیا۔ للکارا: "ہائیں کیا کہتے ہو۔ لو یہ بازی بھی گئی۔ پتا میرا ہے۔ ملکہ کہاں ہے۔"

مرکیوری بولا: "حضور وہ تو اکسیون سے باتیں کر رہی ہیں۔ نہیں، خطا ہوئی، حضور معاف کریں۔ میں یہ نہیں سمجھا تھا کہ ملکہ سے حضور کی مراد اینٹ کی ملکہ ہے۔"

(۷)

جوپیٹر نے کہا: "جونو کہاں ہے؟"

وینس مسکرا کر بولی: "مجھے علم نہیں۔"

منروا نے طنزاً کہا: "مجھے بھی خبر نہیں۔"

کیوپڈ نے قہقہہ لگا کر کہا: "اور اکسیون کہاں ہے؟"

[1] تاش کے کھیل کی ایک صطلاح۔ [2] یہ بھی تاش کے کھیل کے متعلق ہے۔

جوپیٹر نے کہا "مرکیوری! اور گنی میڈ تم دونوں خود جاکر دریافت کرو کہ ملکۂ عرش کہاں ہیں" جوپیٹر نے یہ حکم بہت ہی کڑک اور گرج کے ساتھ دیا۔

قاصدِ افلاک مرکیوری اور بادشاہ عرش کا کاسہ بردار گنی میڈ حکم سنتے ہی قصر کے مختلف دروازوں سے نکلتے ہی دوڑے۔ ہر طرف سکوت کا عالم طاری تھا۔ خاموشی غیر فانی اور خوفناک تھی۔ اور جوپیٹر کی پیشانی پر قہر و عتاب ایسا تھا جیسے پہاڑ کی چوٹی پر طوفان تلا کھڑا ہو۔ منروا تاش کی میز کے پاس جا بیٹھی۔ اور تاش کا ایک خاص کھیل کھیلنے لگی جس میں دوسرے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وینس اور کیوپڈ دور کھڑے باتیں کرتے تھے تھوڑی دیر میں مرکیوری اور گنی میڈ واپس آئے۔ مرکیوری کے چہرے پر متانت تھی اور گنی میڈ کے سینے میں بغض و کینہ تھا۔

جوپیٹر نے اِن دونوں سے کڑک کر کہا "کیوں"

اس کڑک پر سارا اولمپس لرز اٹھا۔

مرکیوری نے سر ہلایا اور کہا "ملکۂ دوجہاں جونو بادشاہ تھسلی کے ساتھ چبوترے پر چہل قدمی فرما رہی ہیں"

"اچھا اب وہ کہاں ہیں"

مرکیوری نے سر ہلایا گویا اسے معلوم نہیں۔

گنی میڈ نے کہا "ملکۂ عالم جونو کیوپڈ کے خلوت کدہ میں بادشاہ تھسلی کے ساتھ آرام فرما رہی ہیں"

جوپیٹر بولا "یہ تو بڑی گڑبڑ ہے" جوپیٹر اٹھا اور تاش کی میز پر سے شمع اٹھائی۔ تاش سب فرش پر بکھر گئے۔ جتنی غیر فانی ہستیاں وہاں موجود تھیں۔ منروا، وینس، مارس، اپولو، مرکیوری، گنی میڈ۔ شعر اور راگ کی دیبیاں اور تینوں سگی بہنیں یعنی خیر و برکت کی دیبیاں۔ بڑے بڑے جنات جن کے شانوں پر پر لگے تھے، ان سب نے چہل چراغ میں سے ایک ایک شمع نکالی اور جوپیٹر کے پیچھے پیچھے چلے۔

مرکیوری بولا "ادھر سے تشریف لے چلیں" پھر اس آسمانی گروہ میں سے کسی نے کہا "اِدھر سے" کسی نے کہا "اُدھر سے"

کیوپڈ دل ہی دل میں کہنے لگا "ارے، یہ تو بڑا غضب ہوا۔ اب میرا فرض ہے کہ جن دو میں میں نے مرضِ عشق پیدا کیا ہے ان کا علاج کروں۔ اس وقت تو وہ دونوں چبوترے پر ہیں" جوپیٹر کو اس وقت غصہ میں تھا اور جلدی بھی تھی۔ مگر چال میں وہی شاہانہ انداز تھا عرش پر حسب دستور روشنی تھی اور فضا میں تارے چمک رہے تھے۔ مگر آج چندر دیبی کا یا تو مزاج ناساز تھا یا وہ کسی اور کام میں لگی تھی۔ عرش پر چاندنی مطلق نہ تھی۔

اب یہ سب اتنے قریب آگئے کہ چبوترہ نظر آنے لگا۔

کیوپڈ نے جنات میں سے ایک جن سے پوچھا، جس کی شمع گُل ہوتی تھی کہ "تم کون ہو"

اس پروں والے جن نے کہا "میں بادل ہوں"

"بادل ہو واہ وا! یہی چیز تو اس وقت درکار ہے۔ ایک کام میرا کردو گے تو کیوپڈ تمہارا ہمیشہ شکر گذار رہیگا۔ پیارے بادل اُڑ جا اڑ جا اور چبوترے پر خوب چھا جا۔ کچھ پوچھو نہیں۔ جلدی کرو جلدی"

وینس بولی "میں سمجھتی ہوں کہ کہر گھر آیا ہے"

منروا بولی "یہ تو شام کے وقت کا معمولی غبار ہے۔ جو آج عرش پر بھی گھر آیا ہے"

اپولو کہنے لگا "لیجئے میری شمع بھی گل ہوگئی"

جوپیٹر نے کڑک کر پوچھا "رات کی دیبی لوکش کہاں ہے۔ آج تو سب باتیں اُلٹی ہو رہی ہیں۔ بھلا آج تک کسی نے بھی سنا تھا کہ عرش پر غبار چھایا ہو"

اپولو بولا "مری شمع گل ہوگئی"

مارس نے کہا "اور میری شمع بھی"

مرکیوری، گنی میڈ اور جتنے دیوتا اور دیبیاں وہاں تھیں، سب نے مل کر کہا کہ "ہماری شمعیں بھی گل ہوگئی ہیں"

کیوپڈ بولا "شمعیں سب کی گل ہوچکی ہیں، غبار بڑا تیرہ و تار ہے۔ مجھے تو چبوترہ سجھائی نہیں دیتا۔ مگر وہ ہوگا یہیں آس پاس۔ مجھے تو چبوترے پر سے ہو کر اپنے خلوت کدے میں جانا ہے۔ اندھیرے میں اِدھر اُدھر پھرنے کی مجھے عادت نہیں۔ لو، یہ تو چبوترے کی سیڑھی معلوم ہوتی ہے۔ اور یہیں دروازہ اور اس کا قفل بھی ہوگا۔ دروازہ کھلتا ہے لیکن بادل مجھ سے بھی پہلے وہاں پہونچ جاتا ہے"

عشق کے دیوتا کیوپڈ نے کہا "جونو، جونو۔ ہم سب یہاں پہونچ گئے ہیں۔ بہتر ہو کہ تم بھی اور پاکدامن خواتین کی طرح جو اپنی عفت اور پاک دامنی کو بادل میں چھپا کے بھاگ جاتی ہیں، تم بھی بھاگ جاؤ۔ پھر یہ غبار بھی جلد دور ہو جائے گا اور دیکھو عرش پر سے وہ دور ہونے لگا ہے"

وینس بولی "یہ ہماری روشن شمعوں کی گرمی تھی جس نے غبار کو ہوا کر دیا۔ لو یہی وہ خلوت خانہ ہے"

گنی میڈ نے دوڑ کر دروازہ دھڑ سے کھول دیا۔ دیکھا تو دہاں اکسیون اکیلا بیٹھا ہے۔

جوپیٹر نے کہا: "اسے پکڑ لو۔ اِس نے مجھے کھانے پر دیر تک انتظار کرایا تھا"

اکسیون نے کہا: "جوپیٹر بس یہی آپ کی مہماں نوازی ہے" یہ جملہ اکسیون نے ایسے لہجے میں کہا تھا جس میں بہیمیت اور معصومیت دونوں پیدا تھیں۔

"میں اپنے تئیں بچاؤں گا"

جوپیٹر نے کہا: "اسے گرفتار کرلو۔ گرفتار کرنے میں جھجکتے کیوں ہو۔ کیا ایک آدم زاد سے تمہیں ڈر لگتا ہے" اور آدم زاد بھی وہ جو تھسلی کا رہنے والا ہو" یہ آخیر جملہ گنی میڈ نے کہا تھا۔ اس پر بھی کوئی اکسیون کو پکڑنے آگے نہ بڑھا۔

جوپیٹر نے للکار کر کہا: "ہرکیولیز کو بلاؤ"

گنی میڈ بولا: "میں ابھی جاکر اُسے لاتا ہوں"

بادشاہ تھسلی نے کہا: "اس طرح نہایت مقدس حقوق تلف کئے جاتے ہیں، احتجاج کرتا ہوں"

مرکیوری نے کہا: "کیا اپنی شادی کے متعلق احتجاج کروگے"

جوپیٹر بولا: "نہیں کھانے کے وقت انتظار کرانے پر"

وینس نے کہا کہ "ایسے نازک لطیف اور حاسہ خیز خیالات اکسیون کے سامنے ظاہر کرنے فضول ہیں۔ آدم زاد تو سب ہی بجس ہوتے ہیں"

منروا[1] بولی: "آفاقیت آفاقیوں ہی کو مبارک رہے۔ لو۔ وہ ہرکیولیز بھی آگئے"

جوپیٹر نے ہرکیولیز کو دیکھتے ہوئے کہا: "اس آدم زاد کو گرفتار کرلو"

اکسیون نے ہرکیولیز سے بہت کشمکش کی مگر کچھ نہ کرسکا۔

گنی میڈ بولا: "حضور وہاں آپ کا کڑک بجلیوں والا تیر کمان رکھا ہی، حکم ہو تو اُسے اُٹھالاؤں"

"کوئی حکم سزا جو ازلی نہ ہو ایک دیوتا کے دینے کے لائق نہیں"

یہ جملہ جوپیٹر کی زبان سے بڑی متانت کے ساتھ نکلا: "اپولو، جاؤ اور اپنی رتھ کا ایک پہیہ نکال لاؤ"

سورج کے دیوتا اپولو نے کہا: "پھر حضور، کل صبح کو سورج کا رتھ کیونکر چلے گا"

"مشکل کیا ہے کل گرہن بول دینا۔ اس آدم زاد کو پہیئے میں باندھکر جہنم میں پھینک دو اور پہیہ کی گردش لازوال ہے"

[1] زور اور طاقت کا دیوتا۔

ہرکیولیز نے پوچھا کہ "اس آدم زاد کو پہیئے میں باندھوں کا ہے سے؟"

جوپیٹر نے حکم دیا: "دیبی وینس کی کمر کا پٹکا کھول لو"

اتنے میں جونو پریشان حال صورت زرد اس طرف آئی۔

جوپیٹر نے کہا: "آؤ، آؤ۔ تم بھی دیکھ لو۔ میرے پیچھے پیچھے چلی آؤ"

اب آگے جوپیٹر اور اس کے پیچھے تمام دیوتا اور جنات تھے۔ اور ان سب کے بیچ میں ہیبی کا شوہر ہرکیولیز، اکسیون کو سر سے اونچا اُٹھائے آیا تاکہ اپولو کے رتھ کے پہیہ میں اُسے باندھ دے۔

یہاں تک کہ وہ چبوترے پر پہونچا۔ پکھراج کی سیڑھیاں اُترا۔ ہرکیولیز برابر اپنا بوجھ سر سے اونچا اُٹھائے رہا۔ تاکہ اشارہ پاتے ہی اس کمزور اور مغرور آدم زاد کو جہنم میں پھینک دے۔ آکاش کے تمام دیوتا دیبیاں عرش سے اس ستاروں بھری فضا میں جھانک رہی تھیں۔

نتیجہ اس قصہ سے یہی نکلا کہ غیر مساوی حالات میں دو کا تعلق ہونا کیسی قباحتوں کا موجب ہوتا ہے۔

اکسیون چیخ چیخ کر کہتا تھا: "اے آسمان کے مطلق العنان بادشاہ"

ایک آنِ واحد میں کل آوازیں بند ہوئیں۔ اور سب نے مجرم کی آخری فریاد سُنی۔

جونو نا اُمیدی کی تصویر بنی ایک طرف دیبی وینس اور دوسری طرف منروا کا سہارا لئے کھڑی تھی۔

اکسیون نے کہا: "اے آسمان کے مطلق العنان بادشاہ، میں تیری بیدادگری کے اس ازلی ظلم کو کچھ نہیں سمجھتا۔ کیونکہ میرا حافظہ بھی ایسا ہی ازلی ہے جیسے کہ یہ تیرا عذاب۔ جو لطف اُڑا چکا ہوں میرا حافظہ اُسے یاد دلا کر ہمیشہ مجھے تقویت دیتا رہیگا"

عنایت اللہ دہلوی مترجم

نکات

جہانِ ورزش و غوغا کو مقامِ حال کرتا ہے
تجھے اے ابنِ آدم اوہامِ ادبار سے پامال کرتا ہے
حیاتِ جاوداں کے مقصدِ محمود کی خاطر
دل و جاں کو شہیدِ لذتِ اعمال کرتا ہے

تجھے قاروں کی شوکت نے کیوں مبہوت کر ڈالا؟
نظر آتا نہیں کیا تجھکو داغِ حسرتِ لالہ؟
کوئی اس مادرِ گیتی بدفطرت کو کیا جانے
گلا گھونٹا اسی کا جسکو اس نے شوق سے پالا

فرّ و فالِ سکندر کو دکھا قصرِ غرور اپنا
تو اے شمعِ یقیں کے مہرِ تاباں کر ظہور اپنا
سرِ میداں دکھا فرعون و ہامانِ زمانہ کو
یدِ بیضا عصائے موسوی سینا و طور اپنا

خزاں آمادہ غنچوں کی ہنسی پر مرمٹا کیوں ہے؟
خوشی اپنی گئی، تجھکو جانے کا گلا کیوں ہے؟
تری مادر پدر آزادیوں کا ہے یہی مطلب
ترے ہوتے ہوئے دنیا کے پردے پر خدا کیوں ہے؟

امین حزیں

دیسی زبان کی ترقی

مسعود

کیوں اور کس طرح؟

زبان اور سمجھ:- ہر شخص کو اپنی مادری زبان پیاری ہوتی ہے۔ اور کیوں نہ ہو؟ وہ اسے صرف مدرسے میں ہی کتاب اور قلم سے نہیں سیکھتا، بلکہ پیدا ہوتے ہی ماں کے دودھ سے چوس چوس کر اور کانوں سے پی پی کر پروان چڑھتا ہے۔ چیزوں کے سمجھنے سے پہلے ان کے نام اپنی توتلی زبان سے رٹتا، بے سمجھے لوریوں کی کڑیاں دہراتا اور گیت گاتا ہے۔ پھر ہوش پاتے پاتے ان بولوں کے معنی مطلب جاننے لگتا ہے۔ اللہ میاں نے آدم کو برے بھلے کی تمیز اور روحانی و مادی علوم کی تعلیم سے پہلے جس چیز کی تعلیم دی وہ "اسماء" تھے۔ دوسرے لفظوں میں بولی یا زبان، جس سے فرشتے بے نصیب تھے، آدم کے آگے فرشتوں کا سجدہ شاید زبان ہی کا احترام تھا۔

علمائے نفسیات میں اختلاف ہے آیا بچہ زبان پہلے سیکھتا ہے اور عقل و شعور بعد میں نشوونما پاتے ہیں، یا عقل و شعور پہلے شروع ہو جاتے ہیں اور ان کے اظہار کی کوشش کے ساتھ زبان بعد میں آتی ہے۔ یہ گویا وہی سوال ہے کہ "مرغی پہلے یا انڈا پہلے؟"

زبان اور تہذیب و تمدن:- ان علما کی نفسیاتی موشگافیوں اور پیچیدہ اسباب و علل سے قطع نظر کرکے تواریخ اور واقعات کا مشاہدہ ہمیں صاف بتاتا ہے کہ قوموں کے عروج و زوال میں اور اسباب و محرکات کے ساتھ زبان کا دخل بھی بہت نمایاں ہے۔ کسی قوم کی زبان کا جیسے جیسے انحطاط ہوا ہے اسی نسبت سے اسکی تہذیب اور سیاسی اقتدار پر زوال آیا ہے۔

ایران میں سکندر اعظم کے حملے تک نہ ایک زبان باقی رہی تھی نہ ایک رسم خط۔ بقول نومسلم ایرانی عالم عبداللہ ابن المقفع ایران میں پانچ جدا جدا زبانیں اور سات مختلف رسم خط چلے چلے جاری تھے۔ ہر طبقہ کی زبان علیحدہ علیحدہ تھی۔ جس پہلوی میں ژند لکھی گئی تھی اُس میں کم سے کم ایک ہزار الفاظ ایسے تھے کہ لکھے تو جاتے ارامی زبان میں اور پڑھے جاتے پہلوی میں، جیسے ہم لیرا کے (£) کو پونڈ اور ڈینارس کے (d) کو پنس پڑھتے ہیں۔ نظام الملک طوسی چھٹی صدی عیسوی کے آغاز میں ایران کے ایک مشہور مدعی نبوت مزدک کا قول نقل کرتا ہے کہ "قوم ژند اوستا کے معنی بھول گئی ہے میں اُسے دوبارہ بتانے اور واضح کرنے کو بھیجا گیا ہوں۔" موبد، زرتشتی پیشوا، کہا کرتے تھے کہ ژند اوستا میں ایسی عبارتیں ہیں جن کے ایک ایک کے دس دس معنی ہیں اور ہر موبد ایک ایک معنی کی بیس بیس شرحیں اور تاویلیں کرتا ہے۔ [1]

اس نکتہ کو پروفیسر براؤن نے عہد اسکندری میں ایران کے زوال کے تذکرہ میں ایک مثال سے واضح کیا ہے، جو نہایت بصیرت افروز ہے۔ فرماتے ہیں:-

> "یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے، آیا کسی قوم کی زبان اور اسکے سیاسی اقتدار کے زوال میں کوئی باریک علاقہ ہے؟ میں نے انگریزی زبان کے ماہر ادیبوں کو اکثر یہ کہتے سنا ہے کہ جنگ ہیسٹنگز (۱۰۶۶ء) میں انگریزوں کی نارمن حملہ آوروں کے مقابلے میں کامل شکست اور مغلوبیت سے پہلے ہی قدیم انگریزی زبان اینگلوسیکسن صرفی و نحوی قواعد سے صحیح و سلامت باقی نہ رہی تھی اور زوال پذیر ہو چکی تھی۔ قدیم انگریزی زبان کے متعلق صورت واقعہ جو کچھ بھی ہو، قدیم ایرانی زبان کے متعلق اس حقیقت میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ اسکے کتبات اور نقوش میں صیغوں تک کی غلطیاں موجود ہیں..... زبان کے ساتھ ساتھ دین و مذہب کے زوال کی علامات بھی نمایاں نظر آتی ہیں۔ اہورامزدا (یزدان) جو پہلے خدائے واحد تھا، اسی کے ساتھ اور معبود خورشید و زہرہ شریک ہو جاتے ہیں........" [2]

اسلام کے ظہور کے وقت عرب کے اخلاق بیشک گر چکے تھے،

---

[1] مفصل بحث ملاحظہ ہو راقم کے رسالہ "پارسی علوم اور اسلام" میں۔

[2] تاریخ ادبیات ایران جلد ۱ باب ۳ فصل ۱۔

مگر اس کی فصیح زبان کے ساتھ آزادی کی غیرت وحمیت اور شجاعت باقی تھی۔ قرآن مجید اور پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کے معجزے اپنی جگہ برحق ہیں، مگر اس تاریخی حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جب تک عربوں کی زبان خالص رہی اُن کے فتوحات بڑھتے رہے۔ ان کی زبان اور سیاسی اقتدار کا زوال ساتھ ساتھ رونما ہوا۔ عہدِ عباسیہ کے تکلفات، عیش و جشن اور علوم و فنونِ لطیفہ کی چمک دمک پر نہ جاؤ۔ عربوں کی حربی طاقت، دینی استحکام اور سیاسی اقتدار اصمعی اور ابونواس تک نویں صدی عیسوی تک بہت کچھ برقرار رہا، دسویں صدی عیسوی کے وسط تک المتنبی پر زوال پذیر، اور بارھویں صدی عیسوی کے آغاز میں الحریری کی وفات پر ہلاکو خاں کی تاخت سے ایک صدی پیشتر ہی ختم ہو چکا تھا۔ پھر مشرق میں جو صبح طلوع ہوئی وہ عجمی زبان اور تہذیب کے سورج کی کرنیں تھیں۔

ہندوستان پر محمد غوری کے حملے سے بہت پہلے ہی ملک میں بول چال کی زبان نہ سنسکرت ہی باقی رہی تھی نہ کوئی ایک بھاکا۔ اکبر کے وقت تک زبان کا یہ نقص قائم رہا، اور ساتھ ہی ہندو تہذیب کا انحطاط۔ اس کے بعد ہی برج بھاشا یا اُردو کی پیدائش سے ہندوؤں کی تہذیب و تمدن نے نیا جنم لیا اور ان میں نئی جان ڈال دی۔

ان مشاہدات تاریخی سے ایسے اصحاب کو آنکھیں کھول لینا چاہیئے جو اَب تک مادری زبان کی اہمیت اور قدر و قیمت سے بے خبر ہیں۔ اور مغربی تہذیب و تمدن اور بدیسی حکومت میں زیادہ سے زیادہ حصہ لینے یا دُنیاوی ثروت حاصل کرنے کے ہوکے میں صرف سرکاری زبان کی مہارت ضروری سمجھتے اور اعلیٰ ڈگریوں پر مادری زبان کو بھینٹ چڑھا کر بچوں کے مُنہ میں اُن کے گہواروں ہی سے انگریزی زبان ٹھونسنے اور ماؤں کے دُودھ کے ساتھ حلق سے اُتار دینے کی دُھن میں لگے رہتے ہیں۔

جاپان نصف صدی کی قلیل مدت میں وحشت و جاہلیت کی گھٹا ٹوپ اندھیریوں سے نکل کر اعلیٰ ترین تہذیب و تمدن کی اُس روشن وادی میں جانکلا جہاں تک ہندوستان کو دو صدی کی مغربی تعلیم کے بعد رسائی میسر نہ آئی۔ اور یہ مغربی علوم و فنون کے تراجم سے مادری زبان کے صدقے میں ممکن ہوا، نہ کہ مغربی زبانوں سے۔

ہندوستان اور زبان:- تعلیمی ترقی کا یہ مسئلہ بدنصیب ہندوستان کے لئے زیادہ پیچیدہ بن گیا ہے۔ یہ غدار خطۂ دُنیا مختلف الالسنہ، مختلف المذاہب، مختلف النسل ملکوں کا مجموعہ، ایک بدیسی نظام حکومت کی بندھنوں میں جکڑا ہوا، ایک واحد ملک بن گیا ہے۔ ان اختلافات سے حکمرانوں کا تو کچھ نہیں بگڑتا بلکہ بنتا ہے، کہ انہیں کے سہارے حاکمانہ بندھنیں آج تین صدیوں سے مضبوط ہیں۔ جو کچھ بگڑتا ہے وہ خود ہمارا۔ جو ملک زبان، مذہب، نسل، کسی ایک نقطہ پر متحد نہ ہو اس کی بندھنیں تین صدی کیا تین ہزار برس بھی نہ ٹوٹیں تو تعجب نہیں۔ ہندوستان کو تہذیب و تمدن کی ترقی اور سیاسی آزادی کی خاطر کسی ایک نقطہ پر متحد ہونا ہے اور وہ موجودہ حالات میں زبان کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا۔

اُردو:- سوال یہ ہے کہ وہ زبان کون سی ہو؟ شکر ہے کہ ہمارے مدبرین بالاجماع اس نتیجے پر تو پہونچ گئے کہ ہندوستان کے طول و عرض کے لئے ایک واحد زبان صرف ہندوستانی یا ہندوستانی اتھوا ہندی یا اُردو ہی ہو سکتی ہے۔ جھگڑے صرف دُور رہ جاتے ہیں۔ اس زبان میں عربی، فارسی، سنسکرت الفاظ کا تناسب کیا ہو اور رسم خط کیا؟ یہ عارضی اور ضمنی جھگڑے ہیں، جن کا فیصلہ الفاظ اور رسم خط کی طاقت، سہولت اور ضرورت بقائے اقوا کے ماتحت اپنے وقت پر آپ کرلے گی۔ اس انقلابی دور میں سنسکرت الفاظ اور رسم خط کے علمبردار اپنے جھنڈے اُڑایا کریں اور فارسی، عربی الفاظ کے شیدائی اپنی آن پر اَڑے رہیں۔ جب انقلابی گرد و غبار چھٹے گا، مفاہمت و اعتدال رونما ہوگا تو فتح حق ہی کی ہوگی۔ ہندوستان بھر میں تھیٹروں اور آوازی سینماؤں کی زبان اس حقیقت کی آپ شاہد ہے۔

اُردو اور تہذیب:- اُردو کی ہمہ گیری اور طاقت کے متعلق مجھے مسلمان بھائیوں کے سامنے ایک جغرافی حقیقت پیش کرنے کی جرات ہوتی ہے، جو زبان کی طاقت کے متعلق معروضہ بالا تاریخی نکتہ سے کم عجیب و بصیرت افروز نہیں۔ وہ یہ ہے کہ ہندوستان بھر میں مسلمانوں کی قومی تہذیب و تمدن کے ناپنے کا کوئی آلہ ہو سکتا ہے تو وہ اُردو ہے۔ صوبہ سرحد و کشمیر سے راس کماری تک اور کراچی اور بمبئی سے آسام تک ہندوستان کے طول و عرض کا جائزہ لیجئے۔ آپ ہر جگہ کم سے کم تاریخی شہروں میں مسلمانوں کی ثانوی زبان اور بہتیری جگہوں میں مادری زبان اُردو پائیں گے۔ پنجاب نے تو اُردو کو مادری زبان کی حد تک اپنا لیا ہے۔ دکن، مدراس اور بنگال کے تمام پرانے یا تاریخی شہروں میں مسلمانوں کی مادری زبان بیشتر اُردو ہی ہے۔ صرف یہی نہیں جو مسلمان جس تناسب سے بہتر اور صحیح اُردو بولتے ہیں، اُسی تناسب سے اُن کی تہذیب بلند تر ہے۔ مرکز اُردو سے پیچھے آتے چلیں، صوبہ متحدہ

کے مشرقی اضلاع بنارس اعظم گڈھ، گورکھپور، بلیا، مرزاپور، پھر بہار میں درجہ بدرجہ پٹنہ، گیا، مظفرپور، بھاگلپور، پورنیہ، پرولیہ، پھر بنگال میں کلکتہ، مدناپور، مرشدآباد، ڈھاکہ، چاٹگام، اور مغربی و مشرقی بنگال کے اُن مسلمانوں کی جو اُردو سے کم آشنا ہیں۔ تہذیب و تمدن کے فرق پر غور کریں، جو اُردو مرکز سے جس قدر دُور ہے، کم سے کم روایات ملّی اور تہذیب روحانی و اخلاقی میں اُسی قدر پیچھے ہے۔ ان خطوں سے سرکاری ملازموں کے سوا نہ کوئی سیاسی لیڈر پیدا ہوتا ہے نہ واعظ نہ مصلح نہ مصنّف۔ آئے دن شمالی ہند سے ایک چالاک گنوار اُٹھتا ہے اور بنگال، مدراس، بمبئی، ملابار، آسام میں اپنی رُوحانی پیشوائی کے جھنڈے گاڑتا، جیبوں پر چھاپے مارتا، پاؤں پُجواتا اور چین سے ڈنٹر پیلتا ہے۔

عام تہذیب و شائستگی کے لحاظ سے ہندوستان بھر کے ہندو بھائیوں پر بھی کم و بیش یہی قانون اثرانداز ہے۔ ہندو تہذیب کا مدار اگر سنسکرت پر ہے تو اس مرحومہ کی بڑی بیٹی ہندی ہی اب گھرانے کی سردار ہے جس سے کوئی ہندو فرزند بے نیاز نہیں ہوسکتا۔ اور ہندی اُردو سے جُدا کوئی زبان نہیں۔ الغرض اُردو یا ہندی کی خدمت ہر مسلمان اور ہندو کے فرائض میں سے ہے۔ اور اس سے جی چُرانا اپنی ملّی، تہذیبی اور سیاسی موت کو قریب تر کرنا۔

صوبہ جاتی اُردو:

یہاں ایک اور خطرناک غار سے متنبہ کر دینا فرض سمجھتا ہوں۔ اُردو کی محبت کے زعم میں یا فصحائے زبان کی گرفت سے گھبرا کر بعض غیرمرکزی صوبے مثلاً پنجاب اور بہار کے منچلے نوجوان بگڑ کھڑے ہوتے ہیں "ہم لکھنؤ اور دہلی کی غلامانہ تقلید کیوں کریں؟ اُردو ہماری بھی مادری زبان ہے اور ہم نے اُس کی بڑی خدمت کی ہے۔ ہمارے محاورات اور ترکیبیں غلط کیوں قرار دی جائیں؟ ہمارا حق پہونچتا ہے کہ اُردو کچھ ہمارے تحفے بھی قبول کرے۔"

یہ بالکل سچ ہے۔ اُردو نہ دہلی لکھنؤ اور نہ کسی صوبے کا مال ہے، نہ ہندو مسلمان یا کسی فرقے کی مِلک۔ یہ ہندوستان کی اجمالی ملکیت ہے اور سب کا حق برابر۔ مگر اس حقیقت کو بھی بھولنا نہ چاہیئے کہ ہر ملک میں ایک مقامی بولی عام بول چال کی ہوتی ہے، اور پراسرار قدرتی طور پر خطہ خطہ میں قدم قدم پر اس کے محاورات، اصطلاحات اور لب و لہجہ میں فرق ہوتا چلا جاتا ہے، ایک کاروباری اور بازاری روزمرّہ ہوتا ہے، ایک عورتوں اور بچّوں کا محاورہ، اور ایک زبان ادبیات کی ہوتی ہے جو مُلک بھر میں جہاں کہیں مستعمل ہو ایک ہی ہوتی ہے اور ہونا چاہیئے، ورنہ علمی مقصد کے لئے زبان ناقص اور کمزور ہوگی۔ جہاں تک صوبہ جاتی خصوصیات کا تعلق ہے وہ قدرتی طور پر مقامی بول چال میں باقی رہیں گی، گو مکروہ تر یہی ہیں۔ علمی زبان کے لئے ایک واحد معیار اور مرکز ضروری ہے۔ خواہ وہ لکھنؤ دہلی ہو یا لاہور، حیدرآباد، عظیم آباد، جس پر اجماع ہوجائے۔ یہ اجماع مرضی اور ارادے پر موقوف نہیں۔ فیصلہ قدرت کرتی ہے، واقعات اور تاریخ کے ماتحت۔ دہلی اور لکھنؤ والوں نے اُردو کے بچّے کو دکن سے اُجاڑ کر اپنے گھر آپ نہیں بسایا، نہ کوئی ڈھنڈورا پیٹا کہ آج سے ہم کو اُردو کا مرکز سمجھو۔ مہاجرت وطن کی طرح انتقال زبان قانون ارتقا کے ماتحت وقوع پذیر ہوتا ہے۔ اشخاص یا اقوام زبان یا اُس کا مرکز نہیں بنایا کرتیں، نہ ضرورت ہے۔ پھر صوبہ صوبہ میں ڈیڑھ ڈیڑھ اینٹ کی مسجدیں بنا بنا کر مذاہب کی طرح زبان میں بھی تشتّت اور فرقہ بندیاں کسی متحد قوم اور تہذیب کی تعمیر کے لچھن تو نہیں، بلکہ پیش خیمہ ہیں اُسی تہذیبی و سیاسی زوال کا جو قدیم ایران کی زبان کے ساتھ وقوع پذیر ہوا۔

ہمارے لئے صرف یہی کافی نہیں کہ کسی نہ کسی ڈھنگ کی لنگڑی لُولی اُردو گھسیٹے چلے جائیں، بلکہ بہتر اور بلند تر تہذیب و شائستگی کی خاطر مشق اور کاوش سے تندرست و توانا، صحیح اور فصیح اُردو کو مادری زبان بنائیں اور اُسے سجائیں۔ کون کماست سپوت پسند کرتا ہے کہ سماج کی سبھا میں اس کی ماں گنوارنی کی حیثیت سے چیتھڑوں میں دکھائی دے، اور اس پر انگلیاں اُٹھیں۔

کوئی کہے "وہ آگئیں پنجابن بوا ہم نے جن کو ملنا تھا انگریزی میں بہت ہوشیار ہیں۔ میں نے سمجھا ہوا تھا وہ ضرور آئیں گی۔ سُنا و جی بوا۔"

کوئی کہے "تجھے دِکھتا نہیں؟ وہ آگئیں پچھاں سے بڑی تائی۔ آپ چائے پیو گی؟ مجھ سے تکلّف نہیں آتا اپنا گھر سمجھئے۔"

کوئی کہے "وہ آگئیں احمد کی بہاری ڈیڑھ ساس سموچے بدھنے کے شامل۔ قلی اسباب کدھر رکھین؟ ابھی آپ چائے نہیں پیا؟"

کوئی کہے "وہ آگئیں بنگالن بھابی جن کو ہم کبھی نہ دیکھے تھے۔ آپ کا چیز سب ادھر رکھوا دیجئے۔"

کوئی کہے "وہ آگئیں دکنی خالہ۔ میں کہتوں چائے ہونا پان ہونا میں بلاتوں تو نکو کر کے کاہے کو بولنا؟"

اُردو کے فرزند اگر دُنیائے ادب میں بھی ان بھانت بھانت کی بھاکھاؤں اور اپنے اپنے مقامی محاوروں اور اصطلاحوں پر اَڑ بیٹھیں تو یہ علمی زبان بننے سے رہی۔

ترقی کے ذرائع

اُردو ذریعہ تعلیم:- خیالات فطرتی طور سے مادری زبان میں نشوو نما پاتے ہیں، اس لئے تعلیمی نقطۂ نظر سے ذہنی ترقی کا سب سے بڑا ذریعہ ملکی زبان میں تعلیم ہے۔ اس فطری قانون کو توڑ کر بچوں پر آغاز شعور سے غیر زبان میں سوچنے کا بار ڈالنا ذہنی قتل سے کم نہیں۔ صدیوں سے ہمارے فرمانرواؤں نے بدیسی زبان کو ذریعۂ تعلیم قرار دیکر ہماری تخئیل و فکر کا میدان تنگ اور قوائے ذہنی کو کند بنا رکھا ہے۔ موجودہ صدی کی ابتدا میں لارڈ کرزن نے مڈل تک دیسی زبانوں کو ذریعۂ تعلیم قرار دیا۔ مگر نیک نیتی سے کبھی اُسے کامیاب بنانے کی کوشش نہ کی گئی۔ چالیس سال کی طویل مدت میں مڈل تک دیسی زبانیں ذریعۂ تعلیم رہنے کے باوجود ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کے لئے ان کو استعمال کیا گیا نہ تجربہ۔ آج تک یہ بہانہ ہے کہ اعلیٰ تعلیم کے لئے دیسی زبانوں میں موزوں کتب نصاب مہیا نہیں۔ یہ مہیا ہوتیں کیونکر؟ حکومت کی سرپرستی یا حوصلہ افزائی ہوتی تو چالیس سال میں کم سے کم چالیس سو کتب نصاب دیسی زبانوں میں تیار ہو جاتیں۔ دوسری طرف سرکار نظام حیدرآباد نے دس برس میں سائنس، فلسفہ، ریاضی، معاشیات اور قریب قریب تمام علوم وفنون کی اُردو زبان میں اعلیٰ تعلیم کیلئے مکمل نصاب بنا کر رکھ دئے اور جاری کر دئے۔ آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ جامعہ عثمانیہ گھٹیا قسم کے گریجویٹ پیدا کرتی ہے، جبکہ اس کے فارغ التحصیل طالب علم نے طبیعیات میں دنیا کا سب سے بڑا انعام نوبل پرائز حاصل کیا اور کتنے یورپ سے ڈاکٹریت کی شاندار ڈگریوں سے فائز ہوئے۔

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے، جاپان اپنی زبان میں تراجم ہی کے ذریعہ سے نصف صدی کی قلیل مدت میں وحشت وجہالت کی تاریکی سے نکلکر ذہنی اور تمدنی ترقی کی اُس بلند ترین منزل پر جا پہونچا جہاں وہ مغربی اقوام میں کسی سے پیچھے نہیں۔

تعلیم عوام:- تعلیمی پالیسی میں اصلاح کا تعلق تو زیادہ تر حکومت سے ہے، جس پر زور ڈالنا ہمارے سیاسی مدبّرین کا فرض ہے جسے وہ ایک حد تک انجام دے رہے ہیں۔ شخصی طور پر ہم اُردو کی خدمت اور ترویج یوں انجام دے سکتے ہیں کہ انجمن ترقی اُردو کے پروگرام کے مطابق تعلیم عوام کی تحریک میں زیادہ سے زیادہ حصّہ لیکر، حتی المقدور زراعت پیشہ، مزدوری پیشہ اور اَن پڑھ مَردوں اور لڑکوں کو جو مدرسہ نہیں جاتے نہ جا سکتے ہیں، اُردو پڑھائیں۔ ہر شخص سال کا کچھ حصّہ، کچھ دن یا رات کے چند گھنٹے اس خدمت کیلئے وقف کرے۔ یہ وہ خدمت ہے جو ہر مباحثہ، اشتہار ونمائش سے بے نیاز ہے، اور اتنا ارزاں کہ محلہ محلّہ اور گاؤں گاؤں ایک یا چند اشخاص کی ادنیٰ سی توجہ وایثار سے انجام پا سکتی ہے۔

نجی دفتر:- دوسری خدمت زبان جو ہر شخص کے بس میں ہے، یہ ہے کہ اپنا نجی یا غیر سرکاری دفتر اپنی زبان میں رکھے اور بے ضرورت غیر زبانوں میں مراسلت نہ کرے۔

مشاعرہ:- مشاعرہ اگرچہ فی نفسہ کوئی مفید ادارہ نہیں، بلکہ ہماری شاعرانہ ادبیات کو پستی میں ڈھکیلنے کا بہت کچھ ذمہ دار ہے، پھر بھی ان مقامات میں جو اُردو میں پیچھے ہیں، ترغیب زبان اور کشش عوام کی خاطر مشاعرے قائم کئے جائیں اور نظم ونثر کے مضامین پڑھے جائیں، یہاں تک کہ مشاعرے توسیع واصلاح کے بعد بزمِ ادب بن جائیں۔

اُردو اکادمی مُلک بھر کے ہوا خواہانِ اُردو کے مشترک سرمایہ سے مرکزی انجمن ترقی اُردو دہلی اپنی جدوجہد کے ایک اہم ترین شعبہ اُردو اکادمی کا ذمہ لے، جس کی شاخیں ہندوستان کے مختلف حصّوں میں انجمنوں کے ساتھ پھیلی ہوں۔ یہ بہترین تصانیف یا مضامین پر انعام تقسیم کریں، اور لائق مگر نادار مصنّفوں کی تصانیف کی اشاعت کر کے اُن کی حوصلہ افزائی کریں۔ اردو ادبیات کی ترقی کی راہ میں سب سے بڑا پتھر جو حائل ہے وہ اُردو پریس کا افلاس ہے۔ غریب اُردو پریس تجارتی بنیادوں پر چلائے جاتے ہیں اور نہیں چلتے۔ جن ادبیات میں اُن کو زیادہ پیسے ملنے کی اُمید ہوتی ہے اُنکی اشاعت کرتے ہیں، اور ٹھوس خشک علمی ادبیات مصنّفوں کے بستوں میں پڑے موت کی نیند سوتے یا دیمک یا پنساری کی پڑیوں کی نذر ہو جاتے ہیں۔ اگر اپنی جان جی یا بیوی کے زیور بیچکر آپ چھپوا لے تو بقول غالب:

ع :- "ایں می از قحطِ خریداراں کہن خواہد شدن" اُردو دُنیا کے مذاقِ علمی کی پستی اور تعلیمی افلاس کا یہ عالم ہے کہ آج غزل اور افسانے کے سوا کسی صنف ادب کو قبول عام نصیب نہیں۔

اُردو یا ہندوستانی کی ہندوستان گیری اگر ہمارا حوصلہ اور مقصد ہے تو دو اہم پہلو جن کو ہم نے پسِ پُشت ڈال رکھا ہے پیش نظر رکھ لینا چاہئیں۔ ایک تو سادگی وسلاست، دوسرا املا۔

سادگی زبان:- ہمیں آئے دن ہندو بھائیوں سے شکایت رہتی ہے کہ وہ ہندوستانی زبان میں سنسکرت عناصر کو زیادہ سے زیادہ داخل کرکے اُسے مسلمانوں کے لئے اجنبی سی زبان بنائے دیتے ہیں۔ مگر یاد رکھئے کہ ہندوستانی زبان ابھی معرضِ تعمیر میں ہے۔ کوئی ایسی زبان قیامت تک ہندوستان جیسے مختلف النسل و مختلف المذاہب ملک کی قومی، تہذیبی یا تعلیمی زبان نہیں بن سکتی۔ جو عام فہم نہ ہو۔ اس لئے آپ یقین رکھئے کہ نہ ہندو بھائیوں کی سوامیانہ ہندی اس غرض کے لئے کامیاب ہو سکتی ہے، نہ ہماری مولویانہ اُردو۔ وہ یہ غلطی کرتے ہیں تو اسے بھگتیں گے، ان کے شگون کے لئے ہم اپنی ناک کیوں کٹائیں؟ ہمیں یہ کوشش جاری رکھنا چاہیئے کہ ہماری زبان میں سنسکرت، فارسی، عربی، انگریزی کے عناصر اس اعتدال سے داخل ہوں جیسے نباتات میں نائیٹروجن، کاربن، ہائیڈروجن، آکسیجن، کیلشیم، پانی میں آکسیجن ہیڈروجن اور ہوا میں آکسیجن کاربن نائیٹروجن وغیرہ پھر کوئی وجہ نہیں کہ ایسی اُردو ملک بھر میں سنسکرتی ہندی کی جگہ نہ لیلے اور سوامی جی دیکھتے کے دیکھتے نہ رہ جائیں۔ ورنہ اگر ان کی ضد پر ہم بھی مولویانہ اُردو پر اَڑ جائیں تو دہی ذہنی اور سیاسی غلامی ہمارا حصّہ رہے گی جو آج ہمارا طوقِ گلو ہے۔

املا:- اُردو تحریر میں املا کی دشواری، الف عین، تے طوئے، زے ذال، ضاد ظوئے کے باریک اور مشکل امتیازات عربی رسمِ خط سے ناآشنا مثلاً بنگالی، سندھی، مرہٹی اور تامل قوموں کے لئے ناقابلِ عبور گھاٹی ہے۔ اگر آپ اُردو زبان کے ساتھ اُردو رسمِ خط کو بھی ہندوستان گیر بنانا چاہیں تو اس چٹان کو کاٹ کر راستہ بنانا ہوگا۔ اس کی تدابیر میں سے ایک فوری تدبیر یہ ہے کہ دو طرح کے املے جاری کیے جائیں، ایک موجودہ علمی املا، دوسرا بین الاقوامی کاروباری، جس میں یکساں آواز کے مختلف حرفوں کو کاٹ چھانٹ کر ایک سی آواز کے لئے ایک ایک ہی حرف اختیار کر لیا جائے۔ مثلاً مطابق تے سے لکھا جائے، تقاضا، انتظام اور ذلّت زے سے۔ بے شک یہ طرز املا ہمیں ویسا ہی ناآشنا اور ناپسندیدہ معلوم ہوگا جیسے پنڈت موتی لال اور جواہر لال نہرو کو اوّل اوّل انگریزی لباس اتار کر کھدّر کی دھوتیاں اور کُرتے، یا مس سلیڈ کو کھدّر کی ساڑھی پہن کر چٹائی پر بیٹھنا۔ انقلابی دَور میں ایسے کڑوے گھونٹ حلق سے اتارنا ہی پڑتے ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ یہی ناگوار طرز املا اپنی سادگی اور سہولت کے زور پر ہمارے علمی املا کی جگہ لیلے۔ اور ہم اپنے عربی فارسی الفاظ کی مسخ شدہ ہیئت پر چھاتی پیٹتے رہ جائیں۔ گو ان میں میں نہ ہونگا۔ مجھے اطمینان ہے کہ اس دور کو جسے تصوّر کی آنکھیں دیکھ رہی ہیں میری جسمانی آنکھیں نہ دیکھیں گی۔ اور جو آنکھیں دیکھیں گی وہ بتدریج انگریزی لباس کی جگہ کھدّر کی دھوتیوں یا لنگوٹیوں کی طرح اس منظر سے خوگر ہو چکیں گی۔

طباعت:- املا سے متعلق ایک مہتم بالشان پہلو اور بھی ہے۔ وہ دشواری طباعت ہے۔ مروّجہ لیتھوگرافی اب اس قدر فرسودہ اور دقتوں سے مملو طرزِ طباعت ہے جس کی وضاحت کی ضرورت نہیں۔ ایک حسین و جمیل اور باریک دستکاری کی حیثیت سے نستعلیق کی خطّاطی کو کسی بڑے پیمانے پر پھیلا کر عام کرنا اور تجارتی پیمانے پر وسعت دینا کافی حوصلہ افزائی کے بغیر ناممکن ہے۔ پھر جہاں نئے جگ میں لاکھوں کی مانگ ہوگی مروجہ لیتھو میں بیک وقت دس بیس ہزار کاپیاں نکالنا ناممکن۔ غرض لیتھو کا جنازہ ڈھونا اس بیسویں صدی کے نازک کاندھوں کی توت برداشت سے باہر ہے۔ نستعلیق کے ٹائپ جن کی تعداد اعراب چھوڑ کر دو سو کے قریب اور اعراب ملا کر تقریباً چھ سو، جملہ تعداد آٹھ سو کے لگ بھگ پہونچتی ہے۔ ایجاد کرنے کی کوشش کم سے کم تیس سال سے ناکام ثابت ہو چکی ہے۔

طباعت کے مسئلے کے صرف تین حل ممکن ہیں:-

(۱) اگر خط نستعلیق کو قائم رکھنا ہے تو فرسودہ رسمی طریقوں کی بجائے فوٹو لیتھوگرافی کا جدید طریقہ ارزاں تجارتی پیمانے پر عام ہو سکے تو جاری کیا جائے۔ بعض مطابع میں اس کا آغاز ہو چکا ہے۔ اگر تجربہ کامیاب ہوا تو طباعت کا مسئلہ حل ہے۔ رہی کتابت تو دیسی زبان اور علوم کی ترقی اور طباعت کی سہولت کے ساتھ کاتبوں کی مانگ اور قدر و قیمت بہت بڑھ جائے گی۔ اُردو کتابت فنِ لطیف کے علاوہ ایک منفعت بخش پیشہ اور روزگار بن جائے گا۔ ہر سرکاری اور غیر سرکاری تعلیم گاہ میں، اور صنعتوں کے ساتھ، اختیاری فن کی حیثیت سے اُردو خوشنویسی کی جماعتیں کھلوانا ہونگیں۔ یوں کاتبوں کی پیداوار سے اشاعت اُردو کی ایک اقتصادی مشکل بھی بڑی حد تک حل ہو سکے گی۔

(۲) اگر فوٹو لیتھوگرافی کا تجربہ کامیاب نہ ہو تو اسکے سوا چارہ نہیں کہ اُردو کے حروف متصل نہ رکھے جائیں اور جدا جدا حرفوں کے ٹائپ ڈھالکر اُنکی ترتیب و ترکیب انگریزی کی طرح آسان کر لی جائے۔

(۳) اگر یہ صورت بھی پسند خاطر نہ ہو تو پھر آپ معاف فرمائیں، رومن رسمِ خط اختیار کر لیا جائے۔ یہاں ہمارے ہندو بھائی سوال کرینگے کہ دیوناگری کیوں نہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اولاً اعراب حے خے، عین غین

(بقیہ صفحہ ۵۸)

آیاتِ ثبات

اُٹھ اور توفیقِ خودسری پیدا کر
اُٹھ اور تقدیرِ سروری پیدا کر
اُٹھ اور احساسِ کمتری کے بدلے
کامل احساسِ برتری پیدا کر

باقی بہ ہزار شان رہ سکتے ہیں
ٹھسّے سے براجمان رہ سکتے ہیں
ہمّت کو جوان رکھنے والے افراد
تا روزِ جزا جوان رہ سکتے ہیں

تُو اَب بھی صحیح حرف کہلاتا ہے
اور ثِقل سے برکراں نظر آتا ہے
حرفِ علّت نہ بن کہ حرفِ علّت
اکثر ساقط بھی کر دیا جاتا ہے

قدرت تجھے پھر جِلائے، ناممکن ہے
دُنیا میں دوبارہ لائے، ناممکن ہے
جو کچھ کرنا ہے، اس جنم میں کر لے
ہٹ ہٹ کے حیات پائے، ناممکن ہے

پھر طالبِ لیلائے توانائی بن
پھر عاشقِ شیدائے توانائی بن
پھر کوششِ اِحیائے توانائی کر
پھر مالکِ دُنیائے توانائی بن

سامانِ قیامِ زندگی لایا ہوں
مضبوط نظامِ زندگی لایا ہوں
اے ملکِ اجل گرفتہ، اے کشورِ ہند
خوش ہو کہ پیامِ زندگی لایا ہوں

حکیم آزاد انصاری

گناہگار

مسلم

"توجناب!" مراد علی ایک آہ بھر کر بولا" اب شام ہے لیکن زندگی کی شام نہیں۔ ہاں! کبھی یہی شام نامراد اُمیدوں کی شام تھی۔ ناتمام آرزوؤں کی شام تھی۔ وہ شام جو دھن والوں کیلئے تمہیدِ عیش اور ایک گدائے بے نوا کیلئے فکرِ پیہم! وہ شام ع:۔

جس کے سائے میں غریبوں کی بسر ہوتی ہو!

لیکن آج کی شام! جو اپنے دامن میں ہزار اُداسیاں لئے کائنات پر اس طرح آہستہ آہستہ چھا رہی ہے جیسے کوئی دُلہن میکے سے رخصت ہوتے وقت دھیکے دھیکے قدم اُٹھاتی ہے۔ ہاں جناب! آج کی شام نے میرے نہاں خانۂ دل میں اس دن کی یاد تازہ کردی ہے جس روز بار بار میرے لب پر یہ آتا تھا کہ ع:۔

الٰہی کس وقت شام ہوگی الٰہی کب دن تمام ہوگا

اور آپ کو کچھ معلوم بھی ہے کہ اس خیال کی تحریک کیوں ہوئی؟ کیسے ہوئی؟"

میں نے جواب دیا" مجھے تو کچھ معلوم نہیں"

"اوہو!" مراد علی نے ہنسکر کہا" اتنی جلدی بھول گئے آپ ابھی تو وہ غریب بازار کے نکڑ پر بھی نہ پہونچا ہوگا"

"کون؟" میں نے پوچھا۔

"اجی جناب!" مراد علی نے مسکرا کر کہا" وہی فقیر جسے جاتے دیکھکر آپ نے یہ کہا تھا" مراد! دیکھنا ؎

حسرت برس رہی ہے رُخِ نامُراد پر
یہ کون جا رہا ہے تمنّا لئے ہوئے"

اور یہی میں آج آپ کے اصرار سے مجبور ہوکر کہنے والا ہوں کہ اُس شام اور اس دن کے تمام ہوتے پیچھے، جس وقت میں اُمید کی مرادمندیوں کے خواب دیکھ رہا تھا، جب میں تشنہ آرزوؤں کے سیراب ہونے کی آس لگائے بیٹھا تھا، جس روز میرے جذبات میں خود بخود ایک ہیجان ایک کیف آور سا ہیجان پیدا ہو رہا تھا جس وقت شوق کی بجھی ہوئی چنگاریاں بھی کسی دُور اُفتادہ ستارے کی طرح کسی وقت چمکتی نظر آنے لگتی تھیں۔ وہ شام! جس کے لئے میں راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر درگاہ ایزدی میں سجدہ ریز ہوا کرتا تھا ہاتھ پھیلا پھیلا کر دُعائیں مانگا کرتا تھا اور جب تصوّر کی تخلیق کی ہوئی تصویر سے مخاطب ہوکر کہا کرتا کہ ؎

فلک کے تاروں میں جگمگاؤ بہار بن بن کے مُسکراؤ
تمہاری ہر راہِ خود نمائی میں اپنی آنکھیں بچھا رہا ہوں

تو بندہ پرور! جب وہ شام نمودار ہوئی جب اس رات کی آمد آمد ہوئی، تو کیا پیش آیا۔ کیا افتاد پڑی۔ تمنّائیں اور آرزوئیں، جوانی کے جذبات اور شباب کی اُمنگیں کس طرح وزرِ نامرادی کی نذر ہوئیں۔ یہ ایک طویل داستان ہے۔ بہرکیف! یہ داستان تو مجھے آپ سے کہنی ہی ہے۔ لیکن پہلے تم ذرا سنو میری غربت کی داستان مجھ سے! ابھی! یہ کھجوریں تو کھاؤ، واللہ بازار میں ایسی عمدہ کھجوریں نہ ملیں گی" یہ کہتے ہوئے مراد علی نے پلیٹ اُٹھا کر میرے آگے رکھدی۔

میں نے کہا" کھجوریں تو واقعی عمدہ معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن میرے گلے میں خراش ہے۔ ڈر ہے کہ کہیں بڑھ نہ جائے"

"تم جانو!" مراد نے ایک کھجور مُنہ میں ڈالتے ہوئے کہا" تمہیں ان چیزوں کی قدر نہیں ہوسکتی۔ یہ تو وہ جانے جسے ترس ترس کر یہ چیزیں ملی ہوں۔ ارے توبہ ہے مرے یار! مفلسی اور ناداری بھی کتنی سوہانِ رُوح ہوتی ہے۔ ہر طرف مایوسی اور نامرادی بھیانک شکلوں میں نظر آتی ہے۔ تم کوئی بھی ارادہ کرو ناامیدی چھوٹتے ہی دامنگیر ہونے لگتی ہے۔ دل میں شوق تو فطرتًا پیدا ہوتے ہیں لیکن جب شوق پورے ہوتے نظر نہیں آتے تو اس وقت دل پر جو کچھ گذرتی ہے وہ کچھ پوچھو نہیں"

مراد علی نے ایک دوسری پلیٹ سے ایک نارنگی اُٹھائی اور چھیل کر میری طرف بڑھا کر بولا" ایک پھانک تو لو! اللہ اللہ! کبھی وہ دن بھی تھے کہ میں ان چیزوں کو بڑی للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا کرتا تھا۔ یقین مانو! کبھی لوگوں کو یہ چیزیں کھاتے دیکھنے میں ہی مجھے لطف آیا کرتا تھا۔ کبھی کبھی یوں ہی جھوٹے ہی بازار سے کوئی چیز لینے کے لئے میں جیب میں ہاتھ ڈال دیا کرتا۔ لیکن جب افلاس دل میں چٹکی لیتا تو ایک آہ بھر کر وہاں سے ہٹ جاتا"

میں نے پوچھا" تو تعلیم کیسے پائی؟"

مراد علی ایک آہ بھر کر بولا" تمہارے اللہ کے بس میں ہوتا تو شاید اس سے بھی محروم رہتا۔ میں وہ وقت آج تک نہیں بھولا جب میں نے

ایک قومی مدرسہ میں ناداری اور مفلسی کے عذر پر فیس کی معافی کے لئے درخواست کی۔ پہلے تو میری درخواست یہ کہکر واپس کر دی گئی کہ اس پر کسی معزز آدمی کی سفارش نہیں۔ میری سفارش کرنے والا کون تھا۔ ایک مثل ہے کہ "ملا کی دوڑ مسجد تک"! میں چونکہ ایک مسجد، یعنی تمہارے اللہ میاں کے گھر میں رہتا تھا اور محلّے والوں کے ٹکڑوں پر گذران تھی، مسجد کے امام نے میری دستگیری کی اور علاوہ فیس معاف کئے جانے کے دو روپے وظیفہ ملنے کی بھی پُر زور سفارش کی۔ باوجودیکہ میرے کپڑوں میں جا بجا پیوند لگے ہوتے اور میری شکل وصورت میری ناداری اور غربت کی ترجمان تھی۔ لیکن جواب ملا تو یہ ملا کہ جب تک درخواست زیرِ غور ہے سائل کو فیس ادا کرنی ہوگی۔ میں جب مدرسہ جاتا تو اُستاد سب سے پہلے ہی پوچھتا کہ فیس لائے۔ میرے انکار یا مجبوری کی سزا مجھے بیدوں سے ملتی۔ کوئی ہفتہ دس روز یہی سلوک ہوتا رہا۔ میں درد سے بلبلا اُٹھتا لیکن ایک قومی مدرسہ کے کارکنوں کو مجھ پر ترس نہ آتا۔ مجھ سے بہتر حالت والے اکثر لڑکوں کی فیس معاف ہو چکی تھی اور بعض کو "غریب فنڈ" میں سے دو دو چار چار روپے ماہانہ امداد ملنے کی نوید بھی مل چکی تھی۔ لیکن اس گھر باری اور غریب پروری کے راز سے میں اس وقت واقف نہ تھا۔ یہ سب سفارشوں کا کرشمہ تھا یا دوست نوازی کا اعجاز۔ اور کہیں کہیں کسی با اثر آدمی کی خوشنودی حاصل کرنے کا شوق کارفرما تھا۔ تو خیر! ایک روز فیس معاف ہو جانے کا مجھے بھی مژدۂ جانفزا سُنا دیا گیا۔ لیکن وظیفہ یا امداد دئے جانے کا میں مستحق نہ ٹھہرا۔ امام مسجد بڑا نیک دل آدمی تھا وہ اکثر مسجد میں آنے والوں سے کہہ سُنکر میری ضروریات کے لئے پیسے دلوا دیتا مسجد کے دروازے پر بجلی کا کھمبا تھا۔ بجلی کی روشنی صحن میں خوب آتی تھی، اور سبق یاد کرنے کے لئے میرے لئے یہ ایک ایسی نعمت تھی جس کی قدر و قیمت کچھ میں ہی جانتا تھا۔"

میں خاموش بیٹھا مرادعلی کی جس کا اس وقت شہر کے رؤسائے اعظم میں شمار تھا، باتیں سُن رہا تھا۔ وہ ہنسکر بولا "مرے یار! کیا بُت سے بیٹھے ہو کچھ کھاؤ تو سہی۔ مجھے تمہارے ہی خدا کی قسم! جس طرح کبھی مجھے دوسروں کو اچھا لباس پہنے یا اچھی چیزیں کھاتے دیکھنے میں لطف آتا تھا آج اسی طرح اپنے مہربانوں کی خاطر و مدارات کرنے میں مجھے لطف آتا ہے۔ ممکن ہے تمہارے نقطۂ نگاہ سے میری یہ کمزوری ہی ہو۔ لیکن ہے قابلِ معافی، ہے نا؟ میں قسمت کا ممنون ہوں تمہارے خدا کا نہیں کہ آج کوئی آرزو باقی نہیں اور کوئی ایسا ارمان نہیں جو پورا نہ ہوا ہو۔ لیکن وہ وقت میں ابھی تک نہیں بھولا جب تمہارے خوانِ نعمت سے کبھی مجھے عمدہ کھانا بھی مل جاتا تھا۔

ایک آدھ جوڑا کپڑوں کا ......"

"مراد!" میں نے بات کاٹ کر کہا "یہ ذکر کیا لے بیٹھے تم۔ تم یہ کہو کہ تم خدا سے منکر کیسے ہو گئے"

"یہی تو تم سے کہہ رہا ہوں" مراد نے جواب دیا "لو پہلے ایک مزے کی بات سُنو! لیکن ہنسنا نہیں مرے یار! اس زمانے میں میں نے ایک نوٹ بک بھی بنا رکھی تھی۔ اگر میں کسی کو خوشنما لباس پہنے دیکھتا تو میں اس نوٹ بک میں اس لباس کے متعلق ایک یادداشت لکھ لیتا۔ اگر کسی کے پاس مجھے کوئی عمدہ چیز نظر آتی تو یہ بھی نوٹ کر لیتا۔ مطلب یہ تھا کہ اگر کبھی میرے دن پھرے تو یہ شوق پورے کرونگا"

مراد نے ایک کھجور اُٹھا کر مُنہ میں ڈالی اور ہنسکر بولا "تو گویا تم نے کچھ کھانے کی قسم کھا رکھی ہے۔ تو جناب! مسجد کے حجرے میں رہتے اور مسجد کی روٹیاں کھاتے کھاتے میں اس منزل پر پہونچا جہاں مجھے میٹرک کا امتحان دینا تھا۔ میری امداد کرنے والوں میں بارک ماسٹری کے محکمہ کا ایک ٹھیکہ دار سب سے پیش پیش تھا۔ ایک روز مجھ سے کہنے لگا "بھئی مراد! تمہارا مسجد میں پڑے رہنا کچھ ٹھیک معلوم نہیں ہوتا"

میں نے کہا "اور کوئی آسرا بھی تو نہیں"

ٹھیکیدار بولا "میرے یہاں اُٹھ چلو"

"آپ کے گھر؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"ہاں! ہاں!" ٹھیکیدار بولا "جہاں تین کی بسر ہو رہی ہے وہاں ایک اور بھی سہی"

میں نے جواب دیا "آپ کی نوازشیں پہلے بھی تو کچھ کم نہیں لیکن آپ پر اتنا بار ڈالنے کا مجھے حق بھی تو نہیں"

"حق وق کی رہنے دو بھیا!" ٹھیکیدار بولا "یوں تو میں بھی غریب آدمی لیکن جس نے پیدا کیا ہے وہ روزی بھی دے رہا ہے"

"تو قصّہ مختصر میں اُسی روز ٹھیکیدار کے یہاں آ گیا۔ چھوٹا سا دو منزلہ مکان تھا۔ نیچے کی منزل میں ایک کمرہ مجھے رہنے کو مل گیا۔ ٹھیکیدار کی بیوی اور اُن کی اکلوتی بیٹی زبیدہ پہلے ہی روز سے مجھ پر مہربان نظر آنے لگیں۔ کچھ روز بعد زبیدہ مجھ سے پڑھنے بھی لگی۔ زبیدہ! سرو قد آہو چشم!! جس روز مجھے میٹرک میں پاس ہونے کی اطلاع ملی زبیدہ کی ماں نے محلّے میں مٹھائی بانٹی۔ میں چاہتا تھا کہ تعلیم کا سلسلہ جاری رکھوں لیکن میرا محسن کالج کے اخراجات برداشت کرنے کے قابل نہ تھا۔ آخر اسی کی کوشش سے ایک دفتر میں مجھے پندرہ

عجب نے کہ گر دست یابد گہے — پے قصِ خاتم بگیرد رہے — اگر کبھی اس کو موقع مل جائے اور وہ انگوٹھی کا نگینہ اڑا لینے کی کوشش کرے تو کچھ تعجب نہیں

زناں جملہ در دامِ اہرمن اند — بخلوت ہمہ کارِ شیطاں کنند — عورتیں تو سبھی شیطان کے پھندے میں پھنسی ہوتی ہیں اور سبھی خلوت میں بدکاری کرتی ہیں

چو شورید نفسِ زنِ پارسا — بخلوت دہد باسگے ہم رضا — پارسا عورت پر بھی جب نفس کا غلبہ ہوتا ہے تو وہ کتے سے ہم صحبت ہونے کیلئے بھی راضی ہو جاتی ہے

نہ زیبد بزن تاج و تختِ شہاں — کہ شد مملکت قسمِ کار آگہاں — تخت و تاج شاہی عورت کو زیب نہیں دیتا کیونکہ سلطنت تو کار آگاہ لوگوں کا حصہ ہے

جہانداری از زن نیاید نکو — کہ در اصل ناقص شد است عقلِ او — عورت کبھی اچھی طرح حکمرانی نہیں کر سکتی کیونکہ وہ ناقص العقل ہوتی ہے۔

زنے کو طرب جوید و جاہ ہم — ز شہوت تواند بُد آزاد کم — جو عورت عیش و عشرت اور جاہ و منزلت کی طالب ہوتی ہے وہ شہوت پرستی سے نہیں بچ سکتی

(اسی قسم کے بہت سے اشعار عورتوں کی مذمت میں ہیں۔)

زمردی نباشد کہ پیشِ زنے — نہیم از سرِ غافلی گردنے — یہ امر ہماری مردانگی سے بعید ہے کہ از راہِ غفلت ایک عورت کے سامنے سرِ اطاعت جھکا دیں

خصوصاً ازیں پس کہ اہلِ جہاں — گشتند در حقِ او بدگماں — خصوصاً ایسی حالت میں کہ ساری دنیا اس سے بدگمان ہو چکی ہے۔

اس مشورے کے بعد دوسرے دن جب رضیہ دربار میں آئی تو

شنیدم ہماں روز یاقوت را — بکشتند یکسر دراں بارِ جا — میں نے سنا ہے کہ اسی دن یاقوت کو سرِ دربار قتل کر ڈالا۔

گرفتند پس رضیہ را بے درنگ — نہادند بندش بپا بے درنگ — اور فوراً رضیہ کو قید کر کے اُسے بیڑیاں پہنادیں

وزاں پس ابا بندہائے گراں — بہ تبرہندہ کردند او را رواں — پھر بھاری زنجیروں میں جکڑ کر اسے تبرہندہ روانہ کر دیا۔

اور رضیہ کے بعد معزالدین کو بادشاہ بنایا۔

"رضیہ جب تبرہندہ میں قید تھی اور اس واقعہ کو ڈیڑھ برس گذر گیا تو میں نے سنا کہ ایک ترک جس کا نام لاطونہ تھا اور جنگلوں جنگلوں در ملکوں ملکوں اپنی تھوڑی سی فوج لئے لوٹ مار کرتا پھرتا تھا اتفاق سے تبرہندہ آپہنچا اور اچانک اس قلعہ کو فتح کر لیا۔ اس نے رضیہ کو قید سے نکالا اور جب رضیہ کو اپنے ساتھ شادی کرنے پر آمادہ دیکھا تو اس سے عقد کر لیا۔ ایک دن رضیہ نے خلوت میں اُسے بتایا:

کہ من دختِ شاہِ جہاں پرورم — سہ سال و سہ مہ تاج بد برسرم — کہ میں بادشاہ کی بیٹی ہوں اور سوا تین برس بادشاہی کر چکی ہوں۔

بوحشت زمن بندگانِ پدر — ربودند تاجِ کیانی زسر — میرے باپ کے غلاموں نے میرا تخت و تاج مجھ سے چھین لیا

اور مجھے یہاں قید کر دیا۔ اتفاق سے تم ادھر آنکلے اور مجھے قید سے چھڑا دیا۔ چلو اب ہم تم دونوں مل کر دہلی پر لشکر کشی کریں۔ چنانچہ رضیہ نے دہلی پر چڑھائی کی اور شکست کھائی۔ چند ماہ کے بعد فوجیں مرتب کر کے پھر حملہ کیا اور پھر شکست کھائی اور رضیہ اور لاطونہ دونوں مارے گئے۔"

اب شبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں کہ فرشتہ اور بدایونی وغیرہ نے یہ روایت فتوح السلاطین سے لی ہے کہ (۱) یاقوت ایک حبشی غلام تھا۔ (۲) وہ رضیہ کی بغل میں ہاتھ دے کر اُسے گھوڑے پر سوار کرایا کرتا تھا۔ (۳) رضیہ کے اور اس کے تعلقات نے وہ نوعیت اختیار کر لی تھی کہ ساری دُنیا رضیہ سے بدگمان ہو گئی اور اُمرا کو یہ ڈر ہوا کہ کہیں یاقوت موقع پا کر رضیہ پر دست تصرف نہ دراز کر بیٹھے۔

عصامی کا یہ پورا بیان زبانی روایتوں اور بازاری افواہوں پر مبنی ہے اور کسی طرح قابلِ تسلیم نہیں۔ فتوح السلاطین جس وقت لکھی گئی رضیہ کی وفات کو سو برس سے زیادہ گذر چکے تھے۔ اوّل تو یوں بھی سو برس گذر جانے کے بعد زبانی روایتوں میں واقعات کی صورت مسخ ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ عصامی کے راوی نہایت غیر معتبر ہیں۔ اسی دور کے چند اور واقعات جنہیں عصامی نے بیان کیا ہے تاریخ کی روشنی میں دیکھئے تو معلوم ہو جائے گا کہ عصامی کس حد تک ناقابلِ اعتبار ہے۔ طبقات ناصری سے ثابت ہے کہ سلطان شمس الدین التمش نے چھ اولاد چھوڑی تھیں۔ پانچ بیٹے یعنی رکن الدین، جلال الدین، معزالدین، قطب الدین، ناصر الدین، اور ایک بیٹی رضیہ۔ عصامی کو صرف دو بیٹوں اور ایک بیٹی ہی کا علم تھا، چنانچہ کہتا ہے :-

دو پور و یکے دخترِ شہریار — دریں ملک ماند است زشتہ یادگار

ملک التونیہ کو (جس کا صحیح نام تک عصامی کو معلوم نہیں اور لاطونہ کہتا ہے) ایک جہاں گرد لٹیرا سردار بتایا ہے حالانکہ وہ تبرہندہ کا گورنر تھا۔ پھر ملک التونیہ کو اس طرح پیش کیا ہے کہ گویا وہ رضیہ کے متعلق کچھ جانتا ہی نہیں۔ رضیہ نے بتایا تو اُسے معلوم ہوا کہ رضیہ سلطان شمس الدین

دوچار روز بعد ٹھیکیدار بھی آگیا۔ یہ پہلا روز تھا کہ اس کی باتوں میں مجھے کچھ سرد مہری کی بو آئی۔ وہ دو روز ٹھہر کر چلا گیا۔ زبیدہ کی ماں جو مجھ پر بہت مہربان تھی وہ بھی کئی روز سے کچھ خاموش خاموش سی نظر آتی۔ اور زبیدہ کھنچی کھنچی سی۔ اور میں حیران! میں نے زبیدہ کو شادی کا تحفہ دینے کے لئے ایک خوبصورت رسٹواچ خرید لی۔ اور اپنے لئے ایک خوبصورت جوڑا بھی بنوا لیا۔

رمضان کا چاند دیکھتے ہی ٹھیکیدار بھی واپس آگیا اور اب زبیدہ کی شادی کا انتظام ہونے لگا۔ باپ کے واپس آجانے کے بعد زبیدہ مجھ سے کچھ پردہ سا کرنے لگی۔ گویا میرے سمندِ شوق کے لئے یہ ایک تازیانہ تھا۔ شادی کے انتظام تو گھر میں ہو رہے تھے لیکن اسکے متعلق مجھ سے کبھی کوئی ذکر اذکار نہ ہوتا۔ اور بظاہر اس کی کچھ ضرورت بھی نہ تھی۔ انتظار کے دن تو جیسے گذرے سو گذرے آخر وہ دن بھی آیا جس روز ہلالِ عید کے رونما ہونے کی اُمید تھی۔ ادھر شام کی سیاہی مطلع آسمان پر پھیلی ادھر وہ رہا وہ رہا کی اِدھر اُدھر سے آوازیں آنے لگیں۔ پھر یہاں وہاں سلامی کے گولے چھوٹنے لگے۔ تو جناب! یہ وہی چاند تھا جس کی آمد آمد کی مجھے ایک مدت سے آس لگ رہی تھی۔ اسی رات محلے کی چند عورتیں ٹھیکیدار کے یہاں آئیں۔ رات بھر ڈھولک بجتی رہی۔ زبیدہ کے مہندی لگائی گئی۔ لیکن میں کوٹھڑی میں پڑا پڑا ہی خوش ہوتا رہا۔ صبح عید تھی۔ ٹھیکیدار اور میں دونوں عید کی نماز پڑھنے گئے۔ اِدھر اُدھر کی تو بہت باتیں ہوئیں لیکن جو بات میں سُننا چاہتا تھا وہ بھولے سے بھی اُس کی زبان پر نہ آئی۔ دوپہر کے بعد ایک باورچی آگیا اور کھانے کا انتظام کرنے لگا۔ ٹھیکیدار کا ہاتھ بٹانے کے لئے محلّے کے دوچار آدمی بھی آگئے۔ ادھر مغرب کی نماز ختم ہوئی اُدھر چار آدمی جو میرے لئے بالکل اجنبی تھے خوب اُجلے اُجلے لباس پہنے آئے۔ ان میں سے ایک نوجوان تھا۔ اُس کے گلے میں پھولوں کے ہار تھے۔ اڑھائی ہزار نقد حق مہر پر زبیدہ کا اس نوجوان سے عقد ہوگیا۔ پھر کھانا چنا گیا۔ کھانا ختم ہونے کے کچھ دیر بعد دولھا والے زبیدہ کو سوار کروا کر لے گئے۔

میری رات کیسے گذری؟ چھوڑ دیجئے اسے۔ رات بھر یہ شعر وردِ زبان رہا کہ ؎

یہ نہ تھی ہماری قسمت جو وصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

صبح مجھے دفتر جانا تھا۔ میں جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ ٹھیکیدار آگیا اور بولا "مراد! دفتر جاؤ گے؟"

"جی ہاں!" میں نے جواب دیا "ارشاد؟"

"بھئی!" وہ مسکرا کر بولا "تم ناراض تو ہو گے۔ لیکن میں مجبور تھا۔"

میں خاموش رہا۔

وہ ایک دو بار کھنکار کر بولا "بھیّا! دولت ہے تو سب کچھ ہے۔"

"جی ہاں" میں نے کہا "سچ ہے۔"

"میرے حالات تم سے چھپے نہیں" ٹھیکیدار معذرت کے انداز سے کہنے لگا "یہ تو قسمت تھی کہ ان لوگوں سے میل جول ہوگیا۔ اڑھائی ہزار کچھ کم نہیں۔ گو اتنی بڑی رقم بھی نہیں۔ تاہم کام چل جائیگا۔ ٹھیکیداری کا دارومدار نقد پونجی پر ہے۔"

پھر میرے شانے پر ہاتھ رکھکر "میاں مراد! زبیدہ تو گئی اپنے گھر۔ یہ گھر اب تمہارا ہے۔ تمہاری شادی کا بھی کہیں جلدی انتظام کرینگے۔"

اتنا کہہ کر وہ باہر چلا گیا اور میں نے دفتر کی راہ لی۔

"کیوں جناب!" مراد ایک سیب کاٹتے ہوئے بولا "کیسی رہی؟"

"ہا ہا!" میں نے کہا "دولت بُری بلا ہے۔"

"واقعی بُری بلا" مراد نے جواب دیا "لیکن جانتے ہو میں نے کیا کیا!"

"گھر چھوڑ دیا ہوگا" میں نے جواب دیا۔

"وہ تو چھوڑنا ہی تھا" مراد نے کہا "لیکن سوال یہ تھا کہ خدا نے مجھ پر یہ ظلم کیوں کیا۔ کس خطا کی مجھے یہ سزا ملی۔ تم ابھی کہہ رہے تھے کہ خدا اپنے بندوں پر کبھی ظلم نہیں کرتا۔ میں پوچھتا ہوں کہ مجھ سے کیا قصور ہوا کہ میرے نہاں خانۂ دل میں تین سال تک اُمید کی شمع جلا جلا کر اُسے یوں خاموش کر دیا۔ میں نے کونسا جُرم کیا، کیا کفر بکا جو میری آرزوؤں اور تمناؤں کو یوں پامال کر دیا گیا۔ نمازیں میں نے پڑھیں، آدھی آدھی رات کو اُٹھ کر سجدے میں رہا کئے۔ گڑگڑا گڑگڑا کر دعائیں میں نے مانگیں۔ ہاتھ پھیلا پھیلا کر خدا کو پکارتا رہا کہ اے میرے مولا! ؎

جس نے لگی میں تجھکو پکارا
تیرے آگے ہاتھ پسارا
پھرا نہ خالی کوئی اس چوکھٹ سے
گیا نہ پیاسا کوئی اس پنگھٹ سے

بتاؤ! خدا نے مجھے کیا جواب دیا۔ اس کی بارگاہ سے مجھے کیا انعام ملا۔ مایوسی! نامرادی! ناشکیبائی اور جگ ہنسائی! یا کچھ اور بھی۔

اس دل میں جو خدا کا تقدس تھا سب جاتا رہا۔ عبادت، پاکبازی، اخلاق، عبودیت! سب ایک فریب نظر آنے لگا۔ معاف کیجئو مرے یار! مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ عبادت میں، نمازوں میں، دُعائیں مانگنے میں جو وقت میں نے کھویا ایک گناہ تھا۔ اور یہ اسی گناہ کی سزا ہے کہ وہ چیز جس کی مَیں تین سال سے دل میں آرزو لئے بیٹھا تھا، مجھ سے چھین لی گئی۔ بس اسی روز سے میرے خیالات میں ایک تغیر اور انقلاب پیدا ہونے لگا اور مجھے یقین ہونے لگا کہ انسان اپنی قسمت کا خود مالک ہے۔ ع:-

جو ہو ذوقِ نظر پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

خدا تو محض لوگوں نے ڈرانے کو ایک نام تراش رکھا ہے۔ جزا اور سزا اگر ہے تو یہ دھندا بھی اس دُنیا کے ساتھ ہی ہے۔ جیسی کرنی ویسی بھرنی، اور کچھ نہیں۔ آخر میں نے دل سے عہد کر لیا کہ اب جیسے بھی ہو دولت پیدا کروں اور وہ لوگ جو دولت کے بل پر دوسروں کا گلا کاٹتے ہیں۔ امارت کے زعم میں دوسروں کو ذلیل اور رُسوا کرتے ہیں۔ وہ دوسروں کے جذبات کو نہایت بے رحمی سے پامال کرتے ہیں۔ ان کی زندگی دولت ہی کے بل سے تلخ کروں۔ ان کے عیش میں خلفشار پیدا کروں۔ ان کے سُکھ اور اطمینانِ قلب کو برباد کروں اور اپنے لئے وہ زندگی اختیار کروں کہ مذہب اور اخلاق کا ڈھونگ رچانے والے مجھے گنہگار سمجھیں اور علانیہ گنہگار کہیں۔ زندگی! (میز پر ہاتھ مار کر) جانتے ہو زندگی کا اصل مقصد کیا ہے؟ مجھ سے سُنو! زندگی کا ایک ہی مقصد ہے۔ دولت پیدا کرو اور زندگی کے چار دن عیش اور آرام سے بسر کرو۔ دُنیا چونکہ خود حرص و ہوس کا گھر ہے اس لئے یہاں کسی کام یا فعل کو گناہ قرار دینا بھی محض لغو ہے۔ میں نہیں جانتا کہ گناہ سے تم لوگوں کا مطلب کیا ہے۔ یہ کام مت کرو گناہ ہے۔ ادھر مت دیکھو گناہ ہے۔ یہ مت کھاؤ گناہ ہے۔ لیکن مَیں پوچھتا ہوں گناہ ہے کیا؟ تم غور تو کرو تمہیں معلوم ہوگا کہ دُنیا میں کوئی کام ایسا نہیں جسے ہم گناہ کہیں۔ پاکباز کہتے ہیں کہ دُنیا کے جنجال میں مت پھنسو۔ کیوں؟ دُنیا محض دھوکے کی ٹٹی ہے۔ تسلیم! لیکن اگر دُنیا دھوکے کی ٹٹی ہے تو پھر کوئی کام بھی ایسا نہیں جسے کرنے کو جی چاہے لیکن گناہ سمجھ کر ہم نہ کریں۔ یہاں کا کوئی کام بھی ایسا نہیں ہو سکتا جو اچھا کہلا سکے۔ اور جناب! اگر آپ واقعی خدا کی ہستی کو مانتے ہیں اور اسے کریم و رحیم سمجھتے ہیں تو پھر گناہ کرنے میں ہرج ہی کیا ہے۔ سُنا نہیں آپ نے کہ ؎

بندہ نوازیوں پہ خدائے کریم تھا
کرتا نہ میں گناہ تو گناہِ عظیم تھا

تم ہنسے جاؤ۔ خوب ہنسو! مجھے تمہارے ہنسنے کی کچھ پروا نہیں۔ میں نے دُنیا کی کچھ پروا نہیں کی تو تمہارے ہنسنے کی کیا خاک مجھے پروا ہوگی۔ تو سمجھ لو کہ میں نے دل میں یہ ٹھان لی ہے کہ اب دُنیا میں گنہگار بن کر رہوں گا۔ خدا کو تو ایک مدت "پُوج" کر دیکھ لیا۔ اب دُنیا کی پرستش کروں گا۔"

"مراد!" میں نے ہنس کر کہا۔ "جانتے ہو تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"جی ہاں!" مراد نے اس جی ہاں کو لمبا کر کے کہا۔ "جانتا ہوں کہ آپ کے نقطۂ نظر سے محض کفر بک رہا ہوں۔ یہی مطلب ہے نا آپ کا۔ چلئے یوں ہی سہی۔ لیکن تم جو کچھ مجھ سے سننا چاہتے ہو، پہلے وہ سُن لو، پھر کفر کا فتویٰ ایک بار نہیں ہزار بار لگا دیجئو! دفتر سے واپس آکر وہ رسٹ واچ جو میں نے زبیدہ کے لئے خریدی تھی، بکس سے نکالی۔ زبیدہ کی ماں باورچی خانے میں بیٹھی روٹی پکا رہی تھی۔ میں پاس جا بیٹھا اور رسٹ واچ اُسے دکھا کر کہا۔ "آپا! یہ رسٹ واچ زبیدہ کو دیدینا!"

"تم کہاں چلے؟" اُس نے تعجب سے پوچھا۔

"جہاں سینگ سمائیں گے۔" میں نے جواب دیا۔

"ایسا مت کہو بیٹا!" زبیدہ کی ماں بولی۔ "خدا کی قسم جو کچھ ہوا سخت مجبوری سے ہوا۔ میں تو ہرگز رضامند نہ تھی۔ لیکن زبیدہ کے باپ کے آگے میری ایک نہ چلی۔ لیکن تھے وہ بھی مجبور ہی!"

میں کیا جواب دیتا۔ بہرکیف گھر والوں نے ہزار روکا لیکن میں اسی رات اپنا مختصر سا اسباب لیکر ایک معمولی سے ہوٹل میں اُٹھ آیا۔ تین سال میں پندرہ سے بیس ہوئے تھے۔ ظاہر تھا کہ اس طرح میں اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکوں گا۔ میں نے ملازمت چھوڑ دی۔ اور دولت پیدا کرنے کے لئے وہ طریق اختیار کئے جسے تم ایسے پاکباز "ناپاک" کہو گے، دولت کمائی، اور خوب کمائی! آٹھ دس سال میں اتنا روپیہ پیدا کر لیا جو میری ضروریات کے لئے اور میرے مقصد کیلئے کافی سے زیادہ تھا۔ لیکن تمہارے ہی خدا کی قسم تمہارا خدا کبھی یاد نہ آیا۔ جتنا خدا کو بھولا اتنا ہی کاروبار چمکا۔ اور......"

"مراد!" میں نے بات کاٹ کر کہا۔ "میں یہ فضول داستان نہیں سننا چاہتا۔ سوچو تو تم کہہ کیا رہے ہو؟"

"مرے یار!" مراد نے ہنس کر جواب دیا۔ "تم یہ کہو کہ سوچو تو تم کرتے کیا رہے ہو۔ سُنو! کفر کرتا رہا ہوں، گناہ کرتا رہا ہوں۔ گناہ کر رہا ہوں۔ اور......"

"اور میں نے پھر بات کاٹ کر جواب دیا: "گناہ کرتے کرتے جہنم میں جاؤں گا"۔

مراد نے ایک قہقہہ لگایا۔ اور کہنے لگا:-

"ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

نہ جانے تم جہنم کو کیا سمجھے بیٹھے ہو۔ مجھ سے پوچھو تو اگر واقعی کوئی ایسی چیز ہے بھی تو سچ جانیو کہ ہم تو ع:-

خاکستر کی ایک مٹھی سمجھتے ہیں جہنم کو

لیکن ہاں! ہو تم بھی سچے۔ تم پوچھو کیسے؟ تو عرض ہے کہ اس دنیا میں ایک ایسی چیز بھی ضرور ہے جسے میں نے بھی گناہ سمجھا۔ جس سے ہر گام پر پچھتا رہا"۔

"شکر ہے!" میں نے ہنسکر کہا کہ "تم گناہ کے وجود کے تو قائل ہوئے ـــ"

"جانتے بھی ہو وہ ہے کیا چیز؟" مراد نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا: "تمہارے خدا کے نام پر ایک کوڑی بھی خرچ کرنا میرے لئے چاروں مذہب حرام"۔

"تو گویا!" میں نے پوچھا: "تم نے خدا کی راہ میں کبھی کچھ خرچ نہیں کیا۔ کبھی کسی محتاج، حاجت مند یا غریب پر تمہیں ترس نہیں آیا"۔

مراد مسکرا کر بولا: "بھلا سوچو تو سہی کہ اس خدا کی راہ میں میں کیسے کچھ خرچ کرتا جس خدا نے بلا وجہ بغیر کسی جرم کے زبیدہ کو میری آغوش سے چھین کر دوسرے کے حوالے کر دیا۔ کیا احسان کیا تمہارے خدا نے مجھ پر جو میں اسکے نام پر کسی کو کچھ دیتا"۔

میں نے کہا: "یہ احسان کیا کم ہے کہ تم ایسے نااہل کو اتنی دولت، صحت اور عزت دے رکھی ہے"۔

"اجی واہ!" مراد نے ہنسکر کہا: "کتنا انوکھا استدلال ہے تمہارا۔ تم کہتے ہو کہ خدا گناہ کو پسند نہیں کرتا۔ گنہگار کو ضرور سزا ملے گی۔ گنہگار فلاح نہیں پائیں گے۔ لیکن میں ڈنکے کی چوٹ کہہ رہا ہوں کہ میں نے جو کچھ حاصل کیا ایسے وسائل سے اور ایسے طریقوں سے حاصل کیا جو تم ایسے پاکبازوں کے لئے باعث ندامت ہوں۔ جس کے خیال سے بھی تم ایسے پارسا کانپنے لگیں۔ تو گویا تمہارا مطلب یہ ہے کہ تمہارا خدا ایسے کاموں میں بھی برکت دیتا ہے جنہیں وہ خود گناہ قرار دیتا ہے۔ مرے یار! بات سوچ کر تو کیا کرو۔ باقی رہا تمہارا یہ کہنا کہ مجھے کبھی غریبوں اور محتاجوں پر بھی ترس آیا۔ سچ جانیو! میں جب کسی غریب کو دیکھتا ہوں تو مجھے وہ وقت یاد آجاتا ہے جب میں مسجد میں رہتا تھا۔ جہاں تک مجھ سے ہو سکتا ہے میں ان لوگوں کی ایسے طریق سے خدمت کرتا ہوں کہ کسی دوسرے کو پتہ نہ چلے۔ میں غریبوں کے بچوں کو گود میں اٹھا لیتا ہوں۔ ان سے پوچھتا ہوں کہ انہیں کیا چیز پسند ہے۔ کونسا کھلونا لینا چاہتے ہیں۔ کیسا لباس پہننا چاہتے ہیں۔ کیا کھانے کو دل چاہتا ہے۔ اور جب تک میں ان کی خواہش پوری نہ کر لوں مجھے چین نہیں آتا۔ لیکن اگر کوئی مجھ سے یہ کہے کہ اللہ کے نام پر کچھ دے تو میں چپکے سے پاس سے گذر جاتا ہوں۔ رات کے وقت جب یہ سرمایہ دار عیاش پیشہ وروں کے مکان پر جاتے ہیں تو میں بھی پہنچ جاتا ہوں۔ وہ اگر پانچ دیتے ہیں تو میں دس خرچ کرتا ہوں، وہ بیس خرچ کریں تو میں سو خرچ کرتا ہوں اس طرح اُن کی محفل عیش کو درہم برہم کر کے ہنستا ہوں اور خوش ہوتا ہوں"۔

"دیوانے جو ہوئے" میں نے مسکرا کر کہا۔

"مجھے اس کی کچھ پروا نہیں کہ کوئی مجھے دیوانہ سمجھتا ہے یا کیا، لیکن میری زندگی کا سب سے بڑا مقصد یہی ہے کہ میں ان سرمایہ داروں کو زندگی کے ہر مرحلہ میں نیچا دکھلاؤں۔ اور تم یہ سُنکر خوش ہو گے کہ میں ایسے مقدس مقصد میں بہت حد تک کامیاب ہو چکا ہوں"۔

"مراد!" میں نے کہا: "ابھی وقت ہے توبہ کر لو"۔

"کس بات کی؟" مراد نے ہنسکر پوچھا: "کیسی توبہ؟ کیا جرم کیا میں نے۔ یا محض ع:-

اس خطا پر مجھے مارا کہ خطاوار نہ تھا

انسان دنیا میں اس لئے نہیں آیا کہ دن رات مشقت کرے اور پیٹ بھر کر روٹی بھی نصیب نہ ہو۔ انسان اس لئے تخلیق نہیں ہوا کہ اس دنیائے رنگ و بو میں رہ کر ترس ترس کر زندگی کے دن پورے کرے اور اپنی ناکامیوں اور نامرادیوں کی ندامت چھپانے کے لئے کفن میں منہ چھپا کر گور کے پردے میں چھپ جائے۔ کیسا غضب ہے کہ خدا بھی ایک ہو اور کائنات بھی ایک اور نظام کائنات بھی پختہ تر محکم تر، لیکن ایک انسان تو انواع و اقسام کے نغموں سے لطف اندوز ہو اور دوسرا نان شبینہ کے لئے بھی محتاج۔ اور اس پر ستم یہ کہ اگر کوئی زندگی کے یہ چار دن آرام سے بسر کرنے کے لئے سماج کے مقرر کردہ قوانین سے منحرف ہو کر چار پیسے کما لے تو پھر وہ بدبخت آپ کی نگاہوں میں گناہ گار ہے۔ لیکن اگر کوئی سرمایہ دار سو سو فریب اور طرح طرح کے مظالم سے دولت جمع کرے تو کسی کی مجال نہیں کہ حرف گیری کی جرأت کرے۔ لعنت ہے اس سماج پر جو دولت کی پرستا

ہو۔ اگر ایک چور اُچکّے کے پاس بھی چار پیسے ہوں تو کوئی اُس کے حسب نسب میں رخنہ نکالنے کی جُرات نہیں کرسکتا۔ لیکن مفلس اور نادار کو خواہ وہ کتنا ہی شریف النسل کیوں نہ ہو یہ سماج مُنہ نہ لگائے گی۔"

میں تعجب سے مُراد کی طرف، جس کا چہرہ جوش سے سُرخ ہورہا تھا، دیکھ رہا تھا۔ وہ کہنے لگا:۔

"اب بولتے کیوں نہیں، بتلاتے کیوں نہیں کہ ایک بچّہ ایک مدّت تک ماں کے پیٹ میں رہ کر جب دُنیا میں آتا ہے تو اس ننھّی سی معصوم جان کا کیا قصور کہ اس کی پیشانی پر ناداری اور غربت کی مہر لگادی جاتی ہے۔ جس کی قسمت میں ہر چیز کے لئے ترسنا لکھ دیا جاتا۔ اب اگر یہی بچّہ پروان چڑھکر، جوان ہوکر خواہ کسی طرح سے اپنی قسمت کو پلٹ دے اور ٹھاٹھ سے زندگی بسر کرنے لگے تو کیا حق ہے تمہارے خدا کو کہ اس کے اس بہادرانہ فعل، اس مجاہدانہ عمل کو گناہ قرار دے کر مجرم گردانے۔ تو جناب! اگر آپ اور آپکا خدا مجھے اس لئے گنہ گار سمجھتا ہے کہ میں نے ناجائز وسائل سے دولت پیدا کی تو پھر آپ ہی کے خدا کی قسم! میں آج بھی گنہگار ہوں اور کل بھی اور اگر قسمت میں ہے تو گنہگار ہی مروں گا۔ آپ بھی مجھے گنہگار کہہ کر کلیجہ ٹھنڈا کر لیجئے۔"

شام ہوچکی تھی اور کہیں دُور سے مؤذّن کی آواز اللہ اکبر فضا میں گونج رہی تھی۔

مُراد ہنسکر بولا۔ "جاؤ! تمہارا خدا تمہیں بُلا رہا ہے"

"اور تم!" میں نے ہنسکر پوچھا۔

"میں تو ذرا ریڈیو سُنوں گا"

یہ کہہ کر اُس نے جو سوئچ کھولا تو اس وقت لاہور ریڈیو اسٹیشن سے یہ آواز آئی:۔

دھن والوں کی دُنیا ہے یہ
نردھن کے بھگوان!

ایم۔ اسلم

پھُولوں کی مالا

یُنہیں کھیلتے کھیلتے توڑ ڈالا
کھلونا تھا اُن کا مرے دل کا چھالا

یہ کیا جانتا تھا بچاری کہ اک دن
وُہی آپ ڈھا دیں گے اپنا شِوالا

ابھی یاد ہے دل کو وہ پیار اُن کا
کہ ایک ایک چتون تھی پھُولوں کی مالا

اُن آنکھوں میں ہر دم چھلکتی تھی چاہت
سماتا نہ تھا دل میں دل کا اُجالا

کہیں دل بھی توڑا ہوا جُڑ سکا ہے
اُسے چھیڑتے ہیں جسے مار ڈالا

وہ ہنس ہنسکے آنسو مِرے پونچھتے ہیں
دلاسے کا بھی ڈھنگ ہے کیا نرالا

سہارا نہ دینا تھا گِرتے ہوئے کو
ہے اک موت بیمار کو اک سنبھالا

وہ پھر پوچھ کے اور چرکے لگائیں
ابھی دل کا پہلا ہی گھاؤ ہے آلا

اُنہیں ہر گھڑی دِھیان رہتا ہے میرا
اُچھالا ڈُبویا ڈُبویا اُچھالا

کوئی ڈھب ہو جینے کا، جیتے ہیں جبتک
بُھلایا نہ جائے گا یاد آنے والا

دلاسا نہ دینا تھا لے آس دل کو
چُھری گھُونپ دی اور کانٹا نکالا

نہ جانے کوئی روگ ہے یہ کہ جینا
دھڑکتا ہے دل یا تپکتا ہے چھالا

اُلجھتی ہے رہ رہ کے ہر سانس کوکب
اُترتا ہے جیسے کلیجے میں بھالا

کوکب شاہجہانپوری۔

رباعیاتِ جوشؔ

قدِ موزوں

تابش سے فضا دمک رہی ہے گویا ⁞ ہیرے پہ کرن جھلک رہی ہے گویا
یہ قد کی بلندی یہ دمکتا مکھڑا ⁞ نیزے پہ انی چمک رہی ہے گویا

جنّتِ کشمیر

ممنوعِ طرب سے لطفِ پیہم لینے ⁞ عصیاں کی شجر کی چھاؤں میں دم لینے
آوازدو کاشمیر آپہونچا جوشؔ ⁞ اللہ سے انتقامِ آدم لینے

درسِ عمل

اے نوعِ بشر عقدہ کشائے فردا ⁞ اے مشعلِ محرابِ سرائے فردا
مردانہ قدم بڑھا سوئے اَوجِ کمال ⁞ اے بندۂ امروز و خدائے فردا

جوشؔ ملیح آبادی

دیوانگی

انسان اپنے تمام ظاہری اور باطنی اثرات اور محسوسات کو حواس کے ذریعے سے محسوس کرتا ہے، یعنی اس کے گردوپیش کی موجودات اور واقعات، ان کی ماہیت وحقیقت، بلکہ خود اپنی ہستی اور اسکے اثرات، اپنی قوتوں اور طاقتوں کے احساس کو بھی حواس خمسہ کے ذریعے ہی معلوم کیا جاتا ہے، بغیر حواس کے انسان کو کسی بات کا علم نہیں ہوتا۔ اگر حواس کلیۃً زائل ہو جائیں تو انسانی زندگی محال ہو جائے، چنانچہ منشیات یا سخت چوٹ لگنے سے بےہوشی واقع ہوتی ہے تو حواس عارضی طور پر معطل ہو جاتے ہیں، اور اس وقت انسان پر کسی تاثر یا تحریک کا اثر نہیں ہوتا، بےہوش آدمی بےخبر پڑا رہتا ہے اور اس کو نہ صرف اپنے ارد گرد بلکہ اندرونی حالات کا بھی علم نہیں ہوتا، اسی وجہ سے تکلیف دہ آپریشن مریض کو بےہوش کر کے عمل میں لائے جاتے ہیں اور اس وقت وہ اس تکلیف سے دوگنی تگنی تکلیف بلا کسی احساس کے برداشت کر لیتا ہے جو ہوش کی حالت میں اس کی قوت برداشت سے باہر ہوتی ہے لیکن حواس کا تعلق انسان کے دماغ سے ہے اور دماغ ہی عقل پر موثر ہے، دراصل دماغ ہی وہ چیز ہے جو انسان کو انسان بناتی ہے، چنانچہ وہ لوگ جن کا دماغ اچھا ہوتا ہے دُنیا میں بہت بڑے اور کامیاب آدمی بن جاتے ہیں۔ اور جن کا دماغ خراب ہوتا ہے، وہ دُنیا میں کسی کام کے نہیں ہوتے۔

دماغ کے اچھے یا بُرے ہونے میں خود دماغ کے وزن کا بھی بڑا دخل ہے۔ ماہرین طب کا کہنا ہے کہ ایک اچھے اور تندرست آدمی کا دماغ جوانی کے زمانے میں ۴۸ اونس کے قریب ہونا چاہیئے۔ وہ لوگ جو پیدائشی پاگل یا دیوانے ہوتے ہیں ان کے دماغ کا وزن ۱۶ اونس اور بعض وقت اس سے بھی کم ہوتا ہے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ نوزائیدہ بچّوں کا دماغ ۱۰ سے ۱۴ اونس تک ہوتا ہے۔ عمر اور دوسرے جسمانی اعضا کی نشوونما کے ساتھ ساتھ دماغ بھی بڑھتا جاتا ہے، چنانچہ سات برس میں دماغ کا اوسط ۴۰ اور چودہ سال میں ۴۸ اونس تک پہونچ جاتا ہے۔ چالیس سال کے بعد جس طرح انسان کے دوسرے اعضا میں انحطاط شروع ہوتا ہے اسی طرح دماغ کے وزن میں بھی ہر دسویں سال ایک اونس کی کمی ہونے لگتی ہے۔ عورت کا دماغ مرد کے دماغ سے ہر حالت اور ہر [illegible] چھوٹا ہوتا ہے اور جوانی میں اس کا وزن مردانہ دماغ کے مقابلے میں ۵ اونس کم ہوتا ہے۔ غالباً اِسی بنیاد پر عورت کو مردوں کے مقابلے میں کم عقل سمجھا گیا، اور اسی کلیہ سے اس بات کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ کیوں ایک بچّہ بہ نسبت جوان آدمی کے کم عقل رکھتا ہے، اور یہ مقولہ کہ بڑھاپے میں دماغ سٹھیا جاتا ہے، کس حد تک ٹھیک ہے، لیکن یہاں ایک بات کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے کہ ہم انسانوں سے بحث کر رہے ہیں، اور ان میں مستثنیات پائے جا سکتے ہیں، لیکن اس سے عام اصولوں پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور ایسی خاص صورتوں کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

عام طور پر انسانوں میں تین قسم کے آدمی پائے جاتے ہیں۔ ایک اچھے دماغ والے، دوسرے اوسط درجے کے اور تیسرے خراب دماغ والے۔ ان میں سے درمیانی قسم کے لوگوں کی تعداد بہت ہوتی ہے۔ اور پہلے اور تیسرے لوگوں کی تعداد بہت کم۔ یہاں ایک بات کا خیال رکھنا اور ضروری ہے کہ تعلیم، علم، واقفیت اور ماحول سے دماغ میں ایک قسم کی جلا پیدا ہو جاتی ہے اور وہ اپنی پوری صلاحیتوں کے ساتھ کام کرنے لگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ کے اکثر ملکوں کے لوگوں کی دماغی صلاحیت کا معیار ہندوستانیوں سے اُونچا ہے، یا ہندوستان کے شہری بہ نسبت دیہاتیوں کے اچھے دماغ رکھتے ہیں۔ یا متمدن اور تعلیمیافتہ قوموں کے مقابلے میں غیر متمدن اور وحشی اقوام کے دماغ کمتر ہوتے ہیں، لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں کہ جن کے دماغ دوسرے ملکوں یا قوموں کے دماغ سے کمتر ہیں، ان میں ترقی کی صلاحیت ہی نہیں۔ آج سے سو سال پہلے جاپان ایک بہت ہی معمولی قوم تھی، لیکن آج وہ کسی طرح یورپ کی کسی متمدن قوم سے پیچھے نہیں، وجہ صاف ظاہر ہے کہ اس میں ہر قسم کی صلاحیتیں موجود تھیں البتہ ان سے کام نہیں لیا گیا تھا۔ جب ان میں جلا پیدا کر کے ان سے کام لیا گیا تو یہ فریب دُور ہو گیا۔ دراصل یہ ماحول ہے جو ہم میں فردوسی و شیکسپیر، رستم و سہراب، اکبر و شیر شاہ، بوعلی سینا و لقمان، برکلے و نطشے اور ہٹلر وچرچل پیدا کرتا ہے۔ ورنہ ہماری سوسائٹی میں ایسے بہت سے افراد ہیں جو ان لوگوں سے زیادہ دماغی قابلیت اور صلاحیت رکھتے ہیں، مگر اُن کی یہ صلاحیتیں

یا تو منظرِ عام پر نہیں آتیں یا اُن کو موقع ہی نہیں ملتا۔ اس لئے وہ انکو ظاہر کئے بغیر فنا ہو جاتے ہیں۔ بہر حال اس چیز کی وضاحت کے بعد مندرجہ بالا کلیہ یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ ہر سوسائٹی میں اُسکے مروّجہ معیار کے مطابق تین قسم کے آدمی پائے جاتے ہیں۔ ایک اچھے دماغ والے دوسرے معمولی اور تیسرے خراب دماغ والے۔ اور اسی آخر الذکر درجے میں وہ لوگ شامل ہیں جن کو ہم پاگل، مجنون، دیوانے یا فاترالعقل وغیرہ کہتے ہیں۔ ان کی دو بڑی قسمیں ہیں، پہلے وہ جو فطری طور پر دیوانے پیدا ہوئے ہوں اور جن کی عام حالات میں اصلاح ناممکن ہو۔ غالباً ماہرین طب اس درجے میں ان لوگوں کو شامل کریں گے جن کا دماغ پیدائشی طور پر چھوٹا ہو یا اس پر کوئی پردہ اور جھلّی ایسی ہو جس سے وہ اپنی مقررہ صلاحیتوں کو انجام نہ دے سکے، دوسری قسم میں وہ لوگ ہیں جن کے دماغ پہلے اچھے تھے مگر بعد میں خراب ہو گئے۔ اسکے حسب ذیل اسباب ہو سکتے ہیں:۔

(۱) کسی بیماری یا عارضہ کی وجہ سے دماغ کا خراب ہو جانا، مثلاً جب انسان کے دماغ پر فالج گر جاتا ہے تو وہ پاگل ہو جاتا ہے، اور اگر دماغ بالکل ہی مفلوج ہو جائے تو ہلاکت واقع ہو جاتی ہے۔

(۲) کسی خاص صدمہ سے دماغ کا بیکار ہو جانا۔ مثلاً محترمہ ب کا دماغ اس لئے خراب ہو گیا کہ پہلے اُن کے شوہر کا انتقال ہوا، اس کے کچھ دنوں بعد ان کی اکلوتی بیٹی مر گئی۔ اور اس کے تیسرے روز اُن کے نواسے کا انتقال ہو گیا۔ یہ متواتر صدمے ان کا کمزور دماغ برداشت نہ کر سکا اور وہ دیوانی ہو گئیں۔ مالی صدمے سے بھی اس ذیل میں آ جاتے ہیں۔ بہت سے کاروباری آدمی جب اپنے کاروبار میں دیوالیہ ہو جاتے ہیں تو اُن کا دماغ چل جاتا ہے۔ چوٹ اور حادثوں کے مریض بھی اسی ذیل میں آ سکتے ہیں۔

(۳) کسی خاص خوشی سے بھی دماغ پر اثر پڑتا ہے۔ مثلاً جب مسمی کلو چمار کو ایک دم یہ اطلاع ملی کہ اس کو کسی لاٹری سے ایک لاکھ انعام ملا ہے تو اس کا دماغ خراب ہو گیا اور وہ ہر وقت "ایک لاکھ، ایک لاکھ،" چلّایا کرتا تھا، اور باوجود علاج کے کوئی فائدہ نہ ہوا۔ مگر ایسی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔ ورنہ خوشی میں آدمی شادیِ مرگ تو ہو جاتا ہے مگر دیوانہ کم ہوتا ہے۔

(۴) کسی خاص تعجب کا بھی بعض وقت دماغ پر اثر پڑتا ہے مسٹر د کی معمر والدہ راجپوتانہ کے کسی حصّہ میں سفر کر رہی تھیں، انہوں نے وہاں اونٹوں کے ایک قافلے کو گذرتے ہوئے دیکھا، جس پر تمباکو کے بڑے بڑے گٹھے لدے ہوئے تھے، انہوں نے حیرت سے کہا "ارے اتنی مسواکیں"! اس کے بعد سے ان کا دماغ چل گیا، بہت کچھ علاج کیا مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اتفاق سے دہلی کے ایک نامور طبیب کو انہیں دیکھنے کا موقع ملا، انہوں نے پوچھا کہ وہ کونسا حادثہ تھا جس سے ان کا دماغ متاثر ہوا۔ اب کسی کو خیال بھی نہ تھا، کسی نے کچھ بتایا اور کسی نے کچھ، اتفاق سے ان کے کسی عزیز نے اس ذیل میں اونٹوں کا واقعہ بھی سنایا۔ چنانچہ حکیم صاحب نے کہا "بس اب یہ اچھی ہو جائیں گی"! چنانچہ انہوں نے چیخ کر کہا "وہ سب مسواکیں جل گئیں" مریضہ نے بھی یہ بات سنی اور پوچھا "کونسی؟" انہوں نے جواب دیا "ارے وہ اتنی مسواکیں جو اُن اونٹوں پر لدی ہوئی تھیں" مریضہ نے کہا "سب جل گئیں" حکیم صاحب نے اثبات میں جواب دیا۔ تو مریضہ نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور خاموش ہو گئیں۔ اس کے بعد اُن کا دماغ آہستہ آہستہ کام کرنے لگا، اگرچہ وہ اگلی سی بات حاصل نہیں ہوئی مگر ان میں دیوانگی کے آثار بالکل باقی نہ رہے۔

(۵) بعض لوگوں کا دماغ عام حالات میں بالکل اچھا ہوتا ہے مگر خاص خاص چیزوں میں ان کا دماغی توازن بگڑ جاتا ہے، مثلاً بعض لوگ کسی خاص تذکرے کو سنتے ہی دیوانگی کی حرکات شروع کر دیتے ہیں۔ بعضوں پر کسی خاص چیز کے دیکھنے یا کسی خاص شخص کے سامنے آنے سے جنونی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور اس تذکرے کے ختم ہوتے ہی یا اس چیز اور شخص کے سامنے سے ہٹتے ہی یہ کیفیت ختم ہو جاتی ہے۔ اسکی وجہ وہ مخصوص کیفیات یا تاثرات ہوتے ہیں جو ایامِ گذشتہ میں انکو کسی خاص شی، بات یا فرد سے پیش آئے ہوں اور جن سے انکو روحانی اذیت اور دماغی تکلیف پہونچی ہو، اور ان نظاروں سے وہ احساسات تازہ ہو جاتے ہیں اس لئے وہ ایسی حرکات کرنے لگتے ہیں۔

(۶) بعض لوگوں پر خاص موسموں اور خاص اوقات میں جنونی کیفیت طاری ہوتی ہے، مثلاً مشرقی شعرا کی خیالی دنیا میں جنونی کیفیت اور چاک گریبانی کا زمانہ موسمِ بہار ہوتا ہے، یہ تخیل محض خیالی نہیں ہے، بلکہ اکثر دیوانوں کی وحشت بہار میں اپنا زور دکھاتی ہے، بعض مجنونوں کو گرمی کے موسم میں جنون کے دورے زیادہ سخت پڑنے لگتے ہیں، یا عام طور پر چاندنی راتوں کا اثر جنون کے اثرات میں اضافہ کرتا ہے۔ اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ اس زمانے یا وقت میں انسان کے خون کی حدت بڑھ جاتی ہے اور اس کی مجنونانہ حرکات میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

(۷) کسی خاص چیز کی دُھن بھی دراصل ایک قسم کا جنون ہے

چنانچہ دُنیا کے اکثر بڑے بڑے فلسفی، سائنسداں اور موجدوں کو دیکھا گیا ہے کہ وہ بڑی پریشانی کی حالت میں رہتے ہیں، نہ ان کو اپنے کھانے کا ہوش ہوتا ہے اور نہ پینے کا، نہ لباس کا خیال ہوتا ہے اور نہ آرائش کا۔ بال بکھرے ہوئے ہیں، ڈاڑھی بڑھی ہوئی ہے، ناخن غیر تراشیدہ ہیں، انکے پاس سوائے اپنے خاص مشغلے کے گفتگو کا اور کوئی موضوع ہی نہیں' اور دُنیا کے بڑے سے بڑے حادثہ سے ذرہ برابر متاثر نہیں ہوتے، اسی دُھن میں بعض لوگ اپنے دماغی توازن کو خراب کر لیتے ہیں۔

(۸) اکثر مذہبی ریاضت اور عبادت کرنے والے بھی اپنے دماغی ہوش و حواس کھو بیٹھتے ہیں، اور ان کو اصطلاح میں مجذوب یا سالک کہا جاتا ہے۔ منصور نے اسی حالت میں خدائی کا دعویٰ کیا اور دار پر کھینچا گیا۔ ان کے یہاں آخری درجہ ریاضت کا وہ ہے جہاں "من وتو" کا احساس ہی باقی نہیں رہتا۔ مگر یہ چیز بڑی محنت اور ریاضت کے بعد حاصل ہوتی ہے اور اکثر اسی دُھن میں اپنے حواس کھو بیٹھتے ہیں، نیز فقرا کے یہاں یہ بھی دستور ہے کہ نئے لوگوں کو ایک دم تعلیم نہیں دی جاتی، بلکہ برسوں ان سے محنت ریاضت اور مجاہدے کرائے جاتے ہیں، اور اس کے بعد کچھ دیا جاتا ہے، فقرا کے تذکروں اور کتابوں میں جابجا ایسے واقعات ملتے ہیں کہ اگر کسی صاحب کمال نے اپنے کسی نئے مرید کو خوش ہو کر فوراً سب کچھ دے دیا تو یا تو وہ مر گیا یا اس کا دماغ خراب ہو گیا۔

(۹) بعض وقت معمولی معمولی پریشانیاں بھی انسان کا دماغ ماؤف کر دیتی ہیں۔ خانگی، خاندانی اور مالی تفکرات، ازدواجی تلخیاں بھی دماغ پر اثر ڈالتی ہیں۔ جس طرح انسان کے دوسرے اعضا کو آرام کی ضرورت ہے اسی طرح دماغ کو بھی سکون کی ضرورت ہے' اور یہ سکون نیند سے حاصل ہوتا ہے، چنانچہ ماہرین طب نے طبعی نیند کی تعریف یہ کی ہے کہ جس میں آدمی آرام و سکون سے سوئے اور کوئی خواب نہ دیکھے، کیونکہ خواب دیکھنے کے معنی یہ ہیں کہ اس کے دماغ کے کچھ حصے بیدار ہیں اور وہ اپنے افعال میں معروف ہیں، اور دماغ کو سکون نہیں مل رہا، مسلسل دماغی الجھنوں اور پریشانیوں سے سستی، کاہلی، درد سر، ضعف دماغ اور کم خوابی کی شکایت پیدا ہوتی ہے، مگر متواتر بے خوابی سے جنون اور دیوانگی کے اثرات پیدا ہونے لگتے ہیں۔ خراب نیند میں جب دماغ کام کرتا رہتا ہے تو نہ صرف طرح طرح کے خواب نظر آتے ہیں بلکہ بعض وقت سام نمبولزم (خواب میں چلنا) کی بیماری پیدا ہوجاتی ہے جس میں سوتا ہوا انسان چلتا پھرتا ہے بلکہ کبھی کبھی اپنے دوسرے مشق کئے ہوئے کام مثلاً لکھنا پڑھنا، باجہ بجانا، ٹائپ کرنا، وغیرہ بھی کرتا ہے، اور جب حالت بیداری میں اس سے پوچھو تو لاعلمی کا اظہار کرتا ہے اور واقعی اس کو ان چیزوں کا احساس نہیں ہوتا کیونکہ اس کا پورا دماغ بیدار نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کے کچھ حصے بیدار ہوتے ہیں۔

اب تک ہم نے جن لوگوں کا تذکرہ کیا یہ وہ لوگ ہیں جن کے دماغ یا تو فطری طور پر عام انسانی دماغوں سے کمتر ہیں یا کسی سبب کی بنا پر کمزور ہو گئے ہیں، اس لئے وہ ایسی حرکات یا گفتگو کرتے ہیں جو عام انسانی معیار سے کم ہوتی ہے یا اس میں بعض خامیاں پائی جاتی ہیں' اور ان لوگوں کو ہم پاگل کہتے ہیں، ان میں سے بعض لوگ قابل علاج ہوتے ہیں اور اگر معقول طریقہ پر ان کا علاج معالجہ کیا جائے اور غور و پرداخت کی جانب خاص توجہ کی جائے تو وہ درست ہو سکتے ہیں۔ اور ان میں کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کا علاج ناممکن ہے، مگر دُنیا میں مجموعی حیثیت سے ان کی تعداد بہت زیادہ نہیں، لیکن دُنیا میں پاگلوں کی صرف یہی قسمیں نہیں ہیں بلکہ ایک اور قسم بھی ہے اور یہ بہت ہی اہم ہے یعنی کچھ لوگ ایسے ہیں جو عام انسانی سطح سے اُونچے ہیں' اور جس طرح سطح سے کمتر لوگوں کی گفتگو غیر مربوط اور بے تکی ہوتی ہے اسی طرح ان لوگوں کی گفتگو اور باتیں ہماری سمجھ سے بالاتر ہوتی ہیں' اور چونکہ یہ باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں اس لئے ہم ان کو جلدی سے پاگل کہہ کر اپنا پیچھا چھڑا لیتے ہیں۔ ازمنہ وسطیٰ میں ایسے لوگوں کی کافی تعداد ملتی ہے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت نہ تو سائنس نے اتنی ترقی کی تھی اور نہ لوگ اپنے قدیم عقائد کے خلاف کوئی نئی بات سُننا چاہتے تھے اس لئے جب کسی نے کوئی نیا انکشاف کیا یا کوئی نئی حقیقت دریافت کی تو اس کو پاگل قرار دیا گیا۔ جب گالی لیو نے اپنی دُوربین کی مدد سے سیاروں کا مشاہدہ کرنے کے بعد یہ رائے قائم کی کہ زمین سورج کے گرد چکر لگاتی ہے تو عوام نے اس کا خوب مذاق اُڑایا اور اس کو پاگل قرار دیا۔ پادریوں اور مذہبی رہنماؤں کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو وہ بہت ہی برہم ہوئے اور انہوں نے اس سے جواب طلب کیا کہ وہ مذہبی تعلیمات کے خلاف ایک حماقت آمیز بات کہنے کی جرات کس طرح کر رہا ہے، اور وہ اس کو اس جرم میں پھانسی کی سزا دینا چاہتے تھے۔ لیکن لوگوں کے کہنے سننے پر وہ اس بات پر تیار ہو گئے کہ اگر یہ اپنے عقائد سے توبہ کر لے اور اپنے شیطانی آلات توڑ دے تو اس کو معاف کیا جا سکتا ہے۔ جان بہت قیمتی ہوتی ہے، لہذا اس نے اپنے قول کی تردید کی، اپنے قصور کی معافی چاہی

اور اپنے آلوں کو برباد کیا تب کہیں جا کر خلاصی ہوئی۔ حالانکہ کچھ دنوں بعد یہ کلیہ تسلیم کر لیا گیا اور آج ساری دنیا اس پر اعتقاد رکھتی ہے۔ اسی طرح جب نطشے نے مافوق الانسان کا نظریہ دنیا کے سامنے پیش کیا تو لوگوں نے اس کو مجنون کہا۔ اور کسی نے اس کی بات پر دھیان نہیں دیا مگر وہ بددل نہ ہوا اور اپنے خیالات کو طبع کر کے دنیا میں چھوڑ گیا۔ بعد میں لوگوں نے اس کی کتابیں پڑھیں اور اس کے خیالات پر غور کیا، اور آج اس کو علمائے فلسفہ کی صف اول میں جگہ حاصل ہے، اور جرمنی جیسے ملک کا نظام اسی نظریہ پر کام کر رہا ہے۔

بعض وقت ہمارے ان ہی غلط تخیل کی بنیادوں پر بہت سے نظریوں، ایجادوں اور اسکیموں کا سہرا ان کے حقیقی وضع کنندوں اور موجدوں کے علاوہ دوسروں کو مل جاتا ہے، مثلاً آج ڈارون کا نظریہ ارتقا بہت مشہور ہے۔ لیکن دراصل یہ ڈارون کی تحقیق نہیں ہے بلکہ اس سے پہلے کسی شخص نے اس اصول کو دریافت کیا، مگر لوگوں نے اس کو پاگل بتایا اور وہ غریب ڈر کے مارے خاموش ہو گیا۔ جب ڈارون کو اس کا علم ہوا تو وہ اس کے پیچھے پڑ گیا اور مزید تحقیقات سے اس میں جان ڈال کر دنیا کے سامنے پیش کر دیا۔ اور باوجود اسکے کہ آج تک انسان اور بندر کے درمیان کی گمشدہ کڑی دستیاب نہیں ہوئی، دنیا اس نظریہ پر یقین رکھتی ہے اور اس تحقیق کا سہرا ڈارون کے سر باندھتی ہے۔ لیکن دراصل یہ خیال کس کے دماغ کی پیداوار تھا اس کا نام بھی کوئی نہیں جانتا۔ آج دنیا میں نوٹوں کو جو مقبولیت حاصل ہے وہ سب پر ظاہر ہے، اس کا ایک بڑا بدیہی فائدہ یہ ہے کہ اس سے قیمتی دھاتوں کی بچت ہو جاتی ہے۔ نوٹوں کی جو تاریخ بیان کی جاتی ہے اس میں بنک آف سویڈن کا ذکر ضرور آتا ہے کہ اس نے سب سے پہلے نوٹ جاری کئے، اور اس کے بعد دوسرے ملکوں اور بنکوں کا حال ہوتا ہے، مگر اس ذیل میں محمد تغلق کا نام کہیں نہیں لیا جاتا کہ اس نے بھی چاندی کے بجائے تانبے کا سکہ چلایا تھا، ہندوستانی تاریخ میں یہ غریب بادشاہ تو بہت ہی بدنام ہے اور اس کو اس کے زمانہ میں بلکہ بہت بعد تک پاگل ہی سمجھا جاتا رہا، تو اب کچھ مورخین اسکی تجویزوں کی مدح سرائی کرتے نظر آتے ہیں۔ اور انہوں نے ثابت کیا ہے کہ اس کی کوئی تجویز محض جنونی کیفیت پر مبنی نہ تھی بلکہ وہ بہت مناسب اور ٹھیک تھی، البتہ اس میں بعض کوتاہیاں رہ گئی تھیں مگر کوتاہیاں اور خامیاں اکثر رہ جاتی ہیں۔ نپولین کو روس کے حملے میں باوجود کامیابی کے جو ناکامی ہوئی اور جو نقصان اٹھانا پڑے وہ سب جانتے ہیں۔ مگر اس بنا پر نپولین کو کوئی پاگل نہیں کہتا بلکہ اس کا شمار دنیا کے بہترین جنرلوں میں ہوتا ہے۔ حالانکہ یہ سب نقصان اس کو اپنی خامیوں کی وجہ سے اٹھانا پڑے تھے۔ پاکستان کا مسئلہ آج ہندوستانی سیاست میں بڑا اہم درجہ رکھتا ہے، اور مسلم لیگ کا سارا زور اسی پر ہے، ملک کے مختلف گوشوں میں اس پر اظہار خیال ہو رہا ہے، اس کی موافقت اور مخالفت میں کتابیں لکھی گئی ہیں مگر یہ کوئی نہیں جانتا کہ یہ تخیل کس کے دماغ کی پیداوار ہے۔[1]

دراصل ہمیں مجنونوں کے مستند واقعات نہیں مل سکتے۔ کیونکہ اگر ہم ان کو مستند سمجھتے تو پھر ان کو پاگل کیوں کہتے لہٰذا اس سلسلہ میں ہم کو روایات اور افسانوں ہی پر اکتفا کرنا ہوگا۔ کہتے ہیں کہ بوعلی سینا نے ایک مشہور دیوانے کا نام سنا، اس کو دیوانے سے ملنے کی خواہش ہوئی، چنانچہ جب وہ پاگل خانے کے اندر داخل ہوا تو دیکھا کہ وہ دیوانہ سلاخوں سے لگا کھڑا ایک طرف دیکھ رہا تھا، حکیم بھی اس سے تھوڑے فاصلے پر کھڑا ہو کر اس کو گھورنے لگا، پاگل دوسری طرف ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ بوعلی سینا بھی مڑ کر اس کے سامنے آ گیا۔ پاگل تیسری جانب چلا گیا، بوعلی نے بھی رخ بدلا اور پھر اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اب تو پاگل سے ضبط نہ ہوا اور اس نے مسکرا کر کہا "دیوانے تو آزاد ہیں اور جو دیوانے نہیں ان کو قید خانوں میں بند کر رکھا ہے"۔

ظاہر ہے کہ اگر دیوانے کی یہ حرکات دیوانگی تھیں تو بوعلی سینا بڑا پاگل ہوا۔ مگر آج تک کسی نے حکیم کو دیوانہ نہیں بتایا۔

ایک افسانہ مشہور ہے، کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ ڈاکٹر اقبال مرحوم ایک پاگل خانہ دیکھنے گئے، وہاں ان کو ایک فلسفی سے بھی ملنے کا اتفاق ہوا۔ اس کو جب یہ معلوم ہوا کہ ڈاکٹر اقبال ہیں تو وہ ان سے فلسفہ پر دیر تک گفتگو کرتا رہا۔ ڈاکٹر صاحب اس کی گفتگو اور خیالات سے بہت محظوظ ہوتے اور ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ ایسے سمجھدار شخص کو یہاں کیوں بند کیا گیا ہے۔ وہ انہیں خیالات میں رخصت ہو رہے تھے کہ دیوانے نے کہا "ڈاکٹر صاحب، ایک بات تو بتا دیجئے کہ اگر

---

[1] غالباً اگر میری یاد غلطی نہیں کرتی تو ۳۲ء میں انگلستان میں بعض ہندوستانی مسلمانوں نے اس نام کی ایک انجمن بنائی تھی اور انہوں نے پمفلٹ وغیرہ کے ذریعے اپنے خیالات کی اشاعت کی، مگر اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ یہ خیال اس جماعت کے سکریٹری یا اسکے بانیوں کا تھا، ہو سکتا ہے کہ کسی نے کسی خاص شخص یا جماعت کے سامنے اپنا یہ خیال ظاہر کیا ہو اور انہوں نے اسکو عملی جامہ پہنانے کی تجویز کی ہو، بہرحال اب مجوز سے کوئی واقف نہیں۔ مگر اسکیم اپنی جگہ پر اہم ہو گئی ہے۔

انسان کی تیسری آنکھ ہوتی تو کہاں ہوتی؟"

ڈاکٹر صاحب اس سوال سے بہت سٹپٹائے اور بہت سوچ کر جواب دیا "گدی کے اوپر"

دیوانے نے وجہ پوچھی تو یہ بتائی کہ "اس طرح آدمی بغیر گردن موڑے پیچھے کی چیزیں بھی دیکھ لیا کرتا"

اس نے کہا "جی نہیں تیسری آنکھ انگلی کے اگلے حصہ میں ہوتی، اس طرح وہ اوپر نیچے، دائیں بائیں ہر طرف دیکھ سکتا۔ مجمع میں اسے کسی کو تلاش کرنا ہے اس نے انگلی اٹھائی اور دیکھ لیا۔ ڈاکٹروں کو حلق کے اندر کوئی چیز دیکھنا ہے انہوں نے انگلی ڈالی اور دیکھ لی۔ جہاں آدمی اپنا سر نہ ڈال سکتا ہو انگلی کی مدد سے آسانی سے دیکھ سکتا ہے وغیرہ وغیرہ"

بات ختم ہوگئی۔ ڈاکٹر صاحب یہ سوچتے ہوئے واپس لوٹے کہ واقعی یہ شخص یہیں رہنے کے قابل ہے، گویا اس کے محض اس سوال نے اس کو دیوانہ بنا دیا۔ مانا کہ سوال مفروضہ تھا مگر دونوں جوابوں کو سامنے رکھکر یہ فیصلہ آپ خود کیجئے کہ کون زیادہ صحیح تھا۔ اور اس گفتگو کے بعد یہ رائے قائم کرنا کہ وہ پاگل ہے کہاں تک حق بجانب ہے؟

اس بات کا ثبوت کہ ہم بعض عام معیارِ انسانی سے زائد سمجھ بوجھ والے انسانوں کو پاگل سمجھتے ہیں اس سے بھی ملتا ہے کہ دنیا میں ان افراد کو بھی پاگل، مجنون یا ساحر سمجھا گیا جو غیر معمولی خصوصیات رکھتے تھے، چنانچہ مذہبی کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ تقریبًا تمام پیغمبروں کو اُن کے زمانہ میں مجنون کہا گیا، لوگ ان کی باتوں پر اعتقاد نہ رکھتے تھے اور ان کی غیر معمولی خصوصیات کو سحر سے تعبیر کرتے تھے، یہ صحیح ہے کہ یہاں تعصب، ضد اور پرانے عقائد کے خلاف نئے عقائد کی تعلیم بھی مخالفت کی جڑ ہوتی تھی۔ اور اگر واقعی یہ غیر معمولی خصوصیات کے حامل نہ ہوتے تو ان کا کامیاب ہونا بہت مشکل تھا۔ اسی طرح وہ لوگ جو اپنی باطنی قوتوں کو ترقی دیکر ان سے کام لینے لگتے ہیں اور ان کو بھی ساحر اور جادوگر کہا گیا، بلکہ عرصہ تک تو خود جنون کو بھی آسیب یا سحر کا شکار سمجھا جاتا رہا، مصر اور بابل کی تاریخوں میں بار بار اس امر کا اعادہ ہے کہ اس زمانہ میں ایسے مجنونوں کا بڑا زور ہے جن پر آسیب یا خلل کا اثر ہے۔ سنہ عیسوی کے ابتدائی دور میں یہ خیال عام تھا کہ جنون انسان کے برے اعمال اور گناہوں کا نتیجہ ہے۔ اور اس کا علاج تعویذ گنڈوں، منتروں، دعاؤں اور قربانیوں سے کیا جا سکتا ہے۔ قرون وسطی میں بھی یہی خیال عام تھا۔ اس لئے ایسے مریضوں کو سخت سزائیں دی جاتی تھیں یا اُن کے جسم کو تکالیف پہونچائی جاتی تھی تاکہ وہ جن یا بھوت جو اُن کے سر پر آتا ہے ان مصیبتوں اور تکالیف سے تنگ آکر چلا جائے، بعض جگہ یہ گمان بھی رائج تھا کہ ایسے لوگ خود بھی سحر یا جادو کے عامل ہوتے ہیں۔ لہٰذا ان کو سُولی دینا، یا زندہ نذرِ آتش کر دینا، یا ان کے جسم کے کسی حصہ کو کاٹ دینا، یا ان کو داغ دینا، یا اُن کو برہنہ کر کے کوڑے مارنا انسانیت کی ایک اہم خدمت ہے۔ جنون کو خلل دماغ یا بیماری تو بہت عرصہ بعد میں سمجھا گیا۔ اور اس میں مسلمانوں کا بڑا ہاتھ ہے۔ چنانچہ گرسیلنی تاریخ طب میں لکھتا ہے: "عرب لوگ اپنے ہم عصروں کے مقابلے میں مجنونوں اور مجذوبوں کے ساتھ بڑا اچھا سلوک کرتے ہیں اور ان کے لئے متعدد شفاخانے قائم کر رکھے ہیں"

بارھویں صدی میں بغداد میں ان کے لئے ایک بہت بڑا ہسپتال بنایا گیا، اور دوسرے اسلامی شہروں میں بھی ان کے ہسپتال قائم تھے حالانکہ یورپ میں پہلا پاگل خانہ ۱۵۴۷ء میں بنا اور ان کے ساتھ ہمدردی کا آغاز انقلاب فرانس کے بعد ہوا۔ اور بیسویں صدی سے صحیح طور پر ان کے علاج معالجے اور نگہداشت کی طرف توجہ کی گئی۔

موجودہ زمانے میں دورِ جہالت کے وہ آثار باقی نہیں رہے کہ پاگلوں اور مجنونوں کو زندہ دفن کر دیا جائے یا سولی پر چڑھا دیا جائے یا پانی میں ڈبو دیا جائے۔ مگر حیاتِ انسانی کے ہر شعبے میں یہ بات اب بھی نظر آتی ہے کہ بہت سے آدمیوں کو پاگل سمجھا جاتا ہے، ان میں کچھ ایسے ہوتے ہیں جن کو قید خانہ میں ڈال دیا جاتا ہے، اور کچھ ایسے ہوتے جو آزاد رہتے ہیں مگر کوئی ان کی بات پر توجہ نہیں کرتا، اور ان ہی میں کچھ ایسے ہوتے ہیں جو اپنی دُھن میں لگے رہتے ہیں، اپنے خیالات کی نشر و اشاعت کرتے رہتے ہیں اور اتفاق سے انہیں مواقع بھی مل جاتے ہیں اور وہ کامیابی حاصل کر لیتے ہیں، یہ ایک عجیب بات ہے کہ جہاں انسان کو کسی بات میں کامیابی ہوئی یا اُس نے ترقی کی لوگ اسکے ہمنوا ہونے لگتے ہیں، ایک بڑے مصنف کو لکھتے وقت ردّی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے چبانے کی عادت تھی اور وہ اس کے بغیر کچھ نہیں لکھ سکتا تھا۔ ایک اور شخص لیمپ کی روشنی میں لکھنے کا عادی تھا اور وہ دن کو بھی کمرے کے دروازے بند کر کے لیمپ جلا کر اپنا کام کیا کرتا تھا اور ایک مشہور و معروف شخص چلنے میں ہمیشہ اپنے قدم گنا کرتا تھا، ایسے ہی تمام بڑے آدمیوں میں کوئی نہ کوئی ایسی جنونی حرکت نظر آتی ہے جس کی سوائے جنون کے اور کوئی تاویل نہیں کی جا سکتی، مگر اِن لوگوں میں سے کسی کو (بقیہ بر صفحہ ۶۵)

حیلہ ساز

اس نظم میں ایک ایسے شخص کے خیالات پیش کئے گئے ہیں جس کی عمر صرف دوسروں ہی کو نہیں بلکہ اپنے آپ کو بھی دھوکا دینے میں گذری ہے۔ اُس نے سب سے پہلے کسی عورت کو دھوکا دیکر اُسے اپنی رفیقۂ حیات بنایا ہے پھر ایک بھکارن سے محبت کر کے اپنی بیوی کو حسد و رقابت کے راستے موت کے گھاٹ اُتار چکا ہے۔ پھر غالباً اس بھکارن کو بھی گندی و گھناونی چیز سمجھکر اُس نے دھتکار دیا تھا اور آخرکار جب وہ کسی تیسری عورت کی جستجو (تازہ اُفق!) میں نکل پڑا ہے تو گویا اپنے آپ کو ایک اور فریب دے رہا ہے اور ساتھ ہی اپنی مرحومہ بیوی کی یاد کو بھی۔ جو ایک خوفناک کابوس بنکر گویا اُسے ڈرا رہی ہے۔

کئی تنہا برس گذرے
کہ اس وادی میں اِن سرسبز اُونچے کوہساروں میں
اُٹھا لایا تھا میں اس کو؛
نظر آتا ہے گاڑی سے وہ سینئے تو ریم اب بھی
جہاں اس سے ہوئی تھیں آخری باتیں؛
"تجھے اے جان میری بیوفائی کا ہے غم اب بھی؟
محبت اس بھکارن سے؟
وہ بیشک خوبصورت تھی
مگر اس سے محبت، آہ ناممکن!
محبت گوشت کے اس کہنہ و فرسودہ پیکر سے؟
ہوس ناکی؟
میں ایک بوسے کا مجرم ہوں؛
فقط اک تجربہ منظور تھا مجھکو
کہ آیا مفلسی کتنا گرا دیتی ہے انساں کو!"

نہ آیا اعتماد اسکو مری اس حیلہ سازی پر
بس اپنی ناتواں دل دوز آنکھوں سے
پہاڑوں اور ان پر تند و سرافراختہ چیلوں
کو وہ تکتی رہی پیہم؛
"یہ دیکھو ایک اونچے پیڑ کا ٹہنا
پہاڑی میں بنا لی اس نے اپنی راہ یوں جیسے
چٹان اسکے لئے کوئی حقیقت ہی نہیں رکھتی!"
مرے ماضی پہ تاریکی سی چھائی ہے
مگر وہ یاد کے روزن سے آتی ہے نظر اب بھی
مجھے بھولی نہیں وہ بے بسی اسکی نگاہوں کی
اور اُس کی آخری باتیں ہیں یاد اب تک!
تو کیا میں اسلئے "تازہ افق" کی جستجو میں ہوں
کہ اس کی یاد تک روپوش ہو جائے؟

ن۔م۔راشد

نئی شلوار

پو پھٹ چکی تھی، لیکن سورج ابھی نکلا نہ تھا، بیگماں نے پہاڑ کی ڈھلوان سے جہاں گاؤں آباد تھا نیچے ندی کی تلیٹی پر نگاہ ڈالی۔ دھان کی پنیری کی ایک بڑی سی تکون میں اُسے اپنا خاوند کام کرتا ہوا دکھائی دیا، اتنے فاصلے سے وہ بالکل کھلونا سا دکھائی دیتا تھا، اُن کھلونوں کی طرح ننھا اور خوبصورت جن سے وہ بچپن میں کھیلا کرتی تھی، چیڑھ کے چناٹھوؤں کو اکٹھا کر کے ان میں لکڑی کی کھپچیاں آر پار پھنسا کر، وہ انکے سروں پر اخروٹوں کو کھوکھلا کر کے لگا دیا کرتی تھی اور بس کھلونے تیار ہو جاتے تھے، سردار اور اُن کے سپاہی اور اُن کی بیویاں۔ فرق صرف اتنا ہوتا تھا کہ بیویوں کے مونچھیں نہیں ہوتی تھیں، اور جو مرد ہوتے تھے اُن کے چہروں پر مکی کے بھٹوں کی نرم، ریشمیں کلغیاں لگا دی جاتی تھیں اور اُسے یاد آیا کہ ایک دفعہ اس کی گل سے محض اس لئے لڑائی ہوئی تھی کہ گل مرد کھلونوں میں مکی کے بھٹوں کی کالی کلغیاں لگانا چاہتا تھا اور وہ سُرخ کلغیاں پسند کرتی تھی، وہ دونوں بحث کرتے ہوئے گتھم گتھا ہو پڑے تھے، اور بیگماں نے غصے میں آ کر گل کا منہ نوچ لیا تھا۔ ہاں، اب گل کے چہرے پر وہ نشان نہیں تھا، گو ——— اب گل اکثر اس کے چہرے پر ایسے سُرخ نشان پیدا کر دیا کرتا تھا کہ چشمے پر جاتے ہوئے اُس کی سہیلیاں اُسے چھیڑا کرتی تھیں، یہ سوچ کر اسکے ہونٹ کانپنے، اور اُسکے رخساروں پر ہلکی سی لالی دوڑ گئی، اسی طرح کی لالی اب مشرقی آسمان کے چہرے پر بھی دوڑ رہی تھی۔ جیسے سورج نے اپنی بیگماں کا منہ چوم لیا تھا، بیگماں چلتے چلتے لڑکھڑا سی گئی، اور ایک پتھر پر بیٹھ گئی اور اپنے سنہری پریشان بالوں کو سنوارتے ہوئے نیچے ندی کی تلیٹی کی طرف تکنے لگی۔ دھان کی پنیری کا رنگ چمکیلا اور گہرا سبز تھا، ایسا سبز رنگ تو اس نے گاؤں کے بزاز کی دکان پر بھی نہ دیکھا تھا کہ جس کے پاس بڑے بڑے خوبصورت رنگ والے کپڑے تھے۔ پاس ہی دیودار کے دو نازک سے چھتنار سے پُرغرور انداز میں آسمان کی طرف سر اٹھائے کھڑے تھے۔ لیکن اُن کا رنگ بھی تو اتنا گہرا سبز نہ تھا۔ اس سبز رنگ میں تھوڑی سی سیاہی بھی گھلی تھی جیسے اُس چشمے کے پانی میں ہوتی ہو جو بہت گہرا ہو۔ پہاڑ اور گاؤں اور وادی اور ندی سب نیند میں کھوئے گئے تھے، جنگل خاموش تھے۔ جھرنے چپ چاپ۔ وہ خود بھی بہت آہستہ آہستہ قدم رکھتی ہوئی نیچے اتر رہی تھی۔ بڑے بڑے پتھروں سے بچتی ہوئی جو پگڈنڈی پر اِدھر اُدھر بکھرے پڑے تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ پتھر بھی سوئے پڑے ہیں اور انہیں جگانا مناسب نہ ہوگا، خود اس کے جسم میں بھی تو ایک ننھا سا کھلونا سو رہا تھا۔ اُس کے بچپن کی کنواری آرزوؤں کی تکمیل، یہ خیال آتے ہی وہ ڈگمگانے لگی، اُس کے سارے جسم میں ایک عجیب سی رو دوڑنے لگی۔ یہ رَو، جس میں ندی کے پانی کی سی ملائمیت، بجلی کی سی تیزی اور اعصابی حرکت کی سی فطری گردش موجود تھی۔ اس کے دھڑ اور پیٹ اور چھاتیوں میں گھومتی ہوئی دو نقطوں پر ختم ہو جاتی تھی، مثبت اور منفی'.... مثبت اور منفی... بیگماں کو اپنا سانس پھولتا ہوا معلوم ہوا۔ یکایک اُس کے کانوں میں آواز آئی، جیسے کوئی درخت کے تنے پر کلہاڑا چلا رہا ہو، کھٹ، کھٹ، کھٹ، اُس نے غلط سمجھا تھا کہ وہ یا اس کا خاوند ہی آج سب سے پہلے جاگے ہیں، گاؤں کا بوڑھا چوکیدار روشن دین ان سے بھی پہلے اُٹھا تھا، اور اب یک چیڑھ کے تنے میں سے سنہری اور پتلی پتلی دینیاں نکال رہا تھا، کھٹ، کھٹ، کھٹ۔ یکایک اُسے خیال آیا کہ گھر میں تو دینیاں ختم ہو چکی ہیں، اور آج رات کو وہ دینیوں کے بغیر آگ کیسے جلائے گی، روشنی کیسے ہوگی؟ آج رات تو اُسے دینیوں کی سُنہری روشنی کی بہت ضرورت ہے' آج رات وہ دینیوں کے شعلوں کی روشنی میں اپنی نئی شلوار پہن کر دیکھے گی، اس کا رنگ، اُس کی پھبن، وہ شلوار پہن کر اور بازو پھیلا کر گل کے سامنے ایک ناچتی ہوئی تیتری کی طرح گھوم جائے گی، اور گل اُسے گلے سے لگا لیگا۔ بیگماں کے لب کانپنے لگے اور اُس کے چہرے پر لالی دوڑ گئی، اور وہ روشن دین کے بالکل قریب جا کر کھڑی ہو گئی، گاؤں کے بوڑھے چوکیدار نے ایک لمحہ کے لئے بیگماں کی طرف مڑ کر دیکھا اور پھر اپنے کام میں مشغول ہو گیا، وہ اپنی چھوٹی کلہاڑی کی مدد سے چیڑھ کے تنے میں سے دینیاں نکال رہا تھا۔ تنے کے جسم میں ایک گہرا گھاؤ نظر آ رہا تھا اور قریب ہی دینیوں کا ایک ڈھیر جمع ہو گیا تھا۔

"کہاں جا رہی ہو بیٹی؟" روشن دین نے اس کی طرف مڑے بغیر پوچھا۔

"نیچے، پنیری کے کھیتوں میں"۔

"گل کو میں نے صبح ادھر سے گذرتے ہوئے دیکھا تھا، شاید

تیسرا پہر ہوگا، میں جب بھی دینیاں نکال رہا تھا، یہ تنا کمبخت بڑا سخت ہے"
بوڑھے روشن دین نے کلہاڑی سے زور زور سے ٹھوکے لگاتے ہوئے کہا۔

بیگماں خاموش کھڑی رہی۔

روشن دین بولا" اب کے دھان کی پنیری اچھی ہے، تمہارے کھیتوں کی پنیری بھی بہت عمدہ اور مضبوط نظر آتی ہے...... گل کے ماہ کے بعد واپس آیا ہے؟"

"تین ماہ کے بعد"

"بارہ مولے میں ــــ کیا کرتا تھا؟ کسی لکڑی کے ٹھیکیدار کے ہاں ملازم تھا نا؟"

"ہاں، پر یہاں دھان کا کام سنبھالنے والا کوئی نہ تھا، دیور بیمار ہے، اسی لئے میں نے بارہ مولے چٹھی لکھ بھیجی تھی"

"تم نے اپنے دیور کو میری جڑی کھلائی تھی"

"اور بھی کئی جڑی بوٹیاں کھلا چکی ہوں، اب جو دوا بارہ مولے سے آتی ہے وہ کھلا رہی ہوں"

"اللہ فضل کریگا..... لیکن تم اس وقت کھیتوں میں کیا کرنے چلی ہو؟...."

"اوہ ــــ پار والے گاؤں کے درزی کو شلوار سینے کے لئے دی تھی، آج اُس نے دینے کا وعدہ کر رکھا ہے" بیگماں نے کمزور، مدھم، شرمیلی آواز میں کہا۔

"اخاہ!" بوڑھے روشن دین نے مڑ کر بیگماں کی طرف مسکراتے ہوئے کہا" گل بہت اچھا لڑکا ہے.... بہت اچھا لڑکا ہے... نئی شلوار.... مجھے یاد ہے (کھانس کر) جب میری بیوی نے ایک دفعہ مجھ سے ریشم کے کپڑے کی شلوار مانگی تھی، اور میں نے کہا تھا کہ میں تجھے سری نگر سے لادونگا... سری نگر میں میرے پاس پیسے ختم ہوگئے تھے، اور میں ریشم کی شلوار نہ لا سکا.... بڑی نیک بخت تھی وہ..... اُسے عمر بھر ریشم کی شلوار پہننا نصیب نہ ہوئی.... مرتے دم تک اس کے دل میں یہ حسرت رہی......"

بوڑھے جو کیدار کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے، کلہاڑی ہات میں کانپ رہی تھی۔

بیگماں نے آہستہ سے پوچھا" چاچا، میں ان میں سے تھوڑی سی دینیاں لے لوں، ہمارے ہاں آج ختم ہوگئی ہیں، اور...."

"ہاں، ہاں، بیٹی، جتنی ضرورت ہوں لے جاؤ.... میں بھی آج ندی کے پار کی گھاٹی پر جاؤں گا، آج گنڈ پر میلہ ہے، اور سڑک پر بہت سے سیاح لاریوں اور تانگوں پر جاتے ہوئے ملیں گے اُمید ہے کہ میری سب دینیاں بک جائیں گی"

بیگماں نے دینیاں اٹھاتے ہوئے کہا" سُنا ہے کہ گنڈ پر رات کو یہ سیاح لوگ دینیوں کی مشعلیں جلاتے ہیں!"

"بیٹی، اگر یہ باہر کے لوگ کشمیر میں نہ آئیں تو ہم لوگ تو بھوکوں مرجائیں.... اللہ بڑا کارساز ہے"

بوڑھا پھر کھانسنے لگا، اور کلہاڑی سے کھٹ کھٹ کرنے لگا۔

بیگماں وہاں سے چلدی، دینیوں کا گٹھا اُس نے اپنے دوپٹے میں رکھ لیا تھا، تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی وہ ندی کی تلیٹی میں پہونچ گئی۔ یکایک سورج نکل آیا، اور ساری وادی میں جیسے اک "ہلچل" سی پیدا ہوگئی، کیڑے اور پتنگے جو شبنمی لبادوں میں لپٹے ہوئے بے سُدھ پڑے تھے، جاگ کر گھاس پر پُھدکنے لگے، کرنوں کو چھو کر دھان کی پنیری کا رنگ اور بھی گہرا اور چمکیلا ہوگیا، اور اُس کے خوشے سمندری لہروں کی طرح کھیت کی سطح پر ناچنے لگے، ندی کا پانی جو پہلے چپ چاپ معلوم ہوتا ہے، یکایک موسیقی سے لبریز ہوگیا، موسیقی اور روشنی، نور اور نغمہ، حرکت اور زندگی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سورج کی کرنوں میں کوئی ایسی اضطراری قوت چھپی ہوئی ہے، جو ہر اُس چیز کو بیدار کر دیتی ہے جس سے سورج کی کرنیں ہم آغوش ہوجائیں، گل نہایت تیزی سے کام کر رہا تھا، اس کے سُرخ چہرے پر پسینے کی لکیریں تھیں اور ہاتوں میں دھان کی پنیری۔ وہ گھٹنوں تک کھیت کے پانی اور کیچڑ میں دھنسا ہوا تھا۔ اور نہایت چابکدستی سے پنیری اکھاڑ اکھاڑ کر اسے بڑے کھیت میں مناسب فاصلے پر جمارہا تھا۔ بیگماں کھیت کے قریب ایک پتھر پر بیٹھ گئی، دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھکر مسکرائے، صبح کے پہلے اجالے کا سونا اُن کی آنکھوں میں تھا، اُنکے دلوں میں، آتے دنوں کے گوشے گوشے میں!

"بہت جلد آن پہونچی ہو، ابھی تو میں آدھے کھیت میں بھی پنیری نہیں جما سکا" گل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

یہ شاید نہیں اظہار تشکر تھا۔ بیگماں نے مُسکرا کر اور نگاہ پھیر کر پن چکی کی طرف دیکھا جو ندی کے دوسری طرف تھی، پھر اس کی مسکراہٹ نے ندی کے پرے اسی اونچی گھاٹی کو چھولیا جس کی چوٹی پر سے موٹر کی سڑک گزرتی تھی۔ گھاٹی کی سطح مرتفع سے گزر کر اس کی مسکراہٹ اُس چوٹی سے بھی پرے اونچے اونچے پہاڑوں کے سلسلے پر جا پہونچی، وسیع اور بسیط جنگل اور شمال کی طرف ایک چھوٹا سا گاؤں، وہ دوسرا گاؤں

تبکے درزی کو گل نے بیگماں کے لئے ایک نئی شلوار سینے کو دی تھی۔ یہ مسکراہٹ گھوم کر پھر گل کے چہرے پر جا پہونچی، یہ مسکراہٹ، یہ نگاہ، یہ روشنی کی کرن!

بیگماں بولی "اور واپس بھی تو آنا ہے، اب چلو گے تو بڑی مشکل سے وقت پر لوٹ سکو گے!"

اس کی بات سنتے ہی گل نے پنیری ہات سے چھوڑ دی اور کھیت سے باہر نکل آیا اور ندی کے کنارے بیٹھ کر اپنی ننگی ٹانگوں سے کیچڑ اتارنے لگا۔

سوسی کی شلوار جس کی سرخ زمین پر سفید چمپئی پھول جھلملا رہے تھے پہن کر بیگماں بہت خوش ہوئی، بیس بائیس گز کپڑے کی شلوار ہوگی، گل کی پیداوار کی کمائی، بیگماں نے شلوار کو درزی کے ہات سے لیتے ہوئے اپنے خاوند کی طرف پیار بھری نگاہوں سے دیکھا، کچھ پیار، کچھ غرور، کچھ شوخی، ہنس کر بولی "اور قمیص؟ — چھینٹ کی لو گے؟"

گل بولا "چھینٹ کی قمیص بھی بنوا دونگا، دو تین مہینے اور ٹھہر جا، تب تک شاید ننھے کے لئے بھی کچھ بنوانا پڑے"

بیگماں شرم سے لال ہوگئی، نگاہیں نیچی کرکے بولی "شرم تو نہیں آتی" گل مسکرانے لگا اور اس نے درزی کی طرف دیکھکر آنکھ میچ لی۔

راستے میں سنبلو کی ایک بڑی سی جھاڑی نظر آئی جس پر نیلا دھاری کی گنجان بیل لپٹی ہوئی تھی۔ اس جھاڑی کی اوٹ میں بیٹھ کر بیگماں نے شلوار تبدیل کی، راہ چلتے چلتے وہ نیفے کی چنٹ کو سنوارتی جاتی تھی، ور بیس بائیس گز کی شلوار کے متعلق گھیرے اور اس کے خوشنما پھولوں کو دیکھکر خوش ہو رہی تھی، نئی شلوار نے اس کی چال میں ایک نئی نزاکت اور شعریت پیدا کر دی اور اس کے قدموں میں رقص کا سا انداز آ گیا، پھر اس نے ایک عجیب ادا سے، جو گل کو بہت پیاری لگی، اپنا سر گل کے کاندھے پر رکھدیا۔ وہ کچھ عرصہ اسی طرح چلتے رہے، باہوں میں باہیں ڈالے، درزی کا گھر اوٹ میں چھپ گیا تھا۔ فرش زمین پر چیڑھ کے پیلے پیلے نکیلے جھومر بچھے ہوئے تھے اور ان کے قدموں کے مس سے ریشمیں کپڑوں کی طرح سرسراتے تھے، گویا زمین نے بھی اک نئی شلوار پہن لی تھی، چیڑھ کے پیلے پیلے جھومروں کی شلوار جس پر جا بجا بنفشے کے پھولوں کی گلکاری تھی، درختوں کی شاخوں پر جنگلی پرند نغمہ زن تھے، اور بادل دیودار اور چیڑھ کی چوٹیوں پر سے خراماں گزر رہے تھے، ایک پگڈنڈی وہ تھی جو جنگل کے درختوں کے اوپر تنی ہوئی تھی اور جس پر بادلوں میں رہنے والے نازک، خوبصورت اور براق شہزادے اور شہزادیاں ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈالے، رخسار سے رخسار لگائے خوشی سے ناچتے ہوئے جا رہے تھے، گل کا دل بھی نامعلوم مسرت سے لبریز ہو گیا۔ اس نے آہستہ سے کہا "میں تمہیں چھینٹ کی قمیص اگلے مہینے بنوا دونگا، یہ قمیص اب پرانی ہو گئی ہے اور اس نئی شلوار کے ساتھ اچھی نہیں لگتی"

بیگماں کے نیم وا لب پھول کی پنکھڑیوں کی طرح کانپ اٹھے، اور گل نے جلدی سے انہیں اپنے سانس کی حلاوت اور ہونٹوں کی شہد آگیں شبنم سے بوجھل کر دیا..... پھر وہ ایک چشمے کے کنارے بیٹھ گئے، اور گل نے شوخ لہجے میں کہا "کتنے ماہ ہو گئے ہیں؟ — چار یا پانچ —؟"

بیگماں کمزور آواز میں بولی "ہٹو بھی، تمہیں تو ہر وقت..."

گل اسے گدگداتے ہوئے پوچھنے لگا "سچ سچ بتاؤ، چار یا پانچ؟ — چار یا پانچ؟"

بیگماں ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئی "ہائے — اوئی — میں مری...."

گل نے اسے گدگدانا چھوڑ دیا۔ بولا "میں بتاؤں، ایک ننھی سی لڑکی ہوگی"

بیگماں بولی "چھورا ہوگا، ننھی کیا تمہارے کھیت میں ہل چلائیگی، چھورا ہوگا، میری تو مدت سے یہی آس ہے"

گل سنجیدہ ہو کر بولا "اماں بھی یہی چاہتی ہیں"

کتنی ہی دیر تک، وہ دونوں اس جھرنے کے کنارے خاموش بیٹھے رہے، خوش آیند خیالوں میں ڈوبے ہوئے، چشمے کے نرم و نازک گیت، جنگل کا مسحور سناٹا، بادلوں کا رقص پیہم، ان سب چیزوں میں انہیں اپنے مستقبل کی سنہری تصویر نظر آئی۔ اس تصویر میں اک ننھا سا بچہ بھی تھا، جو اپنی ماں کی گود میں کلکاریاں مار رہا تھا۔ ہنستے ہوئے لڑکھڑاتے ہوئے پہلا قدم اٹھا رہا تھا، کاؤ کی سونٹی کاندھے پر رکھے بھیڑ بکریوں کے گلے کو جنگل میں چرانے کے لئے لے جا رہا تھا، درانتی سے گھاس کاٹ رہا تھا، اپنے باپ کے لئے کھیتوں میں کھانا لے جا رہا تھا، اپنے باپ کے شانہ بشانہ کھیتوں میں ہل چلا رہا تھا، کہیں جیسے کوئی شہنائی سی بج اٹھی اور بیگماں اور گل چونک اٹھے اور مسکرا کر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ شاید اس تصویر کو ان دونوں نے اکٹھے ہی دیکھا تھا۔

اسی طرح آہستہ آہستہ باتیں کرتے ہوئے، ایک دوسرے کو چھیڑتے ہوئے، بچپن اور جوانی اور آنے والی زندگی کے سہمیں لمحات میں گھومتے ہوئے، اُن سپنوں کو یاد کرتے ہوئے جو بیت چکے تھے، اور اُن سپنوں کو دیکھتے ہوئے جو ابھی آنے والے تھے، وہ واپس موٹر کی سڑک پر آن پہونچے سڑک پر اتنی رونق نہ تھی، پھر بھی کبھی کبھی اکا دکا لاری، تانگہ یا پیدل چلنے والے سیاحوں کی ٹولی نظر آجاتی تھی۔ گل نے بیگماں کو بتایا کہ کس طرح ان سیاحوں کی آمد سے کشمیر کے لوگوں کو ہر سال لاکھوں روپے کا فائدہ ہوتا ہے۔ سری نگر ایک بہت بڑا شہر ہے، جس کے بیچوں بیچ دریائے جہلم بہتا ہے، جس پر سات پل بنے ہیں، اور جب دھان کی فصل کٹ جائے گی تو وہ ضرور اپنی بیگماں کو سری نگر لے جائے گا، تاکہ وہ اپنی آنکھوں سے اُن شاندار نظاروں کو دیکھ لے کہ جن کے لئے دُنیا بھر کے سیاح وہاں کھنچے چلے آتے ہیں۔۔۔۔ ایک چنار کے نیچے چار پانچ سیاح بیٹھے تاش کھیل رہے تھے، بیگماں اور گل اُن کے قریب سے گزرے اور بیگماں اُن سیاحوں کے خوبصورت کپڑوں کی طرف حیرت سے دیکھتی رہی، اور وہ سیاح بیگماں کے مثالی حسن کو دیکھکر محو حیرت ہو گئے۔

چنار کے آگے ایک چھوٹا سا نالہ تھا۔ اُسے پار کر کے وہ گھاٹی کی ڈھلوان کے قریب پہونچ گئے۔ دُور نیچے ندی بہتی تھی، جس کے ایک طرف کھلونے جیسی پن چکی تھی، جس میں پانی کا جھاگ برف کے گالوں کی طرح اُڑتا ہوا معلوم ہوتا تھا، ندی کے دوسری طرف دھان کے کھیت تھے، جہاں گل صبح کام کرتا رہا تھا، اس سے پرے پہاڑ کے اوپر اُن کا اپنا گاؤں تھا۔ سفید کوٹھے، کھریا مٹی سے لپے ہوئے، سیپ کے کھلونوں کی طرح نظر آتے تھے، ان میں عورتیں نازک ننھی ننھی تیلیوں کی طرح اندر یا باہر جاتی ہوئی دکھائی دیتی تھیں، سورج کی کرنوں نے گاؤں کو بھی چھو لیا تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ زندگی ان تیلیوں کا تماشہ ہے، جن کی نازک ڈوریاں سورج کی کرنوں کے تاروں سے بنی ہیں۔

جس بلند و بالا گھاٹی پر بیگماں اور گل کھڑے تھے، اُس سے دو راستے نیچے کی طرف جاتے تھے، ایک تو سیدھا ڈھلوان راستہ ندی کی کھڈ میں جاتا تھا، اور دوسرا ترچھا، پُر پیچ راستہ جو گھاٹی پر بل کھاتا ہوا ندی کی تہ میں پہونچتا تھا۔ گل نے کہا "میں اس چھوٹے راستے سے نیچے جاتا ہوں، اس حالت میں تمہارے لئے یہ راستہ خطرناک بھی ہے اور پھر یہاں پھسلن بھی بہت ہے، تم دوسرے راستے سے آؤ، میں پن چکی پر تمہارا انتظار کرونگا۔"

"انتظار؟" بیگماں نے چمک کر کہا "میں تم سے پہلے وہاں پہونچوں گی۔"

"ایک دفعہ پہلے بھی تم مجھ سے ایسی شرط لگا کر ہار چکی ہو" گل نے ہنستے ہوئے کہا "ایکی پھر بد کر دیکھ لو"

"رہی" بیگماں نے تیقن کے لہجے میں کہا "دیکھو، اگر میں پن چکی پر پہلے پہونچ جاؤں تو تمہیں کل ہی نئی قمیص کے لئے کپڑا خریدنا ہوگا، اور اگر۔۔۔۔۔۔"

"اور اگر۔۔۔" گل نے شرط کا دوسرا رُخ بتاتے ہوئے کہا "اگر تم ہار جاؤ، تو کل دن بھر میرے ساتھ پنیری کے کھیتوں میں، گھٹنے گھٹنے کیچڑ اور پانی میں ۔۔۔ کیوں منظور ہے؟"

"منظور ہے، لیکن دیکھو دوڑنا نہیں ہوگا، بس چلنا ہوگا۔"

گل نے اثبات میں سر ہلا کر ڈھلوان کے راستے پر چھلانگ لگا دی، اور تیز قدموں سے نیچے کی طرف جانے لگا۔ بیگماں ایک لمحہ کے لئے تو رُکی پھر وہ بھی تیز تیز قدموں سے دوسرے راستے پر ہولی، اب کی بار وہ گل کو ضرور شکست دے دیگی۔ گل خوشی سے سیٹی بجاتا ہوا نیچے اتر رہا تھا، اُسے پورا یقین تھا کہ وہ بیگماں سے بہت پہلے پن چکی پر پہونچ جائیگا، بیوقوف لڑکی، اُس نے سوچا، بیگماں میں ابھی تک بچپن کی شوخی اور ضد موجود ہے، یوں ہی بات بات پر جھگڑ پڑتی ہے، بھلا اس حالت میں اُسے شرط بدنی چاہیئے تھی، یکایک اُس کے دل میں خیال آیا کہ وہ بیگماں کو آواز دے اور اُسے رک جانے کے لئے کہے، لیکن دوسرا راستہ اب آنکھوں سے اوجھل ہو گیا تھا اور اُس کی آواز وہاں تک نہ پہونچ سکتی تھی، اُسکے قدم آہستہ ہو گئے، اُس نے سوچا اگر وہ شرط ہار جائے، اور بیگماں کو پن چکی پر پہلے پہونچ جانے دے، تو وہ شریر لڑکی کتنی خوش ہوگی۔ وہ مسکرانے لگا۔ اور اُس نے فیصلہ کر لیا، کہ وہ شرط ہار جائے گا، وہ نہایت دھیمے دھیمے قدموں سے چلنے لگا، اور آخر ایک بڑی چٹان کے قریب جا کر رک گیا، پانچ منٹ، دس منٹ، پندرہ منٹ، اُس نے اپنے دل میں اندازہ لگایا کہ بیگماں اگر دھیمے قدموں سے بھی چلی ہو تو اس وقت پن چکی پر پہونچ گئی ہوگی، یہ سوچ کر وہ اُٹھا اور تیز تیز قدموں سے نیچے اترتا ہوا پن چکی کی طرف جانے لگا۔ پن چکی سامنے نظر آرہی تھی۔ لیکن بیگماں ابھی تک وہاں نہ پہونچی تھی، اُس نے تو شرط ہارنے کی پوری کوشش کی تھی، مگر اب ۔۔۔ یہ بیگماں کا اپنا قصور تھا کہ وہ ابھی تک نہ پہونچ سکی تھی۔۔۔ یکایک اُس کے دل میں ایک خیال آیا اور وہ مسکرانے لگا۔ شریر لڑکی، مجھے دھوکا دینا چاہتی ہے، پن چکی کی دیوار کی اوٹ میں چھپی بیٹھی ہے۔ وہ بھاگتا ہوا پن چکی کے دوسری جانب گیا، لیکن بیگماں وہاں نہ تھی،

وہ بیچاری ابھی غالباً راستے ہی میں تھی۔ گل نے ایک بار گھاٹی کے اوپر نظر دوڑائی، اور پھر اس نے دو انگلیوں کو منہ میں رکھکر زور سے سیٹی بجائی وہ سیٹی جو وہ بچپن میں بیگماں کو بلانے کیلئے بجایا کرتا تھا۔

سیٹی کی آواز پہاڑوں میں گونج کر خاموش ہوگئی۔

چند لمحے اسی خاموشی میں گزرے۔ پھر گل نے زور سے آواز دی "بیگماں! ——"

پہاڑوں کے سینوں میں اک گونج سی پیدا ہوئی اور پھر وہی سناٹا چھا گیا۔

گل کو بہت غصہ آیا، چیخ کر بولا "یہ کیا شرارت ہے؟ جواب ہی نہیں دیتی ہو، کہاں چھپ کر بیٹھ گئی ہو، بس تمہاری یہی باتیں تو مجھے دق کرتی ہیں۔ یہ کیسا مذاق ہے؟"

گل دوسرے راستے پر اوپر چڑھنے لگا۔ غصہ سے دانت پیس رہا تھا، ہر ایک جھاڑی کو غور سے دیکھتا ہوا اوپر چڑھ رہا تھا۔ اگر اسوقت بیگماں مجھے کسی جھاڑی یا چٹان کی اوٹ میں دبکی ہوئی مل جائے تو ——

ایک بڑا سا پتھر اوپر سے لڑھکتا ہوا اس کی طرف آیا، وہ فوراً ایک طرف کو سرک گیا، بس چند لمحوں کا فرق رہا، ورنہ اس کا سر (یا ٹانگیں زخمی ہو جاتیں)۔

"بیگماں" اس نے چلاّ کر کہا "یہ کیا حماقت ہے؟"

آٹھ دس پتھر ایک دم نیچے لڑھکتے ہوئے آئے، اس کا پاؤں پھسل گیا، اور وہ گھسٹتا ہوا نیچے ندی میں جا گرا، اس کے ہات پاؤں زخمی ہوگئے اور ماتھے سے خون نکل آیا۔

اس نے چلاّ کر کہا "بیگماں —— بیگماں ——"

دوسرے راستے کے درمیانی حصے میں ایک موڑ کے قریب جہاں انجیر کا درخت اُگا تھا، اور گھنی جھاڑیاں تھیں، اسے دو آدمی دکھائی دئے، ان کی ٹانگیں ننگی تھیں، اور وہ اپنے ہاتھوں میں بڑے بڑے پتھر اٹھائے ہوئے تھے۔

گل کو جیسے کسی نے گلے سے پکڑ لیا ہو، اس کے خون کی روانی رکنے لگی، اس کی آنکھوں کے آگے شرارے ناچنے لگے، وہ بھاگ کر راستے پر اوپر چڑھنے لگا۔ لیکن اب ان جھاڑیوں کے پیچھے سے تیسرا آدمی نمودار ہوا، اور پتھروں کی جیسے بارش شروع ہوگئی۔ گل نے پہچانا، یہ وہی سیاح تھے جو تھوڑی دیر پہلے گھاٹی کے اوپر چنار کے نیچے تاش کھیل رہے تھے۔

ایک بہت بڑا پتھر تیزی سے نیچے لڑھکتا ہوا آیا اور اپنے ساتھ گل کو نیچے ڈھکیلتا ہوا لے گیا۔

گل ندی کے کنارے گر گیا، اس کا گلا رندھ گیا تھا اور اب وہ سرگوشیوں میں چلاّ رہا تھا، گھاٹی کی طرف ہاتھ پھیلائے ہوئے التجا کر رہا تھا۔

"خدا کے لئے —— میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے —— خدا کے لئے —— میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے —— تمہیں خدا کا واسطہ —— اپنی بیوی بچوں کا واسطہ —— اللہ رسول کا واسطہ ....."

اور اوپر جھاڑیوں کی اوٹ میں سے چوتھا آدمی نمودار ہوا، اسکی ٹانگیں ننگی تھیں اور اس کے ہات میں سوسی کی نئی شلوار تھی۔

گل نے اٹھنے کی کوشش کی، اس کے ہاتوں نے اس پاس کے پتھروں کو اپنی ہتھیلیوں میں پکڑنے کی کوشش کی، لیکن پتھر اسکے لہو سے سرخ ہو چکے تھے اور اس کی ہتھیلیوں میں سے پھسلتے گئے، اور وہ ندی کے کنارے گھٹنوں کے بل جھک گیا۔ یکایک چمپئی سوسی کی نئی شلوار ایک ہوائی چھتری کی طرح بل کھاتی ہوئی اسکے سامنے آن پڑی، اور پتلی پتلی سنہری دینیاں پتھروں پر بکھر گئیں۔

کرشن چندر

دیسی زبان کی ترقی

(بسلسلہ صفحہ ۳۴)

قاف ذال ضاد طوئے ظوئے کی علامات کے اضافے کی دشواریاں بالکل دیوناگری میں بھی ہیں۔ دوسرے انگریزوں کی عملداری میں انگریزی کی حرف شناسی ہر ہندوستانی کیلئے ضروری ہے، اس لئے رومن رسم اختیار کرلیا جائے تو ایک ہی وقت اور محنت میں دو مقصد حاصل ہوجائینگے اور کسی نئے رسم خط کے سیکھنے سے بچے اور عوام نجات پا جائینگے۔ اگرچہ اصولاً میں ہر اردو داں کیلئے دیوناگری کا سیکھنا نہایت فائدہ مند اور ضروری سمجھتا ہوں۔

متعدد زبانوں اور رسوم خط کے سیکھنے سے ہمیں گھبرانا نہ چاہیئے۔ یورپ میں درجنوں بانیں جاننے والے ماہرین السنہ سے قطع نظر کرکے، سدھارن طور پر کوئی تعلیمیافتہ شخص مشکل سے مل سکتا ہے جو کم از کم تین زبانوں سے واقف نہ ہو۔ ایک کلاسیکی یونانی یا لاطینی، ایک بر یورپ کی فرانسیسی یا جرمن ایک انگریزی جنوبی و مشرقی یورپ والوں کو ان سے بھی زیادہ زبانیں سیکھنا پڑتی ہیں۔ مسلمانوں کا تعلیمیافتہ طبقہ بھی عہد اقبال میں متعدد زبانوں میں ماہر ہوتا تھا۔ عام تہذیب دماغی کے علاوہ خود اپنی مادری زبان کی توسیع و ترقی کا یہ بہت بڑا گر ہے۔

کھیل سے پہلے

سامنے کہرے کی مانند ہے تو آویزاں
یہ نم آلود عبا پل میں ڈھلک جائے گی
مٹتے شعلے کی طرح کانپتی، لہراتی ہوئی؛
مری تخئیں جو اس وقت ہے بل کھاتی ہوئی
ایک گلزار کی مانند مہک جائے گی،
اور میں دیکھوں گا حقیقت کا لہو آویزاں

ہر فسانے میں حقیقت کا لہو لرزاں ہے
ہر فسانہ ہے نم آلود عبا میں پنہاں
ہر فسانہ کسی بھالے کی انی ہے شاید
چشم شوق آتشِ نمناک بنی ہے شاید
چاہتی ہے کہ ہو افسانہ فضا میں رقصاں
وہی افسانہ جو اس وقت کہیں پنہاں ہے

ابھی دن اپنی جہاں سوز حرارت لیکر
ذہنِ درماندہ پہ مانندِ فسوں چھایا تھا
رات کی طرفہ حکایت کا خیال آیا تھا
جس نے اک پل کے لئے ذہن کو بہلایا تھا
کیوں خیال آیا تھا، کیوں مجھکو خیال آیا تھا
میں جو اس دہر میں آیا ہوں روایت لیکر

رات کی طرفہ حکایت کا فسوں ہے کچھ اور
رات کی طرفہ حکایت یہ فسانہ تو نہیں
جو حقیقت کا لہو بن کے نظر آئے گا
تشنگی کو مری کچھ اور بڑھا جائے گا
میں جو کہتا ہوں وہ کمزور بہانہ تو نہیں
میں یہ کہتا ہوں محبت کا جنوں ہے کچھ اور

مرات کی طرفہ حکایت ہے محبت کا جنوں

لیکن افسوس مرے پہلو میں خوابیدہ ہے
ن روایت جسے ناکام فسانہ کہئیے
جسے تقدیر کا کمزور بہانہ کہئیے
آئینہ کہتا ہے یہ شکل ہی غم دیدہ ہے
اور میں سوچتا ہوں عمر گذر جائیگی یوں:

اس طرح شام کو، ہر روز درِ مے خانہ
گھستے گھستے مرے قدموں سے بچک جائیگا
چشم شوق آتشِ نمناک میں گھل جائیگی
گردِ آلام کسی درجہ تو دھل جائے گی
برقِ سیمیں پہ افسانہ نظر آئے گا
ایک آئینہ کہ جذبات کا اک پیمانہ!

لیکن افسوس کہ افسانے کی بے رنگ شراب
درِ مے خانہ کے جادو کو مٹا ڈالے گی،
اور میں سوچوں گا افسانہ نہیں یہ میرا
حسب معمول گیا آج بھی خالی پھیرا
کیا ہمیشہ مجھے تقدیر یونہی ٹالے گی؟
کیا ہمیشہ ہی رہوں گا میں فسردہ، بیتاب؟

کاش یہ تلخ حقیقت بھی فسانہ بن جائے
سامنے کہرے کی مانند ہے تو آویزاں،
جب یہ نمدار عبا پل میں ڈھلک جائے تمام
ایک گلزار کی مانند نظر آئے تمام
وہ روایت جو مرے دل میں رہی ہے پنہاں
اور یہ بات ہی جینے کا بہانہ بن جائے

میراجی

شاعر اور ایلیشن

ایک شاعر ایک ادارہ ہے، دو شاعر ایک مشاعرہ اور تین شاعر ایک ہنگامہ۔ اور اگر ترنم کو پیش نظر رکھا جائے — ترنم آپ جانتے ہیں کلام کی جان ہوتا ہے — تو لکھ سکتے ہیں کہ ایک شاعر ایک موسیقار ہے، دو شاعر قوالی کی چوکی اور تین شاعر آرکسٹرا، ممکن ہے آپ کہیں کہ یہ تعریفیں یا یہ درجہ بندیاں مبالغہ آمیز ہیں یا وجہ دلآزاری ہیں۔ اگر آپ واقعی ایسا ہی سمجھتے ہیں تو پھر میں نیک نیتی کے پورے احساس کے ساتھ اعلان کرتا ہوں کہ یہ مقولے شاید میرے نہیں ہیں، اور کچھ ایسا یاد پڑتا ہے کسی بڑے مفکر کے ہیں جن کو میں نے بے سوچے سمجھے نقل کر دیا ہے۔ اور آپ کو معلوم ہے نقل کفر کفر نہ باشد!

مجھے کچھ ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ مضمون کی بسم اللہ غلط ہوئی درحقیقت میں مضمون کو ذرا محتاط طریقے پر شروع کر کے محتاط طریقہ ہی پر ختم کرنا چاہتا تھا، یہ اور بات ہوتی کہ بیچ میں ایسی ویسی باتیں قلم سے نکل جاتیں۔ مگر یہاں تو مطلع ہی میں سخن گسترانہ بات آ پڑی ہے۔ اور مقطع تو ابھی بہت دور ہے۔ مگر خیر۔ میرا ضمیر مطمئن ہے۔ ضمیر کا اطمینان بڑی چیز ہے۔ مگر کچھ ایسی بڑی چیز بھی نہیں۔ اس لئے کہ تہذیب و شائستگی کے اس دور میں ہمارا آپ کا ضمیر بڑی آسانی سے مطمئن اور پاک ہو جاتا ہے۔ فطرت میں لچک نہیں نہ سہی ضمیر میں لچک ضرور ہو۔ بس پھر بیڑا پار ہے۔ دیکھئے نا، کتنا اعلیٰ تخیل ہے! افسوس ہے میں شاعر نہیں ہوں۔ ورنہ اس خیال کو روکھی پھیکی نثر کے بجائے ایسے موثر انداز میں شعر میں ظاہر کرتا کہ معلمین اخلاق دنگ رہ جاتے اور میں قہقہہ لگا کر آگے بڑھ جاتا۔

ہاں تو میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ میری طالب علمی کے زمانے میں ایک مباحثہ اسی موضوع پر ہوا کرتا تھا کہ بنی نوع انسان کی خدمت کون زیادہ کرتا ہے، سائنسداں یا شاعر؟ میں ہمیشہ شاعر کا معمہ اٹھایا کرتا تھا۔ واللہ! یہ میری ناسمجھی نہ تھی۔ اس لئے کہ اس زمانہ میں شاعروں کی بہتات کہاں تھی! لیکن دور حاضر کی بات اور ہے۔ اور اب اگر مجھے اس مباحثہ میں حصہ لینے کو کہا جائے تو میں پچھلی سی سرگرمی دکھانا ہرگز پسند نہ کروں گا بلکہ قطعاً غیر جانبدار رہوں گا۔ اور آپ جانتے ہیں کہ اس زمانہ میں جملہ آفات سے بچنے کا ایک طریقہ ناطرفدار بن جانا ہے، گو بعض وقت ایسا بھی ہوتا ہے کہ آپ کی ناطرفداری کام نہیں آتی۔ خود آپ کام آ جاتے ہیں۔

بعض دیوانوں کی دیوانگی کی مانند اس بحث میں میری غیر جانبداری بھی ایک قاعدہ ہی ہے تفصیل سے وضاحت کی گنجائش نہیں کیونکہ کاغذ بہت گراں ہو گیا ہے۔ یوں سمجھئے کہ سائنس داں اب نوع انسانی کی خدمت نوع انسانی کو حتی الامکان قلیل التعداد بنا کر کر رہا ہے۔ وہ کس طرح؟ اجی صاحب! جنگ کے ذریعے سے! ایں سعادت بزور بازو نیست۔ ظاہر ہے، تعداد انسانوں کی جتنی گھٹے گی، رنج و مصیبت اس دنیا سے اتنے ہی کم ہونگے۔ اور مستقل فائدہ چونکہ مقصود نمائی ہے، اس لئے جنگ کی عارضی تباہی و بربادی کو انگیز کر لینا چاہیئے۔ کہئے یہ انسانی خدمت نہیں تو پھر کیا ہے؟ سچ پوچھئے تو یہ ایک ترقی پسندانہ خیال ہے، اب آپ کی مرضی، اس کو تسلیم کریں یا نہ کریں۔

اور شاعر؟ شاعر بنی نوع انسان کی خدمت یوں کر رہا ہے کہ ہر دوسرا آدمی شاعر بننے پر کمر بستہ ہے۔ یقیناً آپ اس سے انکار کی جرأت نہیں کر سکتے کہ شاعروں کی آبادی جتنی بڑھے گی انسانیت کا اتنا ہی بھلا ہوگا۔ چنانچہ آپ کو چاہیئے کہ اس حقیقت کو مان لیں کہ پہلے ایک مربع میل میں ایک شاعر تھا تو اب اتنے ہی رقبہ میں ایک ہزار ایک شاعر ہیں استاد شاگرد کا جھگڑا ختم کر دیا جا رہا ہے اور مساوات کی اساس پر یہ کار عظیم انجام پا رہا ہے۔ سوچئے نا، ماضی میں انسانیت کے دن کیوں نہ پھر سکے تھے؟ وجہ یہ تھی کہ تب شاعر کم تھے اور کام زیادہ۔ لیکن اب صورت حال بدل گئی ہے۔ کام رضاکارانہ بنیاد پر ہو رہا ہے، جبری بھرتی کی مطلق ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ اور پھر تقسیم کار کا اصول کارفرما ہے۔ ترقی حوصلہ افزا ہے۔ اب انسانیت کے نہ صرف دن بلکہ راتیں بھی پھر جائیں گی۔ نجات قریب ہے — گو لوگ غلطی سے اس کو یوں کہہ دیتے ہیں کہ قیامت قریب ہے!

غالب نے کہا تھا:۔ ؎

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

مگر اس زمانے میں معیار اور اقدار بدل گئے ہیں۔ غالب اس زمانے میں ہوتے تو انہیں یہ کہنا پڑتا۔ ع۔

کیوں شاعری ذریعۂ عزت نہیں۔ مجھے
یا پھر فوج میں بھرتی ہو کر میدانِ جنگ کو جانا پڑتا۔

مطلب کہنے کا یہ کہ شاعری اب ایک معزز پیشہ ہے۔ ملازمت کے لئے میٹرک پاس ہونا اور شرافت خاندانی کا مجسٹریٹ کا سرٹیفکیٹ حاصل کرنا ضروری ہے، مگر شاعری ان قیود سے بھی آزاد ہے۔ الحمد للہ!

یہ انداز نظر شہر عامی نگر میں اُس وقت عروج پر نظر آیا جب سرکاری طور پر وہاں کی اسمبلی میں اور پیشوں کے علاوہ ایک نشست شاعر کے لئے مخصوص کر دی گئی۔

جس طرح اور شہروں میں مزدوروں کی نوآبادیاں یا ترک مسکرات کی نوآبادیاں قائم ہیں۔ اسی طرح عامی نگر میں شاعروں کی نوآبادی قائم ہے۔ اور یہ نوآبادی کافی بڑی ہے بلکہ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو اُس نے آدھے سے زیادہ شہر کو گھیر رکھا ہے۔ جوں ہی کسی شخص میں شاعری کے آثار پائے جانے لگتے ہیں، اس کو فوراً سرکاری حکم سے وہاں منتقل کر دیا جاتا۔ اس طرح اس نوآبادی کی آبادی بڑھتی ہی جاتی ہے۔ اس نوآبادی کا ایک فائدہ یہ ہوا ہے کہ حکومت کو شاعروں کی مردم شماری کا علیحدہ انتظام نہیں کرنا پڑا۔

جب یہ سرکاری اعلان ہوا کہ اس حلقے سے ایک شاعر کا الیکشن ہوگا تو سارے شہر میں جوش وخروش پھیل گیا اور اس نوآبادی میں تو جشن منایا گیا۔ شاعروں کا ایک جلسہ عام منعقد ہوا اور ایک قرار داد میں جو متفقہ طور پر منظور ہوئی حکومت کا تہ دل سے شکریہ ادا کیا گیا کہ اس نے شاعری کے پیشے کو اور شاعروں کے حقوق اور مفادات کو سرکاری طور پہ تسلیم کر لیا اور ان کے تحفظ کا انتظام کیا اور مجلس قانون ساز میں شاعر کو ایک نشست عطا کر کے دوسری حکومتوں کے لئے ایک قابل تقلید مثال قائم فرمائی۔

ایک دوسری قرار داد میں طے پایا کہ ہر سال عظیم الشان پیمانہ پر "شاعر ڈے" یعنی "یوم شاعر" منایا جائے۔ ——— اس خوشی میں ایک نہتم بالشان مشاعرہ بھی ترتیب دیا گیا جو اکثر کانفرنسوں کی طرح کئی دن اور رات جاری رہا۔

لیکن جب اُمیدوار کے انتخاب کا سوال پیش آیا تو شاعروں کی پارٹیاں بن گئیں۔ ان کی تنظیم اور ان کا اتحاد کئی تنظیموں اور کئی اتحادوں سے بدل گیا۔ خدا کے فضل اور سرکاری عنایت سے کئی کہنہ مشق شعرا اس نوآبادی میں موجود تھے اور ہر شاعر اپنے آپ کو اس نشست کے لئے کھڑا ہونے کا حقدار سمجھنے لگا۔ لیکن بعض سنجیدہ و فہمیدہ اصحاب کی کوششوں سے ایسی صورت حال پیدا نہ ہونے دی گئی۔ البتہ دو شاعروں نے کسی قیمت پر بھی میدان سے ہٹنا گوارا نہ کیا۔ ایک تو تھے حضرت اُستاد عامی نگری اور دوسرے تھے حضرت مزدور عامی نگری۔ چنانچہ مقابلہ کی تیاریاں زور شور سے شروع ہو گئیں۔

حضرت اُستاد مسلم الثبوت غزل گو شعرا میں ہیں۔ ان کے اوصاف اور کمالات جو الیکشن کی مہم کے دَوران میں پریس اور پلیٹ فارم سے منظر عام پر لائے گئے، ان میں سے خاص خاص درج ذیل کئے جاتے ہیں:۔ ان کے شاگردوں کی تعداد کثیر ہے۔ اور ان کی رحلت کے بعد اُن کے اتنے جانشین ہوں گے کہ بایدو شاید۔ وہ مُلک کے بہترین غزل گو ہیں۔ اخبارات ورسائل میں ان کے کمالِ فن پر کئی طویل مضامین نکلے۔ ریڈیو پر بھی تقریریں کرانے کی کوشش کی گئی لیکن اجازت نہ ملی۔ مختصر یہ کہ چونکہ ان کی ٹکر کا کوئی غزل گو سارے ملک میں نہیں ہے اور نہ آئندہ پیدا ہونے کی توقع ہے، اس لئے پرزور اپیلیں کی گئیں کہ شاعروں کے حقیقی نمائندے حضرت اُستاد ہی ہو سکتے ہیں، اس لئے ووٹ ان ہی کو دیا جائے!

حضرت اُستاد کے حریف حضرت مزدور آزاد شاعر ہیں۔ زندگی کے تلخ حقائق کو ردیف، قافیہ اور بحر سے بے نیاز ہو کر پیش کرتے ہیں۔ بیڈھنگی زندگی کی حقیقت پرستانہ ترجمانی کا یہ طریقہ موزوں بھی ہے۔ سرمایہ داری کا استیصال، مزدور کی ترقی، انقلاب زندہ باد وغیرہ ان کے خاص خاص موضوع ہیں جن پر وہ طرح طرح سے طبع آزمائی کرنے سے کبھی نہیں تھکتے۔ مگر یہ عجیب بات ہے کہ ان کے سامعین اکثر تھک جاتے ہیں یا سو جاتے ہیں۔ ذرا اور آسودہ حال ہو جائیں تو عام طور سے توقع ہے کہ وہ اور زبردست انقلابی نظمیں لکھ سکیں گے۔ آپ نے انتخابی مہم کے وقت ایک نظم لکھی تھی جو بہت مقبول ہوئی تھی۔ اس کو ہم یہاں درج کرتے ہیں:۔

زندگی کا چاندنی چوک

زندگی کا چاندنی چوک آ گیا۔
گلی سے نکل کر میں فٹ پاتھ پر
ٹھہرا ہوا ہوں، ٹھہرا ہوا ہوں۔
کیوں؟
مجھے خود بھی نہیں معلوم
وہ دیکھو وہ دیکھو!
دولت کی بیٹیاں ہیں رواں قہقہوں کے ساتھ
کیوں نہ میں گھوروں انہیں
حسرت بھری نگاہ سے؟

اف چاروں طرف ہے اک شورِ محشر
سرمایہ داری! سب کھیل تیرے
یہ موٹریں یہ بنگلے ہیں
آہ!!
چیخ کیسی میرے کانوں نے سنی؟
کیا ہوا ہے، کیا ہوا؟
موٹر کی ٹکر!
لاناؤ میرا ہتوڑا
یہ نظام زندگی، اس کو نہ کیوں ڈھادوں ابھی؟
موٹر کی زد میں آکر اس شاہراہ پر
مزدور کا خون بہہ رہا ہے
خون بھی کیسا، گرم اور تازہ
اور مجھے غش آگیا!

غرض یہ کہ الیکشن کا ہنگامہ بہار پر تھا۔ فریقین نے اپنے اپنے امیدوار کی حمایت میں جلسے کئے۔ جلوس نکلے۔ نعرے لگائے "حضرتِ استاد زندہ باد" اور "حضرت مزدور زندہ باد"۔ پوسٹر دیواروں پر چپکائے گئے: "شاعری گل وبلبل، شمع و پروانہ کی داستان کا نام نہیں"۔ "شعر شاعری مزدوروں کا کام نہیں"۔ "بے معنی تک بندی شاعری کی توہین ہے"۔ "بے تکی شاعری دیوارِ کج کی مانند ہے"۔ "حضرت استاد کو ووٹ دو"۔ "حضرت مزدور کو ووٹ دو"۔

یہ گولہ باری دونوں طرف سے بڑی شدت سے جاری رہی اور جمہوریت کے اس دور میں آزادیٔ تحریر و تقریر کے حق سے پورا استفادہ کیا گیا۔ اس کے دوران میں عوام کی معلومات میں بڑا اضافہ ہوا۔ مثلاً یہ بتایا گیا کہ حضرت استاد نے شاعری کو تجارت بنالیا ہے۔ لوگوں کو غزلیں قیمتاً لکھ کر دیتے ہیں اور نرخ فی غزل پانچ روپے سے لیکر دس روپے تک ہے۔ جن سرمایہ داروں اور دولتمندوں کے دسترخوان پر وہ اکثر نظر آتے ہیں، ان کو غزلیں کہہ کر دیتے ہیں۔ اور اس طرح سرپرستی اور زر پرستی سے بات بنتی آرہی ہے۔ الیکشن کے لئے ان ہی نوابوں سے روپیہ اینٹھا گیا ہے۔ اس کے علاوہ حضرت استاد کی شاعری پر سخت تنقیدیں اخبارات میں نکلنے لگیں۔ ان میں انکے کلام سے غلطیاں چن چن کر دکھائی گئیں کہ سند رہیں اور بوقت ضرورت کام آئیں۔

دوسری طرف حضرت مزدور پر خوب پھبتیاں کسی گئیں۔ آزاد شاعری کو ایک خبط، ایک فیشن بتایا گیا۔ تعلیمیافتہ نوجوانوں کے خلل دماغ سے تعبیر کیا گیا۔ بتایا گیا کہ ایسے شاعر مزدور کے غم میں گھل گھل کر موٹے ہوتے جاتے ہیں مگر مزدوروں کو خبر نہیں ہوتی۔ حسد اور بغض و عناد کے جذبہ کی بنا پر جو کچھ کہا جائے وہ اور سب تو ہوسکتا ہے، شاعری نہیں ہوسکتی۔ شاعری تو لطیف جذبات و احساسات کے موزوں اظہار کا نام ہے، وغیرہ وغیرہ۔

قصہ مختصر ناگفتنی اور ناگفتہ بہ کا یہ طوفان جاری رہا۔ رائے دہندوں نے خوب دعوتیں اڑائیں، مشاعرے ہوئے، گانے کی محفلوں میں حضرت استاد کی غزلیں طوائفوں نے سنائیں جو اچھی تھیں ـــ میرا مطلب ہے، غزلیں اچھی تھیں۔

آخر وہ دن آپہونچا جب رائے دہندوں کو اپنے حق کا استعمال کرنا تھا اور جب عشق و عاشقی کے راگ الاپنے والی شاعری اور دعوت عمل اور درسِ انقلاب دینے والی شاعری کی قسمت کا فیصلہ ہونے کو تھا۔ خدمتِ خلق اور حقیقی نمائندگی کے دعوے تو دونوں نے کئے تھے، مگر کون معیار پر پورا اترتا ہے، اس سوال کا جواب آج دیا جارہا تھا۔ ووٹر شعر پڑھتے ہوتے پولنگ اسٹیشن کو موٹروں میں روانہ ہوئے۔ موٹروں کے انجن بھی شعر گنگناتے معلوم ہوئے۔ رائے دہی کے دوران میں غیر شاعرانہ حرکتیں بھی لوگوں سے سرزد ہوئیں۔ ایک آدھ دفعہ ہنگامہ کی صورت بھی پیدا ہوگئی تھی۔ مگر پولیس کا معقول انتظام تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو شاعری جامہ سے باہر ہوتی نظر آئے۔

دونوں طرف سے یہ شکایتیں بھی سننے میں آئی ہیں کہ رائے دہی میں کچھ گول مال ہوا ہے۔ فرضی ووٹ دلوائے گئے ہیں۔ ممکن ہے یہ شکایتیں صحیح ہوں، ممکن ہے نہ ہوں، اور اگر صحیح ہوں بھی تو جنگ اور محبت کی مانند الیکشن میں بھی سب کچھ روا ہے۔

بہرحال وہ دن بھی گذر گیا۔ اب سب کو نتیجے کا انتظار ہے۔ مقابلہ بہت سخت ہوا ہے، اس لئے پیش قیاسی بیحد دشوار ہے کہ بازی کون لے جائے گا ـــ استاد یا مزدور ـــ ووٹروں کی تعداد چونکہ زیادہ ہے، اس لئے آراء کی جانچ اور گنتی میں کئی دن لگ جائیں گے ـــــ!

اب کاپی پریس کو جارہی ہے۔ نتیجہ کا اعلان ابھی تک نہیں ہوا ہے، انتظار کرو اور دیکھو!

***

ممی

"ناکارہ" حیدرآبادی

بھول بھلیاں

"لفٹ رائٹ۔ لفٹ رائٹ کوئیک مارچ!" اڑاڑا دھم!!
فوج کی فوج کرسیوں اور میزوں کی خندق اور کھائیوں میں دب گئی۔ اور غل پڑا۔

"کیا اندھیر ہے۔ ساری کرسیوں کا چورا کئے دیتے ہیں۔ بیٹی رفیعہ ذرا ماریو تو ان مارے پیٹوں کو" چچی ننھی کو دودھ پلا رہی تھیں۔

میرا ہنسی کے مارے برا حال ہوگیا۔ بمشکل مجروحین کو کھینچ کھانچ کر نکالا۔ فوج کا کپتان تو بالکل چوہے کی طرح ایک آرام کرسی اور دو اسٹولوں کے بیچ میں پچا پڑا تھا۔

"آں.... آں صلو بھیا نے کہا تھا فوج فوج کھیلو" رشید اپنی کاغذ کی ٹوپی سیدھی کرنے لگے۔ اور منو اپنے چھلے ہوئے گھٹنے کو ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے گھور گھور کر بسور رہے تھے۔ اچھن چچا جان کے کوٹ میں سے باہر نکلنے کے لئے پھڑپھڑا رہے تھے اور ان کا مفلر بری طرح پھانسی لگا رہا تھا۔ مگر کپتان صاحب ویسے ہی ڈٹے کھڑے تھے۔

"یہ ہو کیا رہا تھا؟" میں نے کپتان صاحب کی سیاہی سے بنی ہوئی مونچھوں کو دیکھکر کہا۔

"صلاح الدین اعظم رچرڈ شیر دل پر چڑھائی کر رہا تھا" منو کو ہنسی آگئی اور وہ لیٹ گیا۔ "پھر کالی کرسی کھسک گئی اور بس" کپتان صاحب نہایت احتیاط سے مونچھیں تھپکتے ہوئے بولے۔

"اچھا۔ اور یہ اچھن؟"

"یہی تو رچرڈ ہیں، اور کیا، شیر دل، یہ مفلر دیکھو اِن کا، یہ شیر کے بال ہیں"

"اور جناب؟" میں نے چار فٹ کے کپتان کو نظروں سے ناپا۔

"ہم صلاح الدین اعظم" اور وہ اکڑتے ہوئے چلے۔

"اور بھئی یہ میرا کوٹ تو اتارو، سیاہی لگ گئی تو خدا کی قسم ٹھوکوں گی"

"اوہو آپ کا کوٹ۔ بات یہ ہے کہ اِسکے بالوں دار کالر کو.... تو لیجئے نا کوٹ اپنا"

"رفو باجی ذرا یہ سوال بتا دیجئے" صلو اپنی سلیٹ میری ناک کے پاس اڑا کر بولے۔

"نا بھئی میں اس وقت سی رہی ہوں ذرا"

"پھر ہم آپ کو سینے بھی نہیں دیتے" صلو نے میرے پیروں میں گدگدیاں کرنی شروع کیں۔

میں نے پیر سمیٹ لئے تو وہ میری کمر میں سر اڑا کر ریٹ گیا اور بکنا شروع کیا "پھٹ جائے، اللہ کرے جھیر جھیر ہوجائے یہ کرتا۔ سوال تو بتاتی نہیں ہیں لیکے کفن سئے جا رہی ہیں اپنا"

"چل یہاں سے باجی ورنہ سوئی اتار دونگی" اور وہ وہاں سے ہٹ کر میری البم الٹ پلٹ کرنے لگا۔

"یہ کون ہیں چڑیل جیسی.... کالی مائی.... اور یہ.... یہ......"

"صلو بھیا رکھدے میری چیزیں" میں نے سوچا جن ہے یہ تو۔

"تو پھر سوال بتاؤ" اور وہ پھر میرے پاس گھس کر بیٹھ گیا۔

"ارے ذرا ہٹ کے گرمی کے مارے ویسے ہی اُبلے جا رہے ہیں ــــ"

"تو میں کیا کروں" اور وہ مجھ سے اور لپٹا۔

"میری باجی کیسی۔ ہاں گڑیا ذرا بتا دو پھر سوال"

مجبوراً میں نے سوال کرنا شروع کیا۔

"اب یہ سوال سمجھا جا رہا ہے یا میرے بندوں کا معائنہ ہو رہا ہے" اور وہ جلدی سے سلیٹ پر جھک گیا میں بتا رہی تھی اور وہ بیوقوفوں کی طرح میرا منہ دیکھ رہا تھا۔

"اونہہ" میں چڑ گئی "پڑھ رہے ہو یا منہ تکنے آئے ہو، صلو دق نہ کرو ورنہ چچی جان سے کہدونگی"

"آپ کی تصویر بنا رہا ہوں یہ دیکھئے، آپ کے ہونٹ بولتے میں ایسے ہلتے ہیں جیسے.... جیسے ــــ پتہ نہیں کیا۔ بس ہلتے رہتے ہیں" شرارت سے آنکھیں مٹکائیں۔

"بھاگ یہاں سے اُلو" میں نے سلیٹ دور پھینک دی۔

وہ بڑبڑاتا ہوا الگ بیٹھ گیا۔ اور میں اٹھ کر برآمدے میں چلی گئی۔

تھوڑی دیر بعد دیکھتی ہوں کہ چلے آرہے ہیں اپنا بستر بوریا

سنبھالے۔ یا اللہ خیر!

"کیوں تم پھر آ گئے یہاں"

"اور کیا۔ وہاں دل جو گھبراتا تھا" اور وہ پھر میرے پاس بیٹھنے لگا۔

"صلّو اگر تم مانوگے نہیں تو۔۔۔۔"

"تو۔۔۔ تو۔۔۔ ای" اُس نے منہ چڑایا "ہم تمہارے پاس بیٹھتے ہیں تو اچھا پڑھا جاتا ہے"

"اچھا تو چپکے بیٹھو"

صلاح الدین میرے چچا کا اکلوتا سپوت تھا۔ پھوٹی آنکھ کا یہی تو ایک تارا تھا۔ اتنی لڑکیاں پیدا ہوتیں کہ چچا چچی بولا گئے اور پھر آپ تشریف لائے۔ جناب کی انگلی دُکھے تو بکرے صدقے کئے جانے لگیں، منتیں مانی جائیں، گھر میں کوئی زور سے نہ بولے، جوتے اُتار کر چلو۔ برتن نہ کھڑکے لاڈلے کی آنکھ کھل جائے گی۔ گھر میں اسی لئے کوئی کتّا نہ پلتا، مُرغیاں نہ رکھی جاتیں کہ ننھے میاں کی کبھی نیند نہ خراب کر دیں۔ اور ہم بچارے نہ لاڈ جانیں نہ لاڈ کریں۔ پھر بھی ماں بہنوں کا لاڈ اُسے کچھ کڑوا لگنے لگتا تھا۔ اور وہ سارے وقت مجھی سے اُلجھتا۔ لوگوں کے "نان وائلنس" سے وہ تنگ آ گیا تھا۔ یہی بات تھی کہ وہ جان جان کے مجھے چھیڑتا کیونکہ میں اُسے بُری طرح ڈانٹ دیتی اور کبھی کبھی چپت بھی رسید کر دیتی۔

لاڈلے پوت دُبلے اور سوکھے تو ہوتے ہی ہیں اور اُوپر سے پتلا بانس جیسا قد۔ امّاں تو نظر بھر کے نہ دیکھتیں، اُنہیں ڈر تھا کہ کہیں اُونٹ صاحب کو نظر نہ لگ جائے، اور یہاں یہ کہ جہاں لمبی لمبی ٹانگیں پھلکتے آئے اور چھیڑنے لگے۔ یہ عادت سی ہو گئی تھی کہ کالج سے آئے اور امّاں کو بلائیں دیکر اور دادا صاحب کو نمبر دکھا کر سیدھے میری جان پر نزول۔ کیا مجال جو گھڑی بھر خود نچلا بیٹھے یا بیٹھنے دے۔ بہنوں کو چھیڑنا۔ کسی کے گدگدی کی کسی کے گلے میں جھول گئے۔ کسی کے کندھے میں کاٹ لیا۔ میرے پاس آئے اور میں نے [illegible] دیا۔

گھنٹوں ماں بہنیں بیٹھ کر ارمان بھرے ذکر کیا کرتیں۔ ہر دلچسپ اور پُر مسرت بات صلّو میاں کی شادی کے لئے اٹھا کر رکھدی جاتی۔

"صلّو کی شادی میں بناؤں گی سب کی گوالیر کی چندیری کی ساڑھیاں۔ اور بمبئی میں تو دہلی جا کر کردوں گی سہیل کی شادی کی طرح اپنے دونوں طرف کے مہمان آ گئے اور بس۔ اس گھر میں تو۔۔۔۔"

"اور امّاں اُسے بلائیں گے لیلا ڈیسائی کو ناچ کے لئے" ایک بہن بولتیں۔

"بھئی ہم تو سہرا وغیرہ سب باندھیں گے۔ زربفت کی اچکن ماموں ابا جیسی اور۔۔۔۔"

بہنوں کے لئے بھائی تھا گویا جگمگاتا ہیرا! میری اندھی آنکھوں میں جیسے اور چھ سات بھائی تھے یہ بھی ایک لڑنے جھگڑنے تُو تُو میں میں کرنے اور بات بے بات رعب جمانے والی ایک ادنیٰ ہستی تھی۔ میں اُن کے ارمان بھرے دلوں کے بھڑکتے ہوئے جذبات سے کُملا جاتی۔ کاش میرے بھی اتنے بھائیوں کے بجائے ایک ہی ہوتا۔ ایک دُبلا پتلا، آئے دن کا مریض۔ چنچنا لڑاکو۔ کتنا رومنٹک معلوم ہوتا!

"باجی ذرا کرتے میں یہ بٹن ٹانک دو" وہ اپنی پتلی گردن آگے بڑھا کر بولا "جٹ پٹ ٹانکو مجھے بیچ میں جانا ہے" میں ناول کے ایسے حصہ پر پہونچ گئی تھی جہاں ہیرو ہیروئن کے بازوؤں تک پہونچ چکا تھا۔ بھلا اس قدر غیر رومانی کام میں میرا کیا جی لگتا۔

"رابعہ سے کہو وہ ٹانک دیگی"

"نہیں ہم تو تم سے ہی ٹکوائیں گے"

"میرے پاس سوئی بھی نہیں" وہ دوڑ کر چچی جان کی بقچی اُٹھا لایا۔

"لو یہ سوئی"

"تاگہ پرو"

"لاؤ میں پرو دوں" چچی سروتہ چھوڑ کر بولیں۔

"میں تو انہیں سے ٹکواؤں گا۔ لو سوئی"

مجھے ضد آ گئی "راشدہ سے ٹکواؤ" ہیرو آگے بڑھ رہا تھا۔ مجھے آخری دو لائنیں پھر سے پڑھنا پڑیں۔

"نہیں ہم تو تم سے ہی ٹکوائیں گے۔ رکھو کتاب اُدھر ورنہ پھاڑ دوں گا"

"پہاڑی۔ بھاگ جاؤ نہیں ٹانکتے" میں نے کتاب دوسری طرح موڑ لی۔ اُسے بھی ضد آ گئی۔

"آج یا تو تم سے بٹن ٹکواؤں گا یا اپنا تمہارا خون بہا دونگا"

"چل ہٹ بڑا وہ ہے نا۔ بہاؤ نہ بہاؤ اپنا خون بہاؤ"

ہیرے کی کنی کے خون بہانے کے ارادے ہی کو دیکھکر بہنیں لرز گئیں۔ اُن کا بس چلتا تو وہ بٹن کی جگہ اپنی آنکھیں نکال کر ٹانک دیتیں۔

"صلّو لاؤ میں ٹانک دوں ذرا سی دیر میں۔" راشدہ بولی۔

"کہدیا صلاح الدین اعظم ایک بات جو کہدیتے ہیں وہ ٹلتی نہیں۔ دیکھو جی باجی ٹانکتی ہو یا......"

"یا! کیا؟" میں نے تیوریاں چڑھائیں۔

"یہی کہ میچ دیکھنے نہیں جاؤں گا اور ایک لفظ کتاب کا نہیں پڑھنے دوں گا۔ اور موقع ملنے پر کتاب پار کر دوں گا ـــ اور... اور..." مجھے ہنسی آ گئی۔

"او ہو۔ لو بس تو پھر پیاری سی بچّو کی طرح ٹانک دو۔"

میں نے بھی سوچا وبال کاٹوں میں نے تو بٹن ٹانکنا شروع کیا اور وہ مجھے دق کرنے لگا۔

"دیکھو صلّو میرا ہاتھ ہل جائے گا تو سوئی کلیجہ میں اتر جائیگی۔"

"اتر جانے دو۔" اور اُس نے پھر گدگدی کی۔ میں نے سوئی مذاق میں چبھونا چاہی۔ وہ جلدی سے ہٹا۔ دھکّے سے نہ جانے کیسے سوئی کی نوک چبھ گئی، خون بھی نکلا اور غضب یہ کہ نوک غائب۔ سنتے ہیں کہ سوئی کی نوک خون میں کھو جاتی ہے۔ دل میں جا پہونچتی ہے۔ دم نکل جاتا ہے۔

"ارے نوک"، میرے مُنہ سے پریشانی میں نکلا۔

"میرے سینے میں اتر گئی۔ اور اب خون میں چلی جائے گی۔ اور پھر.... پھر دل میں آ جائے گی.... لو اماں جان ہم تو چلے۔" چچی جان کو سکتہ ہو گیا مگر وہ سنبھلیں اور چیخیں۔ رابعہ چیخی اور راشدہ چیخی۔ میرا یہ حال کہ مجرم کی طرح سوئی پکڑے کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ صلاح الدین سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اور لاچاری سے گریبان ٹٹولنے لگا۔

پھر جو ہلڑ مچا ہے تو خدا ہی جانتا ہے کہ مجھ پر کیا کچھ گذری۔ ڈاکٹر حکیم اور نمازیں۔ اور میرا دل چاہے ڈوب مروں۔ آخر میں نے مذاق کیا ہی کیوں اور وہ بھی اس کانچ کے گلاس سے۔

کیا بتاؤں کیسی پشیمانی ہو رہی تھی۔ ایکس رے ہوا۔ سارے جسم میں سوئی ڈھونڈ ڈالی۔ مگر خاک پتہ نہ چلا۔ اور بھی مصیبت، چچی جان کے آنسو اور رابعہ، راشدہ کا ٹہل ٹہل کر دعائیں مانگنا اور اوپر سے صلّو کا اترا اترا کر مرنے کی دھمکیاں دینا۔ میرے آنسو نکل آئے۔ صلّو نے میری طرف دیکھا اور مُسکرایا۔

"اب تو چین آ گیا آپ کو۔"

میں نے سر جھکا لیا۔

"اچھا یہاں آئیے ذرا میرے سر میں تیل تھپک دیجئے۔"

بھلا اب مجھ میں ہمّت کہاں تھی جو انکار کروں۔ چپ چاپ سر میں تیل ڈالنا شروع کیا۔ صلّو فتحمندانہ انداز سے مجھے آنکھیں چڑھا چڑھا کر دیکھتا اور مسکراتا رہا۔

"دیکھا میرا حکم نہ ماننے کا نتیجہ؟" وہ میری انگلی میں چٹکی نوچ کر بولا۔ "سوئی تو میرے گریبان ہی میں رہ گئی تھی۔"

غصّہ کے مارے میرا خون کھول گیا۔

"اچھا جانے دو۔ اماں جان کا ہیکو مائیں گی میں نے سوئی پھینک بھی دی،" میرے ہاتھ پھر ڈھیلے پڑ گئے۔ اور وہ اور ہنسا۔

"اچھا باجی تجھے بھی اس کی سزا نہ ملی تو.... خیر،" میرا جی چاہا اُس کے بال نوچ کر دور ڈھکیل دوں۔ "خدا سمجھے...."

"مجھے تم سے کام کروانے میں مزہ آتا ہے۔ جب میں نوکر ہو جاؤنگا تو تمہیں اپنے پاس رکھوں گا۔"

"ہوش میں میری جوتی رہتی ہے تیرے پاس۔"

"دیکھ لینا میں تمہیں لے لوں گا ـــ گو دلیلوں گا ـــ ہنستی کیوں ہو؟"

مجھے ہنسی آ گئی۔

"اور پھر تمہیں ہوائی جہاز میں بٹھاؤں گا۔ ہا آں....!" وہ آنکھیں گھما کر بولا۔

میرے امتحان آ گئے اور میں کمرہ بند کر کے پڑھا کرتی۔ مگر صلّو کہیں مانتا تھا۔ جہاں میں پڑھنے چلی اور وہ بھی موجود۔ میں نے سنجیدگی سے منع کر دیا کہ "اگر تم نے دق کیا تو میں بورڈنگ چلی جاؤں گی۔" پڑھنے کے خیال سے تو چچا میاں کے گھر رہنا پڑا تھا۔

وہ خاموش پڑھا کرتا مگر گھنٹہ آدھ گھنٹے بعد بےچینی ہونے لگتی۔

"اب بھئی انٹرول ہوگا،" وہ کتاب بند کر کے میرے پاس آن گھستا۔ اور دس منٹ تک وہ اُدھم مچتا کہ خدا کی پناہ۔ شرارت میں اُسے کاٹنے کا مرض ہو گیا تھا۔

"بات یہ ہے کہ جی چاہتا ہے تمہیں کھا جاؤں۔" وہ ہنس کر دانت پیستا۔

"خود اپنی بوٹیاں چبا ڈالو۔" مگر وہ بُری طرح لپٹ جاتا، اور باوجود ڈھکیلنے کے تنگ کئے جاتا۔ کبھی مجھے غصّہ آ جاتا۔ لیکن عموماً اگر وہ کمرے میں نہ ہوتا تو کسی چیز کی کمی سی محسوس ہوتی۔ گھر کی ساری چہل پہل اُسی ایک انسان کے دم سے تھی۔ بچّوں کو چھیڑنا، بہنوں کو رُلانا، کبھی

پھر فوراً لپٹ کر پیار کرنا اور منالینا۔

***

امتحان ختم ہوگئے۔ اور گھر جانے کے خیال سے خوشی کے ساتھ ساتھ دُکھ بھی ہو رہا تھا۔

"کیوں جا رہی ہو چھٹیوں میں" وہ ایک دن بولا۔

"واہ میری اماں بچاری اکیلی ہیں"

"اکیلی ہیں! جیسے انہیں بڑی تمہاری پروا ہے"

"ہوں اور نہیں تو تمہیں پروا ہوگی"

وہ میرے پاس بیٹھ گیا" سچ کہتا ہوں بجّو.... سچ کہتا ہوں تم نہ جاؤ" اُس نے پیار سے میرے کندھے پر سر رکھدیا اور اپنی سوکھی باہیں میرے گلے میں حمائل کر دیں۔

"ہٹو تو.... خیر ہوگی تمہیں میری پروا۔ مگر اب تو جاؤنگی"

"مگر میں کہتا ہوں کہ مت جاؤ" وہ ذرا ہٹ کر بولا۔

"بکواس مت کرو۔ جاؤ ذرا کسی کو بھیجو میرا سامان باندھ[illegible]"

"اور میں کہتا ہوں تم نہیں جاسکتیں"

"ہنھ! بڑے لاٹ صاحب ہو نا جو روک لوگے"

"یاد ہے وہ سوئی" وہ شرارت سے مُسکرایا۔

"مکّار ہو تم.... کہیں کے"

***

دوسرے دن صلّو کو بخار چڑھا۔ سارے گھر پر جیسے آفت ٹوٹ پڑی۔ ذرا سا ملیریا اور یہ اُودھم! مگر دم مارنے کی اجازت نہ تھی۔

"امّاں جان بجّو کو روک لیجئے۔ آپ سے اکیلے تیمارداری نہ ہوسکے گی" جیسے سور کو بڑی تیمارداری کی ضرورت تھی!۔

"ارے میاں بھلا وہ کیوں رُکیں گی!" چچی امّاں طعن سی بولیں "میں حمیدہ کو تار دیکر بلالوں گی"

"نہیں امّاں وہ اپنے بچّے لیکر آن دھمکیں گی تو اور غل مچیگا۔ بجّو تو خود رُک رہی تھیں۔ اسکول میں پارٹی ہے۔ دوسرے جب ہم اچھے ہوجائیں گے تو سنیما دیکھنے چلیں گے"

"رُک جاؤ نا کیا ہرج ہے" رابعہ نے رائے دی۔ اسی چڑیل کو کیا پتہ کہ یہ مکّاری کر رہا ہے۔ بخار تو اتفاق سے آگیا ورنہ وہ کچھ اور فیل مچاتا۔ رُکنا ہی پڑا۔

"صلاح الدین اعظم کا حکم!" وہ شرارت سے مُسکرایا "میرے مونچھیں نکل آئیں تب تمہارے اوپر اصلی رعب پڑا کرے گا۔ لو اسی بات پر ذرا سی برف کچل کر تو کھلادو" چچی جان نے اس قدر ڈری ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا کہ میں جلدی سے تولیہ میں برف توڑنے لگی۔ کسی کا لاڈلا ہو تو ہو۔ ہم کیوں بھگتیں۔ مگر وہ تو بھگتنا پڑا۔

"بجّو... بجّو..." کسی نے آہستہ سے مجھے پکارا۔

"کیا ہے؟" میں ڈر گئی۔

"ذرا سا پانی" صلّو نے اپنے پلنگ سے ہاتھ ہلا کر کہا۔ میں جلدی سے اُٹھی۔ اندھیرے میں تھرماس ٹٹول کر پانی نکالا۔

"امّاں تھکی ہوئی ہیں... بیٹھ جاؤ" اُس نے سرہانے مجھے بٹھالیا۔ اور آہستہ آہستہ گلاس میں برف ہلانے لگا۔

اُسے میری طرح پسینہ آ رہا تھا اور ہاتھ پیر کانپ رہے تھے۔ پانی پی کر وہ میری گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا۔

"بجّو!"

"کیا؟"

"میرا دل گھبرا رہا ہے؟"

"چچی جان کو جگاؤں" میں نے چاہا آرام سے اس کا سر تکیے پر رکھدوں۔

"نہیں.... ہلو مت!" اُس نے اپنے پتلے پتلے ہاتھ میری کمر میں ڈال دئے "دل گھبرا رہا ہے بجّو!" وہ تیزی سے گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔ میں نے اپنے کو چھڑانے کی کوشش نہ کی اور اُس کی پیشانی پوچھنے لگی۔ وہ اور بھی پریشان ہوگیا۔ اس نے جلدی جلدی میرا نام لیکر بڑبڑانا شروع کیا۔ سسکیاں! وہ سسکیاں بھرنے لگا۔ عجیب سوکھی سوکھی سی اُکھڑی ہوئی سانسیں۔ میں سمجھی نہ جانے کمبخت کو سرسام ہوگیا یا کیا، اور اُسے لٹانے کی کوشش کرنے لگی۔

"بجّو جاؤ مت.... میں مر جاؤں گا" اور بری طرح بچّوں کی طرح مجھ سے لپٹ گیا۔ اور اُس کی آنکھیں! اوہ جیسے.... نہ جانے آج مجھے ان آنکھوں میں کیا نظر آ رہا تھا۔ میرا دل بُری طرح دھڑکنے لگا۔ وہ شوخی سے تھرکنے کے بجائے چڑھی ہوئی اور گہری تھیں۔ کچھ پاگل سی! کچھ عجیب! مجھے تھوڑی دیر کے لئے یہ معلوم ہوا گویا اندھیرے پیچدار راستوں میں پریشان چکّر لگا رہی ہوں، اور کوئی دروازہ نہیں ہے

کوئی قریب کے پلنگ پر کلبلایا۔ اور وہ جلدی سے چونک پڑا "جاؤ.... رابعہ جاگ گئی!" اُس نے خوفزدہ ہو کر مجھے دُور دھکیل

دیا۔ "جاؤ جلدی" وہ خود چادر میں ڈر کر چھپ گیا۔

میں پریشان لیٹ گئی۔ یا اللہ! کیا واقعی یہ پاگل ہو رہا ہے!

"رابعہ جاگ گئی!" "تو کیا ہوا؟" مجھے چچی جان پر رحم آنے لگا۔ خدا نخواستہ.... خیر....

اور اس کے بعد سے اس میں ایک غیر معمولی انقلاب ہو گیا۔ وہی رات والی پاگل گہری اور چڑھی ہوئی آنکھیں کبھی بغیر بخار اور ہذیان کے بھی کچھ عجیب ہو جاتیں۔ وہ مجھے پہلے سے بھی زیادہ چھیڑنے اور چڑھانے لگا مجھ سے ہر وقت الجھتا اور پھر بالکل پاگل ہو جاتا۔ وہ میرے قریب میں رہنے کے بہانے تراشتا۔ ہر جگہ ہر کمرے اور ہر موڑ اور کونے پر وہ میری تاک میں مجھے ڈرانے اور گدگدانے کے لئے چھپا رہتا۔ میں اس کی ضرورت سے زیادہ توجہ سے کبھی بے طرح پریشان ہو جاتی، اور کبھی مجھے وہ سب ایک لھڈر لڑکے کی شرارتیں معلوم ہوتیں اور یہ شرارتیں کس تیزی سے بڑھ رہی تھیں!

* * *

دو سال بعد جب میں رابعہ کی شادی پر آئی تو صلّو کو صلاح الدین اعظم کہنا پڑا۔ اُفوہ ایک چھوٹا سا لپکتا ہوا کملایا سا پودا نوخیز درخت بن گیا تھا۔ خون کی حدّت سے چہرہ سانولا گیا تھا۔ اور پتلے سوکھے زرد ہاتھ سخت گٹھلیوں دار مضبوط شاخوں کی طرح جھلسے ہوئے بالوں سے ڈھک گئے تھے۔ اور آنکھیں تو بخدا بالکل ہی پاگل ہو گئی تھیں۔ پتلیاں ناچتی بھی تھیں اور ایکدم سے جم کر گہری ہو جاتیں کہ فوراً آنکھ جھپک جاتے۔

"بجّو کچھ میری موچھوں کا رعب پڑتا ہے؟"

"خاک! اسقدر ٹیڑھی شکل ہو گئی ہے"

"اور تمہاری بڑی بھولی ہے نا" اس نے مجھے گدگدانا چاہا۔ میں اُسکے بڑے بڑے ہاتھ دیکھکر ہی لرز گئی۔

"ہٹو صلّو.... خدا کے لئے۔ تم سے تو ڈر لگتا ہے۔ ریچھ ہو گئے ہو بالکل"

"ہاں؟" اور وہ غرور سے اور پھیل گیا۔

"ارے میں مار دوں گی صلّو...." اُس نے زبردستی اپنا کھُردرا گال میرے ہاتھ پر زور سے رگڑ دیا۔ سارا ہاتھ جھلا اُٹھا جیسے لوہے کا برش۔ کبھی تو میں آ کر پچھتاتی تھی۔ نہ جانے کیوں؟

* * *

شادی کا گھر اور وہ بھی ہندوستانی طور طریق۔ گھر کیا ہوتا ہوا ایک بھول بھلیاں کا راستہ۔ جس میں مزے سے آنکھ مچولی کھیلو۔ سر کو پیر کی خبر نہیں رہتی۔ اور نہ جانے کتنے کھلاڑی آنکھ مچولیاں کھیل رہے ہوتے ہیں۔ کبھی دو چوروں کی کسی کونے میں ٹکر ہو جاتی ہے تو پھر جھنپ! مزہ آجاتا ہے۔

معلوم ہوتا تھا کہ گھر کے ہر کونے ہر دیوار کی آڑ میں ہر زینہ پر کئی کئی صلاح الدین کھڑے ہیں۔ آپ کدھر بھی نکل جائیے ناممکن جو صلاح الدین نہ موجود ہو جائے۔ بعض وقت تو یہ معلوم ہوتا گویا آسمان سے ہی ٹپک پڑے۔ میں عاجز آ کر رابعہ کے پاس گھس گئی۔ لو وہ تھوڑی دیر میں لاڈلا بھیّا بہن کی صورت دیکھنے کو موجود! اور پھر یہ کہ ہم دونوں رضائی میں بمشکل سما رہے ہیں۔ کہ جناب مع اپنے بے ڈول ہاتھوں اور چوڑے کندھوں کے اُسی رضائی میں گھسیں گے۔ کس سے شکایت کی جائے کس کے آگے گلا کریں؟ یعنی اُن جگر کے ٹکڑے، کلیجے کی کور، کی کس سے شکایت کی جائے؟ اور کیا شکایت ہو؟ گھرک دو۔ سنجیدگی سے ڈانٹ دو۔ آپ ہی شرم آئے گی۔ مگر وہ سنجیدہ ہونے کا موقع بھی دے۔

"جاؤ صلّو سر میں درد ہے" جو یہ بہانہ کیا تو۔

"سر میں درد؟ ارے امّاں جان بام کہاں ہے۔ ڈرائیور کو بھیجے ڈاکٹر سے اسپرو لائے۔ اور بھئی کوئی شور کرے گا تو مجھ سے بُرا کوئی نہ ہو گا۔ چلو رشو، حمید، منّی کھسکو یہاں سے، بجّو کے سر میں درد ہے" دروازہ بند! یا اللہ! لیجئے سر کا درد غائب اور امّاں جان سے ضروری کام نکل آیا۔

"کیوں بجّو جھوٹی! کہہ رہی تھی سر میں درد ہے اور یہ یہاں پوریاں تلی جا رہی ہیں" لیجئے باورچی خانے میں بھی موجود۔ اب بھاگئے! کبھی آنچ بگاڑ دی کبھی کچھ اور پھر وہی شرارتیں! باورچی جانتا ہے کہ میاں بے چین بوٹی ہیں۔

"بی بی آپ بھی جائیے اور صلّو میاں بھی۔ ورنہ مجھ سے کھانا پک چکا!"

"صلّو مجھے تم سے ایک بڑی ضروری بات کہنی ہے" میں نے سوچا آج انہیں سنجیدگی سے ڈانٹوں۔

"کس سے؟ مجھ سے؟.... ارے میرے بھاگ!" ایسے خوش گویا تمغہ ملنے والا ہے۔

اب ضروری بات کہنے سے پہلے خود اس قدر ضروری خدمات انجام دینا شروع کیں کہ بھاگتے ہی بن پڑے۔

* * *

کیا لوگ اندھے ہوتے ہیں؟ دکھائی نہیں دیتا انہیں؟ آنکھ مچولی

میں تو بڑے بڑے شاہ پکڑے جاتے ہیں۔ اور پھر صلّو جیسا چور! دن دہاڑے ڈاکہ ڈالنے سے نہ چوکے لوگ سمجھتے ہیں بچّہ ہے!

سینما میں لوگوں کو بس عورت ہی عورت دکھائی دیتی ہے خواہ ہزاروں مرد کام کر رہے ہوں۔ اور میں بھی عورت تھی۔ مجھے جلد ہی معلوم ہوگیا کہ چند ایسے غیر جانبدار بھی ہیں جو فیصلہ کرتے وقت نہ کسی کے کلیجے کا ٹکڑا دیکھیں نہ جگر کی ٹھنڈک، کھڑی دھار پڑتی ہے تلوار کی۔ مجھی کو تو الزام دے گی دُنیا! یہ تو کوئی دیکھتا نہیں کہ فتنہ..... ! غصّے سے آنکھوں تلے اندھیرا آگیا۔

"ہٹ جاؤ صلاح الدین۔ حد ہوتی ہے بیہودگی کی۔ مجھے یہ باتیں پسند نہیں"

"ایں" اُس کا مُنہ اُتر گیا" کیا ہوا اَبچّو؟"

"کچھ نہیں... تمہیں معلوم ہے لوگ کیا کہتے ہیں"

"میرا بولنا... میرا... آپ کو بُرا لگتا ہے"

"ہاں... مجھے بہت بُرا لگتا ہے۔ اچھی بات نہیں۔ لوگ..."

"لوگ؟... کون لوگ؟۔ کون لوگ ہیں وہ مجھے بھی بتاؤ ذرا ـــــ"

"کوئی بھی ہوں وہ، میری اور تمہاری بہتری چاہنے والے"

"بہتری!" وہ سُرخ ہوگیا۔

"ہاں اسی میں بہتری ہے" اور میں تیزی سے چلی آئی۔ دل پر سے ایک بوجھ اُتر گیا۔ آخر کو میں نے کہہ ہی دیا۔ عورت کے تو ہاتھ میں ہے خواہ وہ بدراہ ہو جائے خواہ عین موقع پر آنکھیں کھل جائیں اور اُسے عاقبت نظر آنے لگے۔ آنکھیں کھل گئیں اور خوب موقع پر کھلیں! میں دل ہی دل میں مسکرا رہی تھی۔

صلاح الدین آیا میں حسب عادت چوکنّی ہوگئی۔ مگر گذرا چلا گیا! اُس نے مجھے دیکھا تک نہیں! میرے دل پر گھونسہ سا لگا۔ خیر... اُونہہ... کیا ہے۔ بہتری اسی میں ہے۔ بلا سے جان چھوٹی۔ کسی وقت سکون ہی نہ تھا۔ ابتو... خیر! اور گھر کے ہر کونے اور ہر موڑ پر اب کوئی بھی تھا؟ گویا امن، چین اور سکون! لیکن یہ پھر پریشانی کیسی؟ ایک فکر سی، ایک پستی، گویا کمان اُتر گئی، دھار کُھل ہوگئی۔ گویا کچھ ہو ہی نہیں۔ اب کوئی آپ کو دیکھکر کھنچا نہیں چلا آتا۔ اب کسی کو شرارتیں نہیں سوجھتیں، اب کسی کی عجیب اور پاگل آنکھیں آپ کے پیچھے نہیں دوڑتیں۔ جائیے شوق سے جائیے۔ اندھیری کوٹھڑی میں بھی چلے جائیے کوئی مزاحمت نہیں کرتا۔ چور ملتا بھی ہے تو آپ کو جھک کر آداب عرض کرتا ہے اور سر جھکا کر چلدیتا ہے ایک طرف کو۔ اب کوئی آپ کے پاس گھس کر بیٹھنے کا شوقین نہیں۔ بلکہ دُور... وہ سامنے کمسن خوبصورت لڑکیوں کے جھرمٹ میں شرارت بھری آنکھیں نچا کر خراج تحسین وصول کر رہا ہے۔ کبھی بھولے سے بھی اگر آنکھ مل جاتی ہے تو سر جُھک جاتا ہے۔ پہچانتا تک نہیں!

شادی کے گھر میں معلوم ہوتا ہے موت ہوگئی۔ ایک موت نہیں سینکڑوں موتیں۔ ہزاروں خیالات سینکڑوں جذبات اور ان گنت مسکراہٹیں مُردہ پڑی ہیں۔ گھر بھائیں بھائیں کر رہا ہے۔

اور چچی تو معلوم ہوتا ہے کبھی تھیں ہی نہیں کوئی اپنی۔ رابعہ اپنے دولھا کے خیال میں مست۔ حمیدہ کا بچّہ ضروریات زندگی ہی سے فارغ نہیں ہو چکتا۔ چچا اباّ بیچ شادی سے چلدوں کالج۔

دیکھنے والوں نے دیکھ لیا اور تاڑ بھی لیا۔

"اے یہ صلّو کی اور تمہاری کیا اَن بن ہوگئی ہے" چچی بولیں۔

"نہیں تو" میں جلدی سے بولی۔

"جھوٹ" صلّو نے دبی آواز میں کہا اور کھانے کی پلیٹ پر جُھک گیا۔

"اُوئی! چھوٹوں سے کیا غصّہ۔ چلو صلّو باجی سے معافی مانگو"

"جی نہیں... یہ خود مانگیں معافی" صلّو اکڑے۔

"معافی وافی کیسی؟ کوئی لڑائی نہیں ہوئی" میں نے معاملے کو سیدھا کرنا چاہا۔

"جی نہیں میری تو ہے لڑائی"

"یہ کیوں آخر ہوا کیا؟"

"ہوا یہ... کہ خواہ مخواہ ڈانٹنے لگیں..." میں ڈری۔

"کچھ بھی نہیں چچی جان یہ مجھے چھیڑ رہا تھا۔ میں نے کہدیا مجھ سے مت بولو۔ بھلا میں اس سے لڑوں گی" میں جلدی سے بولی۔

"نہیں امّاں جان... کیسی بھولی بن رہی ہیں۔ ایسے انہوں نے نہیں کہا تھا..." اور میں ڈری کہ کہیں اس نے کہدیا سب کے سامنے تو کیا ہوگا۔ مجھے خیال ہوا کہ میری غلط فہمی ہوگی۔ شاید یہ بھی اس کی شرارتیں ہیں اور.... اور شاید یہ شرارتیں ہی ہوں لعنت ہو کہ میں اُسے اسقدر ذلیل سمجھی!

"مجھے ایسی بُری طرح کہنے لگیں.... ہنہ، جیسے میں کوئی وہ ہوں...."

"اے میں تو یونہی کہہ رہی تھی" "لیجئے ملاپ ہوگیا! آپ؟

"لو اسی بات پر ہاتھ ملاؤ۔ اُوہ.... کس قدر سردی ہے۔ ساری رضائی آپ اوڑھے بیٹھی ہو یہ نہیں کہ کسی اور کو بھی اُڑھا لو۔"

وہ رضائی میں گھس کر بیٹھ گیا اور میرے اتنی چٹکیاں لیں کہ ملاپ کرنے کا مزہ آ گیا۔

"صلّو خدا کا واسطہ۔ پھر کہو گے میں نے یہ کہا اور وہ کہا۔" چچی جان معصومیت سے مسکرا رہی تھیں۔

"کہا ہی کیسے تم نے۔ بولو ہاریں کہ نہیں۔"

"بابا میں تجھ سے جیتی اور نہ جیتنے کا شوق۔ بس۔" وہ ہنسا' دُنیا کی ہر چیز ہنس پڑی۔

اور پھر وہی آنکھ مچولی! وہی بھول بھلیّاں! اور عاقبت؟ ایک دفعہ کو عاقبت بھی کھلکھلا پڑی۔ کونا کونا مسحور کن نغموں سے گونج اٹھا۔ کان گنگ ہو گئے اور آنکھوں میں ریت بھر گئی۔ میٹھی میٹھی کھٹک والی ریت!

اور اب قصور کس کا؟ قصور تو ہونا ہی ہوا کسی کا۔ تقدیر کا؟ بچاری تقدیر! بات یہ ہے کہ اللہ پاک اپنے بندوں کی آزمائش کرتا ہے۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ.... وہ تاکہ دیکھے.... یہی کہ بس دیکھو! جیسے ہم سب تماشہ دیکھتے ہیں! ڈر.... دھڑکا۔ بدنامی، ذلت، پریشانی بربادی، تباہی اور.... اور سب کچھ ایسے ہی موقع کی تاک میں رہتے ہیں۔ کچّی شاخ میں جھولا ڈالو تو آپ ہی چرچرائے گی۔ بھئی پہلے خوب ٹھوک بجا کر دیکھ لینا چاہئے کہ کہیں کمزور تو نہیں۔ رسّی تو گھنی گھنائی نہیں۔ ورنہ آپ ہی پھنسنی لگے گی۔

لڑائی پر جانے سے چند دن پہلے تشریف لائے۔ ننھّا برآمدے میں "لفٹ رائٹ، لفٹ رائٹ" کر رہا تھا۔ اُسے دیکھ کر ایسے سٹپٹائے کہ بس۔

"لمبی چوڑی ہے میری فوج!" میں نے سوچا۔ "بڑے بڑے دہل جاتے ہیں اسے دیکھکر۔"

"تم نے مجھے بتایا بھی نہیں۔"

"کیا.... ؟"

"یہ.... یہ...." وہ ننھّے کو گھورنے لگے۔

"اوہ یہ.... ہاں کوئی ایسی بتانے کی بات ہی کیا تھی۔ میں نے اسے یتیم خانے سے لے لیا تھا۔ جی بہلتا ہے اس سے۔"

"مگر یہ.... سچ بتاؤ" کتنی گھبراہٹ اور کتنی التجا تھی۔

"کیا بتاؤں؟.... ہاں تم اپنی کہو، یہ چچی جان نے لاڈلے بیٹے کو کیسے لڑائی پر بھیجدیا؟" میں نے بات پلٹی۔

"لڑائی پر.... وہ.... ہوگا.... تم پہلے یہ بتاؤ.... کہ.... یہ" وہ ننھّے کی طرف مُڑے۔

"سمجھ ہی میں نہیں آتا تمہاری تو.... کہا تو یتیم خانہ...."

"ہوں" صلّو کا چہرہ دیکھنے کے قابل تھا۔ کچھ کھوئی ہوئی سی کھسیانی صورت۔

"جی گھبرا رہا ہے؟" میں نے چھیڑا۔

اور اُن کی رنگت بدلی۔ "بیچارا بچّہ! مر گیا اس کا باپ شاید!" تلخی سے کہا گیا۔

"خاک تمہارے مُنہ میں۔ خدا نہ کرے" میں نے ننھّے کو کلیجہ سے لگا لیا۔

"ٹھائیں...." ننھّے نے موقع پاکر بندوق چلائی۔

"ہائیں.... باجی.... ابّا کو مارتا ہے" میں نے بندوق چھین لی۔

اور پھر آنکھوں میں وہی شرارت تڑپی.... پھر.... بلا کی گہری ہو گئیں.... کچھ پاگل!.... عجیب سی!.... ٹٹولنے کے باوجود اس بھول بھلیاں میں راستہ نہ ملا۔

عصمت چغتائی

M. Nazir

دیوانگی

(بسلسلہ صفحہ ۴۸)

ان حرکات کی بنا پر دیوانہ نہیں کہا گیا۔ مگر یہ ہمیشہ کامیابی کے بعد ہوا لیکن کامیابی صلاحیت کا نتیجہ نہیں، بلکہ کامیابی کا انحصار ماحول اور موقع پر ہے، لہذا یہ کہنا صحیح نہیں ہو سکتا کہ چونکہ ان میں صلاحیت تھی اسلئے ان کو کامیابی ہوئی۔ اور اس سے اس نظریہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا کہ دنیا میں اکثر وہ انسان بھی پاگل سمجھے جاتے ہیں جن کی دماغی صلاحیتیں مروجہ عام انسانی معیار سے بلند ہوتی ہیں۔ اور یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے کہ کون حقیقی معنوں میں پاگل ہے اور کون ایسا ہے جس کو ہم نے پاگل سمجھ رکھا ہے، حالانکہ وہ پاگل نہیں ہے اور اسکے مقابلے میں ہم سب پاگل ہیں۔

محمد احمد سبزواری

شیکسپیر کی تمثیل:-

انطنی و قلوبطرہ

تمہید:- انطنی، سلطنت روما کا ستونِ سوئم، قلوبطرہ ملکۂ مصر کے دام محبت میں گرفتار اسکندریہ میں مقیم داد تعیش دے رہا ہے۔ سلطنت کی سیاسیات ایک نازک دور سے گذر رہی ہے۔ سیکسٹس پومپے سلطنت پر اپنا حق فائق سمجھ کر بغاوت پر کمر باندھے ہوئے ہے۔ فلویا، انطنی کی بیوی الگ اُس کے قیام مصر سے تنگ آکر برسر جنگ ہے۔ انطنی کے ہم چشم، لے پدس اور اوکٹے ویس قیصر (یعنی قیصر اعظم کے دوسرے دو جانشین اور انطنی کی شرکت میں سلطنت کے موجودہ حکمراں) اُس کی اس بے راہ روی سے سخت برہم ہیں اور روما چلے آنے کے پیہم تقاضے بھیج رہے ہیں۔ لیکن انطنی اپنی جملہ آہنی قوتوں کے باوجود اس رنگین پھندے سے مخلصی حاصل کرنے کی سکت نہیں رکھتا۔ اسی دوران میں یونان سے فلویا کی اچانک موت کی اطلاع مزید پریشانیوں کا سامان لئے انطنی کے پاس پہونچی۔ انطنی ہزار کشمکش کے بعد، قلوبطرہ کا دیدۂ و دل ہمراہ لئے بالآخر اسکندریہ سے روانہ ہوا۔ بغاوت فرو کردی گئی۔ لیکن ان تینوں عمائدین سلطنت کی باہمی مصالحت کی ایک صورت یہ قرار پائی کہ انطنی کی شادی قیصر کی بہن اوکٹے ویا سے ہوجائے۔ انطنی نے وقتی حالات سے مجبور ہوکر ناچار اس رشتے کو قبول کرلیا۔ اور فوری مشکلات ایک عرصے کے دفع ہوگئیں۔

مگر یہ حالات کا محض ایک سنبھالا تھا۔ قلوبطرہ اُس کی اس نئی خانہ آبادی سے کیا کچھ چراغ پا نہ ہوتی ہوگی! ادھر انطنی بھی اس مفارقت کو بہت دن گوارا نہ کرسکا اور ارضِ شرق، کی یاد اُسے ایک بار پھر مصر کھینچ لائی۔ اوکٹے ویا سے طلاق۔ انطنی کی مصر میں آمد، قیصر کی برافروختگی اور بالآخر اعلان جنگ کے بعد انطنی کو اپنی زندگی کا آخری معرکہ درپیش ہوا۔ خوب خوب بری و بحری معرکے رہے جن میں انطنی نے قیصر کے دانت کھٹے کردئے۔ لیکن قلوبطرہ نے عین ہنگامۂ جنگ میں دغا دیکر اس کی تمام دادِ شجاعت کو خاک میں ملا دیا۔ جنگ ختم نہ ہونے پائی تھی کہ قلوبطرہ نے اپنے مرنے کی افواہ اُڑا دی جس کو سنکر انطنی جان پر کھیل رہا اور اس طرح خود بھی قلوبطرہ ہی کے ایک غمزۂ خونیں کا شکار ہوگیا۔

قلوبطرہ، نازنینان جہاں کی سرتاج، عورت کی جملہ ذہنی و عصبی خصوصیات کا مرقع کمال، مصر کی لاثانی ملکہ، انطنی کو اپنی بے پناہ نسائی گرفت میں لئے رہتی ہے اور اپنے ذوق مردافگنی کے اس آخری شکار کو محبت کی بھینٹ چڑھا کر بالآخر خود بھی اسی آگ میں ستی ہوگئی۔ انطنی کی موت کے بعد اُس نے مار افعی سے کٹوا کر جان دے دی۔

مغربی ادب کی اس اجنبی جنس کو اُردو ادب میں اپنانے اور رنگ سے رنگ ملانے کی کوشش کے ساتھ ساتھ اس ترجمے میں شیکسپیر کی اصل عبارت کا بھی پوری طرح اتباع کیا گیا ہے اور کوشش کی گئی ہے کہ حتی الامکان جزوی تصوّرات بھی شستگی اور سلاست کے ساتھ اُردو میں نبھائے جاسکیں۔ تاہم بعض موقعوں پر ترجمہ کی دُشواریوں کے سبب تھوڑا بہت تصرف ناگزیر تھا۔

منظوم تمثیل ہمارے ادب میں نایاب ہے اور یوں بھی ایک پُرتکلف سی چیز معلوم ہوتی ہے۔ لیکن مترجم کا مقصد اس صنف میں کوئی ذاتی تصنیف پیش کرنا نہیں بلکہ انگریزی کے ایک کلاسیکل شاہکار کو، امکانی مطابقت کے ساتھ، اپنی زبان میں ملاحظہ کرانا ہے۔ چنانچہ قارئین، موضوع اور اس کے اصل کی قدامت کا لحاظ رکھتے ہوئے اس ترجمے سے کسی جدید ڈرامے کا نہیں تو ایک رومانی مثنوی کا سا لطف ضرور اُٹھا سکیں گے۔ ترجمہ، وہ بھی نظم کا نظم میں، ایک نہایت دُشوار

پچیس منٹ

ہر روز صبح، کاربولک ایسڈ اور سپرٹ کی جراثیم کش بُو سے میری رُوح لرز جایا کرتی۔ پھر جب ڈاکٹر اپنا ایپرن پہن کر، اور آستین چڑھا کر میری طرف بڑھتا، اور بڑی بیدردی سے میری کلائی کو تختۂ مشق بنانے پر تُل جاتا، تو مجھے چکّر سے آنے لگتے۔

کئی دنوں سے میری کلائی زخمی تھی۔ اس میں شیشے کا ایک ٹکڑا اُتر گیا تھا۔ پھر زخم خراب ہو گیا۔ یہ زخم شاعروں کے "زخمِ دل" سے بالکل مختلف تھا۔ اور جب روئی کا پھاہا اُس پر رکھا جاتا تو ــــ توبہ! اُس زمانے میں مَیں اکثر تذکرۃ انبیا میں حضرت ایوبؑ کے حالات دلی شوق سے پڑھا کرتی تھی۔ اور اس سے دل کو ڈھارس بندھتی تھی۔

جس صبح کلائی کا آپریشن کیا جانا تھا، مری بُری حالت تھی۔ رات ہی سے مختلف وضع کے چھوٹے بڑے تیز اور تیز تر نشتر میری بدنصیب آنکھوں کے آگے ناچ رہے تھے۔

صبح ڈاکٹر مسکراتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ جیسے کسی کو مبتلائے کرب دیکھنا اُسے آمادۂ تبسّم کر رہا ہو۔ "آپ اپنے ننھے منے سے آپریشن کیلئے بالکل تیار ہیں نا خاتون روحی؟"

"ہاں ہاں ــــ" میں نے مسکرانے کی کوشش کی پھر بھرائی ہوئی آواز میں کہا "نہیں نہیں"۔

ڈاکٹر نے مُسکرا کر کہا "معلوم ہوتا ہے صرف ایک پل بھی آپکے نیک ارادے میں خلل انداز ہو سکتا ہے۔ ذرا کلائی تو دکھائیے"۔

جملہ ختم کرتے ہی ڈاکٹر نے اپنے اسسٹنٹ کو سامان جراحت تیار کرنے کو کہا اور ایک روشن اور لمبے دریچے کے آگے آناً فاناً میں آپریشن کا سامان تیار ہو گیا۔

میں اپنی کلائی کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے ڈاکٹر سے کوئی آٹھ گز کے فاصلے پر کمرے کے آخری سرے پر کھڑی تھی۔ باہر باغیچے میں تندرست چڑیاں مصروفِ نغمہ تھیں اور فوارے کے پاس ایک گل سوسن قہقہہ لگا رہا تھا۔

"آئیے" ڈاکٹر کی آواز آئی۔

"آپریشن میں دیر کتنی لگے گی؟"

"پانچ منٹ!"

"پانچ منٹ!!؟" میرے منہ سے نکلا "بہت ہیں ڈاکٹر۔ پانچ لمحوں میں نہیں ہو سکتا؟"

ڈاکٹر ہنس پڑا اور میری کلائی پکڑ کر دریچے کی روشنی میں لے آیا اور بولا "خاتون روحی! آپ کا زخم دیکھکر مجھے آج سے سات سال قبل کا ایک خوفناک واقعہ یاد آ گیا۔ آپ اپنے ذرا سے زخم کو دیکھکر ہراساں ہو گئیں؟ اپنی کلائی میرے سپرد کر دیجئے اور آرام سے اس کرسی پر بیٹھ جائیے۔ ہاں تو وہ خوفناک واقعہ سُنیں گی؟"

"سنوں گی۔ بشرطیکہ وہ آپ کے کام میں خلل انداز نہ ہو" میں نے کہا۔

"آپ اطمینان رکھئے، کوئی خلل نہ پڑے گا۔ سات سال پہلے کی بات ہے مَیں میڈیکل کالج میں تھا۔ اُس زمانے میں ہمیں تقریباً ہر روز لاشوں کو چیرنے پھاڑنے کا موقع مل جاتا تھا"۔

"اور آپ کو اس میں لطف آتا تھا؟" میں جلکر بولی۔

"مجھے اس شغل سے خاص شغف تھا خاتون روحی اور ــــ"

"دیکھئے دیکھئے میری کلائی ــــ"

"نہیں نہیں کوئی بات نہیں ــــ میں عموماً رات کے سنسان وقت، گھنٹوں اس شغل میں محو رہتا تھا اور دو دو بجے گھر لوٹتا تھا۔ جب میں گھر لوٹتا تو مجھے راستے میں گاؤں کے قبرستان پر سے ہو کر گزرنا پڑتا تھا۔

ایک رات جب میں قبرستان پر سے گذر رہا تھا تو مجھے کسی کے کراہنے کی آواز آئی۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ مگر وہاں کوئی نہ تھا۔ اسکے بعد ہر روز رات کے وقت جب میں قبرستان پہونچتا تو کراہنے کی آواز آنے لگتی۔ لیکن نیند کا غلبہ اس قدر ہوتا کہ مجھے اس آواز کی تلاش کا نہ کبھی خیال آیا نہ وقت ملا۔

ایک رات میں خلافِ معمول ذرا جلدی یعنی کوئی بارہ ایک بجے اسی راستے پر سے گذر رہا تھا۔ گرمی شدید تھی اور تاریکی غیر معمولی۔ البتہ آسمان پر بے شمار تارے چمک رہے تھے۔ مگر چونکہ میں بید مجنوں اور ناشپاتی کے درختوں کے نیچے سے گذر رہا تھا اس لئے میرے اطراف تاریکی ہی تاریکی تھی۔

میں قبرستان کی دیوار تک پہونچا تو مجھے کراہنے کی آواز آئی۔

آج یہ آواز زیادہ قریب اور واضح تھی جیسے کوئی شخص انتہائی درد کو ضبط کرنے کی کوشش کے باوجود کراہنے پر مجبور ہو۔ آہ خاتون روحی۔ وہ دردناک آواز۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میرے دل میں اُتری جا رہی ہے۔"

میری کلائی میں کوئی چیز اُتری جا رہی ہے ۔۔۔ "اُف" میں نے کہا۔

ڈاکٹر نے کوئی اوزار طشت میں چھن سے پھینکا اور دوسرا اُٹھالیا

"مجھے معلوم ہوا کہ یہ آواز قبرستان کے اندر سے آرہی ہے۔ مجھے بڑا تعجب ہوا کہ دنیا گورستان کے اطمینان قلب اور سکون کی تعریف کرتی ہے یہ کون بدنصیب اس سکوت میں خلل انداز ہو رہا ہے! مرے دل نے کہا پھر میں نے قبرستان کی دیوار سے اپنے کان لگا دئے۔ یہ آواز رقصاں تھی یعنی کراہنے والا اِدھر اُدھر بھاگتا پھرتا تھا۔ وہ آواز کبھی قبرستان کے اس حصے سے آتی تھی کبھی اُس حصے سے۔ میرے دل میں اس مبتلائے کرب بدنصیب کو دیکھنے کی خواہش چٹکیاں لینے لگی اور میں پنجوں پر کھڑے ہو کر اندر جھانکنے لگا۔ مگر اندر تاریکی تھی۔ صرف تاریکی۔ ناشپاتی اور بید مجنوں کے درخت کالی کالی قبروں پر چپ چاپ کھڑے تھے!

دفعتاً پھر کراہنے کی آواز آئی اور میں نے فوراً سر پھیر کر دیکھا۔ اُف خاتون روحی۔ تاروں کی چھاؤں میں میں نے ایسا خوفناک منظر دیکھا کہ لرز گیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ قبروں کے درمیان کوئی گوریلا ناچ رہا تھا۔"

"گوریلا؟"

"مجھے شبہ ہوا کہ گوریلا ہے۔ مگر جب میں نے اس کی کراہ سنی تو مجھے انسان ہونے کا شبہ ہوا۔ اس رات میں پہچان نہ سکا کہ وہ انسان تھا یا کوئی جانور۔

دوسری رات میں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ قبرستان کے اندر جا پہونچونگا چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ میں قبرستان کی دیوار پھاند کر اندر جا پہونچا۔ اور جنگلی گلاب کی جھاڑیوں میں چھپ کر بیٹھ رہا۔

کراہنے کی آواز آج زیادہ شدت اور زیادہ بےبسی کے ساتھ آرہی تھی۔ میں نے دیکھا قبروں کے درمیان انتہائی تکلیف کے مارے کوئی کراہ رہا اور ناچ رہا ہے۔ دو لمحے بعد مجھے شبہ ہوا کہ اس نے مجھے دیکھ لیا ہے۔ کیونکہ اُس نے اپنی کراہ ضبط کر لی تھی اور پیچھے جھاڑیوں کی طرف جانے لگا تھا۔

میں نے فوراً ٹارچ جلائی اور روشنی پھیل گئی۔ وہ گھبرا کر قبروں کے درمیان کہیں غائب ہو گیا میں تیزی سے اسکی طرف چلا۔

مئی کے تپتے ہوئے آسمان پر بوڑھے تارے ساکت تھے، اور گورستان کی زمین سے ایک عجیب المناک خوشبو نکل نکل کر چاروں طرف پھیل رہی تھی۔

میں نے ہر طرف پھر کر دیکھ لیا۔ مگر وہاں کوئی نہ تھا۔ میں روحوں کا قائل تو تھا نہیں، کہ یہی سمجھ کر دل کو تسلی دے لیتا کہ کوئی گنہگار روح اپنے اعمالنامے پر مصروف گریہ ہے۔ میں ڈاکٹر تھا خاتون روحی ۔۔۔ ایک طبی آدمی! اس لئے ہر چیز کو عقل کی روشنی میں دیکھنا چاہتا تھا۔ اِس لئے میں نے ہر طرف ہر گوشے میں گھوم کر اطمینان کر لیا اور آخر مایوس ہو کر واپس جانے کی ٹھانی۔

میں جب واپس جانے لگا تو یکایک ایک آہ کی آواز آئی اور میں رُک گیا۔ سامنے، یعنی میرے قدموں میں جو قبریں تھیں اُنہیں میں سے کراہنے کی نہایت دھیمی آواز آرہی تھی۔ میں بیٹھ گیا۔ بلاشبہ یہ کسی مبتلائے کرب کی آواز تھی۔

میں چپ تھا۔ میں نے اپنی سانس تک روک لی تھی تاکہ کسی کو میری موجودگی کا علم نہ ہونے پائے۔ میں قبروں میں بیٹھ گیا۔ کس قدر تعجب ہوا ہے جب یہ آواز بالکل میرے قدموں کے نیچے والی قبر میں سے آنے لگی! میں پنجوں کے بل چلنے لگا اور اس قبر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ کوئی جانور اس قبر میں گھس گیا ہے۔ کیونکہ کراہ کی آواز آدھی انسانی تھی اور آدھی ۔۔۔ کیا بتاؤں غیر انسانی نہایت خوفناک!"

"تو کیا قبر کھلی ہوئی تھی؟"

"جی ہاں ۔۔۔ کیونکہ میرا ہاتھ ایک ناہموار جگہ پر رُک گیا۔ وہ قبر کا ایک کھلا ہوا کونہ تھا۔ جوں ہی میں نے اپنا چہرہ اس کے سامنے کیا تو میرا سر چکرا گیا۔ اندر سے ایک عجیب نمدار بُو نکل رہی تھی۔ میں نے اپنا چہرہ ہٹا لیا۔ اندر سے کسی کی سانس کی آہستہ آہستہ آواز آرہی تھی خاتون روحی۔

میں نے ٹورچ جلائی اور قبر کے اندر دیکھا ۔۔۔ اور ۔۔۔ اور ۔۔۔ ششدر رہ گیا۔ میں نے زندگی میں سینکڑوں انسانی لاشوں کو چیرا ہے۔ بیسیوں خوفناک مناظر دیکھے مگر جو چیز اندر دیکھی اُسے دیکھکر میرے جسم میں ایک پھریری سی آئی!"

"تو اندر کیا دیکھا" میں بےچین ہو کر بولی۔

"اندر؟ ۔۔۔ اُف۔ کوئی لیٹا ہوا تھا۔ وہ گوریلا نہ تھا۔ گوریلے کے جسم پر لمبے لمبے بال ہوتے ہیں۔ مگر وہ تو کھال اُترے ہوئے بکرے

کی مانند تھا۔ خدا کی پناہ گوشت کا ایک لوتھڑا!"

"یعنی؟"

"وہ انسان تھا خاتون روحی۔ مگر انسان کہلائے جانے کا مستحق نہ تھا۔ اور اگر وہ خود اپنے آپ کو انسان نہ کہتا۔ تو میں کبھی نہ سمجھ سکتا کہ وہ کیا تھا۔ وہ چھلے ہوئے بکرے کی طرح گہرے گلابی رنگ کا تھا۔ جس جگہ پر چہرے کا شبہ ہو سکتا تھا اُسی جگہ سے کراہنے کی آواز پیدا ہوتی تھی۔ میں دیر تک نہ سمجھ سکا کہ اُس نے مجھے دیکھا بھی یا نہیں" اور پھر میں نے ہمت کر کے پوچھا: تم کون ہو؟"

اس میں ایک حرکت پیدا ہوئی اور جواب ملا: انسان"

میرے ہوش و حواس جاتے رہے اور میں لرز گیا۔ پھر اُس نے اپنی سرگذشت مجھے سنائی۔ اُسے سنکر آپ کیا کرینگی؟ اس نے بیان کیا کہ کس طرح ایک خوفناک دلدل میں پھنسنے کے بعد اُسے ایک جلدی بیماری لاحق ہو گئی اور رفتہ رفتہ اُس نے یہ شکل اختیار کر لی اور پھر دُنیا میں اس کے رہنے سہنے کے لئے کوئی جگہ باقی نہ رہی۔ پھر اُس نے ایک پُرانی قبر کو اپنا مسکن بنایا۔ وہ تمام دن اندر لیٹا رہتا اور رات کے وقت باہر نکلتا اور درخت سے ناشپاتی ——"

اس کے ساتھ ہی ڈاکٹر نے ایک تیز قینچی چھن سے طشت میں پھینکی اور بینڈیج کو گرہ دیتے ہوئے کہا: "خاتون روحی خدا کا شکر ہے یہ تکلیف دہ آپریشن ختم ہو گیا۔ پچیس منٹ لگے! مجھے ڈر تھا آپ —————— خیر تو سُنا آپ نے؟ آپ سے زیادہ مصیبت زدہ لوگ اس دُنیا میں بستے ہیں — اور آپ کے آپریشن میں پچیس منٹ ہی لگے!"

اور وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

پہلی دفعہ میں نے درد محسوس کیا۔ بے چین ہوتے ہوئے بھی پوچھا "اور اس شخص کا کیا ہوا؟"

ڈاکٹر ہاتھ دھوتے ہوئے بولا "کس شخص کا؟ ہاں وہ؟ — وہ تندرست ہو گیا خاتون روحی — جیسی آپ ہو گئیں" اور وہ زور سے ہنس پڑا۔

حجاب امتیاز علی

پنگھٹ پر

دوش پر گاگر اُٹھائے ناز فرماتی ہوئی
آ رہی ہے آج پنگھٹ سے وہ کچھ گاتی ہوئی

بج رہی ہیں گھاٹ پر پھر حُسن کی شہنائیاں
وجد کرتی ہے زمیں، مدہوش سا ہے آسماں

اپنی اپنی گاگروں کو بھر رہی تھیں دیویاں
یہ فضائے شام ہے یا کوئی نغموں کا جہاں

گنگناتی، مسکراتی، کیف برساتی ہوئی
ساری دُنیا جھومتی ساری فضا گاتی ہوئی

کیوں مجھے ہوتا ہے احساس تباہی کیا کروں
اک خلش سی ہے مرے دل میں الٰہی کیا کروں

اس قدر آخر طبیعت آج گھبراتی ہے کیوں
کچھ نہیں کھلتا کہ دل میں بات کیا آتی ہے کیوں

اپنے دل کی بات بھی اُس کو سنا سکتا نہیں
اُف رے محرومی اشارے سے بُلا سکتا نہیں

مست آنکھوں سے شباب رُوح برساتی ہوئی
جا رہی ہے وہ مرے ارماں کو ٹھکراتی ہوئی

جوہر فریادی

فرقانِ حمید

جب زیاں کاریٔ ابلیس نے پائی تکمیل — نذرِ نسیان و تصرّف ہوئی تورات، انجیل
نہ مسیحی رہے باقی نہ بنی اسرائیل — تا بہ کے، قصّہ واژونیٔ ادراکِ عقیل

عقل تختوں میں اُتر آتی تھی بے دینوں کی
کون ہڑبونگ میں سُنتا تھا سخن حبینوں[1] کی

تھی نگاہوں میں وہ نیرنگیٔ افسونِ خلیل — نہ رہی دامِ ضلالت سے نکلنے کی سبیل
نہ براہین و دلائل نہ ثبوت و تاویل — ہر مکاں بن گیا "بتخانۂ آذر" تمثیل

کٹ گیا رشتۂ انسان و خدائے قدّوس
پتھروں سے ہوئے تخلیق بتانِ محسوس

اِن بُتوں میں وہ جسارت کہ عیاذاً باللہ — حسبِ موضوع وہ قوّت کہ عیاذاً باللہ
بندگی اور وہ بدعت کہ عیاذاً باللہ — یعنی یہ شانِ عقیدت کہ عیاذاً باللہ

نہ ہوا غم ۔ جو خدا وقتِ سفر ۔ چھوٹ گیا
"اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا"

الغرض کفر سے معمور تھے اطرافِ زمیں — پختہ مغزوں کے لئے خام نہ تھا وہم یقیں
تھے نئے طرز پہ ہر ملک میں برگشتہ دیں — عجمی غاشیہ بردار ۔ عرب صدر نشیں

بُت اگر عینِ ہیولےٰ تو پجاری ذی رُوح
ناطقہ ۔ سنگ سے تھا ۔ طالبِ امداد و فتوح

وہ دُھواں دھار کہ تاریک تھا ہر گوشۂ دل — خود پسندی میں شریر النفسی تھی شامل
پوجنے والے تھے نااہل ۔ خُدا ناقابل — عقل سِفلی زدۂ وہم و گمانِ باطل

استخارے کی ضرورت پہ سہام[1] اندازی
تیر تکوں کے بھروسے پہ حصص افرازی

عزوشانِ بشری ورطۂ ناپاک میں تھی — "آدمیت" کی قضا "ساغرِ بیباک" میں تھی
آبرو خاک بہ سر دیدۂ ادراک میں تھی — عصمتِ "زہد و ورع" "چادرِ صد چاک" میں تھی

امراء القیس کے اشعار زبانوں پر تھے
بلکہ طاری وہی کردار جوانوں پر تھے

تھی ضرورت کہ زمانے کو حماقت سُوجھے — دُور کج فہمیٔ احساس ہو ۔ عظمت سوجھے
تھا مشیّت میں ۔ کھُلے چشمِ بصیرت ۔ سوجھے — اور اک مخبرِ صادق کی بدولت سوجھے

یعنی وہ مخبرِ صادق وہ صحیفہ میں ہوں
جس نے باطل کئے ادیانِ ضعیفہ میں ہوں

---

[1] (موحد)

[1] مراد ازلام۔

میرے حرفوں سے ضیا بار ہیں پیغامِ خدا
میرے الفاظ کے پردوں میں ہیں احکامِ خدا
مجھ سے ظاہر ہوئے مخلوق پہ انعامِ خدا
حاملِ سرّ و معانی ہی نہیں۔ نامِ خدا

ہوں میں۔ سرچشمۂ اذعانِ خداوندی ہوں
بلّٰہ الحمد کہ۔ فرمانِ خداوندی ہوں

مجھکو اللہ نے تفویض کیا اپنا کلام
یعنی سونپے مجھے احکام و فرامینِ عظام
مجھ میں ایجازِ فصاحت ہے بلاغت اتمام
کعبۂ قلبِ مسلماں ہے مری جائے قیام

جو مرے علم کے اندر ہے بیاں کرتا ہوں
جلوۂ طور نگاہوں پہ عیاں کرتا ہوں

میرا ہر قولِ بجا، ناطق و کامل گویا
میں نے تاریکیٔ عالم کو مٹایا۔ کھویا
بغض و کینہ کی جگہ تخمِ محبت بویا
اس کو ٹوکا جو سرِ زانوئے غفلت سویا

کیا ارشاد۔ پنپنا ہے تو بیدار رہو
کامیابی کے طلب گار و سزاوار رہو

ہاتھ سے دامنِ اخلاقِ رذیلہ چھوڑ دو
پھر "اسی" خالق و قیوم سے رشتہ جوڑو
"ماسوا" کے درِ بےفیض پہ سرمت پھوڑو
طرف قبلۂ ذی شاں۔ رخِ سجدہ موڑو

ہے "وہی" واجبِ منشائے متینِ سجدہ
نہ اُٹھے اُس کی حضوری سے جبینِ سجدہ

جس نے آدم کی فرشتوں پہ جتائی تعظیم
خاک کو جس نے کیا اوجِ ثریا پہ مقیم
واحد و "قادرِ مطلق" ابدی، حیّ و قدیم
کی عطا جس نے تمہیں فکرِ رسا عقلِ سلیم

فلسفی جس کو یہ سمجھے کہ سمجھ ہی نہ سکے
حکما جس کی حقیقت کو پرکھ بھی نہ سکے

میرے دربار میں ہمدوش ہیں سلطان و غلام
میں سمجھتا نہیں ازادیٔ انساں۔ تہۂ دام
صورت و رنگ کی تفریق سے مجھکو کیا کام
مجھے اعمال سے مطلب۔ چہ خواص و چہ عوام

فرد ہو جاؤ مساوات میں۔ ہمدردی میں
داب اعدا سے خلل آئے نہ پامردی میں

بات ایسی ہو کہ ٹوٹے نہ کوئی دل جس سے
ہو وہ رفتارِ قدم چوم لے منزل جس سے
وہ صداقت ہو کہ حیران ہو باطل جس سے
جرأت ایسی کہ سمٹ جائے مقابل جس سے

غمِ محکومیٔ اُفتادہ گوارا بھی نہ ہو
تن بہ تقدیر۔ متانت سے کنارا بھی نہ ہو

تو اگر مردِ مسلماں ہے تو یہ بات نہ بھول
حرکت ہے مرے قانون میں سرتاج اصول
رہ منزل میں ٹھٹکتے ہیں ظلوم اور جہول
کام کرنا ہو تو سستی مرے نزدیک فضول

طلبِ حق کی حمایت میں تکلّف بے جا
وطن و قوم کی خدمت میں توقّف بے جا

شاد عارفی

رحمٰن کے جوتے

دن بھر کام کرنے کے بعد جب بوڑھا رحمٰن گھر پہونچا تو بھوک اُسے بہت ستا رہی تھی۔ جینا کی ماں، جینا کی ماں، اُس نے چلّاتے ہوئے کہا۔ کھانا نکال دے بس جھٹ سے۔ بڑھیا اس وقت اپنے ہاتھ کپڑوں لتّوں میں گیلے کئے بیٹھی تھی اور پیشتر اس کے کہ وہ اپنے ہاتھ پونچھ لے رحمٰن نے ایک دم اپنے جوتے کھاٹ کے نیچے اتار دئے اور کھدّر کے ملتانی تہمد کو زانوؤں میں دبا، کھاٹ پر چوکڑی جماتے ہوئے بولا: "بسم اللہ"۔

بڑھاپے میں بھوک جوان ہوجاتی ہے۔ رحمٰن کی بسم اللہ بڑھاپے اور جوانی کی اس دوڑ میں رکابی سے بہت پہلے اور بہت دور نکل گئی تھی۔ اور ابھی تک بڑھیا نے سجّی اور نیل میں بھگوتے ہوئے ہاتھ اپنے دوپٹے سے نہیں پونچھے تھے۔ جینا کی ماں برابر بیالیس چوالیس سال سے اپنے ہاتھ دوپٹے سے پونچھتی آئی تھی اور رحمٰن قریب قریب اتنے ہی عرصے سے خفا ہوتا آیا تھا۔ لیکن آج یکلخت وہ خود بھی اس وقت بچانے والی عادت کو سراہنے لگا تھا۔ رحمٰن بولا: "جینا کی ماں، جلدی ذرا"۔ اور بڑھیا اپنی چوالیس سالہ، دقیانوسی ــ ادا سے بولی: "آئے ہائے، ذرا دم تو لے بابا تو!"

سوءِ اتفاق رحمٰن کی نگاہ اپنے جوتوں پر جا ٹھہری جو اس نے جلدی سے کھاٹ کے نیچے اُتار دئے تھے۔ رحمٰن کا ایک جوتا دوسرے جوتے پر چڑھ گیا تھا اور یہ مستقبل قریب میں کسی سفر پر جانے کی علامت تھی۔ رحمٰن نے ہنستے ہوئے کہا: "آج پھر میرا جوتا جوتے پر چڑھ رہا ہے، جینا کی ماں، اللہ جانے مجھے کونسے سفر پر جانا ہے؟"

"جینا سے ملنے جانا ہے اور کہاں جانا ہے؟" بڑھیا بولی: "یونہی تو نہیں تیرے گوڈے دھور ہی ہوں بڈھے! دو پیسے ڈبل کا تو نیل لگ گیا ہے تمہارے کپڑن کو۔ کیا تو دو پیسے روز کی کمائی بھی کرے ہے؟"

"ہاں ہاں" بڈھے رحمٰن نے سر ہلاتے ہوئے کہا "کل مجھے اپنی پیاری بچی سے ملنے انبالے جانا ہے۔ تبھی تو یہ جوتا جوتے سے نیارا نہیں ہوتا.... پار سال بھی جب یہ جوتا جوتے پر چڑھ گیا تھا تو رحمٰن کو پرچی ڈالنے کے لئے ضلع کچہری جانا پڑا تھا۔ اس کے ذہن میں اس سال کا سفر اور جوتوں کی کرتوت اچھی طرح سے محفوظ تھی ضلع سے واپسی پر اُسے پیدل ہی آنا پڑا تھا کیونکہ ہونے والے ممبر نے واپسی پر اس کا کرایہ بھی نہیں دیا تھا۔ اس میں ممبر کا قصور نہ تھا بلکہ جب رحمٰن پرچی پر نیلی چرخی کا نشان ڈالنے لگا تھا تو اُس کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور اُس نے گھبرا کر پرچی دوسرے ممبر کے حق میں دیدی تھی۔

جینا سے ملے دو سال ہوئے تھے۔ وہ انبالے میں بیاہی ہوئی تھی۔ ان دو سالوں میں یہ آخری چند ماہ رحمٰن نے بڑی مشکل سے گذارے تھے۔ اُسے یہی معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی دہکتا ہوا اُپلا اس کے دل پر رکھا ہوا ہے۔ جب سے جینا سے ملنے کا خیال آتا تو اُسے کچھ اطمینان، کچھ سکون میسر ہوتا۔ جب ملنے کا خیال ہی اس قدر تسکین دہ تھا تو ملنا کیسا ہوگا ــ بڈھا رحمٰن سوچتا تھا، وہ اپنی لاڈلی بیٹی سے ملے گا پھر اُس تلنگوں کے سردار، اپنے داماد علی محمد سے۔ پہلے تو وہ رو دے گا، پھر ہنس دے گا، پھر رو دے گا اور پھر اپنے نواسے کو لیکر گلیوں، بازاروں میں کھلاتا پھرے گا" یہ تو میں بھول گیا تھا، جینا کی ماں" رحمٰن نے کھاٹ کی ایک کھلی ہوئی رسّی کو عادتاً گھساتے ہوئے کہا "بڑھیپے میں یادداشت کتنی کمزور ہوجاتی ہے"۔

علی محمد، جینا کا خاوند ایک وجیہ جوان تھا۔ سپاہی سے ترقی کرکے وہ نائیک بن گیا تھا۔ صلح کے دنوں میں وہ بڑے جوش و خروش سے ہاکی کھیلا کرتا تھا۔ این ڈبلیو آر، پولیس مین، برگیڈ والے، یونیورسٹی والے اُس نے سب ہرا دئے تھے۔ ابکے وہ اپنی ایمٹی کے ساتھ بصرے جانے والا تھا۔

ان دنوں عراق میں رشید علی زوروں پر تھا....... اس ہاکی کی بدولت ہی محمد علی کمپنی کمانڈر کی نگاہوں میں اُونچا اُٹھ گیا تھا۔ نائیک بننے سے پہلے محمد علی جینا سے بہت اچھا سلوک کرتا تھا لیکن اس کے بعد وہ اپنی ہی نظروں میں اتنا بلند ہوگیا تھا کہ جینا اُسے اپنے پاؤں تلے نظر نہ آتی تھی۔ اس کی ایک اور وجہ بھی تھی۔ مسز جولٹ، کمپنی کمانڈر کی بیوی نے تقسیم انعامات کے وقت انگریزی میں علی محمد سے کچھ کہا تھا جس کا ترجمہ کمپنی کے صوبیدار نے کیا تھا ــ میں چاہتی ہوں تمہاری اسٹک چوم لوں ــ محمد علی کا خیال تھا لفظ اسٹک نہیں ہوگا، کچھ اور ہوگا۔ بڑا حاسد ہے صوبیدار اور انگریزی بھی تو بس گوہانے تک ہی جانتا ہے ــ اور جینا تو نری بچہ اس ہے!

رحمٰن کو یوں محسوس ہونے لگا جیسے اُسے اپنے داماد سے نہیں بلکہ کسی بہت بڑے افسر سے ملنے جانا ہے۔ اس نے کھاٹ پر سے جھک کر

جوتے پر سے جوتا اُتار دیا گویا وہ انبالے جانے سے گھبراتا ہو۔ اس عرصے میں جینا کی ماں کھانا لے آئی۔ آج اس نے خلافِ معمول گائے کا گوشت پکا رکھا تھا۔ جینا کی ماں نے گوشت بڑی مشکل سے قصبے سے منگوایا تھا اور اس میں گھی اچھی طرح سے ڈال دیا تھا۔ رحمٰن کو چھ ماہ پہلے تلی کی سخت شکایت تھی، اس لئے وہ تمام مولداتِ سودا، گڑ، تیل، بینگن، مسور کی دال، گائے کا گوشت اور چکنی غذا سے پرہیز کرتا تھا۔ اس چھ ماہ کے عرصے میں رحمٰن نے شاید سیر کے قریب نوشادر چھاچھ کے ساتھ گھول کر پی لیا تھا۔ تب کہیں اس کی سانس کی تکلیف دُور ہوئی تھی۔ بھوک لگنے کے علاوہ اس کے پپوٹوں کی سیاہی سپیدی میں بدلی تھی، لیکن اس کی گردن بدستور پتلی تھی۔ آنکھوں میں گدلاہٹ اور تیرگی ویسے ہی نمایاں تھی۔ پلکوں کی بھربھراہٹ بھی قائم تھی اور جلد کا رنگ سیاہی مائل نیلگوں ہو گیا تھا۔

گائے کا گوشت دیکھ کر رحمٰن خفا ہو گیا۔ بولا: "چار پانچ روز ہوئے تو نے بینگن پکائے تھے، جب میں چُپ رہا۔ پرسوں مسور کی دال پکائی جب بھی میں چُپ رہا۔ تُو تو بس چاہتی ہے کہ میں بولوں ہی نہیں، مری مٹی کا ہو رہوں۔ جینا کی ماں! تو تو مجھے مارنے پر تلی ہے۔"

بڑھیا پہلے ہی روز سے جب اس نے بینگن پکائے تھے رحمٰن کی طرف سے احتجاج کی متوقع تھی۔ لیکن رحمٰن کی خاموشی سے بڑھیا نے الٹا مطلب لے لیا۔ دراصل بڑھیا نے قریب قریب ایک بھٹو آدمی کی خاطر اپنا ذائقہ بھی ترک کر ڈالا تھا۔ بڑھیا کا سوچنے کا ڈھب بھی نیارا تھا۔ جب سے وہ پیٹ بڑھے ہوئے اس ڈھانچے کے ساتھ وابستہ ہوئی تھی، اُس نے سُکھ ہی کیا پایا تھا۔ بھلا چنگا رحمٰن لدھیانے میں پولیس مین تھا لیکن ایک تربوز پر سے پھسل کر گھٹنا ٹوٹ جانے سے اُس نے پنشن پالی تھی اور گھر ہی بیٹھ رہا تھا بڑھیا نے کپڑے چھانٹتے ہوئے کہا ... "تو نہ کھایا با، تیری کھاطر میں تو نامرو مجھے تو روج دال، روج دال میں کوئی مجا نہیں دکھے۔"

رحمٰن کا جی چاہتا تھا کہ وہ کھاٹ کے نیچے سے جوتا اٹھائے اور اس بڑھیا کی چندیا پر رہے سہے بالوں کا بھی صفایا کر دے۔ سر کے بال اُترے تھا بڑھیا کا دائی نزلہ بھی دور ہو جائے گا۔ لیکن چند ہی لقمے مُنہ میں ڈالنے کے بعد اُسے فوراً خیال آیا ... تلی ہوتی ہے تو ہوتی رہے، کتنا ذائقہ دار گوشت پکایا ہے میری جینا کی ماں نے، میں تو ناشکرا ہوں پُورا پُورا اور رحمٰن چٹخارے لے لے کر ترکاری کھانے لگا۔ سالن کا تر کیا ہوا لقمہ جب اس کے منہ میں جاتا تو اُسے معاً یہ خیال آتا، آخر اُس نے جینا کی ماں کو کون سا سُکھ دیا ہے وہ چاہتا تھا کہ وُہ کسی تحصیل میں چپراسی ہو جائے اور پھر اُسے پُرانے دن واپس آ جائیں۔

کھانا کھانے کے بعد رحمٰن نے اپنی اُنگلیاں پگڑی کے شملے سے پونچھیں اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ کسی نیم شعوری احساس سے اُس نے اپنے جوتے اُٹھائے اور اُنہیں دالان میں ایک دوسرے سے اچھی طرح علیحدہ علیحدہ کر کے ڈال دیا۔

لیکن اس سفر سے چھٹکارا نہیں تھا ہر چند کہ اپنی آٹھ روزہ مکّی میں نلائی لازمی تھی.... صبح دالان میں جھاڑو دیتے ہوئے بڑھیا نے بے احتیاطی سے رحمٰن کے جوتے پرے کر دئے اور بلاارادہ جوتے کی ایڑی دوسری ایڑی پر چڑھ گئی۔ شام کے قریب ارادے پست ہو جاتے ہیں۔ سونے سے پہلے انبالے جانے کا خیال رحمٰن کے دل میں کچا پکا سا تھا۔ اس کا خیال تھا وہ مکّی میں نلائی کر چکنے کے بعد وہاں جائے گا اور نیز مکّی کی مرغن غذا سے اُس کے پیٹ میں پھر کوئی نقص واقع ہو گیا تھا۔ لیکن جب صبح اُس نے پھر اپنے جوتوں کی یہ حالت دیکھی تو اس نے سوچا اب انبالے جائے بنا چھٹکارا نہیں ہے۔ میں لاکھ انکار کردوں لیکن میرا دانہ پانی اور میرے جوتے بڑے بردین ہیں، وہ مجھے سفر کے لئے مجبور کرتے ہیں۔ اس وقت صبح کے سات بجے تھے اور صبح کے وقت ارادے بلند ہو جاتے ہیں۔ رحمٰن نے پھر اپنا جوتا سیدھا کیا اور اپنے کپڑوں کی دیکھ بھال کرنے لگا۔

نیل میں دُھلے ہوئے کپڑے سوکھ کر رات ہی رات میں کیسے اُجلے ہو گئے تھے۔ نیلاہٹ میں سپیدی بہت اُبھر آئی تھی۔ اور جب رحمٰن کی بیوی نیل کے بغیر کپڑے دھوتی تھی تو یوں ہی دکھائی دیتا تھا جیسے ابھی انہیں جوہڑ کے پانی سے نکالا گیا ہو اور جوہڑ کے پانی کی مٹیالی رنگت کپڑوں میں اس طور بس گئی ہو جیسے پاگل کے دماغ میں کوئی واہمہ بس جاتا ہے۔

جینا کی ماں اوکھلی میں متواتر دو تین روز سے جو کوٹ کر تندل بنا رہی تھی۔ گھر میں پُرانا گڑ بھی پڑا تھا جس میں سے کیڑے نکال دئے گئے تھے۔ اس کے علاوہ مکّی کے سوکھے ہوئے بھٹے تھے۔ گویا جینا کی ماں جوتوں کے اس واقعہ سے بہت پہلے سفر کی تیاری کر رہی تھی اور وہ جوتے کا جوتے پر چڑھنا تو محض اس کی تصدیق تھی۔ بڑھیا کا خیال تھا تندلوں میں سے رحمٰن کا زادِ راہ بھی ہو جائے گا اور وہ اپنی بیٹی کو بھی بھیج دیگی۔

رحمٰن کو کوئی خیال آیا۔ بولا: "جینا کی ماں، بھلا کیا نام رکھا ہے انہوں نے اپنے ننھے کا؟"

بڑھیا ہنستے ہوئے بولی: "ساہق (اسحاق) رکھا ہے نام اور کیا رکھا ہے نام انہوں نے اپنے ننھے کا۔ واہ! سچ مچ کتنی کمزور ہو گئی ہے تمہاری

یادداشس!"

اسحاق کا نام بھلا رحمٰن کو کیسے یاد رہ سکتا تھا جب وہ خود بھی ننھا تھا تو اس کے دادا کو بھی رحمٰن کا نام بھول گیا تھا۔ دادا اچھا کھاتا پیتا آدمی تھا۔ اُس نے چاندی کی ایک تختی پر عربی لفظوں میں رحمٰن لکھوا کر اپنے پوتے کے گلے میں ڈال دی تھی۔ اور اُسے دیکھ کر ہر روز ہنسا کرتا تھا اُن دنوں تو نام گاموں، شیرا، فجا وغیرہ ہی ہوتے تھے۔ اسحاق، شعیب وغیرہ نام تو اب قصباتی لوگوں نے رکھنے شروع کر دئے تھے۔ رحمٰن سوچنے لگا' ساہتی اب تو ڈیڑھ برس کا ہو چکا ہوگا۔ اب اُس کا سر جھولتا نہیں ہوگا اور وہ گردن اُٹھا ٹکٹکی میری سپید سپید ڈاڑھی کی طرف دیکھتا جائے گا اور اپنے ننھے منے سے دل میں کہیگا: اللہ جانے یہ بابا، سفید بالوں والا بڈھا کہاں سے آٹپکا۔ وہ نہیں جانے گا یہ اُس کا اپنا بابا ہے۔ اپنا نانا۔ جس کے جسم کے گوشت و پوست سے وہ خود بھی بنا ہے۔ وہ چپکے سے اپنا مُنہ جینا کی گودی میں چھپالے گا۔ پھر میرا جی چاہے گا جینا کو بھی گودی میں اُٹھالوں، لیکن جوان بیٹیوں کو کون گودی میں اُٹھاتا ہے؟۔ جینا تا حق اتنی بڑی ہو گئی: بچپن میں وہ باہر سے کھیل کود کر آتی تھی تو اُسے سینے سے لگا لینے سے کتنی ٹھنڈ پڑ جاتی تھی۔ ان دنوں دل پر سلگتا ہوا اُپلا دکھا ہوا نہیں محسوس ہوتا تھا۔ اب تو وہ صرف جینا کو دُور سے دیکھ ہی سکیگا۔ اُس کا سر پیار سے چُوم لیگا۔ کیا وہی تسکین حاصل ہوگی؟

ایک بات کا رحمٰن کو یقین تھا کہ وہ اس سے مل کر بے اختیار رو دے گا۔ اس لئے نہیں کہ وہ نائیک اسے تنگ کرتا ہے بلکہ وہ زبان کی بجائے آنکھوں سے اس بات کا اظہار کر دیگا کہ جینا، میری بیٹی، تیرے پیچھے میں نے بہت سے کڑے دن دیکھے ہیں۔ جب چودھری خوشحال نے مجھے مارا تھا تو اُس وقت میری کمر بالکل ٹوٹ گئی تھی۔ میں مر ہی تو چلا تھا۔ پھر تو کہاں دیکھتی اپنے ابا کو اگر میں سچ مچ مر جاتا۔ لیکن بن آئی کون مرتا ہے۔ شاید تمہارے یا ساہتی کے پاکیں اور نیک بخت کے پاؤں کی خیرات میں بچ ہی تو رہا۔

پہلے تو ننھا گھبرائے گا، لیکن کیا اپنا لہو جوش مارنے سے رہ جائیگا؟ وہ آپی آپ ہمک کر میرے پاس چلا آئے گا۔ اور میں کہونگا ساہتی بیٹا، دیکھ تیرے لئے لایا ہوں تندل اور گڑ ..... اور جب تلنگے سے میری تو تو میں میں ہوگی تو میں اُسے خوب کھری کھری سناؤں گا۔ وہ ناراض ہو جائیگا، کیا پتہ کہنے لگے تم اپنی بیٹی کو لے جاؤ، گھر رکھو اسے، لیکن میں اُسے لعن طعن کے بعد منا بھی تو لونگا۔ کتنا آسان طریقہ ہے اُسے منانے کا ــ میں سکر جیسے کو اُٹھائے پھرونگا، گلی گلی، بازار بازار .....

رحمٰن نے نلائی کا بندوبست کیا۔ کھڑی کھیتی کی قسم پر کچھ روپے اُدھار لئے۔ سوغات باندھی اور زادِ راہ بھی اور یکے پر پاؤں رکھدیا۔ بڑھیا نے اُسے خدا کے حوالے کرتے ہوئے کہا: "بصرے چلا جائیگا علیا چند دنوں میں، ساتھ ہی لے آنا میری جینا کو اور میرے ساہتی کو۔ اللہ جانے کب دم نکل جائے۔"

ابھی رحمٰن ملکہ رانی سے مانک پور ہی پہونچا تھا کہ اس نے اسحاق کے لئے کئی چیزیں خرید لیں۔ ایک چھوٹا سا شیشہ تھا، ایک سیلولائڈ کا جاپانی جھنجھنا جس میں نصف درجن کے قریب گھنگھرو ایک دم بج اُٹھتے تھے۔ ملکہ رانی سے مانک پور تک یکہ چلتا تھا اور مانک پور سے رحمٰن نے ایک چھوٹا سا گڈیرا بھی خرید لیا تاکہ اسحاق اسے پکڑ کر چلنا سیکھ جائے۔ کبھی رحمٰن سوچتا اللہ کرے اسحاق کے دانت اس قابل ہوں کہ وہ مکی کے بھٹے کھا سکے۔ وہ کم سے کم اتنا بڑا ہو چکا ہو۔ پھر ایک دم اس کی خواہش ہوتی کہ وہ اتنا چھوٹا ہو کہ چلنا بھی نہ سیکھا ہو۔ اور جینا کی پڑوسنیں جینا سے کہیں، ننھے نے اپنے نانا کے گڈیرے پر چلنا سیکھا ہے اور رحمٰن نہیں جانتا تھا کہ وہ اُسے بڑا دیکھنا چاہتا ہے یا چھوٹا۔ صرف اُس کی خواہش تھی اُس کے تندل، اُسکے بھٹے، اس کا شیشہ اس کا جاپانی جھنجھنا اور باقی سب خریدی ہوئی چیزیں سپھل ہوں، انہیں وہ قبولیت حاصل ہو جس کا وہ متمنی ہے۔ کبھی وہ سوچتا جینا کیا گاؤں کے گنوار لوگوں کے ان تحائف کو پسند کریگی؟ کیا عجب وہ محض اس کا دل رکھنے کے لئے ان چیزوں کو پاکر باغ باغ ہو جائے۔ لیکن کیا وہ میرا جی رکھنے کیلئے ہی ایسا کریگی؟ پھر تو مجھے بہت دُکھ ہوگا۔ کیا میرے تندل سچ مچ اُسے پسند نہیں آسکتے؟ میری بیٹی کو، میری اپنی جینا کو۔ علیا تو کچھ بھی نہیں پسند کرنے کا وہ تو نائیک ہے۔ خدا جانے صاحب لوگوں کے ساتھ وہ کیا کچھ کھاتا ہوگا۔ وہ کیوں پسند کرنے لگا میرے تندل۔ اور رحمٰن مانکپور پہونچکر کانپنے لگا۔

رحمٰن کو جسمانی اور ذہنی تھکاوٹ کی وجہ سے نیند آنے لگی۔ رات کے گوشت نے اُسکے پیٹ میں کوئی سوئی ہوئی چیز بیدار کر دی تھی۔ آنکھوں میں گدلاہٹ اور تیرگی تو تھی ہی۔ لیکن کچھ سفر، کچھ مرغن غذا کی وجہ سے آنکھوں میں سے شعلے نکلنے لگے۔ رحمٰن نے اپنے پیٹ کو دبایا۔ تلی والی جگہ پھر ٹھس سی معلوم ہوتی تھی۔

رحمٰن کو ایک جگہ پیشاب کی حاجت ہوئی اور اُس نے دیکھا کہ اس کا قارورہ سیاہی مائل گدلا تھا۔ رحمٰن کو پھر وہم ہو گیا۔ بہرحال، اُس نے سوچا اُسے پرہیز کرنا چاہیئے۔ پُرانا مرض پھر عود کر آیا ہے۔

گاڑی میں کھڑکی کے پاس سے شمالی، ٹھنڈی ہوا فراٹے بھرتی ہوئی

اندر داخل ہو رہی تھی۔ اس کے خلاف آنکھیں کرنے سے ایسی ٹھنڈک محسوس ہوتی تھی جیسے کسی نے آنکھوں میں میرے کا سُرمہ ڈال دیا ہو۔ درختوں کے نظر کے سامنے گھومنے اور کبھی کبھی آنکھیں بند کرنے اور کھولنے سے رحمٰن کو گاڑی لکل ایک ہنگورے کی طرح آگے پیچھے جاتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ دو تین اسٹیشن ایک اونگھ سی میں نکل گئے۔ جب وہ کرنال سے ایک اسٹیشن درے تھا تو اسکی آنکھ کھل گئی۔ اسکی سیٹ کے نیچے سے گٹھڑی اُٹھالی گئی تھی۔ صرف اُسکے اپنے گذارے کیلئے تندل چادر کے پلو میں بندھے رہ گئے تھے یا اسکے پھیلے ہوئے پاؤں میں گڈیرا کھڑا تھا۔

رحمٰن شور مچانے لگا۔ اس ڈبہ میں ایک واجبی وضع قطع کے آدمی خبار پڑھ رہے تھے۔ مت شور مچاؤ بڈھے! مت شور کرو کھوسٹ! وہ چلائے۔ لیکن رحمٰن بولتا چلا گیا۔ اُسکے سامنے ایک بٹی ہوئی مونچھوں والا لفنگا سا سنتری بیٹھا تھا۔ رحمٰن نے اُسے پکڑلیا اور بولا: "تو نے میری گٹھڑی اُٹھوائی ہے بیٹا!" سنتری نے ایک جھٹکے سے رحمٰن کو پرے پھینکدیا۔ اس معمولی سی کھینچا تانی میں رحمٰن کا دم پھول گیا۔ اسکے بعد بابو پھر شور مچانے لگے: "تو سو کیوں گیا تھا بابا، تو سنبھال کے رکھتا اپنی گٹھڑی کو، تیری عقل چرنے گئی ہے بابا؟"۔

رحمٰن اس وقت تمام دنیا سے لڑنے کو تیار تھا۔ درحقیقت دُنیا اسکی نظروں میں بہت ہی سمٹ گئی تھی۔ اور اس کا وجود سنتری، دو بابوؤں اور گٹھڑی تک محدود تھا۔ سنتری سے ہاتھا پائی میں اُس نے سنتری کی وردی پھاڑ ڈالی۔ سنتری نے گڈیرے کا لٹھا اُٹھا کر زور سے رحمٰن کے مارا۔ اس اثنا میں ٹکٹ چیکر کمرے میں داخل ہوگیا۔ لے کیا ہے، اے کیا ہے رے۔ اُس نے بھی گاڑی میں بیٹھے ہوئے لوگوں کے مطابق رحمٰن کو گالیاں دینا شروع کیا۔ اور متفقہ فیصلہ ہوا کہ کرنال پہنچ کر اسے گاڑی سے اتار دیا جائیگا اور پولیس کے حوالے کیا جائے گا۔ اسی تو تو میں میں میں ایک لات رحمٰن کے پیٹ میں لگی اور وہ فرش پر لیٹ گیا۔

کرنال آچکا تھا۔ رحمٰن، اسکی چادر اور گڈیرا پلیٹ فارم پر اُتار دئے گئے، گڈیرا پلیٹ فارم پر دھرا رہ گیا۔ اسکے علاوہ ایک گانٹھ جس میں مکی کے بھٹے تھے مسافر خانے کے قریب پٹخ دی گئی۔ اس میں سے بھٹے نکل کر پلیٹ فارم پر لڑھکنے لگے۔

رحمٰن کے پیٹ میں بہت چوٹ لگی تھی۔ اُسے سٹریچر پر ڈال لیا گیا اور اُسے کرنال میں ریلوے ہسپتال میں لے جایا گیا۔

جینا، ساہتقا، علی محمد، جینا کی ماں .... ایک ایک کرکے رحمٰن کی نظروں کے سامنے سے گذرنے لگے۔ زندگی کی فلم کتنی چھوٹی ہوتی ہے، اس میں بمشکل تین چار آدمی اور ایک دو عورتیں ہی آسکتی ہیں۔ باقی مرد عورتیں آتی ہیں لیکن ان میں کچھ بھی تو یاد نہیں رہتا — جینا، ساہتقا، علی محمد اور جینا کی ماں! یا کبھی کبھار اِن ہی لوگوں کے لئے کشمکش، لڑائی کا واقعہ ذہن میں تازہ ہوجاتا ہے مثلاً گڈیرا پلیٹ فارم پر پڑا ہوا، اور مکی کے بھٹے جنہیں خلاصیوں، واچ مینوں، سگنل والوں کے آوارہ چھوکرے اُٹھا اُٹھا کر بھاگ رہے ہوں اور اُن کے کالے کالے چہروں میں سفید دانت بالکل اسی طرح دکھائی دیں جیسے اس تاریک سے پس منظر میں ان کا ہنسنا، قہقہے لگانا، مال غنیمت کے ہاتھ لگنے سے خوش ہونا .... یا ذہن کے کسی کونے میں کوئی پولیس مین اپنی ڈائری میں چند ضروری اور غیر ضروری تفاصیل لکھ رہا ہو۔

پھر لات ماری؟

ابھی! یہ نہیں ہوسکتا... اچھا پھر لات ماری۔

اور پھر.....

— اور پھر ہسپتال کے سفید بستر، کفن کی طرح منہ کھولے ہوئے بستر اور چار پائیاں۔ عزرائیل نما نرسیں اور ڈاکٹر!

رحمٰن نے دیکھا اس کی چادر ہسپتال میں اُس کے سرہانے پڑی تھی: "یہ بھی وہیں چھوڑ آئے ہوتے" رحمٰن نے کہا "اس کی مجھے کیا ضرورت ہے؟" اسکے علاوہ رحمٰن کے پاس اور کچھ نہ تھا۔ ڈاکٹر اور نرس اُس کے سرہانے کھڑے تھے اور ہر لحظہ سپید چادر کو منہ تک سرکا دیتے تھے۔ دفعتاً رحمٰن کو قے کی حاجت ہوئی۔ نرس نے فوراً ایک چلمچی بیڈ کے نیچے سرکا دی۔ رحمٰن اُٹھ کر قے کرنے کے لئے جھکا اور اُس نے اپنے جوتے بدستور جلدی سے چارپائی کے نیچے اُتار دئے تھے اور جوتے پر جوتا چڑھ گیا تھا۔ رحمٰن ایک میلی سی سکڑی ہوئی ہنسی ہنسا۔ اور قے کے بعد ڈاکٹر سے بولا "ڈاک دارجی! مجھے سفر پہ جانا ہے، آپ دیکھتے ہیں میرا جوتا جوتے پر کیسے چڑھ رہا ہے"

ڈاکٹر جواباً مسکرایا اور کہا "ہاں! بابا تجھے بڑے لمبے سفر پر جانا ہے، بابا!"..... اور ڈاکٹر نے رحمٰن کی چادر ٹٹولتے ہوئے کہا —— "لیکن تیرا زادراہ کتنا ناکافی ہے بابا، فقط یہی تندل ...... اور اتنا لمبا سفر" —— بس جینا، جینا کی ماں، ساہتقا، علی محمد، اور وُہ افسوسناک واقعہ ....

رحمٰن نے اپنے زادراہ پر ہاتھ رکھدیا اور ایک بڑے لمبے سفر پر روانہ ہوگیا!

راجندر سنگھ بیدی

نوائے وقت

نوعِ انسانی ہے جبرِ پیہم کی شکار
چاہتا ہوں میں وہ آئینِ جہاں برہم کروں

بجلیوں کے ہیں شرارے جس کی تاروپود میں
وہ ہلاکت کے جہاں وہ آشیاں برہم کروں

رہزنانِ عافیت کا یہ منظّم کارواں
عافیت کے رہزنوں کا کارواں برہم کروں

وہ ستم توڑوں نہنگانِ جہاں بھی چیخ اٹھیں
یہ صفِ عیشِ نہنگانِ جہاں برہم کروں

خونِ انسانی سے ہے رنگین جس کا یہ ورق
عالمِ تہذیب کی وہ داستاں برہم کروں

دیکھ ہے کیا اتحادِ جسم وجاں شر آفریں
کیوں نہ ایسا اتحادِ جسم وجاں برہم کروں

عرصۂ ہستی ہو اس کے بیذق وفرزیں پہ تنگ
یہ بساطِ فتنۂ عہدِ رواں برہم کروں

اس جہانِ اندک و بسیار کو کردوں تباہ
فردِ فردِ دفترِ سود وزیاں برہم کروں

مے سمجھ کر پی رہا ہے جو غریبوں کا لہو
وہ طرب کا مجمعِ جنت نشاں برہم کروں

جگمگاتے قصر وایواں کو ملادوں خاک میں
سازوسامانِ غرورِ این وآں برہم کروں

پینے والوں میں یہ کیسا امتیازِ خاص و عام
توڑدوں جام وسبو بزمِ مغاں برہم کروں

نظمِ گیتی ہو نہیں سکتا ہے کارِ ابلہاں
فرشِ گیتی سے ہجومِ ابلہاں برہم کروں

یک قلم آفاق کو کردوں سبکسارِ ملال
اک سرے سے لشکرِ رنجِ گراں برہم کروں

وقت ہوں میں اک جہانِ نو بسانا ہے مجھے
اس دہکتی آگ کو گلشن بنانا ہے مجھے

ہو مبارک تجھکو دورِ عیش وگلبانگِ نشاط
عصرِ نو آتا ہے اے امیدوارِ عصرِ نو

نالہ کش ہے آج جو اس کارگاہِ دہر میں
کل اسی کو دیکھیو تو کامگارِ عصرِ نو

آج دنیا بندۂ مزدور کہتی ہے جسے
بالیقیں ہوگا وہی کل شہریارِ عصرِ نو

عہدِ حاضر کو نہیں ہے قدر جن نغمات کی
کل وہ سمجھے جائیں گے پروردگارِ عصرِ نو

مہرِ عالمتاب کہتا ہے زمانہ جس کو آج
کل کہے گا اس کو جامِ زرنگارِ عصرِ نو

دیدۂ انساں میں پھر جائے گی تصویرِ بہشت ؎ کیف ساماں اس قدر ہوگی بہارِ عصرِ نو
زندگی کا نام ہوگا اک بہارِ مستقل ؎ زندگی ہوگی نشاطِ پائیدارِ عصرِ نو
صبح ہوگی عصرِ نو کا عارضِ گیتی فروز ؎ شام کہلائے گی زلفِ مشکبارِ عصرِ نو
سر خمیدہ عجز سے ہوجائے گا چرخِ بلند ؎ دیکھ کر اوجِ کلاہِ افتخارِ عصرِ نو
ارتقائے ابنِ آدم سے ستاروں کا جہاں ؎ کیا تعجب ہے جو کہلائے غبارِ عصرِ نو
اعتبارِ عشرتِ میخواری جم کی قسم ؎ غیرتِ خم ہوگا ادنےٰ بادہ خوارِ عصرِ نو

رنگ عالم را چہ می پرسی چساں خواہد شدن
خاک را اصل وقارِ آسماں خواہد شدن

آج کانٹے ہیں اگر تیرے مقدر میں تو کیا ؎ کل ترا بھر جائے گا پھولوں سے دامن غم نہ کر
تو نظر آتا ہے جس زنجیرِ آہن میں اسیر ؎ ٹوٹ جانے کو ہے وہ زنجیرِ آہن غم نہ کر
اک نیا عہدِ محبت آسماں لانے کو ہے ؎ متحد ہوجائیں گے شیخ و برہمن غم نہ کر
میں نے مانا آج سونی سی ہے تیری بزمِ دل ؎ کل یہ ہوگی غیرتِ وادیِ ایمن غم نہ کر
منزلِ مقصود ہے ہرچند مثلِ ہفتخواں ؎ گر سلامت ہے تری ہمت کا توسن غم نہ کر
دیکھتا ہے آج جس گلشن کو تو وقفِ خزاں ؎ تازہ کیسا تازہ تر ہوگا وہ گلشن غم نہ کر
پھر نشاطِ تازہ کا پیغام لائے گی بہار ؎ پھر چمن میں بلبلیں ہوں گی نوا زن غم نہ کر
قطرہ اک دن بحر بن جائے گا خونِ دل نہ پی ؎ دانہ کو تیرے ملے گی شانِ خرمن غم نہ کر
نکتۂ تعمیر پنہاں ہے ہر اک تخریب میں ؎ بجلیاں ہیں طرح اندازِ نشیمن غم نہ کر
چشمِ بینا ہے تو غم کی غایتِ پنہاں کو دیکھ ؎ شامِ ظلمت ہے دلیلِ صبحِ روشن غم نہ کر
اک نیا عالم دکھائے گا کلیمِ عصرِ نو ؎ گرمِ رخصت ہے یہ عہدِ سامری فن غم نہ کر
گل اگر اک شمع ہوتی ہے ہوائے دہر سے ؎ سینکڑوں اس کی جگہ ہوتی ہیں روشن غم نہ کر
ایک عہدِ تازہ آیا چاہتا ہے جام اٹھا ؎ غم نہ کر اے مائلِ فریاد و شیون غم نہ کر

اس قدر شاداب ہوجائے گی کشتِ زندگی
یہ جہاں کہلائے گا اک دن بہشتِ زندگی

نہال سیوہاروی

رفیقۂ حیات کے نام

میں اپنی طبع کی آوارگی سے خائف ہوں کہ مجھکو پھر یہ ہوا و ہوس میں ڈال نہ دے
تری نظر نے مجھے جو کمال بخشا ہے یہ اس کمال کو خمیازۂ زوال نہ دے
مرے لہو کو یہ وحشت سے ملتہب نہ کرے سکونِ قلب کو ترغیب اشتعال نہ دے
ترے لئے یہ کہیں وجہِ غم نہ بن جائے مجھے کہیں قلق شرم و انفعال نہ دے
خدا کرے کہ مجھے فصلِ گل کی رعنائی تخیّلات ملوث بہ ابتذال نہ دے

مبادا اپنا مقام بلند کھو بیٹھوں
مری ہوس مجھے فردوس سے نکال نہ دے

میں تیرا ہو کے بھی تیرا نہیں۔ نہیں نہ سہی نہ کر خدا کے لئے اس قدر ملال نہ کر
اگر میں آگ میں گرتا ہوں مجھکو گرنے دے دُعائیں پیش خداوندِ ذوالجلال نہ کر
مرے گنہ ترے اشکوں سے دُھل نہیں سکتے مری خطاؤں پہ اظہارِ انفعال نہ کر
خدا کے واسطے چھلکا نہ آبگینوں کو ہتھیلیوں سے تو آنکھوں کو مَل کے لال نہ کر
ہر ایک سمت اندھیرا سا چھائے جاتا ہے وفورِ غم سے پریشان اپنے بال نہ کر
پریدہ رنگ۔ پریشاں نگاہ۔ پژمردہ تو میرے حال کی مانند اپنا حال نہ کر
ستارے سنتے ہیں۔ خورشید و ماہ سنتے ہیں خدا کے واسطے رو رو کے عرضِ حال نہ کر
میں تیرے پاؤں پہ گرتا ہوں مجھکو ٹھکرا دے یہ اک حقیر سی خواہش ہے پائمال نہ کر

میں تیرے واسطے چُن چُن کے پھول لایا ہوں
جواہرات سے کم ترا نہیں خیال نہ کر

مجید ملک؛

جانی مرزا۔ لہاکر "اماں نہیں کن رس وَن رس تو گیا، اتنا ہے کہ آپ لوگوں کو سنتے سنتے کان اک ذری منج گئے ہیں"

چھجو خاں۔ "اور حضور یہ اُستاد بھی کیا معنے کہ اپنے وقت کے گندھرپ ہیں، پھانسا ہی تھا آج تاروں کے جال ہیں، وہ تو کہئیے بات پہ مرشدوں کا سایہ ہے جو بنپ گیا خداوندا اور جیوٹ پنے سے لے کو ساودھے رہا، کیا معنی کہ بڑا بکٹ حساب آکے پڑا تھا، دانتوں پسینہ آگیا"

اُستاد۔ "واہ کیا بات ہے خانصاحب، آخر کے تئیں اُستاد ابن اُستاد ہو" (جانی مرزا سے) "اِن کو پہچانا نہیں حضور نے شائت؟ ای اللہ بخشے (کان کو ہات لگاکر) سِدّھار خاں جی کے خاص الخاص بردتے ہیں، اس موئی کھال کو آبرو تو ان ہی کے گھر سے ملی ہے"

جانی مرزا۔ "اخاہ یہ کہئیے، جبھی ماشاء اللہ سے ہات اتنا سُکھی اور رسیلا ہے، اس پہ بے داری، بولوں کی صفائی اَے سُبحان اللہ، میں دیکھ رہا تھا ایک ایک فقرہ پرکار سے ناپ ناپ کے جیسے قینچی سے کتر رہے ہوں، اور میاں تم لوگوں نے فقط نام سُنا ہے سِدّھار خاں کا، ہم نے تو برسوں انہیں برتا ہے، پکھاوجی بھوانی داس سے ان کے ڈانڈے مینڈے تھے، اسے زک دینے کے لئے طبلہ بنایا، اور بول بانٹ کرکے جو سناتے ہیں تو چھکے چُھوٹ گئے لالہ بھوانی کے، دھرے رہ گئے کھٹرے اور پسرنیں، جہاں پناہ نے بھی تو اُن کے طبلے کا مُنہ ہیرے موتی سے بھروا دیا تھا، اور لے کے تو شہنشاہ تھے وہ، ہائے واللہ یقین مانو استاد، ان آنکھوں نے دیکھا ہے کہ گھر سے نکلے ہیں کسی کام کو، عالم یہ ہے کہ کبھی تتالے میں چل رہے ہیں، کبھی سول فاختہ میں قدم پڑ رہا ہے، چلتے چلتے کوئی مشکل ٹکھڑا یاد آگیا، اب جو قدم اُٹھتا ہے تو واللہ کفشوں کے نشان سے حساب لگالیجیے کہ خانصاحب دُرت لے میں گئے ہیں یا مدھ میں" (حکیم صاحب سے) "کیوں قبلہ حکیم صاحب آپ نے بھی تو اس کوچے کی خوب خاک چھانی ہے؟ خلاف تو نہیں اس میں"

حکیم صاحب۔ (میر فدا حسین عرف فِدن صاحب۔ طب سے آشنا، فارسی داں، عربی خواں) "اے معاذ اللہ، مومن پہ بدگمانی مرزا صاحب کسی کافر زندیق کا کام ہوگا، آثم تو زائرِ کربلا، حاجی حرمین ہے، آپکے قولِ راسخ پر کیوں کر تعریض کرسکتا ہے"

چھجو خاں۔ "جدامجد کے بعد تلکن اور لکھو نے بھی کیا معنی کہ کچھ کم نام نہیں کمایا، وہ بجایا وہ بجایا کہ ہاروت ماروت کی آبرو پانی ہوگئی، کنوئیں جھانکنے لگے، جی اور کیا پیرو مرشد"

اُستاد۔ "اس میں کیا شک ہے قربان جاؤں، پر اتنا ہے کہ یوں تو استاد لکھو کے ہات میں بجلیاں تڑپتی تھیں، پر تلکن کے مقابلے میں لے کا ذری گھٹ کے تھے، آدھا پاؤ ماترا کبھی کبھی چبا جاتے تھے"

جانی مرزا۔ "فِدن صاحب، وہ شہزادہ فغفور مرزا کے ہاں کے جگمگٹ بھی یاد ہیں؟ مسند پہ متمکن ہیں، لب معشوق سے شغل ہے، سامنے بی ثمّو گنگوتری اور کیا نام کہ بنگلہ والی رادھا، بارہ ابرن سولہ سنگار کئے بیٹھی بُلبُل کی طرح چہک رہی ہیں، طنبورے ایک کو میں بندھے ہوئے میٹھی میٹھی آنس دے رہے ہیں، اُدھر میاں روشن علی خاں بین کا رڈٹے ہوئے ہیں، اچُھنگی چل رہی ہے۔ نشے جمے ہیں، آنکھوں سے شہاب ہے کہ ٹپکا پڑتا ہے، پہلو میں بین کیا دھری ہے معلوم ہوتا ہے کوہ قاف کی نیلم پری ہے، ہائے واللہ کیا جھمکڑے تھے! کیا جھمکڑے تھے!!"

فِدن صاحب۔ ٹھنڈی سانس لے کر "مرزا صاحب سب کچھ یاد ہے اور ایسا یاد ہے کہ آج بھی خیال آتا ہے تو قسم ہے ضریح حسین کی کلیجے پہ سانپ لوٹ جاتا ہے" (آہستہ سے) "شمو سے تو آخیر میں اس نحیف سے واسطہ ہوگیا تھا نا"

جانی مرزا۔ "جبھی میں نہیں جانتا، آئے ڈودرے تو شہزادہ صاحب کی محفلوں ہی سے پڑنے لگے تھے، معلوم نہیں جیتی بھی ہیں یا گزر گئیں؟"

اُستاد۔ بات کاٹ کے "گزر گئیں خداوندا یا آج پٹنہ عظیم آباد میں بی شمیم آرا کے نام کی دوہائی پِٹ رہی ہے، اچھے اچھے پوٹلوں کے تماشبین رئیسوں کو کنگال کر کے لنگوٹی کو محتاج کردیا"

فِدن صاحب۔ (باچھیں کھل گئیں) "کیوں نہ ہوتی ہی وہ ایسی ناطورہ ملائک فریب، غارت گر صبرو شکیب کہ اُس کی ایک گردشِ چشم کے لئے اگر زاہد صد سالہ اپنی متاع ایمان وقف نہ کردے تو واللہ ہے کہ مجھے اُس کی بخشائش میں شک ہے"

جانی مرزا۔ "میاں روشن علی کو تو کیا سُنا ہوگا تم نے؟ شانوں سے سُر نکلتے تھے اُن کے، واللہ شانوں سے، دلی والے میر ناصر علی نائک کے نام لیواؤں میں تھے"

اُستاد۔ قربان جاؤں سُنا ہوگا کیا معنی غلام کو اس در سے فیض پہنچا ہے، جُگ جُگ رہے نام ان کا، یہ جو غلام کچھ ٹوں ٹاں کرلیتا ہے انہی کی جوتیوں کا تصدق ہے، کسی دن حکم ہو بین پر دوگتیں عرض کروں اور مینڈ ماند میں وہ ہُنر دکھاؤں کہ لوگ کہیں سُروں کے پینگ دے

رہا ہے، میاں کی ملھار اور کانھڑا اس لطف سے بجاؤں گو یا محمد شاہ کی سواری آ رہی ہے، قربان جاؤں اُستاد کے، جوے کی تیاری اس بلا کی ہے کہ بجاتے بجاتے ہات سیدھا کردوں تو معلوم ہو پھرکی گھوم رہی ہے، وہ مزا ملے کہ نیند آنے لگے جیسے کان میں کوئی پھریری کر رہا ہے۔"

جانی مرزا۔ "ضرور ضرور، یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے، جس دن مزاج چاہے، گھر تمہارا ہے، مگر یہ کرنا کہ ذری پہلے سے کہلا بھیجنا، چار چھے تولے قوام اور بنوا لیں گے، یہ نہ ہو کہ جانی مرزا کے ہاں آؤ اور پیاسی آ تما لے کے جاؤ۔"

اُستاد۔ کھل گئے: "اے اللہ سلامت رکھے، دیکھا ماں جھجو خاں صاحب کیا جواہرات میں تولنے لائق کا مجازنہ پایا ہے ہمارے سرکار نے، سمجھ گئے کہ اِدھر استاد نے معتاد سے چار چھینٹے زیادہ لئے اور دو ڈاڑ رگوں میں کالی مائی کا رنگ، اُدھر نس نس سے سرسوتی جی بولنے لگیں۔"

جھجو خاں۔ "ایسی محفل میں غریب کو نہ بھول جایئے گا، آپ کے طفیل میں رتی دو رتی اپنی کے حق دار ہم بھی ہیں۔"

فدن صاحب۔ "اے ہاں جانی مرزا صاحب، باتوں باتوں میں یہ وقت ہو گیا، اور جانگتی جوت کے خداوند ہیں کہ ابھی تک خاموش پڑے ہیں، قبلہ اُٹھئے لمپ ڈمپ روشن کیجئے، دو دو چھینٹے لیجئے، یہاں جمائیوں کی ڈاک لگی ہوئی ہے، جسم کا جوڑ جوڑ کھلا جا رہا ہے، لعنت واللہ اس شیطانِ رجیم پر کہ مغربین بھی نہ ادا کرنے دی اور ڈُریا کر یہاں لے آیا۔"

جانی مرزا۔ "این واللہ چھینٹوں میں اب کیا منت ہے، آج حکم سے پروردگار کے قوام بھی وہ بنا ہے کہ بایدو شاید، لبوں تک نگالی آئی نہیں کہ دُھت ہوئے نہیں۔"

یہ کہہ کر جانی مرزا صاحب نے نہایت نفاست کے ساتھ چانڈو کا نقشہ جمایا۔ شالباف کے غلاف سے نگالی نکالی گرمٹ کے سوراخ میں سلائی پھرا کے اپنی کا رُوا جھٹکا، اور نگالی میں جوڑ کے لمپ روشن کیا۔

فدن صاحب۔ نگالی کو اُلٹ پلٹ کر، "کتنی سُبک ہو واللہ، اور گرمٹ کا تناسب!! اے سبحان اللہ، گویا شاخِ گل پہ بُلبل کو بٹھایا ہے، حق تو یہ ہے کہ جانی مرزا صاحب، جب نگالی آپ نے عجوبہ شے ہی نکالی۔"

جانی مرزا۔ "یہ جوہر شناسی ہے آپ کی واللہ ورنہ یہ گردتے ہے تو کس قابل ہے۔" (فخریہ) "مبہ یہ وہی رانا دُرجے سنگھ کی مشہور ناگن" ہے، جس کے پیچھے جے پُر والے سے تا بہ لندن مقدمہ لڑا گیا تھا، اور آخر میں یلام پہ چڑھ کے شہزادے بیدار بخت بہادر کے نام سترہ سئے میں چھوٹی تھی، صاحب عالم (انگشت شہادت اور بیچ کی اُنگلی پہ انگوٹھا رگڑ کے) اس چُٹکی کی جُنبش پر آپ جانتے ہیں ہزار جان سے فدا تھے، ایک روز بناکر جو پیش کرتا ہوں تو اتنی پُرتاثیر کہ ٹیٹوے سے بہ قدر اشک بلبل ہی اتری ہوگی جو کیف میں آ گئے اور ترنگ میں نگالی خادم کو بخش دی، میں نے ڈرتے ڈرتے عرض بھی کیا کہ صاحب عالم مزاج شاہی کسی دن چانڈو کی طرف مائل ہوا تو، فرمایا، بھئی جانی مرزا بڑے نادان ہو، اماں رزاق عالم کے خزانہ میں یہی ایک نگالی تھی؟ نیت بخیر چاہیئے ایک دو نگا غیب سے دیکھنا سستر ملیں گی۔" قائل ہو گیا فدن صاحب، اور مجرا عرض کر کے نذر دکھائی، ایک معمولی سی کرامات عرض کرتا ہوں اس کی اخالی دو دم کھینچئے، پورا عمل لیجئے۔"

اِس گفتگو کے بعد چاروں شوقینوں نے گل تکیے سنبھال فرش پر دراز ہو، باری باری سے چانڈو نوش کیا، دو دو چھیے بالائی اور ورق چڑھی برفی کی ایک ایک ڈلی گزک کھا کے دس بجتے بجتے عمل میں شرابور ہو گئے۔"

اُستاد۔ جو غین ہو چلے تھے۔ "قربان جاؤں خداوند، یوں تو چانڈو و افیم غلام کو میراث میں ملے ہیں، پر قسم لے لیجئے جو آج تک غلام پہ یہ طلسم کھلا ہو کہ آخر کے تئیں اس کا اور چھور کیا ہے، اس کی پہل کس بندہ خدا نے کی؟"

جانی مرزا۔ "بھئی اس گھر میں ہم بند ہیں، یہ حصہ حکیم فدن صاحب کا ہے۔"

فدن صاحب۔ (سنجیدہ تیوروں سے لیاقت بگھار کے) "جانی مرزا صاحب عوام پر رموز طبیہ کا انکشاف اگرچہ سلف کے نزدیک ممنوع قرار دیا گیا ہے، مگر بہ محوائے الامر فوق الادب، اس ہیچمیرز بے بساط کم سواد کو علوم صدریہ سے جو حصہ بقدر جثہ عطا ہوا ہے اُس میں سے مشتے نمونہ از خروارے معرض بیان میں لایا جاتا ہے، سُنیئے، دروغ در راست برگردن راوی، کتب قدیمہ میں ثقات سے مروی ہے کہ جب سہراب یل نوجوان، رستم سیستاں کے گرز گاؤسر کی ضربت کھا کر میدان نبرد میں گرد برد ہوا، اور باپ نے بیٹے کو پہچانا اُس وقت رستم نے کیکاؤس سے جو تریاک منگایا ہی افیون لبن الخشخاش، یا بہ زبان سُریانی دیملیامی نون تھا، نتیجہ بدیہی کہ کیکاؤس افیمی اور خود رستم دستانِ تریاق اسود افعال و خواص سے واقف، جمہور یونانیاں اس کو بارد یابس بدرجہ رابع مانتے ہیں، اور متاخرین اطبائے ہند جاریابس، اور یہ خاکپائے حکما مرکب القویٰ کہتا ہے، یعنی اسکا ایک جزحار

لطیف ہوائی، اور دوسرا بار کثیف ارضی۔"

جانی مرزا۔ "سبحان اللہ فدن صاحب، کیا وضاحت فرمائی ہے، سماں بندھ گیا۔"

اُستاد۔ "قربان جاؤں اتنا او معلوم ہو جاتا کہ کیکاؤس نے رستم کو افیم دی کہ نہیں۔"

فدن صاحب۔ "تاریخ اس باب میں ساکت ہے، مگر قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ نہیں دی، یا دی بھی تو اتنی دیر سے کہ سہراب کا واقعہ ہو چکا تھا۔"

اُستاد۔ (آنکھیں پھاڑ کے) یعنی سہراب کے دشمنوں کا انتقال ہو گیا؟ ہائے واللہ کیا کڑیل۔ بچہ سَتّا جوان تھا۔" (ستار پر ہات رکھ کے) اس ساز کی قسم خداوندا، رستم کی جگہ غلام ہوتا تو پکڑ کے ڈانڈو وہ دیتا پھرا کے تو بنا سر پر کہ میاں کیکاؤس کی آنکھوں تلے تارے چھٹک جاتے، غضب خدا کا برادری کا بچہ دم توڑے، اور یہ جُتی برابر افیم سے دریغ کرے، آدمی تھا کہ جنور؟"

چھجو خاں۔ "لیجئے حکیم صاحب کی بدولت آج معلوم ہوا کہ افیم چانڈو صدیوں پہلے ایجاد ہوئے تھے، کیا معنی کہ اگلے رئیس نواب بھی ان کے قدردان تھے، اور اُستاد یہ کیا کہا آپنے، ایک سے ایک کٹر پڑا ہوا ہے دُنیا میں، کسی قصائی دسائی کا لونڈا ہو گا یہ کیکاؤس۔"

جانی مرزا۔ "اب طبیعتیں کڑوی کرنے سے فائدہ؟ جی قبلہ آگے چلیئے۔"

فدن صاحب۔ "ہاں تو میں یہ عرض کرنا چاہتا تھا کہ اس کے افعال و خواص پر بھی دو لفظیں سُن لیجئے، جہلا کا خیال ہے کہ معاذ اللہ معاذ اللہ افیون نشہ کرتی ہے، یہ غلط العام کی ایک روشن مثال ہے، اصلاً اسکا فعل خدر یعنی سُن کرنا ہے اور کچھ نہیں، قابض ہے اور سُدے پیدا کرتی ہے۔"

چھجو خاں۔ "کیا خدا لگتی بات کہی ہے حضور نے، جب ہی تو فدوی کیا معنی کہ گھنٹوں جوجھتا ہے تب کہیں فراغت ہوتی ہے، ایک دفعے مجرا بجانے رات کی گاڑی سے کان پور چلا، ریل چھٹتے ہی حاجت معلوم ہوئی، گیا اور طہارت کر کے جو نکلتا ہوں تو آئیں! تڑکا ہو گیا، الہ آباد کا اسٹیشن ہے اور ریل کھڑی ہے، کیا معنی کہ سدوں ہی سدوں میں دو اڑھائی سے کوس سرک گئے۔"

فدن صاحب۔ "ادویہ اور مرکبات میں اگر قدرے افیون شریک کر دی جائے تو اُن کو سڑنے گلنے سے باز رکھتی ہے۔"

اُستاد۔ "یہ ترکیب اچھی بات آئی۔ غلام بچپن سے شیر برنج کا عادی ہے، گرمیوں میں خداوندا دھر قلفی جمائی اُدھر بلبلے اُٹھے اٹھیر تی ہی نہیں

ظالم، اب کیا ہے، ادھر ہانڈی اتری اور چُسکی سے بچا کر نہیں تو جو گاہی ٹپ کر ڈالیں چار بوندیں۔ اور مزے سے ہفتوں کو فرصت۔"

فدن صاحب۔ "گولی کھائیے، چُسکی پیجئے، چانڈو کھینچئے بہرحال غفلہ فرد ہو۔ طبیعت میں انکسار آئے اخلاق وسیع ہوں۔"...

حکمت مآب کا لمڑ و راچھینٹوں کے زور پہ خدا جانے کہاں تک بڑھتا جو کسی کی آہٹ نے چلتی گاڑی میں روڑا اٹکا دیا،

آواز۔ "لو گو ہم بھی آسکتے ہیں، زنانہ ونانہ تو نہیں ہے؟"

جانی مرزا۔ "(آواز پہچان کر) کون؟ مرزا صاحب؟ آئے آیئے نا آپ سے کوئی پردہ ہے۔"

آنیوالے نے پردہ ہٹایا، اب جو دیکھتے ہیں تو ہماری داستان کی جان، یادش بخیر مرزا الہی خیر گرد میں اَٹے ہوئے، مُنہ پہ ہوائیاں،

مرزا۔ (کمزور آواز سے) "تسلیمات عرض ہے، کون فدن صاحب؟ مُجرا قبول ہو، اُٹھو! اُٹھو!!"

جانی مرزا۔ "کیوں خیر تو ہے مرزا۔ یہ سر سے پا تک ہونق کیوں بنے ہوئے ہو؟"

فدن صاحب۔ "ذری نبض تو دیجئے گا۔ چہرہ مبارک سے زبول قلب کی علامات پائی جاتی ہیں، دواء المسک بار دتجویز کروں گا۔"

اُستاد۔ "سلامتی سے پیشانی پہ پسینہ کی بوندیں قربان جاؤں جیسے موتی جڑے ہوں۔"

مرزا۔ (طیش کے عالم میں) "لعنت ہے اس میونسپلٹی کی ہفتاد پشت پہ واللہ ہزار بار لعنت ہے، اَنجھی ہوئی، اندھی لالٹینیں، کمر کمر سڑکوں پہ دلدل، قدم قدم پہ ملاعون لینڈی بچوں کی عف عف، ایسے میں کہئے کوئی بھلا آدمی چل پھر سکتا ہے؟ معاذ اللہ بس نہیں چلتا ورنہ چُن چُن کے ان (صیغہ جمع میں بہن کی گالی دے کر) کو توپ دم کرا دیتا قسم قرآن کی۔"

جانی مرزا۔ "کچھ کہیئے گا بھی یا ہنکارتے ہی رہیئے گا، چھکے ہوئے آئے ہیں یا اک دو چھینٹے دوں؟ نگالی ابھی مدبر ہے۔"

مرزا۔ "چھکے ہوئے کی بھی ایک کہی، آج فجر سے یہ وقت ہونے آیا، عمل کیا ہو تو اولاد شمر سے ہو، چراغ جلے پالٹے نالے پہ آغن صاحب کے ہاں ذری کے ذری ٹکا تھا، قسمیں دے دے کے کہنے لگے، بانکے چُسکی پیتے جاؤ۔ تیار ہے، سوئر حرام کے برابر جو ایک قطرے سے بھی حلق بھگویا ہو۔"

یہ کہہ کر مرزا نے ہات پاؤں کی گرد جھٹکی، ادھر جانی مرزا کی فرد اوڑھ کر ذری گرمائے تھے کہ نگالی گردش میں آگئی، تولہ بھر قوام کے

دُھوئیں بکھیر کے، لب سوز کشمیری چائے کی پیالی چڑھائی، ٹکڑا باقرخانی کا کھایا تب جا کے دم میں دم آیا، اُستاد اور چھجو خاں بھی خوب پیٹ کر رخصت ہوئے اور ڈیوڑھی معمور ہوگئی۔

رات بھیگ چلی ہے، جانی مرزا، فدن صاحب اور ہمارے مرزا الہی خیر دو رستے خمیرے کے دھواں دھار کش، بسے ہوئے حقہ کی میٹھی میٹھی گڑگڑ اور بی چنیا بیگم کے مسلسل بھونکوں کے مزے لیتے ہوئے آج کی اُفتاد اور کل کے مقدمہ پر گفتگو کر رہے ہیں؛

جانی مرزا۔ "ہم بتائیں فدن صاحب! یوں کیجئے، ان کو تو رہنے دیجئے یہیں، اور صبح مجرد و عمل سے فراغت کر، چائے وائے پی کے چلے چلئے اور لنکین صاحب بالسٹر کو چُکا لیجئے اور پان سات روپے بیعانہ دے کے پلٹئے تو کچہری، آج شہر میں دوسرا ڈبلو انکی جوڑ کا نہیں، بڑے بڑے حاکم اور افسر لوگ بڈھے سے بچکتے ہیں۔"

فدن صاحب۔ "آپ کو واللہ، لنکین صاحب پان سات روپے میں ایسا سنگین مقدمہ لیں گے؟"

جانی مرزا۔ "نہ سہی پان سات، دس بارہ سہی، مقدمہ کی سنگینیت کو دیکھئے گا یا اپنی جیب کے ہلکے پن کو۔"

فدن صاحب۔ "جیب ہلکی ہے تو قبلہ سزا بھاری سمجھئے، غضب خدا، سرقہ ایک، دغا دو، خیانت مجرمانہ تین، تلبیس شخصی چار، حبس بے جا پانچ، تحویل جائز سے بے بھاگنا چھ، دادرسی میں جو نکلیں وہ نفع میں، فی جرم سال بھر کے حساب سے بھی ٹھونکی تو اِن بچارے کی ہڈیاں بھی فاتحہ درود کو نہ ملیں گی۔"

جانی مرزا۔ "یہ سمجھے تو واللہ کچھ نہ سمجھے، کوئی تو نکتہ رکھ کے ہم نے یہ بات کہی ہوگی، اماں ڈبلو تو محض بوجھ بھرم کے لئے ہے ورنہ مقدمہ کی ساری بحث تو بندۂ درگاہ کے اس ناخن میں ہے قبلہ، جی اور کیا بڑے صاحب کے دادا جان نہ بھنا جائیں تو جانی مرزا کو چنگیز خاں کا پوتا نہ کہئے گا، کسی الّو کا جایا کہئے گا، عمر بھر کچہری کا گز بتے گزری ہے، فوجداری کیا دیوانی کیا، ابتدائی سے لے کر سشن تک ساری عدالتیں روندی پڑی ہیں، اس مقدمہ میں دھرا ہی کیا ہے، تل کی اوٹ پہاڑ، اک ذری سی باریکی ہے، آپ سے کیا راز (آہستہ سے) ثابت یہ کرنا ہے کہ جرم کیا اور ڈنکے کی چوٹ کیا، مگر واللہ ثم باللہ کہ نیت بخیر رکھ کے کیا، اب فرمایئے مقدمہ چت کہ پٹ۔"

فدن صاحب۔ "اٹکل کر، چت اور ہزار میں چت لاکھ میں چت، قبلہ بایاں قدم ہے آپ کا، یہ تو افلاطون اور بقراط کو بھی نہ سوجھی ہوگی، (مرزا الہی خیر سے) اماں اونگھ گئے مرزا، ارے حضرت مٹھائی کھلوائیے، اب تو یہ کھائی دیتا ہے کہ اُلٹا ہرجانہ لیں گے اُس شقی مٹھوا سے۔" سچ ہے الاعمال بالنیات، جانی صاحب اب یہ کیجئے کہ لنکین صاحب ونکین صاحب کو ماریئے گولی اور روپے بارہ آنے میں کسی ٹٹ پنجئے وکیل کو بھڑا کے اصل مقدمہ لڑایئے آپ۔ کیوں مرزا صاحب؟"

مرزا۔ "وہی تو میں بھی کہتا ہوں، ان کے لقلقے کے آگے وہ بھڑوا لنکین کیا کریگا قسم قرآن کی۔" اس گتھی کو سُلجھا کے تینوں حضرات اوڑھ لپیٹ کے لیٹے اور چشم زدن میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوگئے۔

دن آیا، اور جاڑوں کا ٹھنڈا سورج کہر کی ملگجی سفید چادر میں لپٹا ہوا خاصا بلند ہوچکا ہے، رات بھر کے ٹھٹھرے ہوئے شہر کے ہاٹ بازار کھل چلے ہیں، اور کاروبار جو دن چڑھے تک رزائی لحاف دگلے اور فرغلوں میں دبکا دبکا پڑا تھا ناک اور مُنہ سے گرم گرم بھاپیں چھوڑتا ہوا ہر گلی کوچے میں سوں سوں کرتا پھرتا ہے،

دس بجنے کو ہیں، بڑے صاحب کی کچہری میں آج روز سے زیادہ گھما گھمی ہے، صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر مسٹر مکرچین کے اجلاس پر گدھے کی چوری کا وہ مقدمہ پیش ہونے والا ہے جس کی خبر کل ہی بجلی کی طرح چانڈوخانے چانڈوخانے دوڑ چکی تھی اور اُس وقت سے اب تک بی چُنیا بیگم کے نام لیواؤں کا موضوع فکر بنی ہوئی ہے،

کچہری کے سامنے والے میدان میں ایک حشر برپا ہے،

چلتے پھرتے کھڑے بیٹھے جدھر دیکھئے بھانت بھانت کے آدمی دکھائی دیتے ہیں، پیپل، برگد، آم کے چھتارے درختوں کے سائے میں ٹاٹ کے فرش پر عرائض نویس صاحب کان پر قلم رکھے عرضی سوال لکھانے والوں کے انتظار میں جمائیاں لیتے، انگلیاں چٹخاتے بھوکے گدھ کی طرح اللہ بھیج اللہ بھیج کرتے بیٹھے ہیں۔ زمینداروں کے مختار بیرو کار، سر پہ گول پگڑی، بغل میں بستہ، انگرکھے پجامہ سے لیس اِدھر اُدھر گھوم رہے ہیں، اِکے، ٹم ٹمونکا تانتا بندھا ہوا ہے، دیہات سے ٹھاکر صاحب رتھ میں آئے ہیں، ناگوری بیلوں کی جوڑی بھوسہ کھا رہی ہے، ٹھاکر صاحب چھینٹ کی روئی دار مرزئی پہنے، میلی دھوتی باندھے کمبل پہ بیٹھے کلی پی رہے ہیں، وکالت خانہ میں تخت پڑے ہیں، دری، قالین پر محرر صاحب قلمدان کھولے، تعزیرات

ضابطہ فوجداری کی ورق گردانی کر رہے ہیں، یا موکلوں سے محنتانہ طلبانہ
کا حساب کتاب کر رہے ہیں، خود وکیل صاحب کالی جھول اوڑھے، بینی
کی نوک پر عینک رکھے اپنی جرح اور بحث کا سکہ جما رہے ہیں، انکے
نام کا وکالت نامہ دیکھتے ہی بڑے صاحب فریق مخالف کے خون کے
پیاسے ہو جاتے ہیں، دیہی پاسی پھانسی پہ لٹک چکا تھا، وکیل صاحب
تار پہ اپیل لڑے، تختہ پر سے اُتروا لیا، مولا بھانڈ نے جورو کی ناک
صاف کر دی تھی، رویت کی شہادت ملزم کا اقبال کام نہ آیا، انکے
رُعب کے مارے عدالت کا قلم نہ اُٹھ سکا بری کرتے ہی بنا،

مجمع سے ہٹ کر ٹین کے سائبان میں حلوائی کی دوکان ہے،
کڑھاؤ چڑھا ہوا، پکوان ہو رہا ہے، موٹا حلوائی چیکٹی دھوتی باندھے
ننگے بدن، جنیو ڈالے سودا دینے پر تلا ہوا ہے، گرم گرم پوری کچوری
آلو کی ترکاری، کدو کی بھجیا، چٹنی اچار، لڈو پیڑے برفی جلیبی کے
دونے پہ دونے چل رہے ہیں، برہمن دیوتا دُھلے منجے لوہے کے
ڈول لئے کرا سجاتے ہوئے "جل پلائے" رہے ہیں، وہ سامنے چھپر
تلے نانبائی کی دوکان ہے، گاہکوں سے زیادہ مکھیاں بھن بھنا رہی
ہیں، بدقلعی دیگچے میں نیلا شوروا، ڈھب ڈھب قلیہ، باسی کباب
ٹھسی ہوئی خمیریاں دو آنے کی خوراک ہے،

ایک جگہ زمین پر چادر بچھی ہے، اُس پر طرح طرح کی رنگ
برنگی سفوف کی پڑیاں، تیلی کی کھوپڑی، سینگی کے کانٹے، کمر ٹوٹے
سانڈے، سوکھے ہوئے کیچوے بیر بہوٹیاں، شیر کی چربی، جونک
کا تیل، سرمہ دافع بصارت، دنداں شکن منجن، کی بیچ میل دوکان لگی،
کالی کفنی پہنے، گلے میں موٹے موٹے منکوں کی تسبیحیں ڈالے، عینک
سرمہ سے درست ایک لمبے تڑنگے پورے دو ورکا بے شاہ جی آنکھیں
چمکاتے کاکلیں لہراتے موت کا تریاق، جادو کا زور، کرامات کا شور،
فقیر کے ٹچکلے، مرشد کے عطیے صرف آدھ آنہ میں ہدیہ دے رہے ہیں۔

اسی ہر لونگ میں سب سے الگ تھلگ ایک چڑیا ڈولی بھی نظر
آتی ہے، شالباف کا لال پردہ پڑا ہے، ایک کہار جال بُن رہا ہے
دوسرا ہات کی کھونگھی بنائے اُس میں چلم دبائے سلفے کے دم لگا رہا
ہے، یاران طریقت کی نگاہیں بار بار ڈولی پر پڑ رہی ہیں اور طرح
طرح کی چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں، کسی نے کہا "ظہور ککڑ والے کی
عورت ہے، ایک نکاتہ! زمانہ بھر کی شغفل! مرد کے مرتے ہی بات
پانوں نکالے، گھر میں جوئے کا پھڑ جمتا تھا، نعل لیتی تھی، محلہ بھر
کھوکھلا کر دیا، آخر کے تئیں مخبری ہوگئی، دھری گئیں آج پیشی ہے"

دوسرے نے کہا "اماں نہیں میں جانتا ہوں وہ نہیں بلکن نواب گھسیٹا کی بہو
ہیں، مہاجن نے بیچاری کے وثیقہ کا تالیقہ کرا لیا ہے، بڑے صاحب کے
پاس داد فریاد کے آئی ہیں" تیسرا بولا "آپ بھی کمال کرتے ہیں واللہ
میں کہاروں کو پہچانتا ہوں، مچھلی والی بارہ دری کے پیچھے ہی تو اڈا
ہے، ہو نہ ہو یہ وہی مشہور آگرہ والی بیٹرن ہو جو پچھلی برسات میں
آکر بسی تھی، کیا تیکھا معشوق ہے واللہ، ڈھنگ اچھے نہ تھے، ذری
کمیں پرست تھی۔ رات سُنا کسی دل جلے نے چھاتی پہ چڑھ کے چوٹی
کاٹ لی، ناک پونچھنے چلا تھا جو شور وغل سے محلہ میں جاگ ہوگئی
اور کرنے والا ادھورا کام چھوڑ کے فرار ہوگیا"

یہ ہو ہی رہا تھا جو بڑے صاحب کے چپراسی کی گرجتی ہوئی آواز
نے مجمع میں ہلچل ڈال دی:

"مٹھو دھوبی، الٰہی خیر مرزا، کوئی حاضر ہے؟" لمحہ بھر بعد "مٹھو
مدعی ــــ الٰہی خیر مدعا علیہ کوئی حاضر ہے؟" تیسری پکار پر سب
نے دیکھا کہ دو بزرگوار مجمع سے چھنٹ کر ڈولی کی طرف لپکے، پردہ ہٹا،
اندر سے ککڑ والے کی عورت، نواب گھسیٹا کی بہو، یا آگرہ کی بیٹرن کے
بجائے مرزا الٰہی خیر صاحب ہلتے کانپتے برآمد اور نادعلی پڑھتے ہوئے
جانی مرزا اور حکیم فدن صاحب کی معیت میں بڑے صاحب کے
اجلاس پر پہنچکر ملزم کے کٹہرے میں کھڑے ہوگئے:

مکرجین صاحب ڈپٹی کمشنر پرانی چال کے سیدھے سپاٹ
ولایتی، قانونی واقفیت واجبی واجبی، گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشہ
قسم کے حاکم ہیں، سرکار کا اقبال اور منشی جالپا پرشاد کا ہتھ سکینہ
کی سررشتہ داری شامل حال ہے کہ ضلع کی سب سے اونچی کرسی پر مزے
سے دندنا رہے ہیں،

لکھتے لکھتے صاحب نے دفعتاً سر اُٹھایا، نیلی نظروں سے اجلاس
کا جائزہ لیا، اور ریڈ کے قلم سے سررشتہ دار صاحب کی طرف اشارہ
کرکے حکم دیا کہ مقدمہ پیش کیا جائے،

صاحب: "وَل منشی، مڈیٔ مڈالیہ کا وکیل لوگ حاضر ہے؟"

سررشتہ دار فریقین کے کٹہرونکی طرف دیکھ کے "حضور مدعی
مسمی مٹھو کا ذرمظہر ہے کہ دعویٰ بر سبیل استعجال داخل کیا گیا، وکیل
ہمدست نہ ہو سکا، اب سرکار ہی مادر پدر ہیں، مدعا علیہ مرزا الٰہی خیر
قوم مغل کی جانب سے بابو کریم بخش وکیل درجہ سوم علاالتہائے دیوانی
و فوجداری بمشورہ بیسر کاظمان، مدعا علیہ سمیان جانی مرزا قوم ترکمان

میر فدا حسین عرف فدن صاحب پیشہ حکیمائیت حاضر عدالت ہیں"

صاحب "ٹیک ہے جانے ڈیو"

سر رشتہ دار صاحب نے مٹھو کی درخواست سنانا شروع کی۔

"بہ اجلاس حضور پر نور فیض گنجور عالی جناب فیضمآب مسٹر مکرجین صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر دام اقبالہٗ۔

مسمی مٹھو ولد سکٹو قوم گگا ذر ساکن محلہ تالاب ٹکیت رائے بخشی، پیشہ کپڑے دھونا، ۔ مدعی مستغیث، بنام مسمی الٰہی خیر ولدنا معلوم، قوم مرزا، ساکن محلہ جھنڈے تلے، پیشہ حال چنڈو بازی و افیم نوشی، سابق کمیدانی و رسلداری وگلہ والی پلٹن، ـــــ مدعاعلیہ ملزم،

دعویٰ واسطے دلاپانے یک زنجیر خر نر اعمر دو دانت،.....

صاحب۔ دخل دے کر "وَل یک زَن والا بات کھیا ہے؟"

سر رشتہ دار "حضور "یک زنجیر" فارسی کا محاورہ ہے جیسے مبلغ یکروپیہ اور "خر نر" سے مطلب ہے "مرد گدھا" حضور"

صاحب۔ "اس کا اَورٹ لوگ کھون ہے؟"

سر رشتہ دار "حضور گدھی"۔ یہ قاعدہ ہے کہ مرد کے آگے چھوٹی "ی" جوڑ دیں تو عورت بن جاتا ہے، جیسے حضور بھٹیار سے بھٹیاری، مُرغا سے مُرغی"

صاحب۔ مطمئن ہو کر "ٹیک ہے جانے ڈو"

سر رشتہ دار "عمر دو دانت، سبزہ رنگ، آہو چشم، کبک رفتار، شیریں گفتار، یہ حضور گدھے کا حلیہ ہے"

صاحب "مالُم ہے، جانے ڈیو"

سر رشتہ دار "قیمتی مبلغ بست روپیہ کہ نصفش دہ روپیہ می باشد سکہ سرکار کمپنی بہادر"

"غریب پرور سلامت۔ فدوی مدعی مستغیث عرض پرداز ہے کہ

(۱) بتاریخ دیروزہ مدعاعلیہ ملزم نے بوقت نواخت چھ بجے منہ اندھیرے اپنے خدمتگار مسمی عبدالغفور خاں کے ہات فدوی کا گدھا نگن بچارنے کے لئے طلب کیا، ہرچند کہ فدوی مدعی کی بائیں آنکھ پھڑکی اور چھینک بھی پڑی مگر بہ لحاظ ہمدوش بطور دستگردال دے دیا۔

(۲) بعد گزرنے دو گھنٹے کے فدوی مدعی کو معتبر ذریعہ یعنی بی گھسیٹن بھٹیاری ساکن چاول والی گلی،

صاحب "وَل منشی، بٹیاری اور گڈھے کا اورٹ لوگ بالکل ایک مافک ہے؟"

سر رشتہ دار۔ جی حضور بالکل ایک، اصلا فرق نہیں، بجز اس کے کہ بھٹیاری آدمی ہوتی ہے۔ اور گدھی جانور"

صاحب "اوٹیک ہے جانے ڈیو"

سر رشتہ دار "ساکن چاول والی گلی کے مُنہ سُنا گیا کہ مدعاعلیہ ملزم نے جھوٹ باور کرا کے گدھا حاصل کیا، اور بہ نیت دغا و ضرر پہنچانے اس مدعی مستغیث کے داخل کانجی ہوز و حبس بے جا کرا دیا، اور خود بہ ارادۂ روپوشی گھر گھر موہوں سے لڑنے لام پہ بھاگنے کو تھا کہ بہ قضائے الٰہی چوک میں پکڑا گیا.......

صاحب۔ لال پیلے ہو کر "وَل لڑائی ہوا، پولس نے چالان نیں کیا، سو ٹماٹہ ایک ڈم بے کانون ہے، ہم سب کو جہنڈم بھیجیں گا"

سر رشتہ دار "حکم ہو تو فدوی آگے چلے" (صاحب کے اشارے پر) "۳۔ فدوی مدعی مستغیث شہادت پیش کریگا، لہذا استدعا ہے کہ فدوی کا گدھا دلوایا جائے، مدعاعلیہ ملزم کو جرائم کی پاداش میں قید بامشقت صادر فرمائی جائے، اور کوئی دادرسی جو مدعی مستغیث کے حق میں مفید ہو عطا فرمائی جائے، زیادہ حد آداب فقط۔ مکرر آنکہ الٰہی آفتاب عمر و دولت اقبال دائما درخشاں ہو جیو۔ عرضی فدوی مٹھو۔ گاذر ساکن محلہ تالاب بخشی ٹکیت رائے" مورخہ ۱۳ ر ماہ جون ۱۸۶۹ء عیسوی بقلم منشی ڈالچند عرائض نویس تحریر یافت۔ نافع باد برب العباد"

صاحب۔ (درخواست سن کر مدعاعلیہ کے وکیل سے) "وَل بابو کریم باکس آپ کچھ کہنے سکتا ہے؟"

بابو کریم بخش "غریب پرور پہلے میرے موکل کا بیان قلمبند فرمالیں کہ ترین کی جرح اور بحث محفوظ ہے"

صاحب۔ سر رشتہ دار سے "ڈیکو منشی ہم مُڈالیہ کا بیان لینگا ٹم لکٹا جاتے"

منشی جالپا پرشاد نے کاغذ قلم سنبھالا، اور مرزا الٰہی خیر کا بیان شروع ہو گیا"

صاحب "وَل ٹمارا نام؟"

مرزا "خداوندا، مرزا الٰہی خیر"

صاحب "باپ کا نام؟"

مرزا "سُنا ہے کہ والد مرحوم میرزا آتغ بیگ بوبکرنی کے نام سے مشہور تھے"

صاحب "ٹم مٹو کا گدّا ڈو کاڈے کرلیا؟"

مرزا۔" قسم قرآن کی جو فدوی نے دھوکا دیا ہو، غلام تو گھڑ موہوں سے لڑنے سرحد پہ جا رہا تھا، سواری کے لئے منگوایا بیٹک کرکے، مگر خداوند نعمت فدوی کی نیت بخیر تھی، یعنی سوچا یہ تھا کہ رن میں کھیت رہا تو دام ورنہ گدھا صحیح سلامت واپس۔"

صاحب۔" منشی وَل گرموان کھون لوگ ہے مدّالیہ سے لڑائی کا کیا باٹ ہے؟"

سررشتہ دار۔" حضور یہ مدعاعلیہ کی برادری کے آپس کے جھگڑے ہیں، یہ مرزا قوم بڑی اوجھڑ ہوتی ہے خداوند، دیوانی فوجداری ہمیشہ کرتی ہی رہتی ہے، پولس کا بڑا ناک میں دم ہے ان سے۔"

صاحب۔" ٹیک ہے، (مرزا سے) جانے ڈیو۔"

مرزا۔" میں تو حضور جانے ہی دیتا، اس مٹھو نے لانش جڑدی اور فدوی کو حق ناحق کچہری دربار چڑھنا پڑا۔"

سررشتہ دار۔" یہ نہیں، حضور کا مطلب ہے آگے چلو۔"

مرزا۔" بس یہ ہوا حضور، کہ غلام خوگیر ڈال کے ابھی چال کی بانگی بھی نہ دیکھنے پایا تھا جو خداوند اس ملاعون کے بچے نے مجھ غریب یتیم یسیر پہ یہ ستم ڈھایا کہ آنکھ جو بچی تو حضور انگنی میں کیاری بھر پوستہ بویا تھا، بونڈے بھی نہ چھٹنے پائے تھے قچر قچر کرکے جڑوں سمیت کیاری کی کیاری کھا گیا، ٹھونٹھ تک نہ چھوڑے شقی نے قسم قرآن کی، اصل مالوے کا بیج تھا حضور، آگ لگ گئی تن بدن میں، پھر کوئی دھندا چلا ہا تو ہے نہیں فدوی، ہفتاد پشت کا سپاہی زادہ ہے، جھلا کے جی میں آیا بوٹیاں بودوں کاٹ کے باجی کی، پر ترس کھا کے رسی پکڑے چلا گیا اور کانجی ہوز میں بھر دیا۔

صاحب۔" وَل منشی یہ کانون کا باٹ ہے؟"

سررشتہ دار۔" حضور دفعہ پان سے بہتر ضابطہ فوجداری کے حاشیہ پر ہائیکورٹ کی نظیر بھی ہو چکی ہے۔"

صاحب۔ مرزا سے" مدّالیہ آگے مٹ جانے ڈیو۔"

فدن صاحب اور جانی مرزا کے اشارے پر مرزا الٰہی خیر نے بڑے صاحب کو جھک کے سلام کیا اور خاموش ہو گئے۔

فدن صاحب۔ آہستہ سے" جانی مرزا صاحب مانتا ہوں واللہ کیا موقع سے سلام کرایا ہے فرنگی کو۔"

جانی مرزا۔" تسلیم یہی تو پھبتیاں ہیں مقدمہ بازی کی۔"

صاحب۔ مٹھو سے" وَل اپنا گواہ لاتے۔"

مٹھو۔" ان داتا سب موجود ہیں، کانجی ہوج کے منشی جی سے پوچھ لیا جائے جو کلام جھونٹ بولا ہو۔"

کانجی ہوز کے منشی جی پکارے گئے، ان بچارے نے خواب میں بھی بڑے صاحب کی صورت نہیں دیکھی تھی اجلاس پر آئے تو بوکھلا گئے!

چپراسی۔ عدالتی لہجے میں حلف دے کر" کہو جو کچھ کہونگا خدا کو حاضر ناظر جان کر کہوں گا۔"

منشی جی۔ (اوسان جاتے رہے) "جو کچھ ہے سو خدا ہے۔ حضور فدوی کا استنجا خطا ہوا چاہتا ہے، ذرا ڈھیلا سکھا کے حاضر ہوتا ہے۔"

صاحب۔" اوٹمارا کوچھ کھٹا نہیں ہے، اسٹیڈا اسٹیڈا باٹ بولو۔"

سررشتہ دار۔ ڈرتے ڈرتے" حضور گواہ منظہر ہے کہ اسکو ضرورت کے لئے اجلاس کے باہر جانے کی اجازت دی جائے۔"

صاحب۔ بگڑ کے" نہیں ہونے سکتا ہے، ایک ڈم بیان ڈینا ہوگا، سرکار سب کا ضرورٹ کا اجازٹ میں ڈے سکتی، کانون نہیں ہے۔"

ناچار دوبارہ حلف دیا گیا اور اظہار شروع ہوا۔

صاحب۔" وَل نام؟"

منشی۔" خداوند شیخ جمن۔"

صاحب۔" باپ کا نام۔"

منشی۔" خیراتی۔"

صاحب۔" اِس مکڈمہ میں ٹم کیا جانٹا ہے؟"

منشی۔" جو صاحب کا حکم ہو۔"

صاحب۔ سررشتہ دار سے" وَل منشی ہم کوئی ہُکم ڈینے سکٹا ہے، کانون ہے؟"

سررشتہ دار۔" حضور کی زبان قانون ہے، جو حکم ہو وہی بیان میں لکھا جاتے۔"

صاحب۔" ٹیک ہے جانے ڈیو، (منشی سے) مدّالیہ کو ٹم جانٹا ہے؟ وہ اجلاس پر کیڈر ہے؟"

منشی۔ پریشان ہو کر" حضور یعنی یہ جو۔ یہ اتنے جنے یہاں کھڑے ہیں ان میں سے کوئی نہ کوئی ضرور ہوگا! (بابو کریم بخش کی طرف دیکھ کے) فدوی کے اندازے سے یہ جو کالا خنعہ پہنے کھڑے ہیں یہی ہیں شاید" صاحب مسکرائے، بابو کریم بخش وکیل درجہ سوم چپ کھڑے تھے، فدن صاحب نے جانی مرزا سے کچھ کہا۔ جانی مرزا نے وکیل صاحب سے کچھ کہا!

وکیل صاحب۔ عدالت سے" عدالت ملاحظہ کرے، گواہ مدعی نے مدعاعلیہ کے وکیل کو مدعاعلیہ بتایا، کمترین کی جرح اور بحث محفوظ ہے۔"

عدالت نے لکھ لیا۔

جانی مرزا۔ "سبحان اللہ فدن صاحب، کیا بات سُجھائی ہے وکیل صاحب کو، اِسے کہتے ہیں پیرو کاری۔"

فدن صاحب۔ "واللہ یہ آپ کے فیضانِ صحبت سے القا ہوا اس وقت، ورنہ من آنم کہ من دانم۔"

صاحب۔ "کانجی ہوس میں گدّا کھون لائے؟"

منشی۔ "حضور محلہ کا مہتر تھا، پھٹی رزائی اوڑھے آیا تھا۔"

مرزا۔ (عدالت سے) "حضور اس مردک کو روکیں۔ نہیں تو چھاتی پہ چڑھ کے خون پی لونگا اس وقت، غلام کو مہتر کہتا ہے۔"

وکیل۔ "عدالت ملاحظہ کرے، گواہ اپنے بیان میں اشتعال انگیز حملے کمترین کے موکل پر کر رہا ہے، کمترین کی جرح اور بحث محفوظ ہے۔"

صاحب۔ مٹھو سے۔ "دوسرا گواہ کھون ہے؟" ہازر کرو۔"

بی گھسیٹن بھٹیاری لہنگا پھڑکاتی کنگھی چوٹی سرمہ مسی سے چست حاضر ہوئیں۔ بڑی لیاقت سے بڑے صاحب کو جھک کے سلام کیا، چپراسی نے حلف دیا۔

صاحب۔ "اورٹ لوگ ہے، ٹمارا نام؟"

گھسیٹن۔ "سرکار کی سلامتی ہیں بندی کو گھسیٹن کہتے ہیں۔"

صاحب۔ "ٹم مڈالیہ کو جانٹا ہے؟"

گھسیٹن۔ "حضور کوئی آج سے، جوانی سے جانتی ہوں۔ انکی اللہ رکھے مسیں بھیگتی تھیں اور باندی بھی (ٹھنڈی سانس لے کر) خیر آدمی کا بچہ تھی۔"

صاحب۔ "مڈالیہ نے گدّے کا چوری کیا؟"

گھسیٹن۔ "اے نوج خدا نہ کرے حضور، ان کے دشمن چوری کریں، گھر میں اللہ کا لیا دیا سب کچھ ہے، افیم کی جگہ افیم، چنڈو کی جگہ چنڈو، نگوڑے لام پہ جاتے جاتے ادھر کیسے پلٹ پڑے، ہولا خبطا تو ہیں ہی۔"

صاحب۔ "اچّا ٹم جاؤ۔" (مٹھو سے) اور کھون گواہ ہے؟"

مٹھو۔ "بڑی اُسیٹھ ہوگئی گُسیّاں، عبدالگفور کھاں اور ہیں سو اور پکارے جائیں۔"

عبدالغفور خاں عرف گپو کا نام سُنتے ہی ہمارے مرزا الٰہی خیر چونکتے ہوئے مگر کچہری کا موقعہ تھا خون پی کر رہ گئے۔

صاحب۔ "وِل ٹم عبدالگفور ہے؟"

گپو۔ "جی حضور اور خاں بھی۔"

صاحب۔ "وِل ڈیکو ٹم مڈالیہ کے لئے مٹّو گدّا لایا؟"

گپو۔ "بے شک کر کے لایا۔"

صاحب۔ "پھر کیا ہوا؟"

گپو۔ "ہوا کیا خداوندا! بڑا ذلیل جنور نکلا، پنج عیب شرئی،"

صاحب۔ "ٹم مٹّو کو ڈو کاڑے کر لایا۔"

گپو۔ دھوکا دے کر لایا یا حضور پیشگی کی چہرہ شاہی اٹھنی دے کر سامنے کھڑے ہیں نا، بات میں گنگا جلی دے کر صاحب پوچھ لیں۔"

مٹھو۔ زیر لب۔ "ارے رام رام جھونٹ کی بھی حد ہوگئی۔"

صاحب۔ "ٹم مڈالیہ کا نوکھری کس واسطے چھوڑا؟"

گپو۔ "حضور یہ بڑے چھلے لڑاکا آدمی ہیں، لام پہ لڑنے جا رہے تھے، مجھ سے کہا تم بھی چلو، میں ٹھیرا حضور بال بچے دار آدمی، میں لے ٹھنڈے ٹھنڈے اپنا حساب کرا لیا۔"

صاحب۔ "گدّا کانجی ہوس کیسے گیا؟"

گپو۔ "وہ بڑا حرفتی ہے حضور، کہنے کو جنور ہے کُل حضور ہم سے آپ سے زیادہ چپر تر باز ہے، گھر میں گولی بارود کی بو پاتے ہی تاڑ گیا کہ لدے بیٹا لام پہ، بس حضور رسّی تڑا کے جو بھاگا تو سیدھا مہتر کی جھونپڑی میں گھس گیا۔ مہتر کو غصّہ آگیا اُن نے اُٹھا کے کانجی ہوز میں سنگوا دیا۔"

صاحب۔ "اچّا اب ٹم جانے سکٹا ہے۔" (وکیل سے) وِل بابو کریم باکس آپ اب بولنے سکٹا ہے۔"

وکیل۔ کمترین اب کیا عرض کرے، عدالت خود روشن ضمیر ہے، کمترین کی جرح اور بحث محفوظ ہے، یوں کہ اگر عدالت نے کمترین کے موکل کو جیل یا جرمانہ یا ہر دو کر دیا تو اپیل لڑے گا، آج عدالت کا وقت خراب کرنے سے فائدہ؟ مدعی کے گواہوں سے ثابت ہو چکا ہے کہ کمترین کا موکل مرد سپاہی پیشہ ہے، بدنیتی سپاہی کا دھرم نہیں ہے۔ مدعی نے عرضی دعویٰ میں کمترین کے موکل پر جو الزامات لگائے ہیں وہ اگر سچ بھی ہوں تاہم اتنے الجھا کر لگائے گئے ہیں کہ عدالت کی سمجھ سے بالاتر ہیں۔ عدالت کی یہ کھلی تحقیر ہے اور مدعی کی بدنیتی پر دلالت کرتی ہے، پس استدعا ہے کہ کمترین کا موکل عزت کے ساتھ بری فرمایا جائے۔"

یہ کہہ کر بابو کریم بخش وکیل درجہ سوم نے پیشانی کا پسینہ پونچھا اور اپنی کرسی پر بیٹھ گئے۔

"یہ بہٹ گول مال مکڈمہ ہے"! مسٹر مکرجین صاحب ڈپٹی کمشنر نے گدھے کی چوری کے مشہور مقدمہ کا فیصلہ کرتے ہوئے لکھا۔" اس

مکڈمہ بیں مِٹّو ڈوبی ایک فریک ہے، اور دوسرا فریک میرزا الہی کھیر ہے،
مِٹّو مڈئی کا اُزر ہے کہ ڈاوا جلڈی میں ڈاکھل ہوا وکیل کرنے نیں سکا، دوسرے فریک کا وکیل بابو کریم باکس تھرڈ کلاس وکیل ہے۔ واسطے ڈِلا پالے ایک مرڈ گڈے کے ڈاوا ہے، یہ ڈاوا ڈیوانی کی اڈالٹ میں ہوئے تو کانون کا بالکھل مافک ہوتے۔ فریکین کی کھُسی کا باٹ ہے اس اڈالٹ میں ڈائر کئے ٹوبی کچھ پروا کا باٹ نین ہے۔

مکڈمہ کیسے چالو ہوئے وہ اڈالٹ کے ڈیکھنے کا باٹ ہے، مڈالیہ سولجر لوگ کا کھانڈان ہے، ایک ڈم لرائی کرنے منگٹا ہے، اُس کا کھانڈان میں گرموان لوگ بہٹ بڈماش اور گُنڈا ہے، مڈالیہ اُن سے لرائی کرنے مانگا، اُس کا کِڈ مڈگار اَبڈل گفور کھاں مُڈئی کا گڈا آٹ آنے ڈے کرلاتے، گڈا لوگ بالکھل بے وکوف کا مافک آڈمی ہوٹا ہے، لرائی سے باگٹا ہے، مڈئی کا گڈا بی باگ گیا۔ اوسکو مہٹر لوگ پکر کے کانجی ہوس میں ڈالے، اَبی وہ اُڈر ہے، مڈئی کا گواہ نمبر۱ کانجی ہوس کا کلارک ہے اور ایک ڈم بالکھل پاگل ہی، مڈالیہ کے وکیل بابو کریم باکس کو مڈالیہ بٹایا ہے، اور مڈالیہ کو مہٹر بولٹا ہے، اوسپر ڈفا ۳۱۹ اٹما زیرات کا مکڈمہ چلنے سکٹا ہے،

کپٹن بٹیاری اور ٹ لوگ مڈئی کا گواہ نمبر۲ ہے، یہ بہٹ سِول ہے، ہم اوسکو ڈیک کر بہٹ کھُش ہوا۔ وہ مڈالیہ کو کھوب جانٹا ہے، مڈالیہ چوری نیں کیا بولٹا ہے، یہ باٹ بالکھل برابر ہی، لیڈی لوگ کا باٹ جوٹ نیں ہوسکٹا،

مڈئی کا گواہ نمبر۳ ابڈل گفور کھاں ہے، یہ مڈالیہ کا کِڈ مڈگار ہے، لرائی پرجانے نیں منگٹا، نوکری بی کرنے نیں منگٹا، گڈا لایا، وہ سرارٹ کیا اور باگ گیا، مڈالیہ کیا کرنے سکٹا ہے،

اِتنا باٹ کے واسطے مڈئی بہٹ گول مال کیا، بس

ہکم ڈیا جاٹا ہے کہ مِٹّو مڈئی کا ڈاوا ڈسمس، مڈالیہ میرزا کھیر بری کیا جائے، مڈئی مکڈمہ کا کھرچہ اڈا کرے، گڈے کو کانجی ہوس میں ساٹ ڈن کا کیڈ با مُسکٹ اور ٹین ڈن کا کال کوٹری ڈیا جائے۔

ہم بابو کریم باکس تھرڈ کلاس پلیڈر سے بہٹ کھُش ہے، اوس نے اڈالٹ کا وکٹ کھراب نیں کیا، مسل ڈاکھل ڈفتر ہو۔"

دستخط پی ٹی مکرجین۔

مارہی بمدالتا قسم قرآن کی جو جھوٹے سے ایک لفظ بھی خلاف ہیں سُن پاتا، اور لیجئے کل سے جونا بکار نے سون کھینچی تو آج مٹھو کی گواہی دینے

"خیالاتِ پریشاں"

کیا یاد ہیں تم کو وہ راتیں جو کٹ گئیں آنکھوں آنکھوں میں
میں بھول گیا ہوں بتلا دو کیا ہوتا تھا اُن راتوں میں

پیغامِ محبت جو تم نے نظروں سے دیا تھا مجھکو کبھی
اِک بار ذرا پھر دُہرا دو الفاظ کے سادہ فقروں میں

اے میری محبت کی دُنیا، اے جانِ تمنا رازِ سحر
کیوں چھین لی مجھ سے میری نظر اندھیر ہو دُنیا آنکھوں میں

جب دل سے کبھی تنہائی میں بس آپکی باتیں ہوتی ہیں
کچھ اب بھی ہمیں ملجاتا ہے اُن بھولی بِسری باتوں میں

وہ میرے جنوں کا اک قصہ، ترتیب دیا تھا تم نے جسے
ہاں اُسکو بھی شامل کر ڈالو ماضی کے حسیں افسانوں میں

وہ مِٹ گئی دُنیا جس میں کبھی پیمانِ محبت ہوتا تھا
اب بھول بھی جاؤ چھوڑ بھی دو کیا رکھا ہے اِن باتوں میں

ہاں میرے جنوں کی وسعت کو نظروں میں چھپا لو شرما کر
اور یاد جو میں آجاؤں کبھی ہنس ہنس کے بُھلا دو باتوں میں

کیا تم بھی کہو گے لاؤ میں پی کر اسکو بھی پورا کر ڈالوں
زہرابِ مُقدّر دیکھ رہا ہوں آج تمہارے ہاتوں میں

پروردۂ غم کی نوحہ گری سے تھک جاؤ تو کہدینا
کچھ مکر و فریب ملا دیگا غمناک سے ان افسانوں میں

راحت سعید

محفلِ خیال

فردوسِ کائنات زمینِ چمن ہے آج ۔۔۔ خود ذرّہ ذرّہ باغ کا لعلِ یمن ہے آج
ذرّوں کے پردے میں کوئی جلوہ فگن ہے آج ۔۔۔ عالم تمام بُتکدۂ برہمن ہے آج
بدمستیوں میں روحِ زمین و زمن ہے آج ۔۔۔ ہر ذرّۂ حقیر چمن در چمن ہے آج
ہر وہمِ بے ثبات کو حاصل ہے اک ثبات ۔۔۔ روشن چراغِ محفلِ فکر و فطن ہے آج
ہر ذرّۂ جہاں میں ہے امکانِ رنگ و بو ۔۔۔ پھولوں کے ریشے ریشے میں خونِ چمن ہے آج
چھایا ہوا فضا پہ ہے اک ابرِ عنبریں ۔۔۔ دوشِ صبا پہ کاکُلِ مُشکِ ختن ہے آج
یارب بہارِ حُسن، یہ کافر بہارِ حُسن ۔۔۔ مستِ خرامِ ناز وہ جانِ چمن ہے آج
لَو دے رہا ہے حُسنِ شباب و شبابِ حُسن ۔۔۔ روشن چراغِ جلوۂ سیمیں بدن ہے آج
مستِ شبابِ حُسن کی شیریں خرامیاں ۔۔۔ محوِ بہار، خستگیٔ کوہکن ہے آج
شاید ہے زیبِ صدر کوئی نوبہارِ ناز ۔۔۔ بدلا ہوا سا رنگ و رخِ انجمن ہے آج
بہرِ سکونِ خاطرِ روحِ نیاز عشق ۔۔۔ رقصاں بہ نازِ زلفِ شکن در شکن ہے آج
شکرِ خدا کہ جلوۂ حُسن و جمال سے ۔۔۔ خلوت فروز، روشنیٔ انجمن ہے آج
ہر قطرۂ سحاب میں امکانِ صد بہار ۔۔۔ ہر ذرّۂ حقیر میں جانِ چمن ہے آج
پھر جستجوئے صید کی پیدا ہوئی خلش ۔۔۔ پھر گرمِ ناز کاکُلِ تقویٰ شکن ہے آج
پھر محشرِ تلاطمِ جذباتِ حُسن ہے ۔۔۔ پھر وہ رُخِ لطیف چمن در چمن ہے آج
پھر جلوۂ تصادمِ ناز و نیاز ہے ۔۔۔ پھر مائلِ کرم بُتِ پیماں شکن ہے آج

پھر محفلِ خیال میں ہے عشرتِ وصال
پھر دل مرا بمنزلۂ انجمن ہے آج

فرحت کانپوری

سپارٹا کا صنم

سپارٹا سے دو میل کے فاصلہ پر دریائے یوروطاس کے بائیں کنارہ پر ایک بلند پہاڑی تھی شاداب اور گل پوش۔ اس علاقہ کی نباتاتی دولت کے انبار اگر کہیں سب سے زیادہ ایک جگہ پائے جاتے تھے تو وہ یہ مقام تھا۔ یہ سطح مرتفع دور تک پھیلی ہوئی تھی جہاں سے سپارٹا شہر کی بلند و بالا عمارتیں۔ مینارے اور دیگر مناظر کا بہترین نظارہ کیا جا سکتا تھا۔ تین سو سال سے یہ پہاڑی علاقہ سپارٹا کے حریص بادشاہوں کی بڑھتی ہوئی حرص و آز کا نہایت پامردی کے ساتھ مقابلہ کر رہا تھا اور اب بھی اپنی وسعت کی کمی مگر ہمت کی بلندی کی وجہ سے وہ کسی یونانی منطقہ سیاست سے کم نہ تھا۔

ہماری کہانی کا زمانہ چھٹی صدی قبل مسیح کا ہے جب ریاست سپارٹا کا نظم و نسق اور منظم طریقۂ زندگی "جو بادشاہ" لائی قرگس" نے نہایت شد و مد کے ساتھ جاری کیا تھا" قدرتی طور پر اب سست پڑ گیا تھا اور سپارٹا کی عظمت اب انحطاط کی طرف مائل ہو رہی تھی۔

اس چھوٹی سی پہاڑی کا نام تھا ترپانی۔ اس پُرسحر وادی گلپوش میں بہت سے ہیکل۔ مقبرے اور یادگاریں جا بجا بن گئی تھیں جو عوام و خواص کی دلبستگی و توجہ کا سال سے سال مرکز بنے رہا کرتے تھے۔ ایک ایک پتھر جو کسی جگہ کھڑا دکھائی دیتا تھا اپنے پیچھے کسی نہ کسی داستان کو لئے ہوتا تھا۔

قدیم یونانی معبودوں کے یہ ہیکل جن کے دروازے زر و جواہر سے مرصع ہوتے' دن اور رات ہر وقت کھلے رہتے تھے ان میں زائرین کا ایک تانتا بندھا رہتا تھا اور کوئی مندر ایسا نہ تھا جہاں کی فضا میں یونان قدیم کی رومانی داستانوں اور روایات ماضی کی گونج نہ سنائی دیتی ہو۔ حد یہ کہ قبروں کے گنبد بھی حیات بخش نظارے پیش کرتے تھے۔ بجائے ایک غیر فانی دنیا کا کنارہ معلوم ہونے کے یہ مقبرے ایک فانی زندگی کا میدان عمل بن گئے تھے' بالعموم تاریکی اور خنکی ان گنبدوں اور قبروں کے ساتھ فوراً ہمارے ذہن میں آجاتی ہے لیکن ترپانی کے یہ مقابر و معابد گھماگھمی اور پُرمسرت روحانیت سے ایک گہری نسبت رکھتے تھے۔ یہاں مقبروں میں آپ جا بیٹھے نور و شنی۔ خوشبوئیں گرم ہوا اور خوبصورت عورتیں گوشہ گوشہ میں زندگی کے جرعہ سے آخری قطرہ تک پینے کے لئے آمادہ دکھائی دیں گی۔ جگہ جگہ پرانے بہادروں اور بڑی عورتوں کے مجسمے نصب تھے جن کے سروں پر سونے چاندی کے پھولوں کے گنٹھے لپٹے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ ٹرائے کے ہیرو اٹرا ماموں اور کاسندرا کے مجسمے تھے جو ایک عجب شان کے ساتھ مسکرایا کرتے تھے۔ ان کو دیکھ کر نوجوان مردوں اور حسین عورتوں کی نبضیں تیزی سے دھڑکنے لگتی تھیں' ان کا تنفس تیز تر ہو جاتا تھا' مقام ہمیں قدیم کہانی کی طرف لے جاتے تھے جب نظارہ بین اسے دیکھتے تو یاد کرتے کہ کاسندرا کے دو نیزہ لبوں پر اپالو دیوتا نے ایک بوسہ ثبت کر کے کیسا بس بو یا تھا اور افلاک پر اس ہنگامہ مستی نے کیا ہلچل پیدا نہ کر دی تھی۔ پھر کس طرح آزاک کی حرص سے کاسندرا کو بچا کر اٹرا ماموں لایا تھا۔

کہیں اور قریب "ذیہم" کا ہیکل تھا جو اپالو دیوتا کو بہت پیارا تھا اس دیو استھان پر پری چہرہ لوگوں کا ہر وقت ہجوم رہتا تھا کیونکہ یہاں ٹرائے کی ہیروئین ہیلن کا مندر تھا۔ مریخ دیوتا اور لیدا دیوی کے اختلاط نے ہیلن جیسی خوبصورتی پیدا کی تھی اس پر اگر خود چشم فلک فریفتہ نہ ہوتی اور زمین اس ہلبن میں اگر خاک بسر نہ ہوتی تو تعجب تھا —— اس الہتہ الحسن کا ہیکل اس ہی مقام پر تھا جسے لوگ بوجہ الوہیت و جاذبیت متبرک ترین مقام سمجھتے تھے۔

ہیکل ہیلن!

اسی مندر کا ذکر ہے کہ یہاں ایک عورت روز آتی تھی۔ اس کے ہاتھ میں کپڑوں کا ایک چھوٹا سا پلندہ ہوتا تھا جس کی حرکت سے یہ محسوس ہوتا تھا کہ اس میں کوئی بچہ ملفوف ہے۔ یہ عورت روز سپارٹا سے پیدل چل کر آتی تھی اور مندر میں داخل ہو کر ہیلن کے بت کے سامنے ایک کشتی میں بچا پار کھ کر بچہ کو کپڑوں میں لپیٹے ہوئے آگے بڑھتی تھی' دو زانو ہو کر حسن کی دیوی کے سامنے گڑگڑا کر دعائیں مانگتی تھی اور پھر اٹھ کر جس راہ سے آئی تھی اسی راہ چل دیتی تھی۔

ایک روز جب یہ دراز قد عورت مندر کی سیڑھیوں پر سے اتر رہی تھی ایک بڑھیا سامنے سے آگے بڑھی اور اسے روک کر کہا کہ میں اس بچہ کو جو تیری گود میں ہے دیکھنا چاہتی ہوں' دراز قد جوان عورت نے یہ درخواست فوراً نامنظور کر دی اور بولی میں اس چھوٹی سی بچی کی آیا ہوں۔ یہ بچی بہت ہی

امیر ماں باپ کی ہے اگرچہ یہ دونوں انتہائی امیر، بیحد تندرست اور خوبصورت ہیں لیکن ان کے دکھ کی کوئی حد نہیں ہے جب وہ یہ دیکھتے ہیں کہ ان کے ہاں جو بچی ہوئی ہے وہ بہت مکروہ صورت ہے۔ اس کے جسم میں عیب ہیں اور شکل بہت بگڑ گئی ہے۔ مجھے حکم ہے کہ ان کی اس بچی کو کسی کو ہرگز نہ دکھایا جائے میں دیوی کے مندر میں روز آتی ہوں اور دعا کرتی ہوں کہ وہ اس بچی کی صورت میں کوئی خوبی پیدا کریں اور وہ اس قابل ہو جائے کہ کوئی اس کی طرف دوبارہ دیکھ سکے۔

بڑھیا "کنجریوں" کی طرح اس عورت کو لپٹ گئی اور اصرار پر اصرار کرنا شروع کیا کہ میں تو بغیر دیکھے تمہیں جانے نہ دوں گی۔ اس مسلسل رد وکد کا نتیجہ یہ نکلا کہ تنگ آکر عورت نے کپڑے علیحدہ کر کے بچی کو دکھا دیا۔ آیہ بچی کو گود میں لئے ہوئے تھی اور بڑھیا اسے بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ دیکھتے دیکھتے دو ایک جگہ اس بچی کے جسم کو بڑھیا نے چھوا بھی۔ تھوڑی دیر بعد بڑھیا نے اطمینان اور دلاسہ کے لہجہ میں آیہ سے کہا "اپنے مالک سے کہنا کہ اب پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور ظاہری بدنمائی پر بھی نہ جائیں یہ بچی کسی روز ایسی ہستی بنے گی کہ دنیا رشک کرے گی اس کی خوبصورتی کی لوگ مثال دیا کرینگے آج تک سپارٹا کی زمین پر کسی خوبصورت کے قدم نہیں چلے ہوں گے جیسی کہ یہ لڑکی اپنے وقت میں ہوگی"۔

بڑھیا ایک طرف کو چلی گئی اور آیہ نے اپنا راستہ لیا۔ آیہ نے کچھ یقین نہ کیا کہ بڑھیا کیا کہہ رہی تھی اس کو یہ یقین ہی نہ تھا کہ ایسی مکروہ اور بدنما ہستی کبھی خوبصورتی تو کیا معمولی شکل بھی اختیار کر سکے گی۔ رحم کھا کر آیہ نے اس معصوم و مکروہ جان کو اپنے دھڑکتے ہوئے سینہ سے لگا لیا۔

مگر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ اسی روز سے اس ننھی سی جان پر ہیلن کا سایۂ التفات پڑنا شروع ہو گیا اس کی شکل صورت میں ایک نمایاں ترقی بلکہ تبدیلی ہر روز ہو جاتی اور جب وہ بلوغ کے درجہ تک پہنچی تو اس کے جمال کی کوئی مبالغہ آمیز تعریف بھی تشفی بخش نہ ثابت ہو سکی۔ انسان کا ذہن کسی انسانی پیکر کی جس قدر بھی خوبیاں سوچ سکتا ہے اور حسن و شباب و صحت کا جو بھی مفہوم آپ کے ذہن میں ہو سکتا ہے وہ اس خوبصورت لڑکی میں موجود تھا۔

قدرت بھی عجیب ستم ظریفیاں کرتی ہے۔ اور خاص کر اقوام یونان پر تو قدرت کی فیاضیاں بلکہ غلط بخشیاں بہت عام رہی ہیں ہیلن دیوی کی دعا اور پراسرار بڑھیا کے لمس نے ایک ایسی خوبصورتی پیدا کر دی تھی جس نے تمام ہیلنستانی دنیا کو زیر و زبر کر دیا تھا۔

ہر سال اس خوبصورتی میں کچھ نہ کچھ اضافہ ہی ہو جاتا تھا۔ اور جب وہ حسن لازوال اوج پر پہنچا تو اس کی تابناکی بلکہ حرارت سے بچا رہنا کسی نوجوان کے بس کی بات نہ رہی۔ کوئی دھڑکنے والا دل اور محسوس کرنے والا دماغ ایسا نہ تھا جو اس خوبصورتی سے متاثر بلکہ اس پر فریفتہ نہ ہو گیا ہو۔ اس زمانہ کا رواج تھا کہ عورتوں کا جوان حسن پبلک مقابلوں اور دوڑوں کے وقت بالکل عریاں رکھا جاتا تھا۔ جب یہ شمع فانوس سے باہر رہ کر فروزاں ہوتی تو کوئی وجہ نہ تھی پروانے خود وارفتہ ہو کر قربان نہ ہوتے۔ غرض سارے یونان میں بلکہ اس کے باہر بھی اس حسن کی تابناک شعاعیں پہنچ گئی تھیں اور کوئی لب ایسا نہ رہا تھا جس پہ اس خوبصورتی کی تعریف میں کوئی شعر موزوں نہ ہو گیا ہو!

وہ خوش نصیب ہستی جسے اس حسینہ کی پسند کا مرکز بننا تھا بجائے خود ایک شکیل و طباع ہستی تھی۔ اس نوجوان مدبر سلطنت کا نام آغطس تھا اور یہ ترپانی کی ریاست میں بادشاہ وقت عارستان کا دست راست اور مشیر خاص تھا۔ اس عالی مرتبت شخصیت سے کسی بے مثال خوبصورتی کا منسلک ہو جانا اور بھی شہرت کا باعث ہوا۔ ایک کی شہرت و عظمت نے دوسرے کی خوبصورتی اور رفعت کو چار دانگ عالم میں روشناس کرایا۔

ترپانی کا بادشاہ بھی عجیب بدقسمت آدمی تھا۔ کہنے کو تو بادشاہ تھا مگر مغموم اور صدموں سے نڈھال، ایک بےکیف زندگی۔ عارستان نے دو شادیاں کی تھیں اور دونوں بانجھ نکلیں۔ اس کے کوئی اولاد نہ تھی اور اس صدمہ کی وجہ سے وہ بہت مغموم رہتا تھا۔ سلطنت کے کاموں میں اس کا ایک رقیب تھا "قیلی میناس" وہ تخت کا دوسرا وارث بن سکتا تھا علاوہ ازیں اس کے ہاں کئی نرینہ اولادیں بھی تھیں اور یہ خیال تھا کہ سلطنت اب "عارستان" کے ہاتھوں سے نکل کر "قیلی میناس" کے خاندان میں چلی جائے گی۔

عارستان کو اپنے لاولد ہونے کا یقین سا ہو گیا تھا اور جب اسے اس بات کا خیال آتا تھا کہ اس کے سیاسی رقیب قیلی میناس کو یہ سب نعمتیں حاصل ہیں تو وہ بغض و حسد کی آگ میں تڑپنے لگتا تھا مگر قدرت کے فعلوں کے آگے کچھ پیش نہ چلتی تھی۔ اسی طرح دن بیتتے چلے گئے۔

جب آغسطس اس کے دوست نے اپنی بیوی کا تعارف بادشاہ عارستان سے کرایا تو عارستان اس خوبصورتی کی چکا چوند سے بوکھلا گیا اور ایک عجیب خیال اس کے دماغ میں اسی روز سے چکر لگانے لگا۔ آغسطس کی بیوی کو اپنے پہلو کے لئے حاصل کرنے کے لئے اس کے دماغ میں ایک زہر پیدا ہو چکا تھا اور وہ آہستہ آہستہ اس کی رگ و پے میں سرایت کر رہا تھا ——!

وقت گذر رہا تھا اور عارستان کے دل و دماغ پر ایک ہولناک تصور ہر وقت چھائے رہتا تھا۔

وقت گذرتا چلا گیا۔ ایک تصور تھا جو ہر وقت اس کے دماغ میں چکر لگاتا رہتا تھا۔ ایک شاہی تھا گناہ کا جو اس کی روح کو دبوچنے کے لئے ہر وقت منڈلاتا رہتا تھا۔ آعنطس کی شادی کو غیر قانونی ثابت کرنے کے لئے ملک کا کونسا ایسا قانون تھا جسے وہ توڑ مروڑ کر اپنے مطلب کا نہیں بنا سکتا تھا لیکن وہ اس قسم کی خفیف الحرکتی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے جذبۂ معصیت کو ایک اور بہروپ دیا۔

آعنطس ایک صاحب ثروت آدمی تھا اور اس کے محلات میں نہ صرف خوبصورت عورتوں کا اژدہام رہتا تھا بلکہ جمالیاتی ذوق کی تسکین کے لئے جس قدر بھی اشیائے جمیل اسے فراہم ہو سکتی تھیں لا لا کر اپنے مکانوں میں انبار کرتا رہتا تھا۔ اس کے محلات میں زر و جواہر کے ڈھیر اور آرٹ کے خزانوں کا ایک بے تحاشہ انبار تھا جسے دیکھنے کے لئے خود بادشاہ خواہش ظاہر کر چکا تھا۔ آعنطس نے بارہا بادشاہ سے یہ درخواست کی تھی کہ وہ ان خزانوں میں سے جس بیش قیمت چیز کو پسند کریں ان کی نذر کر دی جائے گی۔ بادشاہ نے بارہا اس درخواست کو سنا تھا اور کوئی خاص توجہ نہ دی تھی اس دفعہ جب اسے یہ دعوت دی گئی تو اس کا دماغ ایک نہایت مکروہ مکر کی طرف راجع ہو گیا۔ گناہ بھی کیسا سنگ دل معلم اسود ہے۔

چنانچہ بادشاہ نے آعنطس سے کہا کہ میں اس وقت تک تیرے خزانوں میں سے کوئی بیش قیمت چیز نہیں لوں گا جب تک تیرے لئے میں کوئی نعم البدل نہ دے دوں۔ دونوں اس بات پر رضامند ہو گئے کہ جس کو جو چیز جس کے خزانوں میں سے پسند آجائے وہ لے لے اور برابر کا بزنا و کیا جائے۔ مانگنے کے لئے کوئی حد مقرر نہیں کی گئی ہے۔ ہر دو فریق کو اختیار تھا کہ جو چاہے مانگ لے اور دوسرا فریق اس کے دینے کے لئے مجبور تھا۔

بادشاہ کے خزانوں کا دنیا میں جواب نہ تھا۔ آعنطس کو اس تصفیہ سے یک گونہ خوشی تھی کہ اسے کسی طرح کا نقصان نہیں ہو سکتا کیونکہ میں جو چاہوں گا بادشاہ کے خزانوں سے لے لوں گا۔

جس مورخ نے یہ داستان واقعہ کے ۵۰۰-۶۰۰ سال بعد تحریر کی تھی اس کی تفصیل نہیں بتاتا کہ آعنطس نے بادشاہ کے کس قیمتی خزانہ یا سنئے نایاب کو اپنے انتخاب سے سرفراز کیا لیکن بادشاہ کی طرف سے آعنطس کے سامنے جو تجویز پیش ہونے والی تھی وہ اس سے بالکل بے خبر تھا۔ اسی لئے خوش تھا۔ کاش صدیوں کے پر نہ ہوتے صرف پیر ہوتے جو ہم تک پہنچنے میں انھیں دیر تو لگتی۔

آعنطس ایک ماہر فنون لطیفہ کے طریقہ پر بادشاہ کے زر و جواہر کے ہنبار تاریخی نوادرات اور نایاب نصادیر و اشیا کے تودے دیکھتا ہوا گذرتا چلا گیا۔ کبھی اس کے ہاتھ میں "تقلیس یا" کے بنے ہوئے بہترین زرین جام آجاتے تھے تو کبھی ہندوستان کے ہاتھی دانت کی چیزیں سونے کے تمکن ٹکڑے کے بے جوڑ رتھ جو فرعونی حکمرانوں کے لئے بنائے گئے تھے جن میں قیمتی جواہرات کی پچی کاری کیا لطف دیتی تھی۔ ایرانی قالین جو ہاتھی دانت کی سوئیوں سے تیار کئے گئے تھے۔ اسیریا کے گھوڑے کی جوڑیاں۔ بابل کے نقشی دار کام کے دروازے۔ سلقیہ کے مجسمے فرنیچر، گلدان اور دیگر آرائش۔ بغرض ہر چیز جو ذوق سلیم، محنت شاقہ اور دولت گرانبہا مہیا کر سکتی ہے شاہ کے خزانوں میں موجود تھی اور صرف کہدینے پر مل سکتی تھی۔ عارتسان اس وقت فیاضی کے زعم میں جھوم رہا تھا اور مطلق اعتراض نہ کر رہا تھا۔ آعنطس آرٹ یا دولت کے جس انبار کی طرف دیکھتا تھا اسے وہ فوراً عطا کر دی جاتی تھی۔

نصف معاہدہ ختم ہو گیا۔ اب بادشاہ آعنطس کے گھر پہنچا اور اس کے خزانے دیکھنے شروع کئے۔ آعنطس کے پاس جس قدر بھی نادر و نایاب چیزیں تھیں ایک ایک کر کے سب دکھا دیں اس نے لیکن عارتسان نے ان میں سے کسی ایک کی طرف بھی ہلکی سی توجہ نہ دی۔ بلکہ آعنطس کی طرف متوجہ ہو کر بولا ——— "تم یہ چاہتے ہو کہ میں یہ بتاؤں کہ مبادلہ میں میں تم سے کیا چیز طلب کرتا ہوں؟ اچھا۔ سنو۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ تم اپنے سب سے زیادہ قیمتی گوہر کو میرے ساتھ گھر روانہ کر دو۔ میرا مطلب ہے اپنی بیوی کو!"

آعنطس کے حواس جاتے رہے۔ پہلے تو وہ یہ سمجھا کہ شاید بادشاہ اس کے ساتھ مذاق کر رہا ہے لیکن گفتگو کی سنجیدگی نے فوراً اسے یہ سمجھا دیا کہ بادشاہ بالکل مذاق نہیں کر رہا ہے اب اس کو معلوم ہوا کہ اس کے ساتھ ایک نہایت ہی مکروہ قسم کی دغا کی گئی جس کا جواب شاید کہیں نہ ملے اس نے احتجاج کیا کہ معاہدہ میں بیوی شامل نہ تھی عارتسان نے جواب دیا کہ یہ بالکل غلط ہے۔ معاہدہ یہی ہوا تھا کہ جو فریق جو چاہے گا مانگ لے گا اور فریق ثانی کو بخوشی وہ چیز دے دینی ہوگی۔ اگر کسی چیز کو مستثنیٰ قرار دینا بھی تھا تو وہ شروع ہی میں نہایت وضاحت کے ساتھ طے کر دینا تھا۔

آعنطس کا سر چکرانے لگا وہ خوب سمجھتا تھا کہ سپارٹا کی مملکت میں قطعیت کو دخل ہے اور قیل و قال نہیں سنی جائے گی اس کے لئے فرار کی کوئی راہ باقی نہ رہی تھی، دھوکہ مکمل ہو کر کامیابی سے ہمکنار ہوا۔

اس بات کے تو کہنے کی ضرورت ہی نہیں کہ اس وقت عورت کی کوئی آواز ہی نہ تھی جو اس نوع کے معاملہ میں قابل سماعت گردانی جاتی۔ اس لئے آعنطس کی بیوی کو اپنا گھر چھوڑ کر اس بادشاہی تخت کے لئے

روانہ ہونا پڑا جس کی اسے کوئی جستجو نہ تھی۔

عارستان نے اپنی دوسری بیوی سے بہت جلد طلاق حاصل کرلی۔

زہرہ دیوی کی محبوب بیٹی ملکہ سپارٹا بن کر مغموم چہرہ متورم آنکھیں اور ڈوبا ہوا دل لے کر تخت پر آئی۔

نئی ملکہ کے تخت پر جلوہ ریز ہونے کی بڑی خوشی منائی گئی۔ لوگوں کی نئی امیدیں بندھنے لگیں اور ہر طرف جشن و شادمانی کے نقارے بجنے لگے۔ اگر فریب خوردہ شوہر کی حمایت میں کوئی آواز اٹھی بھی ہوگی تو اس عشرت خراش غوغا میں جو اس وقت مملکت میں برپا تھا، ڈوب گئی ہوگی۔ اعتراض کی آواز صابن کے بلبلے کی مانند ہوتی ہے ذائقہ میں تند اور تیز اور بے اثر ہی مگر عمر میں کوتاہ!

غریب آغنطس تو کچھ ایسا گمنام ہوا کہ اس کے بعد کسی نے اسے دیکھا بھی نہیں۔ تاریخ بھی اس کے ذکر سے خالی ہوگئی۔ غالباً وہ سپارٹا کی پبلک زندگی کو ختم کر کے کہیں دور نکل گیا۔ اور پھر وطن کی صورت نہ دیکھی۔

شادی کے ابتدائی چند دنوں کا ذکر ہے کہ ایک عجیب اور حیرت انگیز واقعہ رونما ہوا اور ساری مملکت میں اس کا چرچا ہوگیا اس واقعہ نے شادی کی سنجیدگی کو درہم و برہم کر دیا اور مختلف قسم کی چہ میگوئیاں ہونے لگیں گو اس وقت کسی کے ذہن میں بھی یہ بات نہ تھی کہ اس وقوعہ کا کیسا خطرناک انجام پردۂ ظہور پر آنے والا ہے۔

یہ شادی کے بعد تیسری رات تھی۔ عارستان اپنی نئی ملکہ کی خوابگاہ میں داخل ہوا۔ دیکھا کہ وہ برہنہ حالت میں ہے سر کے گرد پھولوں کا ایک گجرا لپٹا ہوا ہے اور کچھ گجرے جسم کے اسفل حصہ و سینہ سے پیوست ہیں۔ بہت دیر تک تو عارستان اس پیچ نظارہ کو دیکھتا رہا اور سمجھ نہ سکا کہ اس برہنگی اور گل پوشی کا مطلب کیا ہے اور ملکہ نے یہ کس نیت سے لباس اختیار کیا ہے۔ کمرہ کے ایک گوشہ میں طاق تھا جس پر جو نو "دیوتا" کی مورت رکھی ہوئی تھی اس کے سامنے ننھا سا دیا جل رہا تھا۔ پہلے پہل تو عارستان کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کیا [illegible] ہے۔ کمرہ میں روشنی بہت ہی کم تھی اس لئے وہ جھپٹ کر باہر گیا اور ایک سہ شاخہ شمع دان اٹھا کر پھر خوابگاہ میں آیا

ملکہ ایک ملکوتی تبسم چہرہ پر لئے ہوئے مسہری پر سے اٹھی اور بادشاہ سے پوچھا کہ آخر اس عجیب و غریب حرکت سے مطلب کیا ہے؟ عارستان نے اس کا جواب ایک دوسرا ہی سوال کر کے دیا۔ اس نے پوچھا ——

"یہ پھولوں کے گجرے کہاں سے آئے؟ اور اس قسم کے عریاں لباس کی کیا ضرورت تھی؟ یہ گجرے کس نے لاکر دئے؟" ملکہ کے چہرہ پر اب بھی تبسم تھا۔

اس نے مسکرا کر جواب دیا "او ہو! اتنے جلدی بھول گئے۔ آپ ہی نے تو یہ گجرے ابھی پہنائے تھے!"

عارستان نے قسم کھا کر کہا کہ آج کی رات وہ پہلی مرتبہ اس خوابگاہ میں آیا تھا۔ ملکہ نے کہا کہ تم غلط کہہ رہے ہو ابھی تو تم میرے پاس دراز تھے۔ پھر اس نے نہایت تفصیل کے ساتھ اس کے آنے کا قصہ دہرایا۔

بادشاہ غصہ اور رقابت کے تصور سے لرز رہا تھا پھر اسے یہ خوف بھی ہوا کہ جس مکاری کے ساتھ اس نے اپنی تیسری بیوی حاصل کی ہے وہ خداؤں کو ناگوار گزری ہے اور کوئی غیر فطری و پر اسرار شے اس کی شادی شدہ زندگی میں دخل انداز ہوکر سزا دینا چاہتی ہے۔

ملکہ بہت سنجیدگی اور متانت کے ساتھ بات کر رہی تھی، نیز واقعات پر کامل توجہ کے ساتھ غور کرنے کے بعد یہی تسلیم کیا گیا کہ ملکہ نے کوئی دانستہ بدعنوانی نہیں کی ہے اور اس کا کہنا درست ہے، فرض کیجئے کہ اس کی خوابگاہ میں کوئی دوسرا مرد بھی ہوتا تو وہ اپنے شوہر کے آنے تک گجروں میں لپٹی ہوئی کیسے انتظار کرتی رہتی اور اس جرم ثابت کرنے والی نشان کو وہ فوراً کیوں نہ تلف کر دیتی۔ جب غور سے دیکھا گیا تو معلوم ہوا کہ ہار قدرتی پھولوں کے نہیں ہیں بلکہ سونے کے ہیں یہ گجرے "اولمپک" کھیلوں کے موقعوں پر رنگ بان بہادروں اور دوڑ میں دیگر جیتنے والوں کو انعام میں دئے جاتے تھے۔ سب سے بڑا کھیل کا انعام ایک ہار تھا جو "استرابتقیس" (کھیلوں کے تاجدار) کے مندر میں رکھا ہوا تھا۔ یہ کھیلوں کا مشہور و معروف ماہر گذرا تھا اور لوگ اسے ایک دیوتا کی مانند پوجنے لگے تھے جس کے لئے ہیکل بن گیا تھا گھوڑوں، گھوڑوں کے سدھارنے والوں، اصطبلوں اور اسی قسم کے اشتغال کے لئے جن کا تعلق اس شریف جانور سے ہے یہ دیوتا پوجا جاتا تھا آج جب رات کو محل کی عورتوں نے ملکہ کو خوشبوؤں سے نہلا کر خوابگاہ میں بھیجا تھا یہ طلائی ہار گھوڑوں کے دیوتا کے مندر سے جو محل کے قریب ہی تھا نکل کر اس خوابگاہ میں پہنچ گئے تھے ملکہ کو صرف ایک خیال کہ معلوم تھا اس شخص کا جو یہ ہار لے کر آیا تھا اور وہ اس بارے میں مطلق غلطی نہیں کر سکتی تھی کہ سوائے عارستان کے اور کوئی شخص ہو ہی نہیں سکتا۔ دونوں میں سے کوئی نہ بولا تھا اور جب وہ مسہری سے اتر کر جانے لگا تو طلائی ہار ملکہ کے سر کے گرد اور چھاتیوں پر غرض تمام جسم سے لپیٹ دئے، پھر بھی کوئی لفظ منہ سے نہ نکالا اور چپ چاپ کمرہ سے باہر چلا گیا۔

وقت گزرتا چلا گیا اور جو نو دیوتا نے عارستان کی دیرینہ آرزو کو شرف قبولیت بخشا۔ ملکہ حمل سے ہوگئی اگر اس کے ہاں نرینہ اولاد ہوتی ہے تو وراثت سلطنت کے معاملہ تمام قضیوں سے خود بخود پاک ہوجاتا ہے۔

تمام ملک میں اخلاص قلب کے ساتھ خوشی اور مسرت کے نعرے لگنے شروع ہوئے اور ہر طرف مسرت و شادمانی کی لہر دوڑ گئی ۔۔ پراسرار واقعہ جو ملکہ کی خواب گاہ میں ہوا تھا اس ہنگامہ میں سب بھول گئے ۔ حد یہ کہ بادشاہ کو بھی اس کا کچھ خیال نہ رہا ۔

لیکن کس قدر جلدی اس کلیہ کا ثبوت مہیا ہو گیا کہ وہ بات جس کی اصلیت سمجھ میں نہ آئی ہے عرصہ دراز تک زندہ رہتی ہے چنانچہ ایک روز عارستان کے سچے قلبی جذبات اچانک از خود اور نہایت مہلک طریقہ پر ظاہر ہو کر رہے ۔

بادشاہ عارستان اپنے "ایفروں" (درباری منصفوں) کے ساتھ بیٹھا ہوا مختلف مقدمات پر انصاف کی نظر سے فیصلہ کر رہا تھا کہ یکایک ایک پیغام رساں دوڑتا ہوا آیا اور عرض کیا کہ ملکہ مبارک کے ہاں فرزند تولد ہوا ہے ۔ اس سے پیشتر کہ مجلس اس مبارک موقع پر اپنی دلی مسرت کا اظہار کر سکتی عارستان نے ایک نہایت حیرت انگیز اور غضب ناک بات کہی جسے سب "بیٹھے" والوں نے سن لیا ۔ وہ چیخ رہا تھا اور ہر شخص کے کان کھڑے ہو رہے تھے ۔

" یہ لڑکا جو پیدا ہوا ہے میرا نہیں ہے ۔ ابھی صرف دس مہینے ہوئے ہیں ، میں اس کا باپ نہیں ہوں !! "

اس کے بعد وہ غوطہ میں چلا گیا ، پھر اٹھ کر مجلس سے چلا گیا ۔ مجلس کے ارکان نے ایک دوسرے کی طرف توجہ سے دیکھا اور حیران ہوئے کہ آخر بادشاہ کا مطلب کیا تھا ۔ ابھی دس ہی مہینے ہوئے ہیں اس کا آخر کیا مطلب تھا ، کوئی شخص یہ محسوس نہیں کر سکتا تھا کہ اگر کوئی بچہ شادی کے دس مہینہ بعد پیدا ہوا تو اس میں عیب کی کیا بات تھی ۔

ممکن ہے بادشاہ کے لفظوں کا ریکارڈ قائم رکھنے میں غلطی کا ارتکاب ہوا ہو لیکن تمام مورخین یونان یہی لفظ نقل کرتے ہیں اور کسی کو جرأت نہیں ہوئی کہ اس میں تبدیلی کریں ، یہی تاریخی واقعہ ہر جگہ ملتا ہے اور یہی لفظ ہر ایک نقل کرتا ہے بہر کیف یہ بحث بالکل غیر متعلق ہے اور داستان کے تار و پود پر اس سے کوئی اثر نہیں پڑتا جس قصہ میں رسوائی کا شائبہ ہو بہت جلد مشہور ہو جاتا ہے ، اس لئے یہ واقعہ بھی تمام لوگوں کو معلوم ہو گیا اور ہوتے ہوتے "قلینوتس" بادشاہ کے رقیب سیاسی کے پاس بھی یہ خبر وحشت اثر پہنچی ۔

اس کو قدرتی طور پر یہ گمان ہوا کہ اگر بادشاہ اپنی پدریت سے انکار کر دیتا ہے تو اس بچہ کو تخت نہیں پہنچے گا اور بہت سے نتائج پیدا ہوں گے ، بہت ممکن ہے میرے لئے بہتر وقت آ جائے ۔ لیکن یہ تمام باتیں فریب خیال ثابت ہوئیں ، کیونکہ ہوا کچھ بھی نہیں ۔ آوازیں اور ان کی گونجیں وقت کے دریا میں یکے بعد دیگرے غرقاب ہوئیں حد یہ کہ بادشاہ تک نے یہ ظاہر کر دیا کہ وہ عاجلانہ فقرہ منھ سے نکل کر اس نے ایک بے وقت اور فضول بات کہی تھی جس پر اسے افسوس تھا !

اس لڑکے کا نام دمارطس رکھا گیا ۔ یہ یونانی نام دو لفظوں سے مرکب ہے جس کے معنی ہیں "پرور دگار نام" ۔۔۔ یعنی بادشاہ ! اس میں شک نہیں کہ عارستان کو قلینوتس سے زیادہ ملک میں مقبولیت حاصل تھی ، اس کی ہر دلعزیزی اور عوام پسندی نے اسے بہت جلد مرکز کا درجہ دے دیا تھا یہی وجہ تھی کہ جب اس کے ہاں تخت کا وارث پیدا ہوا تو ہر ایک خوشی ہوئی اور جگہ جگہ سے مبارک بادیاں موصول ہوئیں ۔

لڑکا بڑا ہونا شروع ہوا اور نہایت خوبصورت جوان بن گیا اس نے شروع ہی سے کھیلوں اور ورزشوں سے دلچسپی تھی اور ابتدا ہی میں اس کی بہادری اور جسمانی طاقت کے جوہر کھلنے لگے تھے اور یہ خیال تھا کہ بہت جلد وہ رتھ بانی (جس کا اسے خاص ذوق تھا) اور اگر فنون ورزشی میں کمال پیدا حاصل کرے گا ۔

وہ بالکل جوان ہو چکا تھا کہ باپ کا انتقال ہو گیا ۔ بہت آسانی کے ساتھ وہ تخت پر جلوہ افروز ہوا ۔

اس اثنا میں قلینوتس اس کے باپ کے رقیب سیاست ، اور خود اس میں کافی کشمکش پیدا ہو چکی تھی ، اور دمارطس نے بھی اپنے دشمن کو اچھی طرح یہ محسوس کرا دیا کہ وہ خصومت میں اپنے باپ سے کم نہیں ہے ۔ شروع شروع میں تو یہ دشمن ڈپلومیسی کی نقاب کے نیچے چھپی رہی لیکن رفتہ رفتہ یہ تلخی بہت بڑھ گئی اور یہ نقاب بھی اٹھ گیا ۔ ذرا ذرا سی بات پر نہایت شدید نکتہ چینیاں دونوں طرف سے ہونے لگیں اور سیاسی نوک جھونک گہرے زخم بن کر دل میں جگہیں بناتے رہے ۔

کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے دمارطس کے نصیب میں یہ لکھ دیا تھا کہ وہ بھی اپنے باپ کی طرح بیوی کسی کی چھین کر لائے گا چنانچہ یہی ہوا ۔ دمارطس نے کسی اور کی بیوی زبردستی چھین کر اپنے پہلو کی زینت بنا لی ۔۔۔ !

سپارٹا کی ایک قدیم رسم یہ بھی تھی کہ دولہا دلہن کو پکڑ کر لے جاتا تھا ۔ یہ تسلیم کیا جاتا تھا کہ عورت اپنی خوشی سے متاع دوشیزگی حوالہ نہیں کرتی اس کے لئے انسان کو کرختگی کا احساس کرانا پڑتا ہے

اور جب تک یہ رسم کثیف ادا نہ ہو جائے شادی کی تکمیل نہیں ہوتی تھی چنانچہ دمارطس نے اپنی جسمانی طاقت اور سیاسی زبردستی سے کام لے کر اپنے ایک عزیز "لوطی قلائیدز" کی بیوی پر چھاپہ مارا اور اسے زبردستی اٹھا کر اپنے محل میں لے گیا۔ اس سلسلہ میں بھی مکاری برتی گئی اور جو کام باپ نے شروع کیا تھا بیٹے نے تکمیل کو پہنچا دیا۔

قلینوس اس خاندان کا پرانا جہاندیدہ دشمن تھا۔ ہر چند کہ وہ عمر کے تقاضے کے باعث اب سنکی ہو گیا تھا مگر دنیا کو خوب سمجھتا تھا۔ وہ اس بات سے آگاہ تھا کہ کسی انسان کے دل میں دشمنی اور تنفر کا شدید ترین شعلہ پیدا کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ عورت کو وجۂ مخاصمت بنایا جائے۔ اگر عورت کسی ضمن سے آجائے تو پھر قلبی خصومت پیدا ہو کر رہتی۔ چنانچہ قلینوس نے وقت ضائع نہیں ہونے دیا اور فوراً "لوطی قلائیدز" سے راہ و رسم بڑھائی قلینوس نے دیکھا کہ لوطی قلائیدز انتقام کی آگ میں تڑپ رہا ہے اور اسی آلۂ کار بنایا جا سکتا ہے۔ ادھر لوطی قلائیدز کو جب یہ معلوم ہوا کہ قلینوس اس بساط شہنشاہی کو الٹنے کی فکر میں ہے اور سپارٹا کے تخت پر خود متمکن ہو جانا چاہتا ہے تو لوطی قلائیدز نے انتقام کی تسکین کی خاطر ہر ممکن مدد قلینوس کی کرنے کے لئے عہد کر لیا اور اپنے آپ کو انتقام کی آگ میں پوری طرح جھونک دیا۔

ہر چند کہ بہت زمانہ گذر چکا تھا مگر دمارطس کی پدریت کا جھگڑا پھر اٹھا۔ بہت سے لوگوں نے ان لفظوں کا حوالہ دیا جو "مجلس" میں بادشاہ کی زبان سے نکلے تھے۔ لوگوں نے گواہی دی کہ دمارطس کے باپ نے اسے اپنا لڑکا تسلیم نہیں کیا تھا اور اسے "ناپاک بچہ" کہا جاتا تھا۔ اس رسوائی کا پھر چرچا ہونا شروع ہوا۔ دونوں فریقوں کی طرف سے دعوے اور ثبوت اپنے اثبات میں پیش کئے گئے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی ایک کیطرف بھی میزان عدل جھکنے کو تیار نہیں ہے۔ چنانچہ متفقہ رائے سے دونوں فریق اس کے رضامند ہو گئے کہ اس قضیہ کو یونان کے سب سے بڑے مذہبی ہیکل "ڈیلفی" میں بھیجنا چاہیئے۔ ڈیلفی ایک قدیم یونانی مندر تھا جہاں ایک "آواز" ہاتف غیبی کی مانند سوالوں کا جواب دیتی تھی اور اہل یونان اس ندائے غیب کو اپنے لئے حکم الٰہی تصور کرتے تھے اور اس سے سرمو بچنے کی کوشش نہیں کرتے تھے۔ یہ بات طے شدہ تھی کہ ڈیلفی کی آواز غیب مستغنی من الخطا ہے اور بے ایمانی۔ بد دیانتی یا غیر عادلہ جواب اس منبع الٰہی سے نکل ہی نہیں سکتا۔ یہاں جو راہبہ رہتی تھی اس کا نام نطونس تھا اور وہ اکثر عالم جذب میں رہتی تھی۔ اس کی آواز آواز غیب تھی اور اس کے لب تقدس و پاکیزگی کے مظہر سمجھے جاتے تھے۔

چنانچہ اس کے لئے قانونی اجازت صادر ہوئی اور سوال کرنے والے پیغام رساں ڈیلفی کی خانقاہ کو روانہ کئے گئے۔ ہیکل کی جلد سوم اور مذہبی تقدس کی تمام روایات کو پوری طرح ملحوظ رکھا گیا اور آخر کار وقت آگیا کہ یہ سوال ڈیلفی کی مجذوبہ کے سامنے رکھا گیا کہ دمارطس بادشاہ سپارٹا اپنے باپ عارستان کے نطفہ سے ہے یا نہیں؟ ڈیلفی کی آواز اکثر مبہم ہوا کرتی تھی اس کے جواب کے اکثر دو دو معنی نکالے جا سکتے تھے۔ مگر اس دفعہ "ہاتف غیبی" کا جواب بہت مختصر اور صاف تھا۔

"دمارطس عارستان کا بیٹا نہیں ہے ——— !"

یہ بم سپارٹا کے ہوش اڑا دینے کے لئے کافی تھا۔ اس جواب کے آگے کسی اور اضافہ کی گنجائش ہی نہیں رہی تھی۔

دمارطس نے اس فیصلہ کو قدرتی طور پر بہت ڈوبے ہوئے دل کے ساتھ سنا اور سر جھکائے ہوئے محل میں پہنچا اپنی ماں سے پوچھا کہ خواہ واقعہ کچھ بھی ہو مجھے بالکل صحیح صحیح علم ہونا چاہیئے کہ میری پیدائش کا راز کیا ہے۔ اس کی ماں نے تمام و کمال اپنی زندگی کا حال سنا دیا جیسا کہ ہم نے بھی ابھی آپ کو سنایا ہے مگر آخر میں یہ کہا:۔

"تو میرے بیٹے، سن لے اور سمجھ لے کہ تجھ کو جو کچھ جاننے کی ضرورت ہو سکتی ہے وہ میں نے سب کچھ بتا دیا ہے بس یا تو اس درزشی ہیرو دیوتا کا تو لڑکا ہے جس کی روح مجسم ہو کر میرے قریب آئی تھی تو اسطرابقیس دیوتا کا گھوڑا ہے یا پھر تو عارستان بادشاہ سپارٹا کا خون جس نے پیغام رساں کے کہنے پر کہ تو محل میں پیدا ہوا ہے یہ کہا تھا کہ تو میرے نطفہ سے نہیں ہے۔ کیونکہ ابھی تو پورے دس نہیں ہوئے۔ یہ فقرہ بالکل بے خیالی میں کہا گیا تھا اور ایک منہ پھٹ آدمی کی جوشش طبع کا نتیجہ تھا اور بس، اس کا مفہوم نکالنے کی کوشش کرنا بیکار ہے۔ سچ بات تو یہ ہے کہ بچے دس مہینہ میں نہیں ہوتے بلکہ نو مہینے میں یا سات مہینہ میں ہو جاتے ہیں تو سنت اللہ ہے۔ عارستان نے یہ فوراً بعد ہی تسلیم کر لیا تھا کہ اس وقت نہ معلوم کس جذبہ یا سنک کی وجہ سے اس کے منہ سے یہ فقرہ نکل گیا تھا اس کا دماغ سے کچھ تعلق نہ تھا۔"

اب بھی ابہام باقی تھا۔ اگر یہ صحیح مان لیا جائے کہ "ہاتف غیبی" سچ ہے تو یہ ماننا پڑے گا کہ وہ ایک "روح الٰہی" کی اولاد ہے! اگر وہ عارستان کی اولاد نہیں

ہے تو اس کا تخت پر کوئی حق نہیں ہے اور اسے "لوطی فلائیڈز" کے حق میں دستبردار ہونا پڑے گا۔ دمارطس اس قسم کا نوجوان نہ تھا کہ آہستگی کے ساتھ تخت پر سے اتر آتا۔ بالخصوص جب کہ اسے یہ معلوم ہوا کہ یہ افواہیں بھی دنیا میں اڑ رہی ہیں کہ ڈلیفی کی آواز نے جھوٹ بولا تھا اور جو کہا گیا وہ حقیقت نہ تھی!

وہ سپارٹا سے فوراً چل پڑا اور یہ تہیہ کر کے نکلا کہ اس کی تہہ تک پہنچ کر رہوں گا۔ مرے ہوئے باپ کے نام اور اپنی ماں کی (جو اب بھی کافی جوان اور دلپسند عورت تھی) عزت بچانے کی خاطر اس کا ایسا کرنا فرض تھا۔

افواہ بالکل صحیح ثابت ہوئی اور دمارطس نے سازش کرنیوالے تمام مجرموں .... کو جو اس جال کے بننے میں لگے ہوئے تھے پکڑ لیا۔

تحقیق کرنے پر یہ راز معلوم ہوا کہ ڈلیفی کے مندر کا ایک بڑا معتمد پجاری "قوبوں" تھا۔ اس کی معرفت قلیمنوس نے مجذوبہ ڈلیفی کو رشوت دینے کی ترکیب کی چنانچہ ایک بڑی رقم طے ہوئی اور وہ آواز دینے والی مجذوب عورت کے حوالہ کی گئی کہ اپنی زبان کے وہ چھ لفظ فروخت کر دے۔ یہ لفظ دمارطس کو تخت سپارٹا سے اتارنے کے لئے کافی ہوئے۔ لوگوں میں اس انکشاف سے سخت صدمہ محسوس کیا گیا' اس سے بڑھکر دمارطس کے تخت سے اترنے کا صدمہ ہوا۔

قوبوں کو مندر سے نکال دیا گیا اور وہ جان بچا کر بھاگا۔ مجذوبہ "پیمبری آلہ" جو آفت کی پرکالہ نکلی بہت بے آبرو ہو کر ڈلیفی کے مقدس ترین منصب سے علیحدہ کی گئی۔

باوجود اس تمام ہنگامہ کے دمارطس کو دوبارہ تخت پر آنا نصیب نہ ہوا۔ ہرچند کہ وہ فخر کے ساتھ یہ کہہ سکتا تھا کہ اس قضیہ میں اس کی فتح ہوئی۔ سپارٹا میں آج تک کسی بادشاہ نے چار گھوڑوں کی رتھ کی دوڑ اولمپک کھیلوں میں نہیں جیتی تھی اس نے وہ بھی جیت لی تھی اور وہ اس فخر کو سپارٹا کے لوگوں کے سامنے پورے جلال کے ساتھ پیش کر کے تخت پر متمکن رہ سکتا تھا۔ لیکن اس کا دل پبلک خدمت سے بھر گیا۔ اور اس مکار دنیا سے جس کا تار و پود فریب کے سنہری تاروں سے بنا ہے' دل ہٹ گیا۔

زندگی تباہ کر لی اس نے مگر اس تخت پر واپس آنا نہ گوارہ کیا جس پر اس کی حقیقت مشکوک اور مابہ النزاع ہوگئی تھی۔

دمارطس نے اس کے بعد جہاں گردی شروع کر دی۔ کبھی مقدونیہ والوں نے اسے پکڑ کر قید کر دیا اور وہاں بری طرح ستایا گیا۔ تو کبھی دارا کے دربار میں عزت و شان کے ساتھ جلوہ ریز دکھائی دیتا ہے اسلحہ کے استعمال فطری سپہ گری کے معرکوں میں سب سے آگے اور بہترین مشیر سیاست بھی' غرض اس کی زندگی ایسی ہی رواں دواں رہی۔

وقت کے ساتھ ساتھ قلیمنوس اور لوطی فلائیڈز سپارٹا کے تخت پر آئے اور جلد جلد اپنا وقت ختم کر کے اتر گئے' دونوں نے اپنی زندگی نہایت افسوسناک طریقہ پر ختم کی۔ قلیمنوس کا دماغ خراب ہو گیا اور اس نے خودکشی کر لی۔ لوطی فلائیڈز عین موقع پر کسی جنگ میں دشمن سے رشوت لیتا ہوا پکڑا گیا اور اسے سپارٹا سے دھکے دے کر باہر نکال دیا گیا' اس کے گھر پر ہل چلوا دئے گئے' اس نے بھی اپنی زندگی خود ہی ختم کی۔

انجام یہ کہ جنھوں نے ٹیڑھا راستہ اختیار کیا تھا انھیں اپنے کئے کی پوری سزا ملی۔ اور جس انعام کے وہ "سزاوار" تھے وہ انھیں ملا۔ یہ دیکھکر کسقدر حیرت ہوتی ہے کہ ڈلیفی کی "آواز غیب" ہرچند کہ کانوں سے بہری مانی جاتی تھی مگر سونے کی جھنکار پر اس کے کان بھی کھڑے ہو گئے اور سونے کے چند ٹکڑے "خداؤں" کے ایمان بھی خرید لیتے ہیں! رہ گیا دمارطس' اس کو یہی دکھ تمام عمر ستاتا رہا کہ اصل میں اس کا باپ تھا کون! - زندگی میں اسے قدم قدم پر یہ محسوس ہوتا تھا کہ جس طرح اسے عارستان کی عادت خصلت وغیرہ ورثہ میں ملی ہے اسی طرح اسطرابقیلیس دیوتا کی صفات بھی اسمیں برابر کی آمیز ہیں۔ "لوطی فلائیڈز" کی بیوی پر ہاتھ ڈالنے سے لوگ یہ تسلیم کرنے لگے تھے کہ وہ اپنے باپ عارستان کا ہی لڑکا ہے کیونکہ اس کے باپ نے بھی تو ایسا ہی کیا تھا۔ لیکن اولمپک میں چار گھوڑوں کی دوڑ آجتک کسی نے نہ جیتی تھی صرف دمارطس نے جیتی تو اس کا مطلب صاف طور پر اس وہم پرست زمانہ میں یہی سمجھا جاتا تھا کہ اگر دمارطس اسطرابقیلیس دیوتا کا بیٹا نہ ہوتا تو اسے یہ عزت ہرگز نصیب نہ ہوتی!

دمارطس کی روح بہیٹ میں آتے ہی کھیلوں کے دیوتا نے انعام کے سنہری ہار لیا اس کو نہیں پہنا دئے تھے؟ ہمیں اس کا بھی تعجب نہ ہونا چاہئے کہ دمارطس کی خوبصورت ماں خود تذبذب میں تمام عمر رہی کہ اس کے بیٹے کا اصل باپ کون تھا' اسے خود اس تاریکی میں معلوم نہ ہوا کہ میرے قریب کون ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ یقین کی وجہ ہونی چاہئے آج سے ڈھائی ہزار برس قبل کی زندگی رومان سے کسقدر لبریز تھی اسے دیکھتے ہوئے کون کہہ سکتا ہے کہ کیا ہوا؟ کیسے ہوا؟ یونان کے رومان بھی طلسم ہیں ہوش ربا——!

ظفر قریشی بی اے دھلوی

پنجاب کے گیت

"سوہنی مہینوال"

مہینوال، وسط ایشیا کا ایک مغل سوداگر بچہ تھا جس نے ارضِ "پنج آب" کی تاریخ رومان میں اپنا نام الفت و شوق کے لافانی حرفوں میں لکھ دیا ——

کون نہیں جانتا کہ عقل اور فلسفہ کی کوشش ہمیشہ سے حسن اور عشق کے صحیح مراتب متعین کرنے سے قاصر رہی ہیں، خود دورِ جدید کی سر چڑھتی ہوئی باریک بینیاں اور ادب و سائینس کی زوروں پر آئی ہوئی موشگافیاں محبت اور ہوس۔ وصل اور ہجر۔ عاشق اور معشوق کے ایہام کو دور نہیں کر سکیں شاید یہی انسانی خامی کا اثر ہے کہ آج ہم سوہنی اور مہینوال کے شوق۔ وفا اور قربانی کے جذبوں کی گہرائی اور شدت کو ٹھیک ٹھیک جانچنے سے معذور ہیں ——

کون نہیں جانتا کہ اگر "تاریخ رومان" کے "معاملات" مردوں کی حدیثوں کی بجائے صنفِ نازک کی روایتوں کے مطابق ارقام ہوتے تو جملہ رومانی معاملات کی ترتیب الٹ جاتی۔ اگرچہ مردوں کی لکھی ہوئی تواریخ میں صنفِ نازک کے جوہر کی چھوٹ عموماً طور پہ دب نہیں سکتی اور عورت ذات کی وفا اور الفت کی صداقت کے لیے صنفِ جابر کے بیان میں بھی تھوڑی بہت جگہ نکل آتی ہے لیکن کہاں "حدیثِ دیگراں" کی تنگ دامانی اور کہاں سر پہ چڑھ کر بولتے ہوئے جادو کے کرشمے۔ کیا ہی لطف رہتا اگر یہی سوہنی مہینوال کا واقعہ کسی عورت کے قلم سے ادا ہوتا شاید اسے بھی مردوں کی ترتیب دادہ روئداد سے ہٹ کر دیکھنا قریب قریب ناممکن نہ ہوتا تاہم ہمیں یقین ہے کہ صنفِ نازک کی شوخیِ تحریر سو بسوے نسائی انفرادیتوں کی غمازی کرتی ——

—— لیکن شاید میں آپ کے اور اصل قصہ کے درمیان "دخل در معقولات" ہو رہا ہوں۔ مرزا عزت بیگ نے اپنی "بھرپور جوانی" میں ہندوستان کا رخ کیا۔ وہ بلخ بخارا کے امور تاجروں کی نشانی تھا اور اس کا حسن ضرب المثل "ترک بچوں" کی یاد تازہ کرتا تھا۔ اس کے دل میں ہندوستان کی سنہری چڑیا کے پر تنبیہ کرا کے اپنے دیس لے جانے کے ارادے تھے اور اس کا خیال تھا کہ اس زرخیز سرزمین کا ایک پھیرا اسے باقی ماندہ عمر کے لئے روپیہ پیسہ کے جھنجھٹ سے آزاد کر دے گا اور ہوا بھی یہی۔ اگرچہ کچھ نئے حالات کے ماتحت یہ سوداگر بچہ سوداگری کے ساز و سامان سے لدا پھندا دلی پہنچا اور شاہ ہند شاہجہاں کے دربار سے خلعت لے یہاں کی بین الاقوامی منڈی کی دولت سمیٹنے میں مصروف ہوا۔ چند سے تجارت کرنے کے بعد وہ لاہور کی راہ وطن لوٹا۔ یہ کاروان لاہور سے چل کر دریائے چناب کے کنارے شہر گجرات کی سرائے میں اترا۔

ایک ادنیٰ خادم کا بازار کی سیر کو جانا اور ایک کوزہ گر کے کمالِ فن کی تعریف سن کر وہاں سے ایک آبخورہ خرید کرنا کوئی اہم معاملہ معلوم نہیں ہوتا لیکن قضا و قدر کے فرشتے رائی کا پربت بنانے میں حضرتِ انسان کے بھی کان کترتے چلے آئے ہیں، بازار سے لوٹ کر خادم نے دخترِ کوزہ گر کے حسن و جمال کی وہ تعریف کی کہ مرزا عزت بیگ نہ رہ سکا اور اسی خادم کے ساتھ خود ایک تماشا کے لئے چلا گیا۔ اس "قدِ آدم نسائی شیشہ" کی ایک جھلک سے اس کی یہ حالت ہوئی کہ ؎

باغ حسن دا ویکھ کے حیران رہیا مغل   مالی کولوں جھکیا توڑ نہ سکیا پھل
دیوا عقل شعور دا بلدا ہویا گل !!   برہوں سندی احمدا پئی نہیری جھل

(ترجمہ) باغِ حسن کے ایک نظارے سے مغل بچہ چشم موسیٰ بن گیا۔

مالی کے ڈر سے وہ گل چینی نہ کر سکا ——

عقل اور شعور کا چراغ جلتے جلتے گل ہو گیا ——

اے احمد محبت کی اندھیری چل پڑی ——

خادم نے بات رکھنے کے لئے ایک آدھ کوزہ خریدا اور دونو واپس لوٹے۔ عقل کے ہاتھوں دیارِ عشق سے یوں کشاں کشاں لایا جانا اتنی جھنجھٹ کی بڑی بات ہے کہ اس پہ کچھ لکھنا سعیِ حاصل ٹھہرے گا اور یہ کہنا بھی کچھ ضروری معلوم نہیں ہوتا کہ اس دن کے بعد مرزا عزت بیگ کوزے خریدنے کے بہانے دو وقت "دیارِ حبیب" کے چکر کاٹتا اور بقول کسے ع بینکا چوٹ جگر کی ابھی انگار و نیر لیکن نا یہ کہ رفتہ رفتہ تمام ہمراہی اس کی ان غیر تاجرانہ حرکتوں سے اکتا کر اسے یہیں چھوڑ وطن کو چل دئے۔ عشق کے سودے کا انجام ملاحظہ ہو ؎

خالی ہویا پلیو۔ عاجز ہویا آن   بھجا تا دولتے۔ تر ماماں تران
سجن دشمن ہو گئے جہاں ال احسان   گھر گھمیاراں قادرا مشکل ہویا جان

(ترجمہ) جیب خالی ہونے سے وہ عاجز ہو گیا ——

دولت نے پشت دکھائی اور سب چاکر نوکر رخصت ہوئے

جن پہ احسان تھے وہ دوست دشمن ہو گئے ——

اے قادرا اسے کوزہ گر کے گھر جانا مشکل ہو گیا ——

دولت اور ہم صفیروں سے آزادی پا کر کھل کھیلنے کی سنہری راہیں

کچھ اور فراخ ہوئیں۔ عشق کی آگ نے عقل کی کوٹھری کو کچھ اور زیادہ گھیرے میں لیا۔ محجبہ رسوائی نے تمکین اور ضبط پر کچھ اور ڈورے ڈالے اور مرزا عزت بیگ ننگ ناموس کے جامے پھاڑ کوزہ گر کے ہاں بھینس چرانے پر ملازم ہوگیا۔ قرب محبوب نے زبانِ خلق کو نقارۂ اتہام سونپنے میں کچھ زیادہ دیر نہ لگائی اور جلد ہی سوہنی مہینوال کے تعلقات کی بات چل نکلی سوہنی کی ماں اپنی کنواری بیٹی کے دل کے افسانہ کو لوگوں کے منہ پر رکھا ہوا دیکھ بولی ٹھولی پہ اتر آئی

ماں :- چل میرے سامنے سے دور ہو ——

اے نافرمان تجھ سے فائدہ کی کچھ امید نہیں —

تجھ سے عشق کے کڑوے زہر کی بسا ہند آتی ہے

اے احمد برے کاموں میں سراسر برا ہوتا ہے —

بیٹی :- پیاری اماں! ذرا دنیا پر نظر ڈال ——

ایک ہی باپ کے بیٹے۔ سب آدم کی اولاد —

ابتدا سے سبھی نیک نہاد اور خوش اطوار ہیں —

اے احمد کام پڑنے پر ذات ظاہر ہوتی ہے

ماں :- ہم نے نہیں دیکھا مجازی عشق کیسا ہے

باپ نے پدڑی نہ ماری۔ بیٹا (پیدا ہوتے ہی) قدر انداز ہے او

چھنال تو کس پہ ایسی نخرے باز ہوئی ہے ؟

اے احمد وہ طعنے برداشت کرتی۔ جلتی اور گداز ہوتی گئی

سوہنی کی "جوانی کی نادانیوں" کے عکس اس کی ماں کے طعنوں میں کروٹیں لے رہے ہیں کہ سوہنی کا باپ تلاّ وار دہوتا ہے۔ اس کی آسانی کے لئے سوہنی کی ماں نقوش ذرا اور گہرے کرتی ہے

سوہنی کی ماں نے کہا "اے مرد خدا سن ——

اچھوتی کنواری کنیا نے خود ہی بیاہ رچا لیا ہے

یہ تو روز میثاق کی باتیں سناتی ہے —

اے احمد ایسے ولی گھروں میں مشکل سے پکتے ہیں —

او بوڑھے تو کہیں کا نہ ہوا ——

تو ورد وظائف کرتھکا — اور کہیں نہ پہنچا

تیری بیٹی کتنی جلدی نور بن کر نور میں جا ملی

اے احمد کاموں سے پوت۔ کپوت اور سپوت کا فرق ظاہر ہوتا ہے —

تو نے مثل نہیں سنی "ایک سپوت سے ہمہ خانہ آفتاب ہوتا ہے"

اے بے داغ بوڑھے دیکھ تجھے جوان نے کیسا داغ لگایا ہے

اے کوزہ گر! تیرے گھر عشق مہمان اترا ہے

اے احمد خانوں کے گھر خان ہی مہمان ہوتے ہیں

کوزہ گر کی برہمی کا سین شاعر کی آنکھ سے دیکھئے : ——

غضب میں وہ اٹھتا بیٹھتا۔ خونی آنکھیں نکالتا —

مسٹنڈا کلال۔ اس کے منہ سے جھاگ بہتا ——

بیوی کو جوتیاں مارتا۔ بال اکھیڑتا ——

اے احمد وہ لاٹھی ابھارتا۔ سینکڑوں گالیاں دیتا

بوڑھا جوانوں کی طرح دونوں پر جھپٹا ——

اس کی باتوں سے خدا امان میں رکھے ——

سوہنی ڈر سے دبک گئی۔ اس کی روح کانپ رہی تھی

اے احمد رحمت والی بدلی اولے برسانے لگی —

لازم تھا کہ رومانی ماحول اور مشرقی روایات کا یہ تفاعل ..... (INTER ACTION) دو صورتیں اختیار کرتا۔ ایک تو سوہنی کے والدین جوان بیٹی کو کسی کے سر منڈھنے کے درپے ہوتے اور دوسرا وہ عزت بیگ جیسے گھر کے بھیدی کو حسن کی سنہری لنکا سے نکال باہر کرتے۔ چنانچہ مہینوال کو مرغزار سے واپس آنے پر اسی شام ٹکڑہ سا جواب دے دیا گیا۔ اس موقعہ پر کوزہ گر کے "تبرکات" عرض ہیں :-

او بانکے چھیلے! تیرا گھروں میں پنپنا مشکل ہے۔ جا کسی مسجد میں ڈیرا کر

او بے نماز کے تہمد! تو ٹخنوں تک پلید ہے ——

او مردار! دور ہو۔ عشق ہماری ریت نہیں ہے ——

اے احمد! تو جہاں جائے تجھے لوگ گھسیٹتے پھریں گے ——

دانشمندوں نے کیا خوب بات کہی ہے ——

کتا راج پہ بٹھا دیئے (پھر بھی) وہ چکی چاٹنے سے باز نہ رہیگا

تجھے اپنی عزت اتارنے کے لئے ملازم رکھا تھا ؟

اے احمد تو نے ہماری خاطر خواہ خاطر کی ہے ——

مہینوال کے نکالے جانے کے کچھ مدت بعد وہیں گجرات میں سوہنی

کی شادی ہوگئی اور وہ اپنے سسرال چلی گئی۔ اس وقت کے رنج وغم کی شدت کو مہینوال نے ایک خط میں یوں نکالا ہے:۔

خدا اور اس کے رسول کی حمد و تعریف کے بعد ——
اے سوہنی تیرا کیا اعتبار؟ تیرا کونسا اقرار سچا نکلا؟ ——
دولھا کی پیاری دلہن کو لاکھ لاکھ مبارک۔ اسے کبھی عیش سے فرصت نہ ملے
جیسے تو دولھا کو پیار کرتی ہے تو نے کسی اور کو ایسا کب پیار کیا ہوگا
اچھا ہوا۔ تیری آس پوری ہوئی۔ اب تجھ سا اور کوئی سکھی کہاں؟
تو ڈولی چڑھتے وقت ہماری طرف سے شرمسار نہ ہوئی۔ تیرے قدم نہ ڈولے۔
تجھے سسرال پر ناز ہے۔ اب ہم جیسا کوئی اور ذلیل کہاں؟ ——
اے مدھ ماتی! روپ پر مت اترا۔ جوبن تو ایک دھوکا ہے ——
بھاگ جانا ہمیں کا کام نہیں۔ اپنی کم ہمتی سے عشق کی بازی نہ ہار۔
گلیوں میں تیرا نام لے کر پھرنے والے کو رونے کے سوا اور کیا کام
سخی وہی جو فوراً جواب دے۔ جھوٹے دلاسے دینا سخی کا کام نہیں
جھوٹی سندرتا پر نہ اترا۔ یہ تو چار دن کی مہمان ہے اور بس ——
گرچہ دوست تلوار کھینچ نہیں مارتے تاہم تو نے بہت اچھا کیا ——
اے فضل شاہ تیرے بدلے مجھ پر ظلم توڑا گیا ——

معلوم ہوتا ہے کہ "دیار حبیب" کی سیر کے لئے عشاق کا جوگ دھارنا ایشیائی رومان کا بہترین شگوفہ ہے چنانچہ مہینوال اسی پیرایہ میں سوہنی سے ملاقات کی راہ نکالتا ہے۔ اس کا پریم کے استھان سے جوگ دھار کر کوے جاناں کو چل دینے کا نقشہ پیش ہے:۔

عشق نے اسے پاس بلایا اور اسے پریم منتر پڑھایا
"میرے بغیر سرگ جانا ممکن نہیں" ——
گول مول ہو جاؤ۔ اپنے پاس کچکول رکھو
اے سائیں جی! احمد کی طرح کسی کو بھید نہ دینا

نہ استرا چھوا۔ نہ پٹاس کرکی ——
عشق نے بغیر پانی کے مونڈ مونڈ کر ناس کر دیا
بالوں کا دبال اتار کر اس نے سوچا کہ
اے احمد اب وہ بال اور مال سے بے نیاز ہوا۔

ڈاڑھی مونچھ منڈانے میں ذرہ بھر کسر نہ اٹھا رکھی
وہ آنکھیں میچ سر ہلا ولی بن بیٹھا
گلے میں الفی ڈال "وہ خاکی شاہ" مشہور ہوا
اے احمد ہیر کے لئے رانجھے نے پھر جوگ لیا

نہ ناد۔ نہ مندرے۔ نہ اسے الکھ کی یاد سے سروکار
وہ زبان پر سجن کا نام رکھ کر چل پڑا
نام کی حلاوت دیکھ —— اس کے ہونٹ الگ نہ ہو سکتے
اے احمد اگر لذت چاہیے تو عشق حقیقی کا مزہ لے

"چیلا بنا کر گرو نے اسے نصیحت کی
ہاتھ میں کاسۂ گدائی ہے اور دنیا کی پہنائیاں غیر محدود
زمانہ سے ڈرتے رہنا۔ دم نہ مارنا
ہمارا قول یاد رہے۔ موت سے خوف نہ کھانا"

عشق نے عزت بیگ کو بے عزت کیا
اسے نیا فقر سکھایا۔ نیا سبق پڑھایا
خدا کو یاد کر کے اس نے زنبیل ہاتھ میں لی۔
اے احمد وہ حق تلفی کی اپیل دائر کرنے نکلا

دنیا کے سیہ رو کہنے سے وہ عشق میں باریاب ہوا۔
دنیاوی کتوں کے خوف سے وہ لاٹھی کے پیچھے چھپ کر چلا
اس کا رنگ دار چولا سبزی جھلک مارتا تھا ——
اے احمد ہاتھوں کے سنہری کنگن عجب آواز دیتے تھے۔

وہ در در صدا کرتا "فقیر کو بھیک ملے" ——
جو گدائی پہ چڑھا زندہ درگور ہوا۔ بھیک مانگنے نہ جا ——
عورتیں کہتیں:۔ او مسٹنڈے مزدوری سے روٹی کما کھا
اے احمد کوئی خیرات دیتا۔ کوئی سوکھی دتھا بتانا ——

گالی جھڑکیاں سہارتے۔ برے بھلے بول سنتا ——
فقیر کو خیرات ملے۔ مریض کو شفا ہو۔
"چور ہے" یا "شریف ہے"۔ باطن کس نے دیکھا ہے لیکن

اے احمد پیا ہوا دارد آسانی سے نگلا جاتا ہے ——

رزق سے بچھڑا ہوا در در رزق کا سوال کرتا ——
دیس سے بچھڑا ہوا گھر گھر کی سیر کرتا ——
گدائی پہ چڑھ کر اس نے عزت کا لباس اتار دیا ——
اے احمد عشق اور حیا کا اینٹ کتے کا بیر ہے ——

یہ تھا مہینوال کا فقیری بانا اور اس کی عمومی کیفیت کا نقشہ۔ اب دائرہ نگاہ محدود ہوتا ہے۔ کوئے جاناں آنکھ کی پتلی پر منقش ہوتا ہے شاعر سرراہے ملاقات کا ذکر کرتا ہے اگرچہ ع کچھ کہیں سے کچھ کہیں سے ——
یار کی حویلی میں وہ نیچی نظروں جھانکا ——
پیاسے ذوالقرنین کو آب حیات نظر پڑا ——
رقیب آباد رہیں۔ عاشق تو برباد ہوا ——
اے احمد فقیروں کے دم قدم سے سو آفات رد ہوتی ہیں

وہ یار کے مکان کی طرف بڑھا ——
آنگن نے محرم راز ہو کر اسے مرحبا کہا ——
کوئی چغلی خور اور غماز موجود نہ تھا ——
اے احمد وہ بھیک مانگنے کے لئے صدا لگانے لگا ——

"دولتیں دوگنی سوائی ہوں۔ گرم ہوا نہ لگے ——
حسن کا موتیا مالی سے بچا رہے ——
عاشق جیسی بلبلیں ڈالی پر بیٹھی رہیں ——
فضل و کرم خدا کے ہاتھ ہے۔ اے احمد فقیر کو دعا سے کام ہے۔

سوہنی آواز سن۔ سوچ میں ڈوب گئی ——
یہ مالی سے بے نیاز بلبل تو ہماری ہی معلوم ہوتی ہے ——
جان صدقے۔ جانی ہی جانی کو پہچانتا ہے ——
اے احمد وہ شوخ ہی میری جان ہے۔ جان (زندگی) تو کچھ چیز نہیں

سوہنی نے اپنے وجود کے نگر پر نظر ڈالی ——
اسے فقیر کو دینے لائق کوئی شئے نظر نہ آئی ——
• وہ روٹی دینے کے بہانے دروازے کو ہولی ——

اے احمد وہ نرمی سے بولی "سائیں جی! خیرات لیجئے" ——

یار کی معطر زلف کی خوشبو نے اس پر غلبہ کیا ——
وہ شرابی کی طرح گرا۔ اور بے خود ہو گیا ——
وہ ہوش و حواس کی بوٹی حیران کھڑی کی کھڑی رہ گئی
اے احمد وہ آنسوؤں کے ہار پروتی اور اسے ہلا کر جگاتی

اس نے اس کے شانے ہلا کر اسے جگانا چاہا ——
اس کے کانوں میں طٰہٰ اور یٰسین پڑھ پڑھ کر پھونکا ——
نرم اور باریک آواز سے کہا "او بے سرت! سرت سنبھال ——
او چست چور نقب کے پاڑ پر بے ہوش نہ ہو۔ تجھے احمد دین سمجھاتا ہے

او فرقت زدہ! جی بھر کر گلے مل لے۔ خدا نے یہ دن دکھایا ہے۔
میری بلبل! اس وقت بوٹا اکیلا ہے۔ اٹھ موتیا چگ لے
اے احمد اگر اس تک یہ بات گئی تو ——
مالی تجھے ہجر کے غلے کھینچ مارے گا ——

صوفی اور مجذوب مستی میں عرش سے بھی پرے نکل جاتے ہیں۔
وہ زندہ ہوش میں آیا تو مردوں سے بھی گیا گزرا ہوا
غموں کی گٹھڑی کھول اس نے یار کے آگے تحفہ پیش کیا
اے احمد مردہ بولے تو کفن پھاڑے ——

تجھے ماں باپ کے لاڈ میسر ہیں
اپنا شہر محلہ ہے۔ محلوں پر سرداری ہے
سسر۔ ساس اور نند ہے۔ پیا سے پریم ہے
اے احمد مجھے صرف ایک کی پہچان ہے۔ نہ دو۔ نہ تین۔ نہ چار

عشق نے ننگ ناموس کا جامہ تار تار کیا ——
اے پردہ پوش دوست تو نے خوب رفوگری کی
او حسینہ تو نے کمذات کوزہ گر کا گھر آباد کیا
اے احمد تیرے بغیر سارا گھر نگر اجاڑ دکھائی دیتا ہے

جو جو مصیبتیں میں نے جھیلی ہیں، ان کا کیا بیان کروں

خدا ہمارے حال کا بہتر جاننے والا ہے ——
عزت بیگ پٹھان کا احوال دیکھنے کے لائق ہے —
اے احمد مجھے کیا خبر تھی کہ عشق کے یہ لچھن ہیں —

سوہنی بولی۔ یہ پار پڑنہ بیل ——
تجھے مردہ سے زندہ کیا۔ الٹا جھگڑے پر تل گیا
طعنوں سے زبان روک۔ ان تلوں تیل نہیں
اے احمد عشق ذات پات سے ناواقف ہے

عشق آگ کا شعلہ ہے۔ اسے ہاتھ لگانا سہل نہیں
دوئی کا میل کو دور کرنا۔ صرف ایک کو پہنچانا۔ یہ ہے عشق
جاہل لوگ کیا جانیں —— عشق یقین اور صدق ہے
اے احمد عشق اور یاری۔ آسمان سے گر کر کھجور میں اٹکنا ہے

عشق مصیبت کی کسوٹی پر کسا جاتا ہے ——
داتا قحط کے دنوں میں اور دودھ دینے والے جانور پھاگن
میں پرکھے جاتے ہیں —— تو چاند ہے میں چکور
اے احمد مولا نے یہ جوڑ ملایا ہے ——

فقیر نے دس میں خوب مستیاں کیں۔ اب کڑی کون جھیلے
جو گاجریں کھائیں انکے پیٹ میں درد بھی اٹھتا ہے
الفت ہنس ہنس کر بڑھائی جاتی ہے۔ انجام پر ہی آنسو بہتے ہیں
اے احمد عشق۔ لڑائی۔ اور کھیر بعد میں اپنا آپ دکھاتے ہیں۔

میں نے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ تو میری چاہت سے انکاری ہے
نادانوں سے دوستی۔ اپنے پاؤں پر کلہاڑی ہے
کم ذات کہ کہ کر نہ جھگڑ۔ تو ہی بلند ذات مغل سہی
اے احمد سیانے کہتے ہیں۔ عشق فرقِ مراتب سے ناواقف ہے

کچھ تو من میں وچار کر۔ ذات پر نازاں نہ ہو ——
گھاس پھوس تیرتا ہے پتھر ڈوب جاتے ہیں ——
بھنورے اور بھڑ کا فرق کام پڑنے پر معلوم ہوتا ہے
اے احمد سوہنی تجھ جیسے سے مل کر سوہنی کہاں رہی۔

تیزی نہ کھا۔ لگام کے بغیر دوڑ مت ——
بارود والی کوٹھری میں آگ لے کر نہ جا ——
زمانہ تیری جان کا گولا ہے ——
اے قادر یار! بات مان۔ ندی کے کنارے ڈیرا جما۔

او پریم ساگر کے کھویا۔ جیون نیا کی فکر کر ——
خدا تجھے کنارا دکھائے۔ کنارے پہ جا بیٹھ ——
پرماتما میرا اور تیرا ہجر دور کرے
اے احمد محبت کا جھوٹا بھی میٹھا معلوم ہوتا ہے

سماجی بندشوں کی بازی کو دو ہاتھ میں مات دینے کے لیے عشق نے قیامت کی چال نکالی۔ مہینوال دریا پہ دھونی رما بیٹھا۔ وہ دن کو ولی بن جاتا اور دن ڈھلے سوہنی سے جا ملتا۔ ملاحوں اور ارد گرد کے لوگوں میں فقیر کی کرامتوں کے چرچے پھیلتے گئے اور اسے ہر طرح سے آرام میسر آنے لگا یہی نقشہ شعروں کی زبانی سنئے:—

لوگوں میں فقیر کا اعتبار جم گیا ——
چور۔ اچکا۔ چودھری۔ سید سفر سے شاہ بن نکلا۔
چور ہوئے پہ چوریاں اور تر نوالے میسر آئے
اے احمد۔ روزی پہنچانے والے کے طریقے نیارے ہیں

ماہی گیر ہر روز ایک مچھلی فقیر کی نذر کرتے
فقیر مصالحے لگا کر کباب بھونتا ——
دن ڈھلے وہ دریا چیر جاتا ——
اے احمد چور۔ فقیر۔ یار۔ چھپے نہیں رہتے۔

شوق کے جہاز پر چڑھ وہ چناب چیر جاتا
چھت دیوار پھلانگتے اسے کچھ چوٹ نہ لگتی
اندھا عشق اونچ نیچ کب دیکھتا ہے
اے احمد یار سے ملاقات کئے بغیر صبر معلوم

سوہنی کو وقت معلوم تھا وہ منتظر بیٹھی ——
وہ یار کی سیٹی سمجھتی۔ ہر آواز پہ کان رکھتی ——
وہ سوئی ہوئی بھی بیدار رہتی ——

اے احمد۔ عشق کے بھاری قرض کس طرح سر سے اتریں

عشق کی استادی دیکھیے۔ وہ دیوار کے اوپر سے گزر جاتا
قفل بدستور بند رہتے۔ طاق سے آواز تک نہ نکلتی
لوگوں کے جاگنے سے پیشتر وہ واپس لوٹ آتا
اے احمد ایسے چور کو نقب پر سے کون پکڑے

وہ رات کو چوکی دیتا۔ دن کو شلوک پڑھتا۔۔۔
مرادیں لوگ پاتے۔ چڑھاوے چور کو چڑھتے ۔۔۔
وہ مراد کا ادہار کرتا (لیکن) نذر نقد وصول کرتا۔۔۔
اے احمد ان انکھڑیوں کی چاہت نے اسے پیر بنا دیا۔۔۔

مہینوال کو عجب لطف حاصل تھے۔ عشق کا پیڑ بار آور ہوا
دھیان۔ بان۔ جمان کبھی کبھی پھل دیتے ہیں ۔۔۔
عشق کا عقیم بوٹا بغیر پھل کے جھک گیا ۔۔۔
اے احمد بانجھ کا بیاہ کرنا خصم کا نقصان ہے ۔۔۔

غرض مہینوال کی پانچوں گھی میں تھیں اور وہ وصل و قربت سے لذت یاب ہو رہا تھا۔ اسے معلوم نہ تھا کہ کیف و سرور کے ایام کچھ جلد ہی خدا کو پیارے ہو جاتے ہیں۔ اور قسمت ایسے اوقات کی روک تھام کے لئے نت نئے حربے ڈھونڈ نکالتی ہے۔ سوہنی مہینوال کے احوال میں دریائے چناب کی سالانہ طغیانی نے فلکِ ستم پرور کے ہاتھوں تیغ عاشق کش بننا پسند کیا۔ طغیانی کا وہ زور بڑھا اور جان و مال کا وہ نقصان ہوا کہ خدا کی پناہ۔ راتوں رات پانی بانسوں چڑھ گیا۔ ان حالات میں مچھیروں کا بغیر شکار کے واپس لوٹنا عام لوگوں کے نزدیک کچھ زیادہ حیرت انگیز امر نہ تھا لیکن دریا کے یہ ٹھاٹ مہینوال کو دہری مصیبت میں ڈال گئے۔ ایک تو اتنے زبردست سیلاب کو چیر کر جانا۔ دوسرا سوہنی کے لئے کباب بنانے کو مچھلی میسر نہ آنا۔ مہینوال کو یقین تھا کہ یہ سیلاب عشق کی آزمائش کے لئے چڑھ آیا ہے اور آج کی غیر حاضری اسے ہمیشہ کے لئے درگاہ عشق کی عظمتوں سے محروم کر دے گی۔ سوہنی کے پاس خالی ہاتھ جانا اسی شان عاشقی کے منافی نظر آیا۔ ان حالات میں

اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ آدم زاد کا کوسوں نام نہ تھا
اس نے دل سخت کیا۔ وہ دلیر ہوا ۔۔۔

شبیر کے قتل کے لئے یزید نے تیغ نکالی ۔۔۔
اے احمد۔ دیکھو ولایتی وحشی کیا قہر ڈھانے لگا ۔۔۔

عاشق نے اپنی ران سے زندہ گوشت کاٹ لیا ۔۔۔
پرائی آس پر گزران کرنے والوں کی بھی کیا زندگی ہے
جنھوں نے عشق مول لیا وہ عقل سے ہاتھ دھو بیٹھے
اے احمد جان گنوانے سے دریغ کیسا ۔۔۔

اس نے زندہ گوشت کے کباب تیار کئے اور ع "ڈوب جانے کا نہیں شوق میں ڈوبوں کو خطر" کا اسم اعظم پڑھ کر وہ دریا میں کود گیا۔ شدتِ الفت میں اس کی شناوری کے جوہر پرکھنے کے لئے صرف ایک شعر سننا کافی ہوگا ؎

چاند کا عکس سمندر سے یہ کہہ کر گزرا ۔۔۔
وہ شناور ہے جو دامن بھی نہ تر ہونے دے

سیلاب بے پایاں کا سینہ چیر کر وہ جلد ہی بارگاہِ ناز میں جا پہنچا۔ سوہنی کباب پر مائل ہوئی اور مہینوال نظارہ کی لذتیں اٹھانے میں مصروف ہوا۔ پہلا لقمہ اٹھاتے ہی سوہنی کو دال میں کچھ کالا معلوم ہوا :۔

دخت کوزہ گر کو کباب میں بلجی دنبہ کی لذت محسوس ہوئی
اس کا نوں لوں کھٹا ہو گیا ۔۔۔ ہتھیلی منھ کو آنے لگی۔
وہ الٹ کر گری اور زمین دیکھنے لگی ۔۔۔
اے احمد آفریں ہے ان پر جنھوں نے اب بھی دم نہ مارا

سوہنی نے فقیر سے وجہ پوچھی اور چند ایک طعنے بھی دئے۔ مہینوال کا جواب شاعرانہ صفتوں کی جھانکیوں میں ملاحظہ کیجئے گا : ۔۔۔

کیتی عرض فقیر نے۔ بے تقصیر فقیر ۔۔۔
بے تقصیر فقیر ہے۔ کیتی عرض فقیر ۔۔۔
آندا نذرا میر دی۔ ماس مچھی دا چیر ۔۔۔
ماس مچھی دا احمدا آندا نذر امیر ۔۔۔

ماسہ نہ وسواس ہے۔ بے وسواسہ ماس ۔۔۔
بے وسواسہ ماس ہے۔ ماسہ نہ وسواس ۔۔۔
اسی تساڈے پاس آں۔ تسی اساڈے پاس
تسی اساڈے احمدا۔ اسی تساڈے پاس۔

فقیر نے تاکید کی۔سوہنی نے مان لیا
اپنی غلطی سمجھ کر اس نے دوسرا لقمہ اٹھا لیا
منہ میں ڈالا۔پھینکا۔پوچھا۔عاشق نے تبلایا
اے احمد یہی کا قول ہے" سچ کڑوا ہے"

پہلے تو مہینوال بات چھپانے پر تلا بیٹھا تھا لیکن حقیقت کا چہرہ کھل جانے پر وہ اس کے خدوخال گننے لگا۔یہ فوری تبدیل فطرت انسانی کا ایک محکم اصول ہے اور ردعمل کے ماتحت انسان اپنے ظرف الفت کی کم مائگی کا بھانڈا عین چوراہے میں پھوڑ دینے کا عادی ہے۔اس وقت مہینوال کے طعنے اس میں مرد کی طرف سے عورت ذات کی خامیوں (نام نہاد یا حقیقی) پر اشارہ کنایہ ہے۔آپ پڑھنے والوں کے سمجھ لیجے۔خواہ شاعر کے بات ایک ہی ہے۔عرض کیا ہے

میں نے اپنا گوشت سیخوں پر چڑھایا ——
اپنے خراب کیے ہوئے معاملے اپنے سامنے آئے ——
ہمیں جان کا صرفہ نہیں۔تجھے لذت نہیں آتی ——
چالیس روپے کا خریدا کردہ ڈھور ڈنگر چور کی نظروں میں جچتا ہی نہیں

سیانے سچ فرما گئے ہیں ——
گھوڑا اور تلوار کسی کے میت نہیں ہوتے ——
عورت کسی کی مِتر نہیں۔ڈیلا کوئی اچار نہیں ——
اے احمد ڈوم کوئی دوست نہیں اور کنگ (ایک ساز) کوئی ہتھیار نہیں

میں نے اپنے آپ چیر کے کھائے۔موت سے نہ ڈرا
تجھے اب بھی لطف نہیں آیا تو مجھے جان سے مار رکھ
دانا سچ کہتے ہیں۔عورت ذات سخت ظالم ہے
اے قادر یار کڑی آزمائشیں ہی اسے قائل کرتی ہیں

ان طعنوں کا سوہنی پر کارگر ہونا یا نہ ہونا کچھ خدا کو ہی معلوم ہے۔ہاں یہ ضرور ہے کہ اس کا جواب تمام دنیا کی عورتوں پر لگائے ہوئے الزام کو کماحقہٗ دور کرتا ہے۔سوہنی کے جواب کی اٹھان پس پردہ نسائی انا (EGO) کی غمازی کرتی ہے اور اس کا اتمام ہندی عورت کے عشق و محبت کی شدت پر دال ہے۔یہ اپنج اور ارتقا۔دو بندوں میں پیش کیا جاتا ہے جو ترجمہ کی آگ میں ڈوب کر کچھ قدرے دھیمے پڑ گئے ہیں:—

بے انصاف دوست! ظالم!! تو نے یہ کیا قہر ڈھایا
اے ولایتی وحشی! کیا میں آدم خور تھی ——
زمین جگہ دے تو میں اس میں سما جاؤں ——
اے احمد مجھے ڈوب مرنے کے لئے چلو بھر پانی دینا۔

جا اپنے ڈیرے بیٹھ رہ۔اب ادھر آنے کی زحمت نہ اٹھا
ہم نے کافی دیر تجھے آزمایا۔اب تو ہمیں آزما
تو بہشتی روح بن کر ایک جگہ قیام کر ——
اے احمد اب ہم دوزخ کی تپش سہاریں گے۔

سوہنی کے اس عزم اور عشق کے اس داؤ پیچ کو شاعر نے تصوف کی خوردبین سے دیکھ کر حقیقی دریا کو مجازی کوزہ میں یوں بند کیا ہے:—

دیکھ۔عشق کے سپاہی نے ایک تیغ چلائی
اس کا پہرہ معاف ہوا۔وہ پنشن پہ چل دیا
سو دفعہ مچھلیوں کا خون کیا اسے کچھ فائدہ نہ ہوا
ایک دفعہ اپنا خون کیا۔سو فائدے اٹھائے

اب محبت کے مراتب کی ترتیب کے پلٹنے کا وقت درپیش ہے۔
مہینوال منزل نیاز سے بے کھٹکے گزر مسند ناز پر آلتی پالتی مار بیٹھتا ہے۔ادھر وہ شمع حرم پروانے کے فرائض اپنے سر لیتی ہے۔ادھر عاشق اور معشوق کا ایہام کچھ اور گہرا ہو جاتا ہے۔شاید یہی وہ منزل ہے جہاں ہندی عورت کی وفا اسے لافانی بلندیوں پر لے اڑتی ہے محبت کے ارتقا میں یہی وہ ہفت خواں ہے جہاں تقدیر اوچھے ہتھیاروں پر اتر آتی ہے۔اس "مقام" پر قدرت کی ستم ظریفیاں فرشتہ اجل کی مدد لیتی ہیں اور یہاں موت اور زندگی کی گتھیاں الفت جاوید کے رنگ میں سمو دی جاتی ہیں۔

زندگی کی اندھی رات میں عشق کی مہتابی چھوٹ رہی ہے ——
پروانے موت کے شعلے پر از خود دھاوے بولتے ہیں ——
عشاق کو گھیر گھیر کر قتل کرنا اس کی سب سے بڑی خوبی ہے۔
اے قادر یار اندھا کام دیتا گھیرے میں لیکر تیغیں مارتا ہے

سوہنی کافی مدت اپنی حیداری سے مردوں کو پرے بٹھاتی رہی اور ہر رات گھڑے کے سہارے دریا پار کرتی رہی۔آخر کار چناب کی سالانہ طغیانی اور سوہنی کی نند کے فریب نے اس نازنین پر دہرا وار کیا اور وہ کچے گھڑے اور سیلاب کے تصادم کی شکار ہوئی۔سیلاب کا نقشہ ملاحظہ ہو:—

سوہنی کنارے پر آکھڑی ہوئی منزل بہت دور تھی ——

منصور حلاج کمال شان بے بسی کے ساتھ دار کے نیچے آکھڑا ہوا ——
دور ایک جھونپڑی میں دیپک جھکا۔ موسیٰ اور کوہ طور کا ماجرا ——
وہ عشق کی ماری باندی کچے گھڑے پر چل پڑی ——

موجیں پھر اس کے قدم آلگیں ——
بلبلے جیسے بلند کرتے اور اسے آغوش میں لیتے ——
چاروں طرف بھنوروں میں قضا کھیل رہی تھی ——
کنارے پر جھینگر مرثیہ خوانی کر رہے تھے۔
سوہنی کے ڈوب کر پار اترنے کا شاعر کہتا ہے:—
ایسی تیری کہ تر گئی۔ وہ یقین کی تیراک
میاں احمد دین اسے دریا برد نہیں کہہ سکتا۔

یہ ہے وہ قصہ جو اپنی گوناگوں نوعیتوں کے سبب انسانی سرشت کی کئی ایک تاروں میں گونج پیدا کرنے کا باعث ہو سکتا ہے یہ ظاہر ہے کہ اہل دل کے لئے "کہانی میری روئداد جہاں معلوم ہوتی ہے" کی کئی... تفسیریں ہو سکتی ہیں لیکن ہم سب ہم آہنگ سروں سے دامن بچاتے ہوئے صرف چند ایک پس پردہ امور کی طرف اشارے کرنے پر یہ مضمون ختم کرینگے

۱۔ حسنت کوزہ گر کے حسن جہاں سوز کا اثر زمانہ حال تک پہنچا۔ معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ ایک مقرر مدت کے بعد اس گھرانے میں پھر ایک چاند عورت ذات کے بھیس میں کھبت کرتا ہے۔

۲۔ روایت ہے کہ نواب مرزا شوق لکھنوی کی مشہور المیہ "زہر عشق" کے برعکس پنجابی ہیرو سوہنی کے ساتھ اسی طوفان میں ڈوب مرا۔ اگرچہ بادی النظر میں اس سے واقعات کے حزنیہ عناصر میں کوئی خاص اضافہ نہیں ہوتا تاہم اس سے پڑھنے سننے والوں کے قدرتی جذبۂ تجسس کی مناسب روک تھام ہو جاتی ہے اور تجسس میں خرچ ہونے والی نفسی قوتوں کی یہ لہریں بھی المیہ ننگناؤں میں دوڑ جاتی ہیں۔ اور اس طرح غیر شعوری طور پر المیہ کے رنگ کچھ اور زیادہ گہرے ہو جاتے ہیں اردو اساتذہ میں میر تقی میر نے اپنی ایک مثنوی میں ہیرو اور ہیروئن کو دریا میں غرق کرنے سے یہی مطلب حصول کیا ہے۔

۳۔ اگرچہ نفس مضمون کے دامن تسلسل پر جملہ ہائے معترضہ کے چھینٹے دینا راوی کی اپنی شاعرانہ اپج پر منحصر ہے لیکن حقیقت یہ ہے یہی چیز پنجابی طرز استدلال کی انفرادیت کے ساتھ مل کر نظم میں مخصوص پنجابی ماحول اور مقامی رنگ پیدا کر دکھاتی ہے۔ مثال کے طور پر جب سوہنی سے اس کے والدین اس کے رومانی طور طریقوں کے متعلق استفسار کرتے ہیں تو وہ عجیب تجاہل عارفانہ برتتی ہے:——

پیاری اماں! مجھے الزام نہ دے ——
بے تقصیر کو کوسنے نہ دے ——
یہ بار بار عشق عشق کی رٹ نہ لگا ——
مجھے تیرے عشق کی کیا خبر ——
اپنی پیاری بیٹی کو چور نہ ٹھہرا ——
شاید تیرا عشق کسی اور نے چرا لیا ہو ——
آخر یہ تھا کیا؟ اس کا رنگ اور حجم تو بیان کر ——
کھانے والی چیز تھی یا پہننے والی کچھ تا پتہ تو بتلا ——
مجھے اگر لینا تھا تو تجھ سے کیوں چھپاتی ——
جو مجھے حاجت ہوتی تو خود تجھی سے نہ مانگ لیتی ——

۴۔ ادبی محقق حضرات کی اطلاع کے لئے یہ بتانا ضروری ہے کہ اس واقعہ کو کئی شعرا نے پورا اور کئی ایک نے ادھورا نظم کیا ہے۔ زیر مطالعہ مقالہ میں مندرجہ ذیل چار شعرا سے نمونے لئے گئے ہیں۔

۱۔ سید فضل حسین شاہ مرحوم گجرات
۲۔ خاں صاحب قریشی عبدالغنی صاحب وفا گوجرانوالہ
۳۔ ٹھیٹھ پنجابی کے ناخدا حضرت قادر یار مرحوم
۴۔ میاں احمد دین صاحب مرحوم گوجرانوالہ

حضرت فضل اور حضرت قادر یار کی تصانیف مطبوعہ سے تراجم پیش ہیں اور دیگر دو حضرات کے غیر مطبوعہ نسخوں سے اشعار مستعار لئے گئے ہیں۔

غلام یعقوب انور بی اے ایل ایل بی

چوہے دان (بقیہ بسلسلہ صفحہ ۹۳) شرط ہاری ہے" اور... اور تیسری مرتبہ اُس نے اپنے ہونٹ بوسے کے لئے خود پیش کر دیئے۔ جس طرح چوہا ہاتھ آیا، اسی طرح سلیمہ بھی ہاتھ آگئی —— مگر بھئی میں شوکت کا بہت ممنون ہوں۔ اگر میں نے چوہے دان گرم پانی سے نہ دھویا ہوتا تو چوہا کبھی نہ پھنستا۔"

یہ داستان سن کر مجھے بہت لطف آیا۔ لیکن افسوس بھی ہوا، اس لئے کہ شوکت اس لڑکی سلیمہ کی محبت میں بہت بُری طرح گرفتار ہے۔

سعادت حسن منٹو

دیوتا گرتا ہے

...... چھوٹی بہن بہت خوش نظر آتی ہے۔ شاید وہ کوئی جل پری ہے گہرے پانیوں سے باہر آکر اس کی آنکھیں ایک نئی ہی دنیا کا نظارہ کر رہی تھیں .... یہ رات کسی طرح جلد گذر جائے۔ کل صبح وہ چرخہ کاتے گی۔ لمبے باریک تار نکال نکال کر اسے کتنی خوش ہوگی۔ چرخہ تو گھر کا سہاگ ہے۔ کھیت سے روئی آگئی۔ گھر میں سوت تیار کر لیا گیا۔ گاؤں ہی میں جلاہے نے کپڑا بن دیا۔ صدیوں سے یہی ہوتا آیا ہے۔ مل کا کپڑا تو نئے زمانے کی کارستانی ہے۔ ہوا کرے وہ تو چرخے سے منہ نہ جوڑے گی۔

بڑی بہن کو بھی خوش ہونا چاہیئے۔ چھوٹی بہن چرخے سے لو لگائیگی صبح ہی سورج بھگوان کو نمسکار کر کے یہ رسم ادا کی جائے گی۔ نئی روئی کی پونیاں بنالی گئی ہیں، پرانا چرخہ، جو دالان کی دیوار پر کھونٹی کے سہارے لٹکا ہوا تھا اتار لیا گیا ہے۔ ایک طرف مکڑی نے جالا بن رکھا تھا سب جگہ گرد کی موٹی تہ جمی ہوئی تھی گرد جھاڑتے وقت چھوٹی بہن کے تاثرات بے حد لطیف ہو گئے تھے جیسے کوئی دور سے آتا ہوا نغمہ وجد سن رہی ہو..... یہ نہیں کہ وہ پہلی بار پونی پکڑے گی۔ ماں کے چرخے پر وہ کبھی کی ہاتھ سادھ چکی ہے مگر جب باقاعدہ کاتنا شروع کیا جائے تو رسم ادا کیجاتی ہے۔ تو لڑکیوں کی آنکھوں میں ایک نئی ہی خوشی ناچ اٹھتی ہے ...... بڑی بہن اپنے ہاتھ سے چرخے کو کیسر کا تلک لگائے گی اپنے ہاتھ سے پہلی پونی کے سرے پر سیندور لگائے گی گویا یہ کسی دلہن کی مانگ ہو۔ اور جب چھوٹی بہن لمبا باریک تار نکالے گی تو بڑی بہن کہہ اٹھے گی —— سوت کا یہ باریک تار دریا جتنا لمبا ہوتا چلا جائے......

اسی رسم میں حصہ لینے کے لئے بڑی بہن سسرال سے یہاں آئی ہے۔

چھوٹی بہن چاند کی طرف دیکھ رہی ہے، دور چاند میں اب بھی اسے ضرور ایک عورت نظر آرہی ہوگی — چاند کی ماں جو نہ جانے کب سے وہاں، بیٹھی چرخہ کات رہی ہے، چاند کے داغ بے معنی تو نہیں۔ چاند کی ماں کا قصہ تو بچپن کا محبوب مشغلہ ٹھہرا وہ اس سے محروم تو نہ رہی ہوگی، اسے خوب یاد ہوگا کہ کس طرح وہ چاند کی ماں کے چرخے کی گھوں گھوں سننے میں ناکام رہ جایا کرتی تھی۔ ماں کہہ چھوڑتی ہوگی —— چاند تو ہم سے بہت دور ہے بیٹی۔ اتنا تھوڑا ہی کہ چاند کی ماں نظر آرہی ہے اور تم صاف صاف دیکھ سکتی ہو کہ وہ چرخہ کات رہی ہے ...... اور چاند کی ماں کے چرخے کی طرف دیکھتے دیکھتے اسے اس پرانے چرخے کا دھیان آجاتا ہوگا جسے وہ روز دیوار پر کھونٹی کے سہارے لٹکتا دیکھتی ہوگی۔ اسے ان دنوں کا دھیان آتا ہوگا جب اس چرخے پر بڑی بہن کاتا کرتی تھی جونہی شادی کے بعد اس نے سسرال کی راہ لی، یہ چرخہ دیوار پر لٹکا دیا گیا۔ یہ دیکھ کر کہ کوئی اس پر سے گرد نہیں جھاڑتا اسے کسی قدر غصہ آنے لگتا ہوگا پھر ایک دن ماں سے یہ سن کر کہ در اصل یہ چرخہ اسی کا انتظار کر رہا ہے اسے بڑی خوشی ہوئی ہوگی۔

بڑی بہن کیا سوچ رہی ہے۔ کبھی یہ چرخہ اس کا تھا۔ کاتنے کا رس تو اپنے چرخے پر آتا ہے، اسی چرخے پر اس نے پہلے پہل وہ پیا نازبان ذدیت گایا تھا جس میں سوت کے دریا جتنے لمبے تار کا تخیل پیش کیا گیا تھا۔ دیس کے سبھی دریا تو نہ دیکھے تھے اس نے کس دریا جتنا لمبا تار؟ ...... دریا جتنا لمبا تار...... اسے خوب یاد تھا جس دن اس نے باقاعدہ کاتنا شروع کرنے کی رسم ادا کی تھی اس چرخے کا تکلا زور زور سے گھوم رہا تھا۔ نئی مال ٹوٹ تو نہ سکتی تھی گگڑی موٹی ہوتی جا رہی تھی اور پہلی خوبصورت گگڑی کو دیکھ کر اس نے یوں محسوس کیا تھا کہ اس کی اپنی ننھی زندگی بھی گگڑی ہی کی طرح ہے —— یہ دنیا ایک چرخہ ہے ....

"صدیوں سے تکلے گھومتے آئے ہیں، بہن!"

"اور بہن صدیوں سے دریا جتنے لمبے تار نکلتے آئے ہیں!"

"میں تو ابھی بنی ہیں۔ چرخہ تو پرانا ہے، بہن! —— بہت پرانا"

"اور ماں سچ کہتی ہے، بہن! —— پہلا چرخہ خود وشوکرما نے بنایا تھا بھگوان کے حکم سے"

"چرخہ ہی کیوں، بہن! —— ابھی اس دن سسرال میں ایک بڑھیا کہہ رہی تھی کہ جلاہوں کے لئے کرگھا بھی وشوکرما نے بنایا تھا پہلے پہل ...... جب تک کھیتوں میں روئی پیدا ہوتی ہے۔ بہن، چرخے اور کرگھے کو بھی دیس نکالا نہیں ملنے کا ......"

چھوٹی بہن نے کبھی کوئی کپڑے کی مل نہیں دیکھی۔ مل کا کپڑا تو گاؤں تک چلا آتا ہے۔ لٹھا، ململ، صوف، قسم قسم کے گبرون اور رنگارنگ کی چھینٹیں۔ چھپٹے چھپائے چرخہ کی سہیلیاں اس کپڑے کے اندر جال میں پھنسی رہتی ہیں۔ ایک بار چھوٹی بہن نے بھی صوف کی شلوار کے لئے ضد شروع کر دی تھی۔ بڑی بہن نے کہا تھا "گھر پھونک تماشا دیکھنا چاہو تو بدیسی کپڑا پہن لو، بہن! یہ تو چرخہ کی ہتک ہوگی، کھیتوں کی ہتک ہوگی جہاں ہر سال روئی اگتی آئی ہے...."

ان گنت پٹڑیوں سے گاؤں کی کنواریاں اپنے گدگدے جسموں پر کھدر پہنتی آئی ہیں۔ مل کا کپڑا پہلے کہاں ہوتا تھا؟ بدیسی کپڑا سب ملوں پر تیار ہوتا ہے خیر اب بدیسی کپڑا آنا تو کافی رک گیا ہے دیس کا روپیہ اب بہت کچھ دیس ہی میں رہے گا مگر نئے زمانے کی ایجادوں نے اس دیس کو بھی چھولیا ہے۔ یہاں بھی بدیسی طرز کی ملیں تیار ہوگئی ہیں۔ چنانچہ گر گئے کے کھدر کی اب بھی خیر نہیں۔ ملوں کے چمک دار ملائم کپڑے کے روبرو اس کی پرانی قدر وقیمت کیسے قائم رہ سکتی ہے؟

"چرخہ تو گھر کا سہاگ ہے، بہن! اپنے کھیتوں کی روئی، اپنے گھروں کا سوت، اپنے گاؤں کا کپڑا ......"

"پر بہن، پیچھے چھاہے بھی مل کا کپڑا نہ خریدنا چاہئیں؟"

کھدر تو گدگدے جسم پر چبھے گا ہی۔ سستا جاپانی کپڑا تو ٹھیک بدیسی ہوا۔ مہنگا انگریزی کپڑا اب ادھر آتا نہیں۔ کیونکہ کسی کی جیب میں اب اتنے پیسے نہیں رہے۔ دیسی ملوں کا کپڑا سہی ...... پر جی تو للچاتا ہے جاپانی کپڑا پہننے کو کتنا چمک دار اور ملائم ہوتا ہے یہ اور سستا بھی۔ دیسی ملوں والے اتنا سستا کپڑا کیوں نہیں بناتے؟ ...... چھوٹی بہن اس سے زیادہ نہیں سوچ سکتی۔

بڑی بہن سسرال جائے گی۔ بس چند روز اور ہے، ادھر بیساکھی کا میلہ تو آنے دو۔ چھوٹی بہن بھی اپنی سہیلیوں کی طرح ملائم جاپانی کپڑے کی شلوار سلوائے گی۔ چرخہ تو وہ کاتے گی ہی۔ لیکن دل کا شوق بھی تو ایک چیز ہے کیا یہ یوں ہی سکڑ جائے، یوں ہی مرجھا جائے!

بڑی بہن کو اگر کوئی شوق رہا تو لچھے دار ازار بند کا، بیاہ سے چند برس پہلے اس نے ایک بار ریشم کاتا تھا۔ پھر اس نے بڑھیا لچھے دار ازار بند تیار کیا تو ماں نے لاکھ سمجھایا کہ اسے بیاہ کے لئے رکھ چھوڑ بیٹی مگر اس نے ایک نہ مانی تھی۔ پھر کیا ریشم کا بھی توڑا ہو جائے گا؟ اپنے ہاتھ بھی ہوں گے اور چرخہ بھی۔ شلوار میں ازار بند ڈالتے ہوئے اس کے من میں گدگدی سی ہونے لگی تھی۔ دفعتاً اس کی آنکھوں کے روبرو اس شہزادے کی کہانی پھر گئی تھی جو بھیس بدل کر راج دھانی کی گلیوں میں چکر لگایا کرتا تھا۔ اندر آنگن میں چرخہ کاتنے والیاں جمع تھیں شہزادہ انکی باتیں سننے لگا ایک کنواری بولی "شہزادے کی دلہن بن سکوں تو میرے دھنیہ بھاگ"۔ شہزادے کے دل میں گدگدی سی ہوئی۔ پھر ایک دن اس نے اسی کنواری کو دلہن بنالیا .... بڑی بہن نے سوچا تھا کہ وہ کبھی کسی شہزادے کی دلہن بننا پسند نہ کرے گی۔ شہزادہ اسے چرخہ تھوڑا کاتنے دے گا۔

شہزادے کی کہانی چھوٹی بہن کو بھی یاد ہے۔ شہزادے کے محل میں تو گدگدے جسم کے لئے ملائم ریشمی لباس ملا کرتے تھا۔ مگر یہ سب ایک ہوائی قلعہ ہے۔ اس کا جسم تو شاید کبھی کھردرے کھدر کی قید سے آزاد ہونے کا نہیں۔

بڑی بہن کی سسرال کوئی سکھ کی جگہ نہیں ہے۔ خاوند ناراض رہتا ہے اسے شکایت ہے کہ اس کی بیوی وقت کے دھارے کے ہمراہ آگے نہیں بڑھتی، وہ چرخے کی شکل تک نہیں دیکھنا چاہتا۔ دیسی ملوں کا کپڑا کیا برا ہے؟ یہ تو سودیشی ہے دیس کی سب سے بڑی سیاسی انجمن کے خزانچی صاحب کی بھی کچھ ملیں ہیں، ان کا کپڑا تو ضرور سودیشی ہے، چرخہ ٹھہرا ایام جہالت کی آخری نشانی۔ اسے قائم رکھنے کی کوشش بڑا بھاری ردعمل ہے۔ یہ نیا زمانہ ہے۔ نئے اس کے مطالبات ہیں۔ کپڑے کی ملیں نہ ہوں تو اکیلے چرخے اور کرگے کہاں تک لوگوں کا تن ڈھانپ سکتے ہیں؟ یہ مشین کا دور ہے۔ مشین کی عزت تو کرنا ہی ہوگی۔ چرخہ بھی بجائے خود ایک مشین ہی تو ہے — تہذیب کے ابتدائی دور میں ظاہر ہو سکنے والی مشین۔ حال کی مشینوں کی ہتک خود انسانی تہذیب کی ہتک ہوگی .... اپنے خاوند کی نگاہوں میں بڑی بہن تہذیب کے ابتدائی دور کی عورت بن کر رہ گئی ہے۔ اس کی مجروح... انفرادیت کے لئے اب کوئی تسکین ممکن نہیں۔ اپنی مرضی وہ برت نہیں سکتی، خاوند کے سانچے میں وہ اب ڈھل نہیں سکتی۔

آنکھوں کو قدرے میچ کر چھوٹی بہن دور چاند کی طرف دیکھتی ہے قہقہہ لگا کر ہنس پڑتی ہے کتنا دلچسپ ہوائی قلعہ ہے — چاند کے داغ بے معنی تو نہیں .... چاند کی ماں مزے سے چرخہ کات سکتی ہے۔ بڑی بہن کی طرح اسے اپنے خاوند سے ڈرنے کی ضرورت نہیں!

"اب سو جاؤ، بیٹو! رات بہت چلی گئی۔"

"آج رت جگا ہی سہی، ماں!"

"رت جگے کا کیا لابھ؟"

"ایسی رات روز روز تو نہیں آتی ماں!"

اندر سے ماں خوش ہے۔ بہنیں ہوں تو ایسی۔ نواڑ کے پلنگ پر بیٹھی ہوئی وہ تاروں کی طرف دیکھ رہی ہیں۔

شاید بڑی بہن کی ہر ایک رگ بغاوت شروع کر دے گی — ایک مسلسل بغاوت۔ سسرال نہیں نرک ہے جہاں چرخہ کاتنے کی بھی مناہی ہے کیا اس ظلم کو چپ چاپ سہہ لیا جائے؟ ....

چھوٹی بہن اپنے گالوں کو مس رہی ہے اس کے گال بہایت گر آ رہے ہیں ---- نئی پونیوں کی طرح جن سے وہ صبح ہی بلے باریک تار نکالے گی۔ گالوں سے ہٹ کر اس کا ہاتھ ناک پر آ ٹکا۔ پھر ہونٹوں پر سے ہٹتا ہوا ٹھڈی پر آ گیا۔ صبح اس کی پہلی گکڑی کا اگلا سرا یقیناً اس کی اپنی ٹھڈی کے سانچے میں ڈھلا ہوا معلوم ہوگا .... جس دن چاندکی ماں نے باقاعدہ چرخہ کاتنے کی رسم ادا کی تھی کیا اس کی پہلی گکڑی کا اگلا سرا بھی اس کی اپنی ٹھڈی کے سانچے میں ڈھلا ہوا معلوم ہوتا تھا؟

ماں کی آنکھ لگ گئی ہے۔ دونوں بہنیں جاگتی ہیں۔ یہ کیا رتجگا ہے؟

کیا میں چرخے سے بھی گئی گذری ہوں؟ ---- بڑی بہن سوچتی ہے ---- جوں ہی چرخے کا پہیّا دھری پر چلتا چلتا بھاری ہو جاتا ہے تو دھری پر تیل دینا ضروری ہو جاتا ہے۔ پھر چیں چیں کی آواز بھی نہیں آتی۔

عورت کی زندگی کٹھن ہو جاتی ہے تو وہ کسی سیانے ہاتھ کا انتظار کرتی ہے جو اس کے چرخۂ حیات کی دُھری پر تیل کی چند بوندیں ٹپکا دے۔ پرانے ہاتھوں میں یہ چرخہ کتنا ادنیٰ ہو رہا ہے ....

"کیا سوچ رہی ہو، بہن؟"

"یوں ہی سسرال کا دھیان آ گیا تھا، بہن"

"اب شاید نیند نہ آئے گی"

"نہیں آتی تو نہ آئے بہن، رتجگا ہی سہی"

"یہ اچھا رتجگا ہے بہن! .... چاندکی ماں کا بھی رتجگا ہے چرخہ کاتتی وہ کبھی تھکتی نہیں .... ہا ہا ہی ہی۔
...... کون دیتا ہے اسے اتنی پونیاں؟"

"چاندکی ماں کا قصہ چھوڑو، بہن، اپنی بات کریں۔"

"ہاں، بہن، اپنی بات کریں ...."

"سسرال کا دکھ بہت برا ہوتا ہے، بہن!"

"ہاں بہن! .... چاندکی ماں تو بہت سکھی ہوگی اپنی سسرال میں۔ چاند کا باپ میرے جیجا جی جیسا تو ہے نہیں۔ انھوں نے تو تمہیں کاتنے تک کی مناہی کر رکھی ہے۔ بڑی مشکل سے انھوں نے تمہیں اب کے یہاں آنے دیا!"

"ہاں، بہن! یہ چھوڑو۔ یہ قصہ سوچنے سے غم اُلٹا بڑھتا ہی ہے۔"

بڑی بہن کے ذہن میں سسرال کی ساری بدسلوکیاں دھندلی تصویروں کی طرح پھرنے لگی ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ اور پریشانی سے جان چھڑانے کے لئے بلند آواز سے چیخنے لگے۔ یہ بیاہ نہیں، ایک پاپ ہے۔ ناٹک ہے ظلم ڈھانا تو پاپ ہے ہی ظلم سہنا بھی کچھ کم پاپ نہیں ہے۔ کون بچا سکتا ہے مجھے؟ شاید کوئی نہیں۔ بھگوان بھی نہیں .... کچھ لوگ کہتے ہیں کہ کہیں کوئی بھگوان نہیں ہے
.... پر کیا فائدہ ہے اس سوچ بچار کا؟ ---- سوچنے سے غم الٹا بڑھتا ہی ہے۔

رہ رہ کر چھوٹی بہن کے جی میں آ رہا ہے کہ بڑی بہن کو بھینچ لے۔ شاید اس طرح بڑی بہن کو کچھ تسکین مل جائے۔ مگر وہ کروٹ لینے پر اکتفا کرتی ہے۔ بچپن میں لڑکی چڑیا کی طرح پھدکتی پھرتی ہے پھر جوں جوں وہ بڑی ہوتی جاتی ہے امنگ اور امید اس کے تاثرات کا تانا بانا بن جاتی ہیں۔ اس طرح ایک خوابی دنیا تیار ہو جاتی ہے۔ پھر شادی کے بعد اکثر اس خوابی دنیا کا طلسم ٹوٹ جاتا ہے .... پر اس سوچ بچار کی کیا ضرورت ہے؟ بڑی بہن سچ کہتی ہے۔ سوچنے سے غم الٹا بڑھتا ہی ہے نہیں نہیں، یہ میں کیا سوچ رہی ہوں۔ سوچ بچار تو ضروری ہے۔ یہ اس استری کی طرح ہے جسے کپڑے پر پھیرنے سے ہر ایک سلوٹ دور ہو جاتی ہے مگر استری کو گرم کرنا ہوگا۔ اور اسے کپڑے پر پھیرنے سے پہلے کپڑے کو کچھ کچھ نمی پہنچانی بھی نہایت ضروری ہے تاکہ اس پر داغ نہ پڑے .....

کامیابی کا راز تو دلیری میں ہے، ماں کہا کرتی ہے، جو جتنا دلیر ہے وہ اتنا ہی کامیاب ہے۔ ظلم کو پی جانے سے تو ظالم کے ہاتھ مضبوط ہو جاتے ہیں۔ ظالم جیجا جی بڑی بہن پر کتنا ستم ڈھاتے ہیں .... کاش بڑی بہن کی جگہ میں ہوتی میں شاید کسی طرح نئے ماحول میں اپنے خیالات کو نئی ترتیب دے لیتی .....
.... نہیں نہیں، یہ میں کیا سوچ رہی ہوں۔ جیجا جی تو بڑی بہن کے پتی ہیں! .... مگر خود بڑی بہن ہی نئے ماحول میں نئی عورت کیوں نہیں بن جاتی؟ اس کا تازہ مولی کا سا جسم کتنی جلد ڈھیلا پڑ گیا ہے، اس کی ابھری ہوئی ہڈیوں پر تو یہ زبردستی پہنایا ہوا ریشم بھی چبھتا ہوگا۔ کھدر تو وہ شاید اب پہن ہی نہ سکے .... چاندکی ماں کو اپنے ہی چرخے کی پڑی ہے۔ وہ کیا جانے بڑی بہن کا غم!

ماں کی آنکھ کھل گئی ہے ---- "یہ کیسا رتجگا ہے، بیٹیو؟"

"ماں! اب تو سویرا ہوا چاہتا ہے۔"

"ماں! اب رات کہاں؟"

"میں تو خوش ہوں تمہارا پریم دیکھ کر، بیٹیو!"

"پریم ہی دکھ سکھ کا سہارا ہے، ماں!"

"بڑی بہن سچ کہتی ہے، ماں!"

ماں خوش ہے۔ ابھی آسمان پر تارے نظر آ رہے ہیں۔ ماں سوچتی ہے کہ سچ مچ وہ شاعر بہت بڑا شاعر تھا جس نے ان گنت تاروں کو پاربتی کے

گھنگھروؤں سے تشبیہ دی تھی جو کہ اس ناچ کے دوران میں جو اس نے شو کو رِجھانے کے لئے ہمالہ کی اونچی چوٹی پر ادا کیا تھا، کھل کر اِدھر اُدھر بکھر گئے تھے۔ پریم کی جھنکار انھیں اب بھی بھولی تو نہ ہوگی۔

چھوٹی بہن بیباک نگاہوں سے ماں کی طرف دیکھ رہی ہے ابھی ماں کہے گی اٹھ کر نہا دھولے، بیٹی پھر چرخہ کو کیسر کا تلک لگائے گی تیری بڑی بہن۔ چرخہ تو گھر کا سہاگ ہے یہ دن روز روز تو نہیں آتا بیٹی! نہا دھو کر، پوتر ہو کر سینہ دور سے پوتر کی ہوئی پونی پکڑنا اور لمبا لمبا تار نکالنا ---- دریا جتنا لمبا تار!

بڑی بہن اٹھ بیٹھی ہے۔ اپنے فرض کا اسے دھیان ہے آج اس پرانے چرخے کے بھاگ جاگیں گے جس پر کبھی وہ خود کاتا کرتی تھی۔ اپنے ہاتھ سے آج وہ اسے مل مل کر نہلائے گی، تیل کی مالش کرے گی اور پھر کپڑے سے پونچھ ڈالے گی۔ پھر جب اس پر کیسر کا تلک لگایا جائے گا، یہ کتنا سندر ہو اٹھے گا۔ یہ ریت تو بہت پرانی ہے، ان گنت پیڑھیوں سے چرخے کی یہ پوجا ہوتی آئی ہے۔

"کتنا برکت والا ہے، بیٹیو، یہ آنگن جہاں نہ جانے کتنی بار چرخے کا یہ شگن منایا گیا ہوگا"

"چرخے کی گھوں گھوں تو گھر کا سنگیت ہے، ماں!"

"بڑی بہن سچ کہتی ہے، ماں!"

بڑی بہن بظاہر ہنسنے کی کوشش کر رہی ہے۔ یہ دن روز روز تو نہیں آتا۔ سسرال کی بدمزگیوں کو اس وقت کیوں یاد رکھا جائے؟...... چرخے کو کیسر کا تلک لگانے سے پیشتر من کی شانتی نہایت ضروری ہے

چھوٹی بہن کے چہرے پر روشنی اور امید کی نئی کرنیں جھلک رہی ہیں۔ بڑی بہن ان میں صداقت اور خلوص کے رنگ دیکھ رہی ہے۔

مگر حقیقت کچھ اور ہی ہے، چھوٹی بہن من ہی من میں جاپانی... قمیص شلوار کی تصویر دیکھ رہی ہے۔ چرخہ تو وہ کاتے گی ہی مگر اس شرط پر ہرگز نہیں کہ چھینٹے چھاپے آنے والے بڑے تیوہاروں اور میلوں پر بھی اس کا جسم کھردرے کھدر کا لباس پہنا کرے۔ بڑی بہن کی رائے کچھ بھی ہو۔ خود اس میں بھی تو کچھ سمجھ ہے۔ گاؤں کا بزاز تو کہتا ہے کہ سودیشی بدیشی کا جھگڑا ابھی نری شور رکھتا ہے گاؤں ہیں جیسے الگ الگ گھر ہیں، سنسار میں الگ الگ دیس ہیں۔ گاؤں کی طرح سنسار میں بھی لین دین اور بکری کا سلسلہ شروع دنیا سے چلا آیا ہے...... چرخہ تو چاند کی ماں بھی کاتتی ہے وہ تو ہاتھ کا کاتا اور بنا ہوا کھدر پہنتی ہوگی! کتنی دور رہتی ہے وہ۔ جاپانی ریشم کی پہنچ وہاں تک ہو سکے تو یقیناً چاند کی ماں کا دل بھی اس کی قمیص شلوار سلوانے

کے لئے للچا اٹھے........

"کیا سوچ رہی ہو، بہن؟"

"کچھ نہیں، بہن۔ من ہی تو ہے۔ بسیر کرنے نکل جاتا ہے دور دور"

"چلو بہن، آج مل کر نہائیں"

"ہاں بہن نہائیں یہ دن روز روز تو نہیں آتا"

پاس سے ماں کہتی ہے ---- اب نہاؤگی بھی یا میٹھی باتیں بناؤگی؟

چھوٹی بہن کہتی ہے ---- آؤ بہن، پہلے چرخہ کو نہلا دیں۔

بڑی بہن کہتی ہے ---- یہ تو میرا کام ہے۔ پر خود نہائے بنا پوتر ہوئے بنا ہی چرخہ کو نہلا دوں؟ واہ! آج باقاعدہ کاتنا شروع کرنے کی رسم ادا کروگی اور سمجھ کا یہ حال ہے۔

نہانے کے بعد بھی چھوٹی بہن کے چہرے سے تکان کی علامتیں نہیں ہٹیں۔ کھدر کی نیلگوں قمیص شلوار پہن کر وہ کوئی جل پری ہی تو معلوم ہوتی ہے، چھدرے کھدر کا کورا دوپٹہ بھی خوب سجتا ہے اسے شرمیلی شبنم بار آنکھوں میں نہ جانے کیا کیا سپنے لٹک رہے ہیں۔ زندگی کو تلخ.... حقیقتوں سے سامنا ہونے پر بھی کیا یہ رنگ روپ اپنی شان برقرار رکھ سکے گا؟ کہاں بیاہی جائے گی وہ؟ یقیناً وہ زندگی کی کچہری میں بھی ایک مجرم عورت کے روپ میں کھڑی ہونے کے لئے مجبور نہ ہوگی۔ نئے ماحول میں وہ نئی عورت بن جائے گی۔

بڑی بہن تو سونے کی عورت معلوم ہوتی ہے۔ چھوٹی بہن کا شگن مناتے ہوئے وہ اپنا دکھ درد بھول گئی ہے۔ غم ہونا چاہیے پہاڑی نالے کی طرح ---- جلد چڑھے اور جلد اتر بھی جائے مگر صبر کی انتہا تو ہوتی ہی ہوئی۔ جب یہ میدان کے بڑے دریا کا روپ دھار لے خیر یہ بھی اچھا ہے کہ کوئی نہ کوئی خوشی کا دن آتا رہتا ہے جب کہ غم کی اداس لہروں پر سونے کا پانی پھر جاتا ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کی ہر چیز نہیں ہے اور اس کا ہر ایک ذرہ اپنی جگہ نہایت نفع بخش اور اہم ہے۔

ماں نے بھی نہا کر نئے کپڑے پہن لئے ہیں۔ اب کیسر گھول رہی ہے کہتی ہے ---- اب دیر مت کرو بیٹی! سورج بھگوان بھی.... درشن دیں گے۔ چرخے کا کام جلد نبٹا لو۔

بڑی بہن جلدی جلدی ہاتھ چلا رہی ہے۔ اسے دھوتے ہوئے اسے یوں محسوس ہو رہا ہے کہ یہ کسی بزرگ کا مجسمہ ہے۔......

چھوٹی بہن دوڑ کر کچھ جنگلی پھول چن لائی ہے ماں کا حکم تھا، اس نے پورا کر دیا۔ چرخہ تو ہوا گھر کا دیوتا۔ عورتیں ان گنت پیڑھیوں سے اس کی

پوجا کرتی آئی ہیں۔

لیکن اس دیوتا کو تو گھن لگ گیا اور کسی نے آج تک اس کی سدھ بدھ نہ لی۔

"بیٹی! یہ کیا کر ڈالا تو نے؟ دھیرے دھیرے ہاتھ چلایا ہوتا..... چرخے کے دونوں منے جڑ سے ٹوٹ گئے! ...."

"میرا کیا دوس ہے، ماں؟ گھن سے بچا کر رکھا ہوتا"

"دوس کسی کا بھی نہیں، بیٹی! .... ہمارے بھاگ! ..... گھن کا بھی کیا دوس ہے؟ ہمارے بھاگ ......"

چھوٹی بہن چپ ہے۔ وہ کچھ نہ بولے گی۔ آج یہ رسم نہیں منائی جا سکتی۔ شاید نیا چرخہ خریدو جائے گا۔ تب کہیں جا کر یہ رسم ادا کی جا سکیگی۔

ماں چپ ہے۔ بڑی مور کھتا ہوئی۔ چرخہ گھن سے بچا کر رکھا ہوتا ...... اب نیا چرخہ کہاں سے لوں گی؟ بڑھئی کو پوچھ دیکھوں گی۔ شاید کسی طرح ایسی چرخے کی مرمت کر دے۔ چرخہ تو گھر کا دیوتا ہے .... پرانے دیوتا کے ساتھ نئے دیوتا کا کیا مقابلہ؟ .... دیوتا جتنا پرانا ہو اتنا ہی نیا ہوتا ہے۔

بڑی بہن بھی چپ ہے۔ اس نے ماں کا خیال بھانپ لیا ہے پر اب اس چرخے میں جان ہی نہیں رہی۔ گھن تو لکڑی کو آٹا آٹا کر دیتا ہے...... اور گھن کسی دیوتا کا بھی لحاظ نہیں کرتا۔ یہی زندگی کی تلخ حقیقت ہے اس سے نہ آدمی بھاگ سکتا ہے نہ دیوتا۔ میں اس سے بھاگتی رہی ہوں اب تک! شروع میں اکثر ہر ریت اور روایت زندگی بخش ہوتی ہے اسی لئے وہ زندہ رہتی ہے۔ مگر جب اسے گھن کھا جائے تو اس کا دور ختم ہو جاتا ہے .... میں اب تک وقت کے دھارے کے الٹ چلنے کی حماقت کرتی رہی۔ جس چرخے کی ہڈیوں میں گھن داخل ہو گیا اسی کو میں نے اپنا دیوتا بنائے رکھا۔ لیکن ہر نیا زمانہ اپنا دیوتا اپنے ساتھ لاتا ہے۔

دیویندر ستیارتھی

کھلونے

تو ہے چنچل سی کھلاڑی لڑکی
مرے جذبات کھلونے ہیں ترے
شوق سے کھیل مرے سینے کی امیدوں سے
مرے ارمانوں سے کھیل
مرے جذبات کھلونے ہیں مری جان ترے
ہاں کہیں ان سے جو اکتا جائے
توڑ دے ان کو، بھلا دے ان کو
ان کی اے جان نہیں قیمت ہے
ان کا مقصد ہے یہی
ان کا مقصد بھی وہی ہے جو مرا مقصد ہے
اور جو مقصود ہے انسان کی پیدائش کا
ایک مجبور سی زیست
کسی خالق کے لئے
کسی بے رحم مشیت کے لئے
کسی بے لوچ سی طاقت کے لئے
جو ہمیں آپ ہی پیدا کر کے
جب کبھی اس کو خیال آتا ہے
توڑ دیتی ہے، بھلا دیتی ہے
کسی غفلت کے اندھیرے میں گرا دیتی ہے
مرے جذبات مری جان ہیں تیری تخلیق
اور کھلونے ہیں ترے
شوق سے کھیل مرے دل کی تمنّاؤں سے

شریف کنجاہی

دِل کی دھڑکن

کردار حسب ترتیب سے آتے ہیں :——

سلطان :۔ ایک ادھیڑ عمر کا زمیندار۔ میونسپل کمشنر
شرفو:۔ سلطان کا ملازم۔ کام چور
وحید۔ سلطان کا خوش باش دوست
اختر۔ ایک دولت مند نوجوان۔ دل کی دھڑکن کا مریض
سعیدہ۔ سلطان کی بیوی۔ ضدی اور بد مزاج
ریحانہ۔ سلطان کی حسین اور طرح دار بیٹی

سلطان۔ شرفو! ۔ شرفو!! (زیر لب) کم بخت کو سانپ سونگھ گیا۔
(بلند آواز سے) ارے او —— (شرفو داخل ہوتا ہے)
شرفو۔ حضور!
سلطان۔ بہرا ہو گیا ہے؟
شرفو۔ ہیں سرکار؟
سلطان۔ کہاں مرا ہوا تھا؟ (کچھ کہنے لگتا ہے)
شرفو۔ کہیں نہیں۔
سلطان۔ مردود —— (دو چار کاغذ الٹ پلٹ کرنے کے بعد) اب کیوں کھڑا ہے؟
شرفو۔ آپ نے آواز دی تھی!
سلطان۔ (گردن اٹھا کر) اچھا — ہاں - تم نے کیا کہا
شرفو۔ سرکار نے کسی کام کے لئے یاد فرمایا ہے۔
سلطان۔ میں نے؟ (ایک کاغذ چاک کرتے ہوئے آہستہ آہستہ) یوسف کے قرضے کا معاملہ تو طے ہو گیا۔ رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گزشت چلو جھگڑا چکا۔ تھوڑا نقصان اٹھا کر سہی۔ مونچھیں نیچی ہو گئیں۔ بلا سے روز کی دانتا کل کل سے چھٹکارا تو ملا (دوسرا کاغذ دیکھنے لگتا)
شرفو۔ تو میاں میں جاؤں؟
سلطان۔ (شرفو کی طرف غور سے دیکھ کر) میں نے نہیں بلایا تھا۔ (شرفو جانے کے لئے مڑتا ہے) ٹھیرو! ہاں — یاد آگیا - میاں وحید کے پاس گئے تھے؟ کیا جواب لائے؟

شرفو۔ سویرے ہی ہو آیا — آئے ہوئے بھی دو گھنٹے ہو گئے۔
سلطان۔ مگر وہ اب کیا لائے؟ عجب نالائق ہو۔ آکر باہر ہی بیٹھ رہے؟
شرفو۔ سرکار نے انھیں بلایا تھا نا؟
سلطان۔ پھر انھوں نے کیا کہا؟
شرفو۔ بس آتے ہی ہوں گے۔
سلطان۔ ابھی تک تو آئے نہیں۔ بھول نہ گئے ہوں۔ بھئی تمہاری حماقتوں نے ناک میں دم کر دیا۔ آدمی جس کام کو جائے اس کا جواب دینا چاہیئے۔ آخر کر کیا رہے تھے؟
شرفو۔ ناشتہ سامنے رکھا تھا۔ مجھ سے کہا تم جاؤ کہہ دینا اختر میاں سے ملتا ہوا آؤں گا۔
سلطان۔ ہونہ پورے گدھے۔ آتے ہی کیوں نہ کہا۔
(مسکرا کر آپ ہی آپ) اختر .... دیکھوں کیا بات کر کے آتے ہیں (ایک کاغذ دیکھ کر رکھ دیتا ہے) شرفو! (دروازہ پر دستک کی آواز) یہ کون دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے۔ تمہارے کانوں میں آواز ہی نہیں آتی۔ افیم تو نہیں کھانے لگے۔
شرفو۔ شاید وحید میاں آگئے۔ میں جانوں۔ وہی ہیں۔
سلطان۔ اور تم یہیں جمے رہو۔ کم بخت جا کر دیکھ! وحید میاں ہوں تو اندر لے آ۔ .... نوکر بھی پلے پڑا تو پاجی۔ کام چور۔ بھیگی بلی بتانے والا۔ کیا منن منن جا رہا ہے!
(شرفو دروازہ کھولتا ہے۔ وحید میاں اندر داخل ہوتے ہیں)
وحید۔ آداب عرض ہے۔
سلطان۔ آیئے۔ (کرسی سے چونک اٹھا کر) اتنی دیر کہاں لگائی۔ انتظار کرتے کرتے آندھ آگئی۔ شرفو سے تم ہی کو پوچھ رہا تھا۔ آؤ۔ ادھر سامنے والی کرسی پر بیٹھو (شرفو سے) ارے کھڑا منہ کیا دیکھتا ہے۔ حقہ تازہ کر کے لاؤ۔ پانوں کا خاص دان منگوا ——
وحید۔ کہیئے۔ کیا حکم ہے؟ کوئی تازہ خدمت؟
سلطان۔ اپنا وعدہ یاد کرو۔ (مسکرا کے) ملے؟
وحید۔ (منہ لٹکا کر) ہل تو لیا!
سلطان۔ کیا۔ ہل تو لیا کے کیا معنی؟ کوئی بات نہیں ہوئی؟

وحید ۔ باتیں یعنی ہوئیں ۔ مگر ....

سلطان ۔ کیا کیا ؟ مگر کا کیا مطلب ؟

وحید ۔ میں نہیں جانتا آپ کو اتنی جلدی کیوں ہے ۔ یہ معاملات چٹ پٹ نہیں ہوا کرتے ۔

سلطان ۔ ہاں ۔ ہاں ۔ سچ ہے ۔ لیکن ———

وحید ۔ لیکن ۔ آج کل کے لڑکوں سے شاید آپ پوری طرح واقف نہیں

سلطان ۔ کیا اختر کے خیالات بھی تازہ ولایت ہیں ؟

وحید ۔ ایک اختر کیا اس وقت کی دنیا ہی بدلی ہوئی ہے ۔

سلطان ۔ ارے میاں مجھے اختر سے مطلب ہے یا دنیا سے ؟

وحید ۔ آپ کا اختر بھی تو آخر اسی دنیا میں سانس لے رہا ہے ۔

سلطان ۔ کیا معنی ؟

وحید ۔ معنی وانی کو رہنے دیجئے ۔ یہ بتائیے ۔ آپ نے مجھے اس وقت کیوں یاد فرمایا ؟

سلطان ۔ کیا مزے کے آدمی ہو ۔ کل کی باتیں بھول گئے ؟ گئے تھے ؟ ملاقات ہوئی ؟

وحید ۔ گیا تھا ۔ ملاقات بھی ہوئی ۔ وہیں سے سیدھا چلا آرہا ہوں ۔

سلطان ۔ پھر ؟

وحید ۔ پھر ؟

سلطان ۔ لاحول ولا قوۃ ۔ ستانے سے کیا فائدہ ؟ اختر اتنا بڑا آدمی تو نہیں کہ تم اس سے کچھ کہتے ہوئے ہچکچاؤ ۔ یا وہ تم کو جھڑک دے ۔ تمہارا اس پر کافی اثر ہے ۔

وحید ۔ آپ لاحول پڑھیں یا درود ۔ کام تو کام ہی کی طرح ہوگا وہ بڑا آدمی نہ سہی لیکن شادی بیاہ کے معاملات گڑیوں کے کھیل بھی نہیں !

سلطان ۔ کچھ باتیں بھی ہوئیں !

وحید ۔ ہوئیں ۔ اور پورے ایک گھنٹے تک ۔ مگر یہ آپ نے کیا فرمایا کہ میرا اس پر کافی اثر ہے ۔ آپ نے اختر کو بالکل الو سمجھ لیا ہے ۔ وہ اپنی زندگی کا جوا میرے کہنے سے نہیں کھیل سکتا ۔ بیسویں صدی کے لڑکے بیوی کے متعلق اپنا نظریہ الگ رکھتے ہیں ۔

سلطان ۔ (ٹھنڈا سانس لے کر) تم بھی دق کر لو ۔ اچھا نہ بتاؤ ۔ بہتر ہے پہیلیاں بجھواتے رہو ۔

وحید ۔ لیکن آپ اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہیں ۔ ذرا صبر سے کام لیجئے مثل مشہور ہے کہ "ہتھیلی پہ سرسوں جما ہو" آہستہ آہستہ سب کچھ ہو جائیگا جلد بازی سے کام بنا نہیں کرتا ۔ پرانے زمانے کی باتیں چھوڑ دیجئے کہ ہڈی بوٹی دیکھی اور چٹ منگنی اور پٹ بیاہ ۔ یہ وقت اور ہے اب ہڈی بوٹی کا سوال ہی نہیں رہا ۔ شرافت اور ذات کو کوئی نہیں پوچھتا ۔ آج کل تو لڑکے لڑکی خود مختار ہو گئے ہیں ۔ فیشن میں جو چیز داخل ہو گئی وہی سب کچھ ہے ۔

سلطان ۔ کیا شادی بھی فیشن میں داخل ہو گئی ہے ؟

وحید ۔ اور کیا ؟ ۔ دوسرے ۔ پچاس فی صدی نوجوان تو باقاعدہ شادی کے نام ہی سے بدکتے ہیں ۔ کون بیٹھے بٹھائے مفت میں روگ لگائے ۔ بیکاری کا دور ہے ۔ ملازمت ملتی نہیں ۔ روپیہ مہنگا ہوتا جاتا ہے "غم نداری بز بخر" اور وہ جو کہتے ہیں "جو بابل میں سماتا نہیں اور دم سے باندھا چھاج" ۔ اپنا پیٹ پالیں ۔ اپنی زندگی اپٹوڈیٹ بنائیں ۔ یا جورو کی غلامی کریں ۔ اس کے بچے پالیں ۔

سلطان ۔ مگر کیا اختر کے بھی ایسے خیالات ہیں ۔ صورت سے تو وہ اس ڈھنگ کا نہیں معلوم ہوتا ۔ انگریزی پڑھے لکھوں کی باتیں اس میں کہاں سے آگئیں ؟

وحید ۔ انگریزی پڑھے لکھوں کی ہوا لگ گئی ہوگی ۔

سلطان ۔ پھر وہ غریب نہیں ۔ دولت مند آدمی ہے ۔

وحید ۔ ہوا کرے ۔ وقت کے کرشمے ہیں ۔ مفلسی اور روپیہ والے ۔ آج کل تو سبھی پر فیشن کا بھوت سوار ہے ۔ آزادی کے ساتھ رہنا کس کو پسند نہیں ؟

سلطان ۔ آخر ۔ منقطع کا بند کیا رہا ؟ مطلب کی کوئی گفتگو ہوئی یا نہیں ؟

وحید ۔ گیا تو اسی لئے تھا اور جہاں تک زبان نے یاری دی سب ہی کچھ کہا شادی خانہ آبادی کی خوبیاں بیان کیں ۔ اخلاقاً اور مذہباً اس کی ضرورت جتائی پرانے طرز زندگی اور نئے طریق معاشرت پر بڑے زوردار الفاظ میں روشنی ڈالی ۔ آپ کے اور اس کے خاندانی تعلقات سمجھائے وغیرہ وغیرہ ۔ لیکن اختر ۔ فیشن کے سبز باغ کا نظارہ کرنے پر ایسا تلا ہوا ہے کہ ——— اب میں کیا عرض کروں ؟

سلطان ۔ ان سب کے جواب میں اس نے کچھ کہا بھی ؟

وحید ۔ کہا کہ معاملہ بہت اہم ہے ۔ سوچے سمجھے ۔ دیکھے بھالے بغیر کیا کہہ سکتا ہوں ۔

سلطان ۔ سوچنا سمجھنا دیکھنا بھالنا کیسا ؟ میں اجنبی نہیں ۔ لڑکی بھی اس کی دیکھی بھالی ہے ۔

وحید ۔ بہرحال اس کے خیالات سے ہمیں کیا واسطہ ؟

سلطان۔ برا کیا۔ موقعہ ہاتھ سے دینا نہیں چاہیئے تھا۔ کسی نے بہکا دیا۔ تو غضب ہو جائے گا بندۂ خدا۔ ذرا لسانی سے کام لیتے۔

وحید۔ آپ بھی ہتھیلی پر سرسوں جمانا چاہتے ہیں۔ وہ کہیں بھاگا نہیں جاتا میں بھی زندہ ہوں۔ میں نہیں جانتا۔ آپ کو اس قدر جلدی کیا ہے کوشش کرنے سے نہ ہارئے۔ ممکن ہے بیل منڈھے چڑھ جائے

سلطان۔ جس کی نہ پھٹے بوائی وہ کیا جانے پیر پرائی۔ تم کو میری مشکلات کا کیا اندازہ؟ لڑکی ہاتھوں سے نکلی جاتی ہے۔ تم اپنے ہو۔ تم سے کیا پردہ۔ ناک اور چھری میں چار انگل کا فاصلہ بھی نہیں رہا۔ کب تک اسکی جوانی کو دبا کر رکھوں۔ کنبے رشتے کے مرد۔ پاس پڑوس والی عورتیں نام رکھنے لگی ہیں۔ دشمنوں کے کان بہرے۔ اگر کچھ ایسی ویسی ہو گئی تو کیا ہو گا۔

وحید۔ تو کوئی اور لڑکا دھیان میں نہیں؟

سلطان۔ میاں۔ سب جگہ سے ہار کر اختر پر نظر پڑی تھی۔ اور خیال تھا کہ تم اسے رضامند کر لوگے۔ مگر معلوم ہوا۔ کہ یہاں بھی نصیب کی کھوٹ سامنے آگئی بس اب زہر کھانا پڑے گا۔

وحید۔ (قہقہہ لگا کر) واللہ زہر کھانے کی ایک ہی کہی۔ اتنی سی بات پر زہر! آپ تو بڑے معاملہ فہم اور عقلمند سمجھے جاتے ہیں۔

سلطان۔ مگر جیسی میری لڑکی ہے۔ اگر تمھاری ایسی ہوتی۔ اور واقعات بھی میرے جیسے ہوتے تو میں تو صرف زبان ہی سے کہہ رہا ہوں۔ تم اب تک کھا بھی چکتے۔!

وحید۔ (اور زیادہ ہنس کر سچ مچ؟

سلطان۔ تم ہنستے ہو۔ اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟

وحید۔ ہنستا یوں ہوں۔ کہ آپ میری باتوں میں آگئے۔

سلطان۔ کیا کیا؟ کیا تم اختر سے ہے نہیں؟

وحید۔ ملا ہوں —— لیکن —— اچھا اب آپ خوش ہو جائیں۔

سلطان۔ دیکھو وحید۔ مجھے یہ مسخرا پن نہیں بھاتا۔ ایسی باتوں میں بدمزگی پیدا ہو جاتی ہے۔

وحید۔ اجی حضرت ہنستے ہی گھر بستے ہیں!

سلطان۔ زیادہ مذاق اچھا نہیں۔ سچ سچ بتاؤ۔ کیا ہوا؟

وحید۔ مٹھائی منگا لیجئے۔ گڑ سے میٹھی بات ہے۔

سلطان۔ کچھ سناؤ تو۔ مٹھائی کیسی۔ حلوائی کی دکان تمہارے آگے لگوا دوں گا

وحید۔ تو پھر سنئے۔ مگر پہلے منہ میٹھا ہونا چاہیئے۔

سلطان۔ شرفو! ارے بھئی۔ گڑ کی ایک بھیلی تو لے آ۔ میاں وحید منہ میٹھا کریں گے!!

وحید۔ گڑ منگانے کی تکلیف کیا ضرور ہے۔ گنوں کی پھاندی نہ منگا لیجئے۔ اگر اس وقت اختر ہوتا تو کیا کہتا۔

سلطان۔ مٹھائی جیسی چاہے۔ کھا لینا۔ قصہ تو سناؤ۔ تم نے تو مفت میں مجھے پریشان کر دیا۔

وحید۔ قصہ کیا چند لفظ ہیں۔ میں گیا۔ شادی کا ذکر چھیڑا۔ وہ خود اسی فکر میں ہے کہ کسی طرح گھر بسے۔ ماں باپ بہن بھائی کوئی رہا نہیں۔ جو کہیں پیام سلام بھیجیں۔ تمہاری لڑکی اس کی نگاہ میں تھی۔ لیکن کوئی ذریعہ نہ تھا۔ کہ بات چیت کرے۔ میرا جانا غنیمت ہو گیا۔ مختصر یہ کہ بظاہر وہ شادی کرنے کو تیار ہے۔

سلطان۔ میری لڑکی سے؟

وحید۔ ہاں۔ ہاں۔ آپ کی لڑکی کے ساتھ۔ بشرطیکہ آپ اس کی قلبی بیماری کا خیال نہ کریں۔

سلطان۔ کیا اسے کوئی دل کی بیماری ہے؟

وحید۔ معمولی سی دھڑکن ہے۔ کبھی کبھی زیادہ بھی ہو جاتی ہوگی۔

سلطان۔ اس کی مجھے پرواہ نہیں۔ بیماری کیسی بھی ہو۔ وہ دولت مند ہے اور بس۔ پھر کچھ طے بھی پایا؟

وحید۔ وہ خود آپ سے مل کر گفتگو کرنا چاہتا ہے اس کے بعد طے ہی سمجھو

سلطان۔ کیا طے سمجھو۔ تم کوئی بات ٹھکانے کی تو کرتے نہیں کبھی کچھ کہتے ہو کبھی کچھ۔

وحید۔ آپ کو یقین نہیں آتا؟

سلطان۔ کیا خاک یقین آئے!

وحید۔ مٹھائی کھلانے کے وقت تو آپ یوں گریز کرنے لگے۔

سلطان۔ اچھا قسم کھاؤ۔

وحید۔ قسم کھانے کی تو میری عادت نہیں۔ ہاں جھوٹ نکلے۔ تو جو چور کا حال وہ میرا حال۔

سلطان۔ اگر ایسا ہے۔ تو بھئی تم نے قومیت شہریت اور برادری وغیرہ کے سارے حق ادا کر دئے۔

وحید۔ اور آپ خشک ہی ٹالے جائیے۔

سلطان۔ ہاں تو تم نے یہ نہیں بتایا کہ انھوں نے کب آنے کو کہا ہے؟

وحید۔ جناب وہ اپنی مرضی کے مالک ہیں آپ کے یا میرے نوکر تو نہیں جب ان کا جی چاہے گا یا دل کی دھڑکن سے فرصت ملے گی آجائینگے

سلطان۔ (اپنی دھن میں) یہ تو کچھ کام کی بات نہ ہوئی۔ تم کو اس سے وقت لینا چاہیئے تھا اگر وہ بھول گیا؟ میں شرفو کو بھیج کر بلوا نہ لوں؟ ابھی

فیصلہ ہوجاتا ہے۔ کہو۔ کیا رائے ہے؟

وحید۔ کہنا تو گستاخی ہے۔ لیکن آپ ہیں پورے ہولو۔ صبر کے ذرا پاس نہیں!

سلطان۔ میاں۔ بیٹی والے ہوتے تو پوچھتا کہ کیسی ساٹھی عقل و قل سب دفو چکر ہوجاتی ہے۔

شرفو۔ (اندر آکر) میاں۔ میاں اختر آئے ہیں!

سلطان۔ (حیران ہوکر) کون۔ کون؟

شرفو۔ وہی جو انگریزی کپڑے پہنتے اور ٹوپ لگاتے ہیں۔

وحید۔ کیوں حضت۔ اب تو میری مٹھائی صحیح ہوگئی؟

سلطان۔ شرفو! تم جیسا گدھا بھی کوئی نہ ہوگا۔ ارے الو کھڑا منہ کیا دیکھ رہا ہے بلا کیوں نہیں لاتا۔ (شرفو جاتا ہے)

وحید۔ لیجئے۔ بندہ چلا۔ آب آمد تیمم برخاست۔ میرا ٹھہرنا مناسب نہیں مگر دیکھنا کوئی اینڈی بینڈی نہ کہہ دینا۔ اونچ نیچ سمجھ کر بات کرنا کہیں کی کرائی محنت برباد ہو جائے۔ خدا حافظ!

سلطان۔ جاتے ہو؟ خدا حافظ۔ کل ضرور ملنا۔ (وحید دوسرے دروازہ سے نکل جاتا ہے)

اختر۔ (داخل ہوکر) تسلیمات عرض ہے۔

سلطان۔ آہاہ۔ اختر میاں ہیں۔ یہ چاند آج کدھر سے نکلا۔ آؤ۔ آؤ (گلے لگا کر اپنے پہلو میں بٹھاتا ہے) بھئی۔ تمہارے دیکھنے کو تو آنکھیں ترس گئیں واللہ مجھ کو جس قدر محبت تم سے ہے۔ گاؤں بھر میں کسی سے نہیں۔

اختر۔ آپ کی اس شفقت کا شکریہ۔ آپ کے سوا اب میرا ہی کون ہے؟

سلطان۔ برخوردار تم میری جان و جگر ہو۔ تمہارے خاندان سے ہمارے خاندان کے تعلقات کوئی آج کے ہیں اور تمہارے والد تو خدا بخشے مجھ کو اپنے حقیقی بھائیوں سے بڑھ کر سمجھتے تھے۔ کہو مزاج تو اچھا ہے؟

اختر۔ آپ بزرگوں کی دعا اور خدا کا احسان ہے۔ دل کی دھڑکن کے سوا اور سب طرح سے اچھا ہوں۔

سلطان۔ میاں ہم غیر نہیں۔ کبھی کبھی آجایا کرو۔

اختر۔ کیا عرض کروں۔ دل تو بہت چاہتا ہے۔ مگر زمینداری کے جھگڑوں سے چھٹکارا ہی نہیں ملتا۔ ایک سر اور ستر سودے۔ پھر دل دھڑکنے کا مرض۔ کئی دن سے ارادہ کر رہا تھا کہ حاضر ہوں۔ آج خدا خدا کرکے موقع ملا ہے۔

سلطان۔ خدا کرے روز ایسا ہی موقع ملے۔ اچھا اب یہ بتاؤ۔ کہ کیا پیوگے چائے منگاؤں۔ یا سوڈا؟

اختر۔ چائے تو میرے لئے زہر ہے اور سوڈا پینے کی مجھے عادت نہیں۔

سلطان۔ پھر تمہاری کیا خاطر کی جائے؟

اختر۔ میرا گھر ہے۔ خاطر غیروں کی ہوتی ہے۔

سلطان۔ کیوں نہیں کیوں نہیں۔ عزیز من میں بہت خوش ہوا۔ کہ تم نے میرے گھر کو اپنا گھر سمجھا اور سناؤ۔ کیا حالات ہیں؟

اختر۔ چچا جان!

سلطان۔ (متوجہ ہوکر) کچھ کہنا چاہتے ہو؟

اختر۔ جی ہاں۔ اس وقت ایک خاص غرض سے حاضر ہوا ہوں۔ ایک درخواست ہے۔ لیکن کچھ تو شرم۔ اور کچھ دل کی بیماری۔ زبان نہیں اٹھتی۔

سلطان۔ واہ بھئی بیگانوں سے شرمانا چاہیئے نہ کہ اپنوں سے۔ میری گودیوں میں کھیل کر بڑے ہوئے ہو۔ کہو۔ بے تکلف کہو۔ جھجکو نہیں۔

اختر۔ معاملہ ایسا ہی ہے۔ آپ۔ اف۔ کم بخت دھڑکن ہونے لگی (دل پر ہاتھ رکھ کر) پانی کا ایک گھونٹ پی لوں۔ دل ٹھہر جائے تو عرض کروں (لانبا سانس لے کر) آہ!

سلطان۔ (گھبرا کر) یا اللہ! کیا درد ہے؟ شرفو۔ شرفو۔ (شرفو آتا ہے) کہاں مرے رہتے ہو۔ جلد ٹھنڈا پانی لاؤ۔ (شرفو پانی کا گلاس لاتا ہے۔ اختر پیتا ہے) طبیعت ٹھہری؟

اختر۔ کچھ تسکین ہوئی۔

سلطان۔ ہاں بھئی کیا کہہ رہے تھے؟

اختر۔ منہ نہیں کھلتا۔ قبلہ! آپ نے سنا ہوگا کہ میں بچپن سے بہت ہی شرمیلا ہوں اور اس پر دل کی بیماری۔ اگر جناب میرے سر پہ ہاتھ رکھیں تو ....

سلطان۔ (بات کاٹ کر) برخوردار۔ سر پر ہاتھ رکھنا کیسا؟ میں تو تمہیں اپنے سر پر بٹھانے کو تیار ہوں۔ تم میرے بیٹوں سے زیادہ ہو۔ بات تو کہو۔ دیکھو مجھے کہیں دورہ نہ اٹھ آئے۔ میرا دماغ بہت کمزور ہے ہاں میاں۔ شرماؤ نہیں۔ جو کہنا چاہتے ہو کھل کر کہو۔

اختر۔ جناب میں آپ کا بچہ ہوں اور بات بھی بری نہیں۔ لاحول ولا قوۃ نہ جانے مجھے کیا ہوگا۔ شرم چلی آتی ہے۔ آپ غالباً سمجھ تو گئے ہوں گے؟

سلطان۔ کہو۔ کہتے کیوں نہیں۔ میں کچھ نہیں سمجھا۔ پانی سے طبیعت نہ کھلی ہو۔ تو (مسکرا کر) دودھ پیو۔ منگواؤں؟

اختر۔ یہ بات نہیں۔ آپ تو شرمندہ کرتے ہیں۔ مجھے یہ عرض کرنا ہے میں یہ درخواست لے کر آیا ہوں۔ میری آرزو ہے۔ (رک کر) کہ۔ کہ اگر آپ ....

سلطان۔ ہاں۔ ہاں۔ اگر آپ .... کہو بیٹا؟

اختر۔ عرض کرتا ہوں کہ اگر آپ — خاکسار کو — اپنی غلامی میں قبول فرمائیں — تو عزو شرف۔

سلطان۔ (خوشی سے اچھل کر) بھئی واہ۔ اچھے جنٹل مین ہو۔ اتنی سی بات کے لئے شرما رہے تھے۔ یہ کوئی شرمانے کی بات ہے۔ لیکن میں ایک مرتبہ پھر سننا چاہتا ہوں۔

اختر۔ آپ مجھے زیادہ بے غیرت نہ بنائیں میں نے عرض کر دیا اور آپ نے سن لیا۔

سلطان۔ لیکن ابھی پوری طرح سمجھا نہیں۔ عزت اور بے عزت کا کہیں کیا سوال ہے دنیا کے یہی دستور ہیں۔ لو کہو۔ ذرا میری طرف دیکھ کر۔

اختر۔ مجھ سے آپ ناواقف نہیں۔ میرا حسب نسب میری دولت ثروت۔ میرے چال چلن اندر باہر کے حالات آپ کے سامنے ہیں۔ اس لئے مجھے توقع ہے کہ جناب میری درخواست رد نہ کریں گے۔

سلطان۔ کیسی درخواست؟

اختر۔ میرے محترم میری خواہش ہے۔ کہ آپ مجھے اپنے دامن میں چھپا لیں۔

سلطان۔ تمہاری جگہ تو میرے دل میں ہے۔ اور کیا چاہتے ہو؟

اختر۔ آپ کی فرزندی میں داخل ہونا۔ دامادی کا فخر لے

سلطان۔ (متانت سے) کیا مضائقہ ہے یہ کوئی انوکھی درخواست نہیں اور مجھ سے بڑھ کر تمہارا مان رکھنے والا اور کون ہو سکتا ہے میں خوش ہوں کہ تم نے اپنے منھ سے اپنی خواہش ظاہر کی۔ تم شریف ابن شریف ہو۔ یقین مانو کہ مجھے تم سے اچھا داماد ساری بستی میں چراغ لے کر بھی ڈھونڈوں گا تو ملنا مشکل ہے۔ لیکن اس معاملہ میں میں تنہا کوئی اختیار نہیں رکھتا۔ تمہاری پھپھی کا عندیہ لئے بغیر اقرار کر سکتا ہوں نہ انکار۔ آج کا دن مبارک ہے۔ نیک کام میں دیر کیوں ڈالی جائے۔ دوسرے تمہاری دلشکنی کا خیال بھی ہے۔ تم آرام سے بیٹھو۔ میں انہیں بھیجتا ہوں وہ تمہارے سامنے ہوتی ہیں۔ آمنے سامنے بیٹھ کر بات چیت کیوں نہ کر لو۔ ہاں۔ نہیں۔۔ کا ابھی جواب مل جائیگا اور نہیں کیسی۔ انشاء اللہ ہاں ہی ہوگی۔ وہ بھی تمہیں بیٹے سے کم نہیں سمجھتیں۔ پھر جیسا تم چاہو گے۔ کسے عذر ہو سکتا ہے
(سلطان جاتا ہے)

اختر۔ (علیحدہ) لعنت بر شیطان۔ کیا پھر یہی راگ الاپنا پڑے گا۔ اور وہ بھی ریحانہ کی ماں کے سامنے! سنا ہے اس کے مزاج کا تو کوئی ٹھکانا ہی نہیں۔ بڑی ناک چڑھی عورت ہے — مردمار۔ کلے دراز۔ خدا خیر کرے میرے ہاتھ پاؤں تو ابھی سے سنسنانے لگے۔ دھڑکن شروع ہو گئی۔ شادی کس قدر خوفناک چیز ہے۔ خواہ مخواہ وحید کے بہکانے میں آ گیا۔ اف (دل کو ہاتھ سے دباتا ہے) چپ کے سے چل دوں۔ دل کم بخت سنبھلتا ہی نہیں (سعیدہ آتی دکھائی دیتی ہے) لو ملک الموت آیا۔ اب کیا کروں۔ بڑی مصیبت کا سامنا ہے (اوسان درست کر کے) آداب۔ آداب۔ چچی جان آداب عرض کرتا ہوں۔

سعیدہ۔ عمر دراز۔ جیتے رہو۔ میاں عید کا چاند ہو گئے۔ کہو خیریت سے تو ہو؟ کچھ چہرہ اترا اترا معلوم ہوتا ہے۔

اختر۔ جی ہاں — کیا نام ہے — یوں تو خدا کے فضل سے اچھا ہوں۔ ذرا دھڑکن کی بیماری ہے۔ آپ کا مزاج کیسا ہے!

سعیدہ۔ میاں۔ میرا مزاج کیا پوچھتے ہو — تم تو کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ بیٹھو۔ کچھ کھایا پیا بھی؟ تمہارے چچا کو تو ان باتوں کا خیال نہیں۔ اپنے گھر کوئی آدمی آئے اور یونہی بیٹھا رہے۔ لوج۔ ایسی بے خبری کسی کام کی میں ناشتہ منگاتی ہوں۔

اختر۔ آپ تکلیف نہ کریں۔ گھر سے ناشتہ کر کے چلا تھا۔

سعیدہ۔ پھر کیا ہوا۔ اور سہی — اچھا کھانا ہیں کھانا۔ گیارہ بج رہے ہیں۔ میں نے آج مرغی کا قورمہ اپنے ہاتھ سے پکایا ہے پان تو کھاؤ (خاصدان دیکھ کر) عجب بد تمیز نوکر ہیں۔ پان تک نہیں لائے۔ جمن ارے او جمن۔ (چھوکرا اندر سے آتا ہے) ہوا نام گم۔ تجھے بھی خیال نہیں۔ میاں آئے ہوئے ہیں چھوٹی بیگم سے گلوریاں بنوا کر لا۔

جمن - بیگم صاحب میرا کیا قصور؟ مجھے کیا خبر؟ کون آیا ہوا ہے۔ ابھی لایا چاندی کے ورق لگوا کر لاؤں نا۔

سعیدہ۔ یہیں بحث کئے جانا۔ ہاں ہاں چاندی کے ورق لگوا کر۔

اختر۔ چچی جان۔ آپ ناحق تکلیف کرتی ہیں۔ میں پان نہیں کھایا کرتا۔ پان سے دل کی دھڑکن زیادہ ہو جاتی ہے (دل پر ہاتھ رکھتا ہے)

سعیدہ۔ اسے کیا تم کو ہول دل کی بیماری ہے۔ اکیلے رہتے رہتے یہ روگ لگ گیا ہوگا۔ بیٹا کچھ علاج بھی کرتے ہو؟

اختر۔ علاج کیا کروں۔ پہلے شراب پیتا تھا۔ پھر کوکین کھانے لگا سگرٹ بھی بہت پیئے۔

سعیدہ۔ اوئی بھئی۔ بڑا اڈھیٹ مرض ہے۔ اتنی چیزوں سے بھی نہ گلا۔ (جمن پان لے کر آتا ہے) اچھا لو پان کھاؤ (ڈبیا میں سے تمباکو کا قوام دے کر) یہ میرے ہاتھ کا بنایا ہوا قوام ہے۔ مشک عنبر۔ زعفران اور دھتورے کے بیج بھی اس میں ڈالے ہیں۔ خدا چاہے تو دل کی۔ دھڑکن ابھی جاتی رہے گی۔

اختر۔ (قوام کی انگلی چاٹتا ہے) اہا ہا۔ کیسا خوشبودار ہے (پان چبا کر) دل دماغ معطر ہو گیا۔

سعیدہ۔ کیوں طبیعت خوش ہو گئی نا؟

اختر۔ شکریہ۔ آپ کی مہربانی۔ چچی جان۔ آپ خفا تو نہ ہوں گی؟

سعیدہ۔ کس بات پر حق ناحق؟

اختر۔ میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔

سعیدہ۔ شوق سے کہو۔ جم جم کہو۔

اختر۔ جی! کہتے ہوئے ذرا شرم آتی ہے۔

سعیدہ۔ یہاں شرمانے کی کونسی بات ہے۔ کہو۔ مرد ہو کر شرمانا کیسا؟

اختر۔ چچا جان کی خدمت میں عرض کر چکا ہوں۔ آپ کی خوشنودی اور رضامندی مقدم ہے اس لئے انھوں نے منظوری نامنظوری کو آپ پر منحصر رکھا انھیں انکار نہیں۔ وہ خوش ہیں —— مگر آپ بھی ہاں کر لیں۔

سعیدہ۔ کیا مزے کی بات ہے۔ چچا سے کہو اور چچی سے شرماؤ بیٹا۔ کیا شادی بیاہ کا معاملہ ہے؟

اختر۔ جی کچھ ایسا ہی سمجھئے۔ چچا جان کے سامنے بھی شرمایا تھا۔ انھوں نے بڑی مشکل سے کہلوایا ہے۔

سعیدہ۔ بھئی۔ تم نے تو لڑکیوں کو بھی مات کر دیا۔ اتنی تو میری ریحانہ بھی خدا رکھے نہیں شرماتی۔

اختر۔ اب کیا عرض کروں (کھنکارتا ہے) میں معاملے کو زیادہ طول نہیں دوں گا صرف دو لفظ کہنے ہیں (کھنکارتا ہے)

سعیدہ۔ یا اللہ۔ پھر کہو چکو۔

اختر۔ آپ مجھے .... آپ سے ہماری رشتہ داری تو ہے ہی، (قمیص کا بٹن کھولتا ہے) معاف کیجئے گا کہ گھبراہٹ سی ہونے لگی

سعیدہ تم تو دو لفظوں میں کہنا چاہتے تھے۔

اختر۔ (جلدی سے) دو ہی لفظ سمجھئے۔ دل کی کم بخت دھڑکن بڑھا دیتی ہے۔ ہاں تو یہ ساری دنیا جانتی ہے کہ میرے والد کا بھی انتقال ہو چکا ہے۔ اور والدہ کا بھی۔ آپ کے اور چچا جان کے سوا کوئی میرا سرپرست نہیں میں بھی آپ کو والدہ کی جگہ اور چچا جان کو والد کی جگہ سمجھتا ہوں۔

سعیدہ۔ میاں ہمارے دلوں میں بھی تمہاری ایسی ہی جگہ ہے۔ تم کڑھو نہیں۔ خدا نے چاہا تو ہماری محبت کے آگے تم ان مرنے والوں کی چاہت کو بھول جاؤ گے۔ اچھا بات تو پوری کرو۔

اختر۔ (دل پر ہاتھ رکھ کر) آپ خیال فرمائیں۔ مجھے کتنی مسرت ہوگی۔ اگر آپ .... پھر میری زمینداری ساری قوم سے زیادہ ہے یہ بھی آپ جانتی ہیں کہ کنبے والے مجھے کتنا پیار کرتے تھے۔ خالہ خالو خیر نگر والی زمین مجھے دے گئے۔ ماموں جان بیریوں والا باغ مرتے وقت میرے نام لکھ دیا تھا (دل پکڑ کر) وہ پیلی کوٹھی بھی میری ہے اور نہر والا بنگلہ بھی۔ اس کے علاوہ چار سو بیگہ کا ایک ٹکڑا جس کی حد آپ کے کھیتوں سے ملتی ہے جہاں نیم کے درخت کھڑے ہیں وہ بھی آپ کے اس غلام کی ملکیت ہے اس لئے میں۔

سعیدہ۔ (بات کاٹ کر) کیا کہا؟ نیم کے درختوں والی زمین تمہاری ہے؟

اختر۔ جی ہاں۔ گو وہ فی الحال بنجر سہی۔

سعیدہ۔ جس میں نیل کی پرانی کوٹھی کے کھنڈر ہیں۔

اختر۔ جی۔ وہی۔

سعیدہ۔ بیٹا۔ بھولتے تو نہیں۔ وہ زمین تو ہماری ہے۔

اختر۔ آپ شاید بھولتی ہیں۔ اس زمین پر میرا قبضہ ہے۔

سعیدہ۔ بھلا کونسی۔ کچھ اور پتہ دو۔

اختر۔ پتہ تو دے رہا ہوں۔ اور آپ سمجھ بھی گئی ہیں (دل پر ہاتھ رکھ لیتا ہے)

سعیدہ۔ جس میں گاؤں کا کوڑہ پڑتا ہے۔

اختر۔ وہی۔ وہی۔

سعیدہ۔ وہ کس کی ہے؟ تمہاری؟

اختر۔ خاکسار کی۔

سعیدہ۔ تمہاری کب سے ہوئی ؟

اختر۔ جب سے میں نے ہوش سنبھالا۔ جب سے مجھے یاد ہے۔

سعیدہ۔ میاں ہوش کی بنواؤ۔ نادانوں کی سی باتیں نہ کرو۔ پرائی ملکیت پر قبضہ جماتے ہو۔ خوب رہے!

اختر۔ میرے پاس اس کا پٹہ موجود ہے۔ اس میں شک نہیں کہ کسی وقت میں وہ کسی دوسرے کی ہوگی۔ لیکن اب تو قصبہ کا بچہ بچہ جانتا ہے کہ میں اس کا مالک ہوں (دل پر ہاتھ رکھ کر) میری پھوپی کی دادی نے آپ کے والد کے دادا کو یہ ٹکڑہ للہ فی اللہ کاشت کرنے کو دیا تھا۔

سعیدہ۔ (بات کاٹ کر) لو اور سنو۔ تمہاری پھوپی کی دادی ایسی تو حاتم کی لڑکی تھی اور للہ فی اللہ کسے کہتے ہیں۔ کیا ہمارے دادا مسجد کے ملّا یا کوئی تکیہ دار تھے ؟

اختر۔ بالکل مفت دی تھی۔ وہ اپنے بھٹے میں انھیں اینٹیں پکا دیا کرتے

سعیدہ۔ جھوٹ بالکل جھوٹ۔ میرے پر دادا کے ہاں تو دودھ بکتا تھا۔

اختر۔ میں نے تو نہیں سنا۔ کہ وہ گھوسی تھے۔ ہاں تو یہ سلسلہ کوئی چالیس برس جاری رہا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پھر ــــ

سعیدہ۔ پھر جو آنکھ کھلی۔ تو آپ مالک بن گئے۔

اختر۔ آپ کا یہ مطلب ہے۔ کہ میں خواب کی باتیں کر رہا ہوں (دل پکڑتا ہے)

سعیدہ۔ خواب کی باتیں کیا۔ مجھے تو یہ معلوم ہوتا ہے۔ تم نشہ میں ہو۔

اختر۔ (دل پکڑ کر) دیکھئے۔ میں تو کسی اور خیال میں آیا تھا۔ آپ میری توہین کرنے لگیں۔

سعیدہ۔ تم پرائی زمین کو اپنا بناؤ۔ میرے دادا کو اینٹیں تھا پنے والا بتاؤ اور میں چپ رہوں!

اختر۔ اگر ــ میں آپ کو دستاویز دکھا دوں؟

سعیدہ۔ منھ دھو رکھو۔ ہم لوگ تین سو برس سے اس زمین کو بوتے جوتتے چلے آرہے ہیں۔ تم آج دعوے دار کیسے بن گئے۔

اختر۔ میں عرض تو کر رہا ہوں۔ آپ کے والد کے دادا میری پھوپی کے دادا کے بھٹے کی اینٹیں بنایا کرتے تھے۔ ان کی کوٹھی کے کھنڈر دیکھئے چنانچہ میری پھوپی کی دادی نے اس کے عوض ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

سعیدہ۔ بھاڑ میں جائے تمہاری پھوپی اور پھوپی کی دادی۔ نہ جانے کیا بک رہے ہو۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ میں تو اتنا جانتی ہوں کہ یہ زمین ہماری ہے۔

اختر۔ آپ جلے پھپھولے کیوں پھوڑتی ہیں۔ میری بکواس فضول نہیں۔ اور آپ کے سمجھنے نہ سمجھنے سے کیا ہوتا ہے۔ یہ زمین قطعی میری ہے آپ کی نہیں!

سعیدہ۔ تم مجھ سے لڑنے آئے ہو۔ یاد رکھو۔ تمہیں کبھی پرائی چیز اپنی بنانے میں کامیابی نہ ہوگی جتنی چاہے بحث کر لو۔ اپنی نانی کو بھی قبر سے اکھاڑ کر لے آؤ گے۔ اور اپنے دادا کی ہڈیاں کھینچ لاؤ گے۔ تو بھی وہ زمین ہماری ہے۔ ہماری ہے۔ میں ڈائن نہیں کہ پرائے کلیجے پر ہاتھ ڈالوں۔ مگر تم میرے ہی سینے پر جب گھونسا مارو تو میں کس طرح چپکی رہوں۔

اختر۔ زمین کا ایک ذرا سا ٹکڑہ کیا چیز ہے۔ مجھے اس کی کیا پروا۔ میں ایسے ایسے ٹکڑے کنوں کے آگے ڈال دیتا ہوں۔ لیکن محترمہ یہ اصول کا معاملہ ہے۔ ہم زمیندار اگر یوں ہی اپنی حقیقت چھوڑنے لگیں تو ہمارا کہاں ٹھکانہ رہے۔ ہاں آپ چاہیں تو میں خوشی سے آپ کی نذر کر سکتا ہوں۔

سعیدہ۔ میری جوتی تم جیسے اوچھوں اور پرائے مال پر یا حسین کہنے والوں کا احسان اٹھائے۔ خدا نہ کرے جو ہم تمہارے آگے ہاتھ پساریں۔ تم کو ضرورت ہے اور اسی ٹکڑے پر تمہاری زمینداری کا جھنڈا گڑے گا۔ تو منہ سے مانگو۔ میں تمہیں دے سکتی ہوں۔ تو یہ چوری اور سینہ زوری۔ میں آج تک خدا جانے تمہیں کیا سمجھتی تھی اور تمہارے ساتھ کیا کرنے کا ارادہ تھا۔

اختر۔ (سینہ پکڑ کر) میرے بھی ایسے ہی خیالات تھے لیکن ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

سعیدہ۔ غضب خدا کا۔ ہمارا تو یہ سلوک کہ تم کو اپنے گھر بار کا مالک بنانے کو تیار کل ہی کی بات ہے۔ تمہاری ضرورت پر اپنا پرانا چھکڑا حوالہ کر دیا۔ تمہارے نوکر اس کا دُھرا توڑ لائے اور ہم نے اُف تک نہ کی۔ آج تم ہمیں بھکاری کہتے ہو۔ ہمارا مال۔ ہم کو دان ــ بڑے زمین دینے والے۔ اچھا ہمسائے کا حق ادا کیا۔ واہ واہ ـ واہ

اختر۔ تو کیا میں آپ کے نزدیک غاصب ہوں۔ معزز خاتون۔ میری سات پشت میں بھی کوئی ایسا نہ تھا۔ لعنت ہے جو کسی کا حق مارے میں ــــــ (پانی کا گلاس صراحی میں سے جھک کر پیتا ہے) اور جو مجھے غاصب سمجھے۔ اس پر بھی لعنت' یہ زمین میری ہے' میری ہے۔ کون مردود ہے۔ جو اس سے انکار کرے؟

سعیدہ۔ پانی پی پی کر کوسو۔ گالیاں دو۔ کتے بھونکا ہی کرتے ہیں۔ میں آج ہی اپنے ڈھور اس میں چرنے کے لئے بھجوا دیتی ہوں۔ دیکھوں

کون روکتا ہے؟

اختر۔ کیا کہا۔ (غصّے سے) کس کے کس کے ڈھور؟

سعیدہ۔ بھرے۔ میرے۔ میرے

اختر۔ مجال ہے۔ گولی نہ ماردوں۔ تو کہنا۔

سعیدہ۔ (اٹھ کھڑی ہوتی ہے) بڑے تیس مارخاں کے سالے نکلے۔ میرے کسی ڈنگر کا رونگٹا تو جھڑ جائے۔

اختر۔ (دل پر ہاتھ رکھ کر کراہتا ہوا) آہ۔ آہ۔ تم ہرگز مجھے نہیں روک سکتیں تم عورت ہو۔ میں مرد۔ میرے پاس بندوق ہے اور وہ زمین میری ہے۔ اف۔ میری۔ سنا آپ نے (بلند آواز سے) میری۔

سعیدہ۔ (غصّہ میں چیخ کر) چپ رہو۔ چیخ کر ڈراتے ہو۔ ہجڑوں کی طرح غل نہ مچاؤ۔ بندوق۔ بندوق۔ بندوق ہوگی تو تمہارے گھر میں تمہیں اس کا چلانا بھی آتا ہے۔

اختر۔ مجھ کو مجھ کو (دل پر ہاتھ رکھ کر) ارے غضب۔ یہ عورت مجھے ہیجڑا بناتی ہے۔ میں بھی تجھے ڈومنی کہے بغیر نہ رہوں گا۔ دیوانی سٹرن۔

سعیدہ۔ تیری اماں ڈومنی۔ تیری نانی کنجری۔ تیری دادی رنڈی۔ کیوں مزا آیا اور کہہ لو اور سنو۔ مجھے ڈومنی بناتا ہے او۔ دیوانے سٹری تیری ہوتے سوتے ہوں گے۔

اختر۔ (دل تھامے ہوئے) آہ۔ اف۔ کتنے زور زور سے دھڑکنا شروع کر دیا اگر یہ دکھ نہ ہوتا۔ تو میں آپ کی باتیں سنتا۔ آپ مجھے اتنی گالیاں دے سکتیں کیوں؟ (شور مچا کر) پاس پڑوس والو تم سب جانتے ہو۔ مگر پھر سن لو۔ نیم کے درختوں والی زمین۔ اختر خاں ولد بختہ خاں صاحب کی ہے۔ اس چڑیل کی نہیں۔

سعیدہ۔ (زور سے) ہو۔ ری اڑوسنوں پڑوسنوں۔ نیموں والی زمین سعیدؔ خانم زوجہ سلطان بہادر کی ہے۔ اختر بجز چوٹٹے بدمعاش کی نہیں اور چلا حرامی مرے سلّے کو دبانے۔

اختر۔ (اور زور سے) مگر زمین میری ہے۔

سعیدہ۔ (اور زیادہ زور سے) جھوٹ زمین میری ہے۔

(شور و غل سن کر سلطان آتا ہے)

سلطان۔ ہائیں۔ ہائیں۔ یہ کیا ہو رہا ہے۔ کیا پاگل ہوگئے ہو۔

(سعیدہ بیٹھ جاتی ہے اور رونے لگتی ہے)

سعیدہ۔ اس موذی کاٹے کو (روتے روتے) سمجھا لو۔ اس نے میرا خون کھولا دیا ہے نہیں تو میں اس کو کوس کوس کر کھا جاؤں گی۔

سلطان۔ بات کیا ہے۔ تم روتی کیوں ہو؟

سعیدہ۔ اچھا بتاؤ۔ نیم کے درختوں والی زمین کس کی ہے؟

سلطان۔ ہماری اور ہمارے باپ دادا کی۔

اختر۔ واہ جناب واہ۔ آپ کی عقل ٹھکانے بھی ہے۔ میری زمین اپنی بتانے لگے۔ میری پھوپی کی دادی نے آپ کے پردادا کو عارضی طور پر دے دی تھی یہ اس احسان کا بدلہ ہے۔ کہ آپ مالک بن بیٹھے۔ سبحان اللہ۔ کیا انصاف ہے۔

سعیدہ۔ (سسکیاں لیتے ہوئے) مردوے گلے نہ پڑ۔ تیرے گھر والوں میں کوئی مرا جیتا ہے بھی۔ تیری دادی بڑی احسان کرنے والی آئیں تھیں۔ عقل تو اپنی ٹھکانے نہیں۔ ہم سے کہتا ہے.....

سلطان۔ (اپنی بیوی سے) تم تو چیخ چیخ کر ہلکان نہ ہو۔ اختر میاں کو میں سمجھائے دیتا ہوں۔

اختر۔ آپ کیا سمجھائیں گے۔ مجھ سے سمجھئے اور سمجھنا سمجھانا کیسا۔ اس آخری بندوبست کے موقعہ پر ——

سلطان۔ (بات کاٹ کر) پہلے میری بات سنو۔ میرے عزیز تم نے شاید جمعبندی کا نقشہ نہیں دیکھا کبھی ضرور یہ زمین متنازعہ فیہ ہے۔ لیکن اب تو قصبے کے گدھے بھی جانتے ہیں کہ ہماری ہے۔

اختر۔ قصبے کے گدھے اپنی جانتے ہیں یہ آپ نے کیا کہا۔ آپ میرا مذاق اڑاتے ہیں۔ اچھی بات ہے۔ میں ثابت کر دوں گا اور آپ مان لیں گے کہ زمین میری ہے۔

سلطان۔ تم ہرگز ثابت نہیں کر سکتے۔

اختر۔ (زور سے) کیوں نہیں۔ آپ نے مجھے کوئی گنوار سمجھا ہے۔

سلطان۔ ارے گنوار کے لٹھ۔ چلاتے کیوں ہو۔ بات کرنے کا سلیقہ سیکھو۔ تھوڑا چلانے سے کسی چیز پر کسی کی ملکیت ثابت نہیں ہو سکتی۔ سوچو۔ تو ہم کوئی بھوکے ننگے ہیں کہ تمہاری زمین کو ہتھیا لیں۔ لیکن یہ بھی ممکن نہیں۔ کہ کسی کے شور و غل سے اپنی چیز چھوڑ بیٹھیں پھر اگر تم جھگڑا ہی اٹھانا چاہتے ہو۔ تو میں آج ہی گنپت بنئے کے ہاتھ اسے بیچے ڈالتا ہوں۔

اختر۔ میں یہ بات نہیں سمجھا۔ آپ کو پرائی چیز بیچ ڈالنا کا حق کیوں کر حاصل ہوا۔

سلطان۔ تم مجھ سے پوچھنے والے کون۔ شہر کے قاضی ہو یا کوتوال۔ مجھے اس کے بیچنے کا حق حاصل ہے یا نہیں۔ میں بیچوں گا۔ ضرور

بیچوں گا۔ تم سے روکا جائے تو روک لو۔

اختر۔ کیا آپ مجھے دودھ پیتا بچہ سمجھتے ہیں۔ یا میں پاگل ہوں۔ میاں بیوی دونوں پنجے جھاڑ کر پیچھے پڑ گئے۔ اچھا مذاق مقرر کیا۔ گھر میں بلا کر لوٹ لو۔ میں نے اب تک بہت لحاظ کیا ہے بس۔

سلطان۔ (غصہ میں لال ہو کر) لحاظ کیا معنی؟ میرے سامنے ایسی بدتمیزی کی باتیں کرتے شرم نہیں آتی۔

اختر۔ ارے غضب۔ قیامت آپ لوگ شریف ہیں؟ ایک تو میری زمین چھینے لیتے ہیں اوپر سے مجھے بدتمیز بنایا جاتا ہے۔ خاصے رہے۔ الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔ ہمسائے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ آپ ہمسایہ نہیں ٹھگ پکے ٹھگ ہیں۔

سلطان۔ (غضبناک ہو کر کیا بکا (کرسی پر سنبھل کر) اب کے تو کہہ ——

سعیدہ۔ (آنسو پونچھ کر) میاں میاں تم کس کے منھ لگتے ہو۔ میں ابھی ڈھور چرانے کو بھیج دیتی ہوں تم گنپت لالہ سے بات چیت کرو

اختر۔ (دل پر ہاتھ رکھ کر) دیکھیے۔ میں بہت ضبط کر رہا ہوں تو تو میں میں شرافت کے خلاف ہے ذرا کچہری کھل جائے۔ کل اتوار ہے پرسوں پیر کے دن آپ کو ثابت ہو جائے گا کہ زمین کس کی ہے؟

سلطان۔ عدالت سے ڈراتے ہو۔ عدالت تو میرے گھر کی ہے۔ جانتا ہے۔ میں کون ہوں۔ میونسپل کمشنر۔

اختر۔ آپ لاٹ صاحب سہی۔ سب معلوم ہو جائے گا۔

سلطان۔ تو میرے ساتھ مقدمہ بازی کر سکتا ہے۔ ذلیل کہیں کا۔ میں خوب جانتا ہوں تیرے باپ دادا پردادا سب مقدمہ باز تھے۔

اختر۔ آپ میرے خاندان کی توہین کرتے ہیں۔ میرے کنبہ کا کوئی آدمی کچہری کا کتا نہیں تھا۔ آپ کے چچا کی طرح ہمارے کٹم والوں میں سے کسی نے نہ کسی کا روپیہ غبن کیا نہ مدعی نہ مدعا علیہ کی حیثیت سے کبھی کچہری گئے۔

سلطان۔ مگر تمہارے والے جیسے چور تھے۔

سعیدہ۔ اور تیرا تو قبیلہ کا قبیلہ مشہور اٹھائی گیرا ہے۔

سلطان۔ تیرا دادا ڈاکوؤں کا سردار تھا اور تیرے دادا کا بھائی پرلے درجے کا شرابی۔ مرا بھی شراب خانہ میں۔

اختر۔ تمہاری نانی کبڑی تھی۔ جھگی جھگی گھروں میں مرغی کے انڈے چرائی پھرتی (دل پر ہاتھ رکھتا ہے) اور تمہاری ساس کم

خانوں میں تیل کی کچوریاں بیچا کرتی (چھاتی دبا کر) ارے رے رے مر گیا۔ دل میں درد اٹھ آیا۔ سر چکرانے لگا۔ ہائے ہائے کیا کروں۔ (خالی جگ (سو معاف) پٹک کر) کربلا ہو کربلا پانی بھی نہیں۔ اف۔

سعیدہ۔ توڑ ڈال موئے توڑ ڈال۔ تیرے باوا کا مال ہے نا۔

سلطان۔ تیرا باپ۔ جواری ڈھنڈاری۔ تیرا ماموں خونی بھنگڑ۔ چرسیا

سعیدہ۔ تیری خالہ سے بڑھ کر ہم نے کوئی اچھال چھکا عورت نہیں دیکھی۔ تیری دادی بازاروں میں جھاڑو دیا کرتی اور تیرا پھوپھا دیوالی کے دنوں میں "چھلا دے مورے تائین نا" گاتا پھرتا۔

اختر۔ تم قسائی ہو۔ میرا دل، جان نکلی۔ یا اللہ میں گرا۔ (دانت پیس کر) دغاباز عورت جاتی کہاں ہے۔ تیرا سر نہ منڈوا دوں تو میرا نام نہیں (سر پکڑ کر) پانی۔ پانی۔ اف اف تو شیطان ہے شیطان۔ اچھا کچھ پرواہ نہیں۔ میونسپل الیکشن کا زمانہ آنے دو۔ سلٹ لوں گا۔ ہاتھ نہ جڑوائے تو بات کیا (چھاتی پکڑ کر جھکتے ہوئے) اف۔ آنکھوں کے نیچے اندھیرا آنے لگا۔

سعیدہ۔ ارے اس نیلے کو نکالو۔ کہیں ہم پہ ہتیا نہ دے۔ جوانا مرگ نکل ہمارے گھر سے۔

سلطان۔ مرنا ہے تو اپنے گھر جا کر مر یا باہر سڑک پہ (اختر لڑکھڑاتا ہوا دروازے کی طرف جاتا ہے)

سعیدہ۔ یہ حرامی ہمارا کب کا بیری نکلا۔ اس کو سوجھی کیا۔ ہم سے کچہری عدالت کرے گا۔ موئے کی شامت آئی ہے۔

سلطان۔ اسی بدمعاش کی میاں وحید تعریف کرتے تھے۔ کس قدر شریر اور گستاخ ہے۔ ذرا دیدہ دلیری تو دیکھو اس رذالت پر شرافت کا دعویٰ؟ ہم سے درخواست کرنے آیا تھا۔

سعیدہ۔ درخواست کیسی؟

سلطان۔ تمہیں نہیں معلوم؟ لاحول ولا قوۃ میں نے تم سے نہیں کہا؟

سعیدہ۔ خدا سے ڈرو۔ مجھ سے کب کہا؟

سلطان۔ میاں ہمارے دامن میں چھپنا چاہتے ہیں۔ ریحانہ سے شادی کی درخواست کی تھی۔ اسی لئے تو حضرت تشریف لائے تھے۔

سعیدہ۔ کیا سچ ہے؟ وہ اس لئے آیا تھا تم نے کیوں نکل جانا؟

سلطان۔ بالکل سچ اس نے خود مجھ سے کہا۔ کیا کینچلی بدل کر آیا ہے اسی کو تو میں بیٹی دوں گا اس کی ایسی تیسی۔

سعیدہ۔ ارے ایسی کی تیسی کیا کر رہے ہو تم نے غضب کیا۔ بنی بنائی

بات بگڑ گئی۔ مجھ نگوڑی کے کان میں تو ڈال دیتے۔ اپنے ہاتھوں قسمت پھوڑ لی۔ ریحانہ کا اب کیا ہوگا۔ میں تو کسی دن دیکھ لینا کنوئیں میں ڈوب مروں گی۔ (آرام کرسی پر گر پڑی ہے اور چلا کر کہتی ہے) اسے لے آؤ۔ جاؤ۔ خدا کے لئے جلد جاؤ۔ میں مناؤں گی۔ نہیں تو جیسے یہ گیا ہے ایسے ہی ریحانہ بھی ایک روز چمپت ہے۔

سلطان۔ چلاتی کیوں ہو۔ گدی پیچھے عقل ہے نا۔ میں کس طرح لے آؤں۔ ذلیل بنوں اس کی نظروں میں۔

سعیدہ۔ چلاؤں نہیں؟ جو میں جانتی ہوں۔ تم نہیں جانتے۔ ناک کٹ جائیگی جس طرح بنے اسے لے آؤ۔ ابھی لے آؤ۔ قدم کیوں گڑ گئے؟ ہائے مجھے غش آیا!

سلطان۔ سبحان اللہ۔ عورتوں کو رونا اور غش کتنی جلدی آتا ہے! اچھا تم غش کو نہانے دو سنبھل کر بیٹھو میں اسے منائے لاتا ہوں (سلطان جاتا ہے)

سعیدہ۔ (پلو سے آنسو پونچھتی ہوئی) ہم نے کیسی غلطی کی۔ بات بڑہانی کیا ضرور تھی۔ زبان سے کہنے میں زمین اس کی تھوڑی ہو جاتی۔ وہ سارے گاؤں کو اپنا کہتا پھرے۔ اس سے کیا ہوتا ہے (ٹھنڈا سانس لیکر) شیطان نے اڑنگا مار دیا۔ اب اللہ کرے وہ آجائے۔ لڑکھڑا رہا تھا۔ بیمار ہے بچارہ۔ دور کب گیا ہوگا۔ (سلطان واپس آتا ہے) مل گیا منالیا؟ کچھ زیادہ تو نہیں بگڑا؟ کہاں چھوڑ آئے؟

سلطان۔ نیک بخت۔ دم تو لینے دے۔ (لمبا سانس لے کر) جاتا کہاں؟ اس میں جانے کا دم کہاں ہے؟ منانا کیسا؟ بگڑنے کے کیا معنی آرہا ہے۔ لیکن۔ اب تم جانو۔ تمہارا کام۔ میں کچھ نہیں بولوں گا۔

سعیدہ۔ تو اس کا بازو پکڑ کر ساتھ ہی کیوں نہ لے آئے۔ کہیں غریب گر نہ پڑے۔

سلطان۔ بازو پکڑ کر تم لے آؤ۔ منع کس نے کیا ہے؟ خدا کی پناہ۔ بچوں والی عورت میاں کو غلام سمجھنے لگتی ہے اور بکواس کتنی لگ جاتی ہے۔

سعیدہ۔ اور تم بات نہیں کر دگے؟

سلطان۔ تم نے خواہ مخواہ مجھے لڑوا دیا۔

سعیدہ۔ کیوں لڑے؟ اپنی خطا اور مجھ پر چھڈا۔ جیسے مجھے بلانے آئے تھے کہدیتے کوئی بات نہ نکلتی۔

سلطان۔ اچھا میرا قصور سہی۔ عورت میرا پیچھا چھوڑ۔

(اختر آہستہ آہستہ لڑکھڑاتا دونوں ہاتھ سے دل پکڑے جھومتا جھومتا آتا ہے)

اختر۔ (ٹوٹے ہوئے الفاظ میں) اللہ میاں۔ میں نے کیا گناہ کیا تھا۔ اف دل منہ ڈولا بنا ہوا ہے۔ آہ کتنی شدت کی ہوک اٹھتی ہے۔ اپنے گھر سے نکال کر اب کیوں بلایا۔ کیا مجھے ماریں گے؟ دیکھا جائیگا۔ مجھے بھی آج یہیں مرنا ہے۔

سعیدہ۔ (اٹھ کر لجاجت سے) اختر بیٹا۔ کیا تم ناراض ہوگئے۔ ہمیں معاف کر دو۔ ہم نے جلد بازی سے کام لیا۔ مجھے اب معلوم ہوا کہ وہ زمین واقعی تمہاری ہے۔

اختر۔ آہ۔ آہ۔ میرے دل کا درد۔ زمین میری ہے۔ آخر تم کو ماننا پڑا۔ اف۔ اف کیا کروں۔

سعیدہ۔ بے شک اس زمین کے تمہیں مالک ہو۔ کھڑے نہ رہو۔ پانی لاؤں؟ افسوس ہم غلطی پر تھے۔ ہم نے ناحق تم کو برا بھلا کہا۔

اختر۔ مگر میں تو اصول کی بات کر رہا تھا۔ مجھے زمین کی پرواہ نہیں اب ویسے مجھ سے مانگ لو۔ کوئی کافر ہو جو انکار کرے۔

سعیدہ۔ کیا شک ہے۔ تمہاری فیاضی کو کیا میں نہیں جانتی۔ لو چلو اب اس قصے کو چھوڑ دو۔ (پانی کا گلاس سامنے کر کے) پانی پیو۔

اختر۔ جناب میرے پاس ایک نہیں دس ثبوت موجود ہیں۔ میری پھوپی کی دادی نے آپ کے والد کے دادا کو...... ہائے ہائے (درد سے کراہنے لگتا ہے)

سعیدہ۔ میاں۔ کیوں شرمندہ کرتے ہو۔ بس ہو چکا۔ دادا دادی کو رہنے دو۔ علیحدہ منہ نہیں کھلتا۔ شادی کا ذکر کس طرح چھیڑوں؟

اختر۔ (گفتگو جاری رکھتے ہوئے) یہ زمین رعایتاً بلامعاوضہ دی (بہت زور سے) پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی اس پر اپنا قبضہ جما بیٹھے اور ہماری ملکیت ہی سے انکار کر دے۔ آہ۔ میری جان نکلی۔ میرا سر چکرایا۔ اف (اور وہ بے ہوش ہو کر گر پڑتا ہے)

سعیدہ۔ ارے دوڑنا۔ اختر کو یہ کیا ہوا؟ (اختر کو جھنجھوڑ کر) ہائے کم بختی۔ اختر۔ اختر۔ بیٹا۔ بولتے کیوں نہیں زمین تمہاری ہے یا اللہ رحم۔ (زور سے) ریحانہ۔ ریحانہ کے ابا۔ کہاں ہو۔ دوڑنا۔ سنتے نہیں؟

سلطان۔ (دوڑتے ہوئے آکر) کیا ہوا۔ خیر تو ہے (اختر کی طرف دیکھ کر) یہ تو بالکل بیہوش ہے کہیں مر تو نہیں گیا۔ حکیم پنجو کو بلاؤں یا ڈاکٹر للو کو (پکار کر) شرفو۔ ابے او مردود شرفو۔ نمک حرام لپک کر آ (شرفو آتا ہے) بھاگا ہوا جا۔ للو پنجو۔ جو ڈاکٹر حکیم مل جائے۔ بلالا۔ فوراً بلکہ فوراً سے بھی پہلے (شرفو باہر اپنی کوٹھری میں آکر حقہ پینے لگتا ہے۔ شور وغل سن کر ریحانہ آجاتی ہے)

ریحانہ۔ اماں جان۔ آپ چلا کیوں رہی ہیں۔ (سلطان سے مخاطب ہوکر)

ابا جان! یہ کون ہیں۔ انھیں کیا ہو گیا ہے؟

سلطان۔ بیٹی تم مردانے میں کیوں آگئیں۔ اندر جا کر بیٹھو۔

سعیدہ۔ کیسا پردہ؟ مجھے اس بچارے کی جان کے لالے ہیں۔ بنّو! طاق پر سے گلاب کی بوتل تو ذرا اٹھا لاؤ۔

ریحانہ۔ گلاب کی بوتل کیا کرو گی؟

سعیدہ۔ توبہ کسی کی ایسی کام چور اولاد نہ ہو۔ ہر وقت حجت ہر بات پر حجت اچھا میں خود جاتی ہوں (جاتی ہے اور گلاب کی بوتل لا کر اختر کے منھ پر چھینٹے دیتی ہے)

سلطان۔ اختر کے دشمنوں کو کچھ ہو گیا۔ تو ہماری ساری عزت خاک میں مل جائیگی۔ ایک چھینٹا اور دو۔

ریحانہ۔ یہ کچھ بیمار ہیں یا انھیں کوئی صدمہ پہنچا ہے۔

سعیدہ۔ اب تم کیوں میرے ہاتھ پاؤں پھلائے دیتی ہو۔

سلطان۔ آنکھیں کھولیں۔ کوئی پھریری آئی؟

سعیدہ۔ کسی طرح ہوش نہیں آتا۔ کیا ہو گا۔ شرفو بھی جا کر مر گیا کسی حکیم ڈاکٹر ہی کو لے آتا۔ ذرا نبض تو دیکھو۔

سلطان۔ (نبض پر ہاتھ رکھ کر) نبض تو چل رہی ہے گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔

ریحانہ۔ (قریب آکر) میں نے تو اب پہچانا یہ تو بختر خاں کے بیٹے اختر خاں ہیں۔ غش آنا تو ان کا فیشن ہے۔

سعیدہ۔ تم سے کون پوچھتا ہے۔ کیا فیشن دیشن لگایا ہے۔

سلطان۔ ذرا ہوا چھوڑو۔ ہاتھ کو حرکت ہوئی ہے۔ منٹ دو منٹ ہی میں غالباً ہوش آجائے گا۔

ریحانہ۔ آنکھوں کے ڈھیلے بھی پھرنے لگے ہیں۔ ابھی ناک بھی سکیڑی تھی۔

سلطان۔ (ہنسی کو ضبط کرکے) آپ تو نہ بولیں۔ واقعی ہوش آرہا ہے صندل کا شربت تیار رکھنا چاہیئے۔ ریحانہ بی بی شربت تو بنا لاؤ مگر پانی زیادہ سے زیادہ ٹھنڈا ہو۔

سعیدہ۔ یہ کس کام کی ہیں۔ فقط باتیں بنوا لو۔ میں خود بنا کر لاتی ہوں (جاتی ہے اختر آنکھیں کھولتا ہے ریحانہ پاس کھڑی غور سے دیکھ رہی ہے)

اختر۔ (اکھڑی آواز سے) اُفوہ۔ کتنا اندھیرا ہے۔ رات ہو گئی؟

ریحانہ۔ عینک لگا کر دیکھو۔

اختر۔ اف۔ سر چکرا رہا ہے۔

ریحانہ۔ سرکس میں سے کب آئے؟

اختر۔ میں کہاں ہوں؟

ریحانہ۔ پاگل خانہ میں!

اختر۔ (غور سے دیکھ کر) واقعی! اور آپ کون ہیں! میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے۔ میں آپ کو شاید جانتا ہوں۔

ریحانہ۔ (منھ پھیر کر) کلکتہ کے چڑیا گھر میں جب آپ بند تھے۔ میں ایک دفعہ وہاں گئی تھی۔ وہاں آپ نے مجھے دیکھا ہوگا۔

اختر۔ اچھا میں سمجھ گیا۔ ماشاء اللہ۔ ماشاء اللہ۔ ماشاء اللہ

(سعیدہ شربت لاتی ہے۔ سلطان بھی آجاتا ہے۔ ریحانہ اندر چلی جاتی ہے)

سلطان۔ اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے آج تو نے ہماری آبرو رکھ لی۔ مجھے تو ہنسی میں پھنسی کا ڈر تھا۔

سعیدہ۔ لو میاں یہ شربت پیو۔ میری تو اب جان میں جان آئی ہے۔

سلطان۔ پی لو بھئی۔ دیکھو۔ کیسا مزیدار ہے۔ اچھا اب طبیعت کیسی ہے۔

اختر۔ بہت اچھی۔ وہ کہاں ہیں؟ لاحول ولا قوۃ۔ ہاں آپ نے نہیں بتایا کہ مجھے ہوا کیا تھا؟

سعیدہ۔ تم کو۔ کچھ نہیں؟ کون کہتا ہے کہ تمہارے دشمنوں کو.......

اختر۔ (بات کاٹ کر) ہاں یاد آگیا۔ دھڑکن۔ دل میں درد!

سلطان۔ اب تو نہیں ہے؟

اختر۔ بالکل نہیں۔ ذرا۔ اسے کیا کہتے ہیں۔ اچھا۔ آپ فرمائیے۔

سعیدہ۔ تم نے تو ڈرا دیا تھا مگر خدا نے فضل کیا۔ (قریب آکر سر پر ہاتھ پھیرتی ہے) میرے لال۔ میرے چاند۔ اللہ تم کو ہمیشہ خوش رکھے۔ اور ہمیں بھی تمہاری خوشی دکھائے۔

سلطان۔ میرے عزیز۔ اب تم ہمارے بیٹے ہو۔ مختصر یہ کہ تمہاری درخواست منظور ہے۔ (افوہ۔ میرے سر سے کتنا بوجھ اتر گیا۔

اختر۔ میں آپ کا بے حد ممنون ہوں لیکن آپ لوگوں کو میری اصولی بات کا لحاظ ہے

سعیدہ۔ (مسکرا کر) اس زمین کا کون مالک ہے؟ تم یا میری ریحانہ اب ثابت کرنا بہت مشکل ہے۔

سلطان۔ کیا کہنے! پھر چلی۔ اختر میاں اب ان باتوں کو خانگی مذاق سمجھو۔

اختر۔ (ہنس کر) مگر چچا جان۔ آپ کو اور چچی اماں کو تسلیم کرنا ہوگا کہ زمین میری ہے اور کسی کی نہیں!

سلطان اور سعیدہ (یک زبان) ہاں بھیّا ہاں زمین تمہاری ہے تمہاری ہے تمہاری ہے۔

(سب ہنستے ہیں اور پردہ گرتا ہے)

شیخ عبد اللطیف تپش

زندگی

ٹک ٹک کی آواز کے ساتھ ہی ساتھ اس کے دل کی لرزشیں بھی تیز ہوتی جا رہی تھیں۔ اس نے سوچا ایک گھنٹہ اور باقی ہے۔ اس کے بعد وہ آزاد ہو گا' اس کرسی سے جس پر وہ گیارہ بجے سے بیٹھا ہے۔ اس میز، رجسٹروں اور فائلوں سے' جن میں وہ دفن ہے' ان پژمردہ صورتوں سے جنھیں وہ دو برس سے برابر دیکھ رہا ہے۔ ان دو برس میں اس نے صرف رجسٹروں کی تبدیلیاں دیکھی تھیں۔ اور ہاں! ایک نوکر جو ایک ایسے نوکر کی جگہ جس کا مہینے سے انتقال ہو چکا تھا' کام کرنے رکھا گیا۔ بس یہی زندگی تھی —— بوڑھے ہیڈ کلرک کو دیکھ کر وہ یہ سوچا کرتا تھا کہ بہت جلد اس کرسی پر کوئی نئی صورت رونق افروز ہو گی اور شاید اسی دن اسے بھی کوئی دوسری کرسی بیٹھنے کے لئے ملے۔ مگر یہ روز سعید آتے آتے ایک سال کے لئے ٹل گیا' کیونکہ ہیڈ کلرک کی خدمات میں ایک سال کی توسیع کر دی گئی تھی۔

اگر انسان محنت کرنے کے لئے پیدا کیا گیا تو زندگی انعام ہوتا تھا محنت کا۔ مگر ہماری دنیا کا تو دستور ہی نرالا ہے۔ یہاں جو سب سے زیادہ محنت کرتے ہیں وہی فاقہ کرتے ہیں۔ جانوروں کی طرح زندگی بسر کرتے ہیں۔ اگر زندہ رہنے کے لئے پانچ گھنٹے کسی کرسی سے چپکے رہنا' اس لئے ضروری ہو کہ انسان زندگی کی دوسری فکروں سے آزاد ہو جائے' تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ اس مصیبت کو ہنستے کھیلتے نہ سہہ جائے۔ مگر "اس" کی زندگی کے ساتھ اور بہت سی مصیبتیں چمٹی ہوئی تھیں۔ آفس کی کرسی سے تو اسے پانچ بجے چھٹکارہ مل جاتا تھا مگر وہ تفکرات جو اس کی زندگی کا جزو ہوتے جا رہے تھے' اس کا پیچھا نہ چھوڑتے تھے۔

دو سال پہلے اس کی زندگی کتنی خوشگوار تھی۔ یہ دو سال اس کے حال اور ماضی میں خلیج بن کر حائل ہو گئے اور یہ خلیج روز بروز وسیع ہوتی جا رہی تھی۔ وہ اپنے کو کھویا ہوا سا پاتا۔ کبھی اسے خیال ہوتا کہ وہ منزل سے بھٹک گیا ہے۔ اور کبھی وہ محسوس کرتا کہ اس میں کوئی ایسی بنیادی تبدیلی ہو چکی ہے کہ وہ اب "وہ" نہیں رہا۔

دو سال پہلے وہ کالج کا خوش باش' خوش مزاج' ہر دل عزیز طالب علم تھا۔ اگر کھیل کے میدان میں وہ سب کا ہیرو ہوتا تو یونین میں سب کی نگاہوں کا مرکز۔ اگر وہ سوسائٹی کی جان تھا تو اساتذہ بھی اسے عزت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ مگر دو سال میں اس کی زندگی پر سینکڑوں انقلابات گذر گئے۔ باپ کے انتقال کے بعد اس نے نوکری کر لی —— والدہ کی زبردستی سے اس کی شادی بھی ہو گئی۔

شادی بھی والدین کی ایک اہم ذمہ داری ہے۔ بچے کی پیدائش کے بعد سے والدین کے فرائض شروع ہوتے ہیں اور شادی کے بعد ختم ہو جاتے ہیں۔ چند سال پہلے بچے کے جوان ہوتے ہی والدین اپنے فرض کی سبکدوشی کے لئے تڑپنے لگتے تھے۔ مگر اب زمانہ بدل گیا ہے۔ اس مہاجنی دور میں جہاں سونے کا معیار دنیا کے تمام معیاروں پر حاوی ہو چکا ہے۔ شادی بھی ایک تجارت ہے لڑکا اور لڑکی کی اقتصادی ساکھ پر ان کی قیمت کا دارومدار ہے۔ اسی سال کا بھاؤ بازار میں زیادہ پڑتا ہے۔ جس کی اقتصادی قدر مستحکم اور دیرپا ہو۔ اولاد کے برسر روزگار ہوتے ہی اس کی بازار میں ساکھ بیٹھ جاتی ہے' اب والدین کو زیادہ سے زیادہ منافع اٹھانے کی فکر ہوتی ہے۔ فرض کی سبکدوشی کا احساس انھیں اس قدر مسرور کر دیتا ہے کہ وہ بھول جاتے ہیں کہ ان کی اس حرکت سے اولاد کی زندگی پر کیا اثر پڑے گا۔ آخر انھیں اس قدر دور اندیشی سے کام لینے کی ضرورت؟ وہ تو اپنے فرض سے آزاد ہو جاتے ہیں۔

اس کی بھی شادی ہو گئی۔ وہ کالج کے ایک آزاد بے فکر طالب علم سے ایک دنیادار آدمی بن گیا اور دنیاداری کی تمام زحمتیں آہستہ آہستہ اس کے قریب آنے لگیں۔ یہاں تک کہ وہ اس کی ہستی میں سما گئیں —— زمانے کے بیرحم ہاتھوں نے گلشن کے ایک نو شگفتہ پھول کو توڑا اور اسے آہستہ آہستہ ملنا شروع کر دیا۔

ابتدا میں اسے ان تبدیلیوں کا خفیف سا احساس ہوا۔ کیونکہ کالج کی بے فکری اب تک اس کے دماغ پر مستولی تھی ایک حسین بیوی کو پا کر وہ اپنے آپ کو بھی بھول گیا۔ مگر زمانہ کی گردش انبساط کی گھڑیوں کو کچلنے میں بڑی فیاض ہے۔ مسرت کے لمحات اس دنیا کے بسنے والوں کے مقدر میں' ویسے ہی کم ہیں۔ مگر جب بھی وہ میسر آتے ہیں تو انسان ان سے اس طرح چمٹ جاتا ہے جیسے پہاڑ سے گرتا ہوا آدمی کسی چٹان سے' ان سے علیحدہ ہونا گوارا نہیں کرتا۔ ان لمحات میں وہ اپنے آپ کو بھی فراموش کر دیتا ہے۔ مگر زمانہ کی تیز رفتار بے نیاز گردش' ان مسرت آگین لمحات کو انسانی آغوش سے چھین کر' اپنے سینے سے چمٹا لیتی ہے۔ اور مستقبل کی منزلوں میں تیزی سے گم ہوتی چلی جاتی ہے۔ بے بس' کمزور' بزدل انسان زمانہ کی گرد کارواں کو دیکھتا رہ جاتا ہے —— وہ زمانہ کے ساتھ نہیں دوڑتا۔ وہ ان چیزوں کو حاصل کرنا نہیں چاہتا' جو اس سے چھین لی گئی ہیں۔ وہ

زمانے کی متلاطم موجوں سے بیکار نہیں کرتا، بلکہ تنکے کی طرح بہنے لگتا ہے۔

شروع شروع میں ساس بہو پر جان دیتی رہی۔ وہ بہو کو خدمت کرانے کے لئے نہیں لائی تھی۔ بہو کے خوبصورت ہاتھ گھر کے کام سے میلے نہ ہو جاتے۔ بہو کو گھر کی رانی کی طرح بٹھا دیا گیا۔ وہ یہ دیکھ کر خوش ہوتی تھی کہ بیٹے اور بہو میں محبت دن بدن بڑھتی جا رہی ہے۔ مگر آہستہ آہستہ اس کی حالت بدلنے لگی۔ اب اُسے بہو کا رانی بنے بیٹھے رہنا، ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ بہو ہر دم اپنے میاں سے لگی بیٹھی رہے، طعنے تشنے کی بوچھار شروع ہو گئی۔ بات بات پر ٹوکا جانے لگا۔ بہو کے ساتھ ساتھ لڑکے کو بھی سیکڑوں باتیں سنائی جاتیں۔ ہر آنے جانے والے اور پڑوسیوں سے ان کی شکایتیں ہوتیں۔ ایک دن اس نے اپنے بھائی سے بھی کہہ دیا۔ "یہ دونوں تو مجھے دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر پھینک دینا چاہتے ہیں ــ وہ تو بالکل بیوی کا غلام ہو گیا ہے۔ مجھ سے سیدھے منہ بات بھی نہیں کرتا، ہمیشہ دونوں کمرے میں گھسے کھسر پھسر کرتے رہتے ہیں۔ مجھے تو گھر کی باندی سمجھا جاتا ہے" وغیرہ وغیرہ ــ اس کے ماموں اس پر بہت گرم ہوئے بہت ڈانٹا مگر وہ کیا جواب دیتا۔ یہ معمہ تو اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ اس کے آفس سے آنے کے بعد، ماں اکثر شکایتیں کرتی تھیں۔ اور جب وہ بیوی سے دریافت کرتا، تو وہاں آنسو کی جھڑی بندھ جاتی۔ وہ کہتی "میں تو ان کی خادمہ ہوں۔ میں ہر طرح ان کو خوش رکھنا چاہتی ہوں۔ مگر وہ تو مجھے پاس پھٹکنے نہیں دیتیں۔ اگر میں ان کا کوئی کام کر دوں تو الٹا مجھے ہی ڈانٹا جاتا ہے کیا تیرے ہاتھ ٹوٹ گئے ہیں۔ میں اپنا کام خود کر لیا کروں گی۔ یہ جو چلے تو ان سے کیا کہ جنہوں نے تجھے رانی بنا کر رکھا ہے"۔

وہ سخت پریشان تھا۔ اس گتھی کا سلجھانا اسکے بس کی بات نہ تھی۔ آفس سے تھکا ماندہ گھر آتا تو یہاں بھی اسے چین نصیب نہ ہوتا ــــ اس غریب کو کیا معلوم تھا کہ اس کی ماں اس کی بیوی کی "رقیب" ہے اگر یہ سچ ہے کہ محبت کی فطرت شرکت گوارہ نہیں کرتی، تو اس کی ماں کیونکر پسند کرتی کہ ایک سر جو اب تک اس کی آغوش میں جُھلا کرتا تھا، کسی اور کے آستان جمال پر خم ہو جائے۔ ایک دل جو اب تک اپنی دھڑکنوں کا، اپنے دکھ درد کا مداوا اس سے چاہتا تھا۔ کسی اور لبوں کی ہلکی جنبشوں کا شرمندۂ احساس ہو جائے۔ وہ کان جو اب تک صرف اس کی پیار و محبت کی باتوں کے لئے وقف تھے کسی اور راگنی کے دلکش نغمے کے مرہون منت ہو جائیں ــــ وہ محبت جس کی وہ اب تک تنہا مالک تھی، اب کوئی اور اس کا حصہ دار ہو جائے۔

اس کا دماغ ان باتوں کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ یہ طوائف الملوکی آخر رنگ لائی۔ اس کی بیوی اکثر بیمار رہنے لگی۔ اب آفس کے بعد اس کا زیادہ وقت ڈاکٹروں اور حکیموں کے پاس گذرنے لگا۔ مگر ان مصیبتوں میں افاقہ نہ ہوا۔ بلکہ خدا نے آزمائش کے لئے اسے ایک بیمار بچی کا باپ ہو گئیں۔ اس کے اخراجات بہت بڑھ گئے اور اکثر پر گذارہ کرنا پڑتا۔ مگر اس کی تنخواہ میں کوئی ترقی نہ ہوئی۔ اور اور آمدنی بدستور رہی۔

٭٭٭

پانچ بجنے کے بعد وہ کرسی سے اٹھا اور آہستہ آہستہ گھر کی طرف چلنے لگا۔ کالج کے بہترین کھلاڑی کی چال سے ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے وہ بیمار ہو۔ ہاں! وہ مریض تھا، ایک زبردست مرض اسے لاحق تھا۔ ہندوستان کے اکثر نوجوانوں کو اس مرض سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

گھر میں بیوی اور بیٹی بیمار پڑے تھے۔ ڈاکٹر کہہ چکا تھا کہ بیوی کو دق ہو چکی ہے۔ سینٹوریم لے جاؤ۔ مگر وہ تو صرف چالیس روپیہ کماتا تھا سینٹوریم کا خواب دیکھنا بھی اس کے لئے مشکل تھا۔

سر لٹکائے آہستہ آہستہ وہ سڑک پر چل رہا تھا، وہ سوچ رہا تھا کہ پہلے حکیم کے پاس جائے یا مکان؟ لیکن پہلے گھر کی خبر لینی ضروری ہے۔ خدا معلوم گھر کا کیا حال ہو۔ خدا جانے وہ کیا الفاظ ہوں گے جو اسے مکان میں داخل ہوتے پر سنائی دیں گے؟

اس کے قریب سے اور بہت سے بابو لوگ گذر رہے تھے۔ خاموش گردن لٹکائے، جیسے مویشی چراگاہوں سے واپس ہو رہے ہوں۔ اس نے سوچا کہ ان کے ہاں بھی کوئی بیمار ہوگا۔ مگر ایک بہت ہی عجیب خیال اس کے دماغ میں آیا اس نے محسوس کیا کہ وہ ایک مریض ہے۔ یہ سڑک پر چلنے والے تمام لوگ مریض ہیں۔ سارا ہندوستان مریض ہے۔ ایک ایسا مریض جو نزع کی حالت میں ہو۔ اور "ہوں" اور "ہاں" بھی نہ کر سکتا ہو۔ یہ سب ایک خطرناک مرض میں مبتلا ہیں۔ مگر وہ اس مرض کو مرض ہی نہیں سمجھتے۔ وہ جونکیں ان کا خون چوس رہی ہیں ان کی ہستی کا جزو ہو چکی ہے وہ اسے علیحدہ کرنا نہیں چاہتے۔ شاید انہیں اس سے عشق ہو چکا ہے۔

چند لڑکیاں، ٹینس کے ریکٹ لئے، سائیکل پر سامنے سے گذریں۔ ان کے شاداب چہروں، رنگین ساڑیوں اور ان لپٹوں نے جو ان کے جسم سے نکل کر فضا کو چند لمحوں کے لئے معطر کر دیتی ہیں، اس کے دماغ کو بھی کچھ دیر کے لئے مفلوج کر دیا۔ کالج کی زندگی اس کے سامنے تھی۔ وہ بھی لڑکیوں کے ساتھ ٹینس کھیل چکا تھا۔ اس کی آنکھیں بھی نگاہوں میں باتیں کرنے کے طور طریق سے واقف تھیں۔ اس نے سوچا۔ یہی زمانہ ہے۔ فریب دینے اور فریب کھانے کا۔ خوب فریب کھاؤ۔ یہ جاننے کی کوشش نہ کرو کہ تمہارے آنچل میں سیکڑوں بجلیاں رقص کر رہی ہیں، تمہارے بل کھائے ہوئے، پریشان گیسوؤں میں سیکڑوں ناگنیں لہرا رہی ہیں

...اپنے چہرے کو رنگین بناؤ! - اپنے حسن و شباب
...لی آنکھوں کو اس قدر خیرہ کر دو کہ وہ اپنے مستقبل
...ہو جائیں - اپنے ناز و ادا کی کرشمہ سازیوں سے ان کی
...قدر معطل کر دو کہ وہ زندگی کی حقیقتوں پر غور کرنا چھوڑ دیں۔

سامنے سے اس کا ایک پرانا دوست رمیش گذر رہا تھا - وہ انجان بن گیا - منھ دوسری طرف پھیر لیا - وہ رمیش سے ملنا نہیں چاہتا تھا - انسان پر ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب وہ غیروں سے تو کیا، اپنے آپ سے شرمانے لگتا ہے - لیکن رمیش نے اسے دیکھ لیا - وہ اس سے لپٹ گیا - پہلا سوال اس کی صحت کے متعلق تھا - پھر دوستوں سے نہ ملنے کا شکوہ سوسائٹی کی مجلسوں میں شریک نہ ہونے کی شکایت۔

اس نے اپنی پریشانیوں کا، بیوی اور بچی کی بیماری کا ذکر کیا۔

رمیش کہنے لگا —— "کس عقل مند نے تمہیں شادی کرنے کی رائے دی تھی - ہمارے نوجوان تو شادی کے نام سے - گویا کھِل جاتے ہیں - ان کے تصور میں حسین، معصوم، سمٹی سمٹائی لڑکی گھومنے لگتی ہے، ایک کھلونا — جس سے وہ اپنی خلوتوں میں اپنی مرضی کے مطابق خوب جی بھر کر کھیل سکیں۔ یہ حسین تصور ان کی قوتِ امتیاز کو بھی سلب کر دیتا ہے، وہ اپنے مستقبل پر قطعی غور نہیں کرتے، وہ نہیں سمجھتے کہ شادی کے بعد انسان کی اقتصادی مشکلات دوگنی ہو جاتی ہیں۔" وہ مسکرا کر کہنے لگا - "اور اگر نفسِ خدا شریکِ حال ہوا تو ان مشکلات میں بتدریج اضافہ ہونے لگتا ہے —— شادی کر کے انسان اپنی قبر کھود لیتا ہے - اور میرا تو یہ خیال ہے کہ اگر دنیا میں تم کچھ اور نہیں کرنا چاہتے تو شادی کر لو —— آج اپنی سوسائٹی کی میٹنگ ہے - تم ضرور آنا - موضوعِ جنگ پر بحث ہو گی۔"

وہ سڑک سے گذر رہا تھا - اس کے دماغ میں اس کے دوست کے کہے ہوئے الفاظ گھوم رہے تھے "اگر دنیا میں کچھ اور نہیں کرنا چاہتے تو شادی کر لو۔" کیا شادی ہماری ترقی میں حائل ہے؟ —— کیا شادی کے بعد انسان کچھ نہیں کر سکتا —— شادی کے بعد وہ گرتا ہی گیا - اس کی گذشتہ زندگی کا نقشہ اس کے سامنے تھا —— اس نے اپنے دوستوں کی زندگی پر غور کیا - بہت سوں کی یہی حالت تھی - ہاں کچھ خوش قسمت ایسے بھی تھے جو اطمینان کی زندگی بسر کر رہے تھے - مگر ان کی مالی حیثیت ایسی تھی کہ اقتصادی مشکلات ان کے پاس نہ پھٹکی تھیں - اگر بیوی کو دق ہو جائے تو سینٹوریم اپنا آغوش ان کے لئے وا کر دیتے تھے —— اس نے محسوس کیا کہ وہ ایک مریض ہے - سارا ہندوستان مریض ہے - ایک جونک ان کی ہستی کی رنگینیوں کو اس طرح چوس رہی ہے، جس طرح غنچوں کی رعنائیوں کو کرم چاٹ جاتے ہیں - ہم اپنی معاشی

زندگی کی دلچسپیوں سے اس وقت تک لطف اندوز نہیں ہو سکتے، جب تک کہ ہم اس کیڑے سے آزاد نہ ہو جائیں جس نے ہماری زندگی کو بے کیف بنا رکھا ہے۔

وہ تھکا ماندہ آہستہ آہستہ مکان میں داخل ہوا - یہاں اور ہی عالم تھا - ماں برس پڑی "کب سے تمہارا انتظار ہو رہا ہے - تمہیں گھر کی تو گویا کوئی پرواہی نہیں — چاہے کوئی مرے چاہے جئے - جانے تمہاری بلا — لڑکی کی دو بجے سے بری حالت ہے - جاؤ جلدی حکیم صاحب کو لے آؤ۔" اس نے لڑکی کی طرف دیکھا - اسے یقین ہو گیا کہ حکیم صاحب کو لانا بیکار ہے - ان کے لانے کے بجائے اسے کچھ اور انتظام کرنا چاہیئے - مگر حکیم صاحب کو لانا ضروری تھا - ماں کے حکم کو وہ کیسے ٹالتا؟ -

حکیم صاحب مطب پر نہیں ملے - ان کے دوستوں کے گھروں پر تلاش کرنے سے قریب ڈیڑھ گھنٹہ بعد ان سے ملاقات ہوئی - بڑی مشکلوں سے ساتھ چلنے پر راضی ہوئے - اور یہ بھی ظاہر کر دیا کہ وہ اس پر بڑا احسان کر رہے ہیں —— لڑکی کی حالت دیکھ کر ناامیدی ظاہر کر دی - بیوی کے لئے چند نئے شربت اور نیا نسخہ تجویز کیا - اسے دوائیاں لانے پھر حکیم صاحب کے ساتھ جانا پڑا۔

قریب ساڑھے نو بجے، جیب میں دوائیوں کی پڑیاں بھرے، ہاتھ میں شربت کی شیشیاں لئے، وہ مکان واپس ہو رہا تھا - اس کا پڑوسی جو منھ میں بیڑی لگائے چہل قدمی کر رہا تھا، اسے دیکھ کر کہنے لگا —— ارے بابو جی آج بڑی رات تک باہر رہے اور سنا آپ نے! - آپ کے دوست اختر صاحب کی بھی شادی ہونے والی ہے - شاید اگلے ماہ میں - اب وہ بھی کیوں گھر سے باہر نکلیں گے؟"

اس نے محسوس کیا، جیسے کسی نے اس کے سینے پر گھونسا مار دیا۔
"کیا اختر کی شادی ہو رہی ہے؟ —— اختر کی!" اس نے تیزی سے دریافت کیا اور بغیر جواب کا انتظار کئے وہ اختر کے مکان کی طرف جانے لگا۔

اختر ابھی سینما دیکھ کر آیا تھا - کپڑے تبدیل کرتے ہوئے وہ آہستہ آہستہ گنگنا رہا تھا "من دھیرے دھیرے رونا" —— اس نے اختر کو آواز دی۔ اختر اسے غیر متوقع طور پر اور اس سراسیمہ حالت میں دیکھ کر کچھ گھبرا سا گیا - اس نے ایک دم کہنا شروع کیا۔

"سنا تمہاری شادی ہو رہی ہے؟ - اگلے ماہ میں —— شادی کر کے انسان اپنی قبر کھود لیتا ہے - جسے دنیا میں کچھ اور نہ کرنا ہو وہ شادی کرے۔ دیکھو! شادی کر کے میں نے کیا پایا - میری زندگی دواخانوں کے لئے وقف ہو چکی ہے - میں کئی لوگوں کا قرض دار ہوں - میری بچی مر رہی ہے — میری بیوی چند دنوں کی مہمان ہے —— یہ دیکھو! —— یہ دوائیں اب بھی میرے ہاتھ

یس ہیں ـــــ یہی میری زندگی ہے ـــــ ایک دن شاید مجھے ان ہی دوائیوں میں ڈوب جانا ہوگا ـــــ اچھا میں جاتا ہوں ـــــ میری بچی مر رہی ہے۔"

اور وہ اختر کو حیرت زدہ چھوڑ کر تیزی سے گھر کی طرف چلا۔

اس کا چہرہ چمک رہا تھا۔ جیسے برسات کا کالے بادل چھٹ جائیں اور سورج نکل آئے ـــــ تاریکی اور خاموشی ہر طرف چھا چکی تھی۔ اور وہ تاریکی اور خاموشی پر چھاتا جا رہا تھا۔ اس کی روح پھیلتی گئی۔ اور ساری تاریکی اور خاموشی پر مسلط ہو گئی۔ وہ چھا گیا تاریکی اور خاموشی پر ـــــ اس نے محسوس کیا کہ وہ اس دنیا سے بہت دور ہے ـــــ بہت دور ـــــ اس دنیا سے جہاں تاریکی ہی تاریکی ہے ـــــ خاموشی ہی خاموشی ـــــ مگر طائر تخیل کے دست و پانے جواب دیدیا۔ وہ تیزی سے گرنے لگا ـــــ تاریکی ہی تاریکی میں ـــــ خاموشی ہی خاموشی میں ـــــ چہرے کی چمک غائب ہو گئی۔ حزن و ملال کے بادل پھر چھانے لگے۔ چال میں تیزی باقی نہ رہی۔ ایک سایہ سڑک پر بسطح حرکت کر رہا تھا۔ جیسے کوئی روح گشت کر رہی ہو ـــــ جب سائیں سائیں کرتی ہوئی ـــــ آہیں بھرتی ہوئی ہوائیں اسے چھوتی ہوئی گذرتیں تو اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے ساری کائنات کوئی دکھیا ہے جو دھیمے سُروں میں آہستہ آہستہ گا رہی ہے ـــــ 'من دھیرے دھیرے رونا'۔

ریاض رؤفی

آپ کے پڑھنے کے لایق کتابیں

جُرعاتِ میکش

بادۂ اہل ہوس میں نہ یقین ہے نہ حضور
فکرِ اربابِ خرد میں ہے نہ مستی نہ سرور
کس کو سمجھاؤں ترے عشق کی دولت کیا ہے
مستی و کیفِ ابد مایۂ ایمان و حضور

تجھ سے بھی دل کو زیادہ ہے تری یاد عزیز
دیکھ آ کر مری ناکامیٔ الفت کا سرور
بے نیازی غم الفت کی دکھاؤں تجھ کو
کہہ رہا ہے ترا جلوہ ابھی افسانۂ طور
اور اک راگ غمِ دل کا سناؤں تجھ کو
گو بجتا ہے تری نظروں میں ابھی سازِ غرور
میرا معبود ہے گو تیرا تکبر بھی مگر
نہ خدا تجھ کو دکھائے کبھی الفت کا غرور
کرکے اپنے سے الگ میں تجھے دیکھوں بھی تو کیا
نور ہے گرچہ تو لیکن ہے مری آنکھ کا نور
گرمیٔ سوزِ محبت کے سوا کچھ بھی نہیں
بند کروں جو میں آنکھیں تو تجلی ہے نہ طور

جہت و فاصلہ سب گم ہیں رہِ الفت میں
کیا بتائے ترا طالب تجھے نزدیک کہ دور
دو جہاں میں لئے پھرتا ہے مرا ذوقِ حیات
آخرت ہے نہ ہے دنیا نہ خفا ہے نہ ظہور
کچھ نہیں تیرے سوا یہ ترا میکش لیکن
پھر بھی کچھ فاصلہ لازم ہے محبت میں ضرور

میکش اکبر آبادی

سوچ بچار کے طریق

انسان نے سائنس میں جس قدر ترقی کی ہے اس کا اندازہ خود اس کے لئے مشکل ہے۔ لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ انسان اپنے بارے میں بہت کم جانتا ہے اور اس سلسلہ میں صدیاں گزر جانے پر بھی اس نے بہت کم ترقی کی ہے۔ ہمارا جینا، انفرادی یا اجتماعی تعلقات، سماجی برتاؤ اور اس کے طور طریقے، دماغی سکون، یہ کس قدر اہم مسائل ہیں مگر ان کے متعلق ہمارا علم کتنا محدود ہے۔ فلکیات، طبیعات، علم کیمیا اور اسی قسم کے دوسرے علوم کے بارے میں ارسطو نے جو نظریات پیش کئے تھے وہ آج سارے کے سارے تبدیل ہو چکے ہیں۔ جدید تحقیقات کی روشنی میں ان کی کوئی حقیقت نہیں رہی۔ لیکن اس کے سیاسی اور اخلاقی افکار ابھی تک جوں کے توں ہیں اور انھیں اس وقت تک مسلمات ہی مانا جاتا ہے — اس کے دو ہی مطلب ہیں، یا تو ارسطو کی نظر اتنی دور بین تھی کہ اس نے انسانی ترقی کے ارتقائی منازل کو بھی دیکھ لیا تھا۔ اور اخلاق اور سیاست کے متعلق اس کے نظریے قطعی اور آخری تھے۔ یا یہ کہ انسان کا اپنی ذات کے متعلق علم دو ہزار سال گزر جانے کے باوجود کوئی نمایاں ترقی نہیں کر سکا۔ اور اس سلسلہ میں ہنوز روز اول ہی ہے — صحیح دوسری صورت ہی ہے۔

یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اس موضوع پر آج تک کسی نے فکر نہیں کیا۔ بلکہ جہاں تک انسانی فکر کا تعلق ہے شعراء نے آدمی کے دل کی گہرائیوں میں جھانکا ہے۔ وہ بنی نوع انسان کا دل بن کر اس کے حقائق بیان کرتے رہے ہیں جہاں ان کے مشاہدات وسیع ہیں وہاں درست بھی ہیں۔ زمانہ حال میں ہمارے افسانہ نویسوں نے انسانی دماغ کو سمجھنے اور اس کی ذہنی حالت کو دریافت کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ان دونوں قسم کے فن کاروں نے انسانی دماغ کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور اس کی کیفیات اور جذبات کو صفحہ قرطاس پر لا رکھا ہے۔

فلاسفروں نے بھی انسانی افکار کا جائزہ لیتے ہوئے چند نظریات پیش کئے ہیں۔ لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ایسے نظریات میں اصل روح کی بجائے فلسفیانہ موشگافیاں زیادہ ہیں۔ سوچ بچار کس طرح پیدا ہوتی ہے اور کس طرح عمل پیرا ہوتی ہے، یہ تھا اصل موضوع، لیکن فلاسفروں نے اس کو تو چھوڑ دیا اور لگے ذہن (mind) کے متعلق فلسفہ چھانٹنے۔ انھوں نے ذہن کو بالکل ایک الگ چیز جان کر اس پر خیال آرائی کی ہے۔ حالانکہ ہم ذہن کو سوچ بچار سے علیحدہ نہیں کر سکتے، بھلا جسمانی عمل، حیوانی جبلتیں، زمانہ جاہلیت کی روایات، بچپن کے تاثرات، قدامت پسندی کا ردعمل اور روایاتی علم، ان سب سے ذہن کو کیسے علیحدہ کیا جا سکتا ہے۔ انھیں کے افعال کا نتیجہ فکر ہوتا ہے، یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ ہم اس چیز کو لے لیں جو فکر کا آلہ ہے مگر ان سارے حالات کو نظر انداز کر دیں جنھوں نے اس آلہ کو حرکت دی ہے۔ کانٹ نے اپنی عظیم الشان تصنیف کا نام (A Critique of Pure Reason) عقل محض پر ایک تبصرہ" رکھا ہے مگر زمانہ حال کے طالب علم کے لئے جو ذہن کا مطالعہ کر رہا ہو "عقل محض" کی حقیقت اسطوری ہے۔

فلاسفروں کا خیال ہے کہ ذہن کا تعلق مطلقاً شعوری فکر (Concions Thought) کے ساتھ ہے۔ ذہن کا ہی کام ہے کہ وہ کسی بات کے متعلق سوچے، اسے یاد رکھے، اس پر فیصلہ دے، استدلال کرے، اسے سمجھے، اپنی مرضی کا اظہار کرے یا اس سے کوئی نتیجہ نکالے۔ لیکن اب نئی تحقیقات نے ہمیں بتایا ہے کہ ہم جن باتوں کو سوچتے اور یاد رکھتے ہیں یا ان کے متعلق اپنی مرضی کا اظہار کرتے یا ان سے کوئی نتیجہ نکالتے ہیں، ان کے اکثر حصہ سے بے خبر ہوتے ہیں، فکر اور سوچ بچار کا کثیر حصہ جس سے ہم اپنے تئیں باخبر خیال کرتے ہیں وہ لاشعور سے پیدا ہوتا ہے۔ تجربات اور مشاہدات نے ثابت کر دیا ہے کہ ہماری نفسیاتی زندگی میں ہمارے شعور سے زیادہ لاشعور کا حصہ ہے۔

قدیم زمانہ سے جسم اور دماغ کا تعلق چلا آتا ہے۔ دماغ کو سمجھنے کے لئے جسم کا وجود ضروری ہے۔ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ ہر فکر کا ردعمل جسم میں رونما ہوتا ہے اور ہر جسمانی تغیر کا اثر ہمارے دماغ پر پڑتا ہے۔ ذرا سی بدہضمی آپ کے خیالات اور دماغ میں ایک ہیجان پیدا کر دیتی ہے اور کسی اعلیٰ قسم کے عطر کی تھوڑی سی خوشبو آپ کے دماغ کو معطر کر دے گی جس کا نتیجہ فکر کی بلند پروازی ہوگا۔ بالکل اسی طرح کسی کا ایک لفظ آپ پر بری سے بری کیفیت طاری کر سکتا ہے۔ چنانچہ آج کل جس قدر لٹریچر پیدا ہو رہا ہے وہ ہمارے جسمانی افراز (Secretion) اور عضلاتی تناؤ (Muscular Tension) کا ہمارے جذبات اور فکر سے جو تعلق ہے اس کا ایک مطالعہ ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے بعض مخفی ہیجانات، خواہشات اور آرزوئیں ایسی ہوتی ہیں جن کو معلوم کرنے کے لئے خود ہمیں کافی دقت ہوتی ہے۔ یہی مخفی تاثرات

ہمارے شعوری فکر پر بری طرح اثر انداز ہوتے ہیں۔ ان لاشعوری اثرات میں سے اکثر کی ابتدا ہمارے بچپن سے ہی ہوتی ہے۔ پرانے فلاسفروں کو شاید بھول گیا تھا کہ ان کے دماغ نے جب ماحول سے اثرات لئے اس وقت وہ بھی کم عمر بچے تھے اور عمر بھر وہ ان ابتدائی تاثرات سے نہ بچ سکے۔

لاشعور —— یہ لفظ اب اتنا مانوس ہو گیا ہے کہ اس کی مزید تشریح کرنے کی ضرورت نہیں رہی۔ عام لکھا پڑھا آدمی بھی اس لفظ سے کسی نہ کسی تحریر میں دوچار ہوتا رہتا ہے، اس کی تعریف یوں کر دینی کافی ہے کہ یہ جامع لفظ اپنے اندر سب عضویاتی تبدیلیوں کے مفہوم کو لئے ہوئے ہے جو ہماری توجہ سے بچ جاتی ہیں، وہ تمام بھولے ہوئے ماضی کے تجربات اور تاثرات جو ہماری آرزوؤں پر اثر انداز ہوتے ہیں اور ہمارے چلن پر اپنا عکس ڈالتے ہوں اس میں شامل ہیں۔ خواہ ہم ان سب باتوں کو یاد بھی نہ رکھتے ہوں۔ کسی وقت ہمیں کوئی بات یاد آجاتی ہے۔ یہ کسی گزرے ہوئے واقعہ کی ایک خفیف سی جھلک ہوتی ہے۔ جب تک ہم سب کچھ بھول نہ جائیں ہم کسی چیز کو یاد نہیں کر سکتے۔ برگساں کہتا ہے کہ "ہمارا دماغ بھول جانے اور یاد رکھنے کی ہر دو صفات کا ترجمان ہے" مزید برآں جن چیزوں سے ہم زیادہ مانوس ہوتے جائیں ان سے ہم غافل بھی ہو جاتے ہیں کیونکہ عادت ہمیں ان کی موجودگی سے لاپرواہ کر دیتی ہے اس لئے ہماری غفلت اور لاپرواہی ہی ہمارے لاشعور کا بیشتر حصہ ہے۔

اگر ہم انسان کے چلن اور ادراک کو سمجھنا چاہیں اور ہماری یہ خواہش ہو کہ ہم اس کی زندگی کے لیے کوئی لائحہ عمل تجویز کر سکیں تاکہ وہ اپنے ہم جنسوں سے خوشگوار تعلقات قائم کر کے خوشی کی زندگی بسر کر سکے تو ہمیں مذکورہ بالا باتوں کا خاص خیال رکھنا ہوگا۔ ہمیں انسانی ذہن کو سمجھنے کے لیے دور حاضر کی مقرر کردہ تعریف سے فائدہ اٹھانا ہوگا۔ پرانے زمانے کے فلسفہ نے ذہن انسانی کا جو نظریہ پیش کیا تھا وہ اب بوسیدہ ہو چکا ہے۔ مانا کہ اس کا ابھی تک ہمارے خیالات پر اثر ہے مگر اب انقلاب کا دور ہے، پرانے نظریئے اب زیب قرطاس ہی بن سکتے ہیں۔ اب دماغ نام ہے شعوری علم اور ذہانت کا —— ہم جو کچھ اس کے متعلق جانتے ہیں اور ہمارا اس بارے میں جو رویہ ہے —— معلومات کو بڑھانے کی خواہش کا، ذہنی ترتیب تنقید اور اس کے استعمال کا،

ہم فکر کے بارے میں بہت کم سوچ بچار کرتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہمیں اس کے متعلق بہت کم علم ہے تھوڑی دیر کے لیے ہمیں پرانے فلاسفروں کے خیالات کو دماغ سے نکال کر سوچنا چاہیئے۔ سب سے پہلی بات جو ہمیں معلوم ہوتی ہے وہ فکر کی تیز پروازی ہے، جس برق رفتاری سے خیالات پرواز کرتے ہیں اس کا بیان مشکل ہے۔ ذرا سی تحریک ہو تو دماغ میں خود بخود خیالات اُمڈ آتے ہیں — ایک کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا خیال آتا ہے اور محو ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات یہ خیالات ایسے عجیب و غریب ہوتے ہیں کہ ان کا اظہار بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ہر صحیح الدماغ انسان کے ساتھ ایسا ہوتا ہے۔ لیکن ان خیالات کا اظہار اگر ہم کرتے ہیں تو بہت ہی کم اور اسی طرح دوسرے لوگ بھی اپنے ایسے افکار کو چھپاتے ہیں۔ بعض اوقات ہم اپنے ایسے خیالات پر شرمساری محسوس کرتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ شاید ہم ہی ہیں جن کے خیالات اتنے ہلکے ہیں حالانکہ دوسرے لوگوں کی دماغی حالت بھی ایسی ہی ہوتی ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ سارا وقت جو جاگتے میں گزرتا ہے ہم سوچتے رہتے ہیں۔ ہم میں سے اکثر یہ بھی جانتے ہوں گے کہ ہم سوتے میں بھی سوچتے ہیں۔ سوتے کے افکار جاگتے کی نسبت زیادہ نامعقول ہوتے ہیں، اگر ہماری اس سوچ بچار میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ کی جائے تو خیالات کی آمد و رفت کا یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ فکر کی اس حالت کا نام "خیال واہی" (REVERIE) ہے۔ یہ طریق فکر بڑا دل خوش کن ہوتا ہے۔ خیالات خود بخود چلے آتے ہیں۔ ہم بھی افکار کو آزاد چھوڑ دیتے ہیں۔ پھر کیا، امیدیں پیدا ہوتی ہیں، خوف ڈرا دیتا ہے آرزوئیں بیدار ہو کر زندگی کے افق پر روشنی پیدا کرتی ہیں، پھر ناکامی کی تاریکی کہیں سے بڑھ کر روشنی پر چھا جاتی ہے۔ اپنے من میں ہی کسی کو پسند کر رہے ہوتے ہیں کہ یکایک سلسلہ منقطع ہو کر ناپسندیدگی کی کوئی بات یاد آجاتی ہے۔ ہم پھر محبت کرنے لگتے ہیں، عشق کے سارے مراحل طے کر لئے جاتے ہیں۔ اچانک دوسری طرف سے نفرت کا اظہار ہو جاتا ہے ہم بھی کنارہ کشی کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں —— یہ سارے پر لطف خیالات اکثر ہمارے اپنی ہی ایغو کے گرد گھومتے ہیں۔ ہم اپنے "انا" کو بہت زیادہ چاہتے ہیں۔ خیالات کی یہ رو جہاں پر لطف ہوتی ہے اس کے ساتھ قابل رحم بھی کیونکہ ان خیالات کا سلسلہ جونہی ٹوٹا تو ہم شکستہ دل ہو گئے۔ غالب نے شاید اسی لئے کہا تھا کہ ع

گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے۔ اسے قفس میں ایسا سوچنے کا موقع زیادہ ملتا تھا،

خیالات واہی اور آزاد تلازم خیالات پر علمی طور پر تحقیقات کی گئی ہیں گو ابھی تک تحقیقات کرنے والوں کا نتائج پر اتفاق نہیں ہوا اور نہ ہی وہ ان خیالات کی کوئی تعبیر بتا سکتے ہیں۔ لیکن یہ بات مسلمہ ہے کہ ہمارے یہ تخیلی خیالات ہمارے بنیادی کردار کے آئینہ دار ضرور ہوتے ہیں۔ مخفی اور بھولے ہوئے تجربات ہماری فطرت پر اثر ڈالتے ہیں اور اس اثر کا عکس یہ خیالات ہوتے ہیں۔

یکسر اتنا قوی اور مضبوط ہوتا ہے کہ اس دوران میں دوسرے خیالات دماغ میں جگہ نہیں پا سکتے۔ ہم خود پسند نہیں کرتے کہ ہمارے خیالات کا یہ دلچسپ سلسلہ منقطع ہو۔ یہ انسانی تجزیہ ہے۔ لیکن فلاسفروں نے اس طریق فکر کو بالکل اہمیت نہیں دی۔ وہ اس کو بالکل نظرانداز کر دیتے ہیں۔ اسی لئے انھوں نے فکر کے بارے میں جو خیال آرائیاں کی ہیں ان میں سے زیادہ غیر واقعی اور اکثر لایعنی ہیں۔

خیالات واہی کا انقطاع اس وقت ہوتا ہے جب ہم عملی زندگی کے بارے میں کچھ سوچنے لگیں۔ فرض کیجئے کہ آپ کو ایک خط لکھنا ہے آپ سوچتے ہیں کہ آیا خط لکھا جائے یا نہیں؟ اس قسم کے اور بھی کئی فیصلے ہوتے ہیں جو آپ کو روز مرہ کی زندگی میں ضروری ہیں۔ ان کی وجہ سے ہمارے آزاد تلازم خیالات کا سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے۔ یہ فکر کی دوسری قسم ہے۔ جہاں پہلے محض خیالات کی پرواہ اور اپنے انا کو خوش رکھنے کے لوازمات تھے اس کی جگہ عملی قدم اٹھانے کا مرحلہ آجاتا ہے۔ پہلے تو ذہن آزادانہ اور بےباکانہ طور پر ہر بات کے بارے میں سوچتا ہے لیکن دوسری حالت میں ہمیں محتاط ہو کر واقعات پر غور کرنا پڑتا ہے تاکہ ہم کسی صحیح نتیجہ پر پہنچ سکیں۔ بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ اضطراری طور پر ہم کوئی بات سوچ کر فیصلہ کر لیتے ہیں۔ یہ طریق فکر خیالات واہی سے زیادہ کاوش اور سوچ بچار چاہتا ہے۔ جب ہم تھکے ہوئے ہوں یا آزاد تلازم خیالات میں محو ہوں تو اس وقت کوئی سنجیدہ بات سوچنا طبیعت اور دماغ پر ایک بوجھ محسوس ہوتا ہے اور کسی نتیجہ پر پہنچنا دوبھر دکھائی دیتا ہے۔

جب کسی نے آپ کے اعتقاد یا رائے پر اعتراض کیا تو اس سے آپ کے دماغ کو سوچنے کی تحریک ہوتی ہے۔ بعض اوقات ہم خود بخود بلا کسی جبر یا قوی جذبہ کے اپنے خیالات کو تبدیل کرتے رہتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی ہمیں یہ کہدے کہ ہماری فلاں بات غلط ہے تو ہم اس "تہمت" کو برا اور اپنا دل اس کی طرف سے سخت کر لیں گے۔ ہمارے اعتقادات کس طرح بنتے ہیں اور بدلتے رہتے ہیں ہم اس بارے میں بالکل بے پرواہ ہوتے ہیں لیکن جب کوئی ان اعتقادات کی رفاقت ہم سے چھیننی چاہے تو ہمارا دماغ مخالفانہ جذبہ سے بھر جاتا ہے۔ ہم اس کی بات کو سوچتے نہیں بلکہ اس وقت ہمارے ذہن میں ایک ہی خیال حاوی ہوتا ہے کہ ہمارے جذبات کو ٹھیس لگی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہمیں وہ خیالات یا اعتقادات اتنے عزیز نہیں جتنا اپنی خود پسندی کا خیال ہوتا ہے۔ ہم اسے اپنی ذات پر ایک حملہ سمجھتے ہیں فطرتاً ہم ہر اس حملہ کے جواب کے لئے تیار ہوتے ہیں جو ہماری ذات، ہمارے خاندان، ہماری ملوکیت، ہمارے خیالات پر کیا جائے۔ آپ نے بارہا لوگوں کو کہتے سنا ہوگا کہ میری فلاں رائے کو اگر خود خدا بھی آجائے تو تبدیل نہیں کر سکتا۔ بارہا ایسا اتفاق ہوتا ہے جب بحث میں ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہم غلطی پر ہیں تاہم اس کے اقبال کرنے سے ہماری خودرائی مانع آتی ہے۔

ہم میں سے بہت ہی کم لوگ ایسے ہوں گے جو اپنے معتقدات کے بنیادی خیال کے متعلق سوچتے ہوں۔ ہمیں ایسا کرنے سے فطری طور پر نفرت ہے جس بات کو ہم ایک بار سچائی تسلیم کرنے کے عادی ہو جائیں ہم چاہتے ہیں کہ وہ لاریب ہی رہے جب ذرا بھی اس میں شک پیدا ہونے لگتا ہے تو ہم سخت بری طرح محسوس کرتے ہیں اور اس مفروضہ سچائی سے چمٹے رہنے کے لئے ہم کئی قسم کے بہانے تلاش کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہمارا استدلال دراصل جواز تلاش کرنا ہوتا ہے تاکہ جو کچھ ہم یقین کرتے چلے آئے ہیں اسی پر قائم رہ سکیں۔

ایک بار ایک دعوت میں شہر کا حاکم اعلیٰ مدعو تھا وہ نہ آسکا۔ اس تقریب کے صدر نے اعلان کیا کہ "........ صاحب بعض "اچھے" وجوہات (good reasons) کی وجہ سے تشریف نہیں لاسکے اس کے نہ آنے کی "اصل وجوہات" (Real Reasons) کیا تھیں صدر نے اس بارے حاضرین کو ان کی قیاس آرائیوں پر چھوڑ دیا۔ فکر کی دنیا میں یہ اچھے اور اصل وجہ کا تفاوت ایک ضروری اور بین فرق ہے۔ اس کی مثال یوں دی جا سکتی ہے کہ ہم اپنے مسلمان ہونے پر اچھے وجوہات پیش کر سکتے ہیں، لیکن اگر یہ کہا جائے کہ ہمارے فرقہ پرست ہونے کی اصل وجہ یہ ہے کہ ہم مذہبی ماحول میں پیدا ہوئے تو ہمارے احساسات کو شاید ٹھیس لگے گی۔ ایک وحشی انسان آپ کو اپنی وہم پرستی کے جواز میں دلائل دے سکتا ہے ہم روز دیکھتے ہیں کہ اخبارات کے مدیر اپنی الٹی سیدھی باتوں کو ثابت کرنے کے لئے وہ عجیب وغریب منطق دکھاتے ہیں اور دور کی لاتے ہیں کہ خدا کی پناہ لیکن ان میں سے کوئی بھی محسوس نہیں کرتا۔ کہ وہ کیوں اپنی کسی خاص رائے پر ڈٹا ہوا ہے۔

ہمارے مخصوص اعتقادات کی اصل وجوہات جہاں دوسروں سے پوشیدہ ہیں، وہاں خود ہم سے بھی مخفی ہیں۔ مذہب، خاندانی تعلقات، وراثت، کاروبار، ملک اور سلطنت، یہ سب ایسی چیزیں ہیں کہ جوں جوں ہم عمر میں بڑھتے ہیں ان کو ورثہ کے طور پر نسلاً لیتے رہتے ہیں۔ ہم لاشعوری طور پر اپنے ماحول کے مطابق ان سب کو اپنے اندر جذب کرتے رہتے ہیں جس قسم کے لوگوں میں ہم زندگی بسر کرتے ہیں ان لوگوں کی مدہم آوازیں خود بخود ہمارے کانوں میں سرگوشیاں کرتی رہتی ہیں۔ ایک مشہور مصنف کی رائے ہے کہ ہمارے اکثر فیصلے محض ہماری اپنی رائے کا نتیجہ ہوتے ہیں اس میں کسی قسم کے استدلال

کو دخل نہیں ہوتا۔ لیکن یہ مسلمہ امر ہے کہ جونہی کسی نے اس رائے پر اعتراض کیا تو اس شخص کے جذبات کو انتہائی صدمہ پہنچے گا۔ اس لئے لازمی طور پر وہ اس کے خلاف احتجاج کرے گا۔ جس قدر اعتقاد پختہ ہوگا اسی قدر نفرت کا اظہار زیادہ شدید ہوگا۔ جس رائے یا خیال کی تہ میں کوئی جذبہ کام کر رہا ہو اس کے متعلق تحقیقات کرنا فضول معلوم ہوتا ہے۔ ہم اس رائے کو اس قدر محکم خیال کرتے ہیں کہ اس کے خلاف سوچنا بھی گناہ معلوم ہوتا ہے۔ ایسی رائے غیر معقول ہوتی ہے۔

ہمارے بعض خیالات ایسے ہیں جن کے متعلق ہماری پہلے سے ہی رائے قائم ہو چکی ہوتی ہے ہم پھر اس رائے کی خود بخود تائید کرتے رہتے ہیں۔ یہ اس تائید کے جواز کے لئے ہمارے پاس اچھے وجوہات بھی ہوتے ہیں۔ ان اچھے وجوہات کے سوچنے کا نام موجودہ ماہرین نفسیات کے نزدیک "احتجاج پسندی یا rationalizing" ہے۔ یہ بات پرانی ہی ہے گو نام نیا ہے۔ یہ اچھے وجوہات خواہ کس قدر معقول معلوم ہوتے ہوں لیکن ان سے کوئی دیانت دارانہ بلند خیالی پیدا نہیں ہوتی۔ ہم ذرا کرید کر معلوم کریں تو ان وجوہات کی تہ میں ہمیں ضرور ذاتی خود غرضی یا تعصب نظر آئے گا۔ درحقیقت ہمیں نیک نیتی سے کسی بات کی جستجو یا نیا علم حاصل کرنے کی خواہش نہیں ہوتی۔

خیالات واہی میں اکثر ہم اپنے خیالات کو حق بجانب ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہم غلطی پر ہیں۔ یہ تو کسی حالت میں بھی سوچا نہیں جا سکتا اور نہ ہم برداشت کر سکتے ہیں کہ ایسا کوئی کہے۔ حالانکہ زندگی میں ہمیں اپنی کمزوریاں اور غلطیاں نمایاں طور پر معلوم بھی ہو جاتی ہیں۔ ہم اپنا بہت سا وقت حالات کی ناموافقت کا شکوہ کرنے میں یا دوسرے کے رویہ کی شکایت کرنے میں گنوا دیتے ہیں۔ گویا یوں ہم اپنی کمزوریوں اور لغزشوں کا بار دوسروں پر ڈال کر اطمینان حاصل کرتے ہیں۔ جب ہم اپنے تئیں یا اپنی جماعت کو کسی غلط فہمی یا خطا کا شکار دیکھتے ہیں تو ہم اپنی بریت کے لئے جو کچھ سوچتے ہیں وہی احتجاج پسندی ہے۔

"میرا" ایک چھوٹا سا لفظ ہے۔ مگر اس میں بلا کی قوت ہے۔ انسانی زندگی اور معاملات میں یہ بڑی اہمیت رکھتا ہے اس کی صحیح جانچ اور تعین کرنا ہی حکمت و دانائی کی ابتدا ہوتی ہے۔ میرا کھانا، میرا کتا، میرا گھر، میرا عقیدہ، میرا ملک یا میرا خدا، ان سب الفاظ میں ایک جیسا زور ہوتا ہے۔ اگر کوئی ہمیں یہ کہہ دے کہ ہماری گھڑی کا وقت غلط ہے یا ہماری کار کا رنگ پسندیدہ نہیں ہے تو ہمیں یہ بات بری معلوم ہوگی۔ ہم اسے پسند نہیں کریں گے۔ اسی طرح ہمارے کسی عقیدہ کے متعلق کوئی ہمیں کچھ کہے تو ہم بالکل اسی طرح جیسے اپنی مملوکہ اشیا کے بارے میں محسوس کرتے ہیں برا مانیں گے۔ اپنے خیالات کے متعلق بھی ہمارا وہی رویہ ہوتا ہے "میرا" کا تعلق برابر قائم رہتا ہے۔ ہندوستان میں مذہبی مناظرے اس کی سب سے زیادہ صحیح اور درست مثال ہوگی جن "میرا" کے برقرار رکھنے کے لئے مناظر لوگ بوالعجبیاں کرتے ہیں۔

یہ عوام تک محدود نہیں بلکہ جہاں بھی خود بینی کا سوال پیدا ہوا بڑے بڑے فلاسفر، علما اور صاحبان علم و دانش اسی قسم کی زود حسی کا مظاہرہ کرنے لگتے ہیں۔ محض اپنی بات منوانے کی خاطر ہزار ہا منطقیانہ کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ان دلائل کو کوئی کتنا ہی کہے لیکن یہ اسی قسم کی احتجاج پسندی ہے جس کی تعریف اوپر کی گئی ہے اور اس کی تحریک ایک عام جذبہ سے ہوئی ہے۔ فلسفہ اور مذہبیات کی ایک تاریخ اگر تعصب، مجروح خود پسندی اور نفرت کی روشنی میں لکھی جائے تو یہ تاریخ اسی موضوع پر لکھی ہوئی دیگر تاریخوں سے زیادہ سبق آموز اور مفید ہوگی۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ کسی ادنیٰ جبلت کو ٹھیس لگنے سے بڑے بڑے افکار پیدا ہوتے ہیں۔ مشہور انگریز شاعر ملٹن نے طلاق کے مسئلے پر ایک معرکۃ الآرا رسالہ لکھا۔ اس کے اپنی سترہ سالہ بیوی سے کچھ ازدواجی تعلقات ناخوشگوار تھے اور اس کا نتیجہ وہ مقالہ ہوا تھا۔ جب اسے اس نئی روش پر ملزم گردانا جانے لگا تو اس نے Areopagitica جیسی بلند پایہ تصنیف لکھ کر آزادی رائے کے حق کو منوایا اور اس طرح وہ حق کی اشاعت میں آزادی پریس کے قیام کا ذریعہ بنا۔

ہر بنی نوع انسان ——— وہ اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھتا ہو یا ادنیٰ طبقے سے ——— مذکورہ بالا طریق میں ہی سوچتا ہے۔ ایک مزدور یا کوئی معمولی کام کرنے والے آدمی کے دماغ میں اگر تخیل پسندی کے خیالات دن بھر موجزن رہتے ہیں تو بالکل اسی طرح بڑے بڑے فاضل جج اور مذہبی پیشوا تک بھی انھیں خیالات میں ڈوبے رہتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ فلسفہ داں، سائنس داں، شعرا اور فقہا تک اسی طرح سوچتے آئے ہیں۔ ارسطو کے دماغ کو بھی جو کہ دقیق نظریات کی آماجگاہ تھا ایسے خیالات کو جگہ دینی پڑی تھی۔ مشہور ہے کہ اس کی ٹانگیں پتلی پتلی تھیں اور آنکھیں چھوٹی چھوٹی۔ اس بدنمائی کو دور کرنے کے لئے وہ بڑا اہتمام کرتا۔ اس کا لباس فاخرانہ اور جاذب نظر ہوتا۔ وہ ہاتھوں میں قیمتی انگوٹھیاں پہنتا اور اپنے بال بڑی احتیاط سے سنوارتا۔ اسی طرح اور بہت سی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ اس سے مراد کسی بلند ہستی کی توہین یا تذلیل نہیں بلکہ اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ ہم جب سوچتے ہیں تو ہمارے فکر کو اکثر متضاد عناصر کا سخت مقابلہ کرنا ہوتا ہے۔ اس ضمن میں وہ چند دماغ بھی شامل ہیں جنکو قدرت صدیوں کے بعد پیدا کرتی ہے۔

جن افکار کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے اس کے علاوہ ایک اور بھی قسم ہے اور وہ ایسا طریق فکر ہے جس سے دنیا کا نظام تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ انسان کو نیم وحشی اور درندگی کی حالت سے موجودہ علم اور راحت و سکون تک ارتقائی

منازل طے کرانے والا سوچ بچار کا یہی طریق ہے۔ آج ساری مہذب دنیا ایک نئی کشمکش میں مبتلا ہے۔ اس سے نجات دینے کے لئے فکر کا یہی طریق ہے اس کے ذریعہ ہی فلاح و بہبودی کے ذرائع سوچے جا سکتے ہیں۔ زمانہ قدیم میں اس قسم کی سوچ بچار کا نام "عقل محض" (Reason) رکھا گیا تھا لیکن اس لفظ کے گرد اس قدر غلط فہمیاں جمع ہو گئیں ہیں کہ ہم میں سے اکثر اس لفظ سے بدظن ہو گئے ہیں۔ اس کی جگہ تخلیقی فکر (creative thought) کا نیا نام زیادہ موزوں ہوگا۔ اس قسم کے غور و فکر کا نتیجہ علم ہوتا ہے کیونکہ اس سے ایک استعداد پیدا ہوتی ہے جس کے ذریعہ ہم اشیاء کی ماہیت کو ایک دوسرے نقطۂ نگاہ سے دیکھنے لگتے ہیں۔ حالانکہ اس علم سے قبل ہم انھیں چیزوں کو کچھ اور سمجھتے تھے۔ جوں جوں علم زیادہ ہوتا جاتا ہے ہم اسی قدر زیادہ ان اشیاء کی تشکیل نو میں حصہ لے سکتے ہیں۔

ایک ایسا بھی وقت ہوتا ہے جب ہم کسی چیز کو ایک نئے زاویہ نگاہ سے دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ اس وقت نہ تو ہم خود پسندانہ خیالات کے زیر اثر ہوتے ہیں اور نہ ہمارا دماغ آزاد تلازم خیال میں مصروف ہوتا ہے۔ نہ ہمیں کوئی فیصلہ دینا ہوتا ہے اور نہ کسی بات کا جواز ڈھونڈنا۔ اس وقت کا فکر ایک نیا تخلیقی فکر ہوتا ہے۔

دوسری تحریکات (urges) کی طرح تجسس بھی ایک قوی تحریک ہے کسی دوسرے کے نام کا تار، بند لفافہ، ٹیلیفون پر گفتگو یا دوسروں کی سرگوشی ہمیں بے چین کر دیتی ہے۔ ہم ان باتوں کو جاننے کے لئے بے تاب ہو جاتے ہیں حالانکہ ان کا ہماری ذات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ تجسس کا یہ جذبہ دراصل حسد، بدظنی یا یہ شک کہ ہم موضوع گفتگو ہیں، کے باعث پیدا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ قدرتی طور پر ہم دوسروں کے معاملات میں زیادہ دلچسپی کا اظہار کرتے ہیں۔ گو ان کا تعلق ہم سے کسی طرح بھی نہیں ہوتا۔ طلاق کا ایک مقدمہ ہفتوں تک اخبار میں کافی دلچسپی کا سامان بنا رہے گا۔ ہم ایسے حالات میں معمولی واقعات کے گرد افسانے کے جال بن لیتے ہیں۔ ناول پڑھنے یا فلم دیکھنے میں جو لطف حاصل ہوتا ہے بعینہ وہی لطف ایسے سنسنی خیز واقعات کو پڑھ کر آتا ہے۔

ہم اکثر ایسی باتوں میں انہماک کا اظہار کرتے ہیں جن سے ہمیں کوئی سروکار نہیں ہوتا اور نہ ہم کو کوئی ہمدردی ہوتی ہے۔ مگر پھر بھی ہم ان میں دلچسپی لیتے ہیں۔ اس کا نام "بیکار تجسس" موزوں ہوگا۔ ہم بعض لوگوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ خواہ مخواہ کسی دوسرے کے معمولی سے واقعہ کو لے کر اس پر طبع آزمائی کرنے لگتے ہیں۔ کئی نظریئے قائم کرتے ہیں اور ان کے سوچنے میں مصروف رہتے ہیں۔ بعض "بیکار تجسس" کرنے والے ایسے بھی ہوتے ہیں جو کسی کے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی ہر ایک چیز کو غور سے دیکھیں گے۔ قالین کی قیمت کا اندازہ لگائیں گے۔ سامان کو جانچ سکیں گے اور پھر اس سے صاحب خانہ کے بارے میں قیاس آرائی کریں گے۔

یہ تجسس محض بیکار ہی نہیں ہوتا بلکہ اس کے ذریعہ دنیا میں بڑے بڑے انقلاب آتے رہتے ہیں۔ جہاں خیالات میں بلندی اور جدت پیدا ہوتی ہے۔ وہیں ایجادات کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ تجسس فکر میں ارتقا کا موجب بنتا ہے۔ جس کا اثر نسل انسانی پر صدیوں تک رہتا ہے۔ اس کی دو مثالیں یہاں کافی ہوں گی۔ گلیلو ایک مفکر نوجوان تھا جس کا ذہن خیالات واہی سے بھرپور رہتا۔ وہ فطرتاً فنون لطیفہ کی طرف مائل تھا جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ وہ آرٹسٹ یا موسیقار بن جاتا۔ اسے مذہبی تعلیم کے لئے بھیجا گیا۔ وہ بچپن سے ہی مشینی کھلونے اور ریاضی کی طرف توجہ دینے لگا۔ ان خشک مسائل کے ساتھ ساتھ گاؤں کی نوجوان لڑکیوں کا تصور بھی اس کے ذہن میں موجود تھا۔

ایک دن جب وہ سترہ برس کی عمر کا تھا، وہ ایک گرجے میں چلا گیا۔ اس کا دماغ اپنے خیالات میں مصروف تھا کہ اچانک اسے گرجے کی چھت سے لٹکتا ہوا لمپ جھولتا ہوا دکھائی دیا۔ اس کی ساری توجہ اس لمپ پر مرکوز ہو گئی۔ اب اس کے ذہن میں، گرجے کی عمارت، مذہبی مراسم کا خیال بھی نہ رہا۔ اس کی فنی اور مذہبی دلچسپی یک دم مفقود ہو گئی اس نے مستقبل کے لئے جو کچھ سوچ رکھا تھا وہ ختم ہو گیا۔ اس کی توجہ تمام تر لمپ کی حرکت پر تھی اسکی رفتار کا اندازہ لگانے کے لئے اس نے نبض کی حرکت کو بطور گھڑی استعمال کیا۔ تجسس سے بڑھ کر فکر نے تخلیقی حالت اختیار کر لی۔ پینڈولم گلیلو کی ہی ایجاد ہے۔

اس کا کشش ثقل کا نظریہ ایک ایسا نظریہ ہے جس نے پہلے سارے نظریات کو باطل قرار دے دیا۔ بعد میں نیوٹن نے اس مسئلہ کو زیادہ سلجھایا اور اجسام فلکی کے ماہرین کے سارے خیالات کو الٹ کر رکھ دیا۔

گلیلو کے تین سو سال بعد ۱۸۳۱ء میں فراڈے نے مقناطیس کے ذریعہ بجلی کی لہر کو دریافت کیا۔ اس کے تجربات شاید کاروباری نقطۂ نگاہ سے محض تضیع اوقات ہوں۔ لیکن اگر اسی بیکار تجسس کا نتیجہ ——— یہ ڈینمو اور موٹریں ——— ایک دن کے لئے بند کر دی جائیں تو کاروباری دنیا میں ایک تہلکہ مچ جائے۔ سینکڑوں سائنسدانوں نے تاریک گھروں میں بیٹھ کر معمولی سامان کی مدد سے اپنے تجسس کو جاری رکھا۔ ان کا ذہن سوچتا رہا اور ہاتھ اسے عملی جامہ پہناتے گئے۔ تاریک مکانوں سے نکلی ہوئی علم کی شعاعوں نے ساری دنیا کو منور کر دیا۔

یہ تو سائنس دانوں کا ذکر تھا۔ اب ذرا فن کاروں کو لیجیے۔ وہ شعرا ڈرامہ نویس اور افسانہ نویس جو تفکر کرکے تخلیقی ادب پیدا کر رہے ہیں۔ ان کا اثر ان کے پڑھنے والوں پر اتنا گہرا ہوتا ہے کہ اکثر کی زندگی کا نصب العین ہی بدل جاتا ہے اور ان کے زاویۂ نگاہ میں حشر آسا تبدیلیاں ہو جاتی ہیں۔ اقبال کی شاعری نے نوجوان مشرق کو بیدار کر دیا ہے۔ اس کے فکر نے نوجوانوں کو اپنے ساتھ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔ روسی افسانے نہ صرف روس میں انقلاب کا موجب بنے۔ بلکہ تمام دنیا کے لٹریچر پر اثر انداز ہوئے۔ اگر علم و حکمت کے میدان میں تجسس کا ارتقا تخلیقی فکر پیدا کر سکتا ہے تو بعینہٖ ادب میں بھی یہی حالت ہے۔

سوچ بچار کے ان طریقوں پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہماری موجودہ سماجی بے چینی کا باعث افکار کی غلط روی ہے۔ ہمارا ایغو اختلاف کی خلیج کو وسیع کرتا رہتا ہے۔ ہم اپنے خیالات پر نکتہ چینی کو برداشت نہیں کر سکتے۔ اگر ہم صحیح سوچنے لگیں تو ہندوستان کی بہت سی قومی اور مذہبی مشکلات حل ہو جائیں۔ تعصب مٹ جائے اور ہم ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھ سکیں۔ بہت سے روایاتی جذبات ہمدردی میں تبدیل ہو جائیں۔

ہماری امیدیں انسانی ذہانت سے وابستہ ہیں۔ جو زندگی کے سمندر کی بے شمار بے آہنگ لہروں پر بھٹکنے والی انسانی کشتی کو روشنی کا مینار دکھائے گی۔ ذہانت کی شاہراہ ہمیں ازمنۂ قدیم کی جہالت کی تاریکی سے موجودہ تہذیب کی روشنی میں لے آئی ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ اگر ہم اس شاہراہ پر گامزن رہے تو یہ ہمیں کن بلند اور زیادہ روشن منزلوں تک لے جائے گی۔

اختر جمیل بی، اے۔

غزل

یہ نگار صبح، یہ حسن جواں میرے لئے
یہ بہار شام یہ رعنائیاں میرے لئے

یہ تبسم یہ لبوں کی سرخیاں میرے لئے
جلوۂ گل میری خاطر، کہکشاں میرے لئے

دل نوازی کے لئے یہ صبح کاشی کی بہار
یہ اودھ کی شام، یہ رنگینیاں میرے لئے

یہ ادائے روح پرور، یہ جمال دل نواز
یہ کسی کے میکدہ کی مستیاں میرے لئے

دھندلی دھندلی وہ فضا، وہ انکا آنا یک بیک
شام میں نو سحر کا وہ سماں میرے لئے

وہ لبوں پر کچھ تبسم، وہ نگاہوں میں حیا
وہ کسی کی ہر ادائے دلستاں میرے لئے

کیف میں ڈوبی ہوئی وہ میری جانب ہر نظر
وہ کسی کی نیم وا انگڑائیاں میرے لئے

میری خاطر شوق سامانی کے پیہم اہتمام
حسن کی ہر لحظہ عشوہ سازیاں میرے لئے

میں ہوں حسرت اور کسی کی یاد ہی شام و سحر
زندگی ہے اب سرور جاوداں میرے لئے

حسرت ترمذی

بی اے ایل۔ ایل۔ بی

شاہراہ

چھوٹی لڑکی ٹائم پیس کو کان سے لگا کر سنتی ہے۔ ٹک ٹک ٹک۔ مگر متواتر وہ چپ چاپ سنتی رہتی ہے بڑی دلچسپی سے۔ اس کی ہرن ایسی گول گول آنکھیں میں ایک عجیب بھولا پن ہے

سرہندر نے اس سے ٹائم پیس لے کر میز پر رکھ دی ہے چھوٹی لڑکی کچھ حیرت سے اس کے چہرے کی طرف دیکھتی ہے۔ خاموش ہے۔ شاید وہ یہ نہیں سمجھتی کہ یہ گھڑی کی ٹک ٹک۔ سالوں گذرنے کے بعد ایک مکروہ شکل اختیار کرے گی جس کو سن کر اس لڑکی کے کان بہرے ہو جائیں گے۔ سامی سسرے کی تکرار زندگی کے جھگڑے بکھیڑے، سماج کی الٹی سیدھی باتیں، ایک ننھی جان ان سب باتوں کو سنتے سنتے تنگ آجائے گی۔

سرہندر کو آج ایک صاحب سے ملنے جانا ہے۔ کسی لڑکی کو پڑھانے کے بارے میں بات چیت کرنے۔ جبھی اس نے دھوبی سے دھلوائی ہوئی، پینٹ اور بہترین کوٹ پہنا ہے اور آئینہ کے سامنے کھڑے ہو کر بال بھی سنوارے ہیں، وہ میز کی طرف دیکھتا ہے۔ اور ننھی منی لڑکی کی طرف۔ شاید وہ اس کی دعا کا متلاشی ہے۔ اس نے بچی کو گود میں اٹھا لیا، پیار کیا، پھر شفقت بھری نظروں سے دیکھا۔ اور کچھ ہلکا سا گیت گنگناتا گھر سے باہر نکل گیا۔

وہ تعلیم یافتہ ضرور تھا اور قابل بھی۔ لیکن پھر بھی اسے ہچکچاہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ قدم قدم پر لرز رہا تھا۔ وہ اچھی طرح سے لڑکی کو متعلقہ مضمون کو پڑھا سکتا ہے۔ لیکن پھر بھی وہ ڈر رہا ہے کہیں وہ بھول نہ جائے۔ سارا زندگی کا پڑھا لکھا ضائع نہ کر دے۔

کوٹھی پر پہنچا۔ پندرہ منٹ تک ادھر ادھر پھرتا رہا۔ پھر بہزار دقت دروازے کے اندر گھسا۔ بجری کی سڑک تھی اور دو رویہ پھولوں کے گملے رکھے ہوئے تھے۔ قدم قدم پر سرہندر کے دل کی حرکت کی رفتار تیز سے تیز تر ہوئے جا رہی تھی۔ خواہ مخواہ وہ سوچنے لگا واپس چلا جاؤں مگر؟ پیسہ! وہ اتنی بڑی رقم کو کیسے گنوا دے۔ کچھ نہ کچھ تو کمائے گا ہی۔

سجا سجایا ڈرائنگ روم، مکلف پردے، سرہندر جا کر بیٹھ رہا۔ کوٹھی کے دروازے سے لے کر ڈرائنگ روم تک پہنچنا ایک دشوار حل مسئلہ تھا

"آپ ہی سرہندر بابو ہیں؟"

"جی" سرہندر نے اپنے کو سنبھالے ہوئے جواب دیا۔

ایک الہڑ لڑکی عمر ۱۸ سال، ریشمی دوپٹہ۔ شلوار، عینک، سینڈل پہنے چپ چاپ ایک کوچ پر بیٹھ رہی۔ سرہندر نے دیکھا لیکن پھر ادھر سے منہ پھیر لیا گویا وہ اس لڑکی کی موجودگی سے واقف ہی نہیں۔

"تو آپ میری لڑکی کو پڑھا سکیں گے"

"جی۔"

"کنتو یہ ہیں مسٹر سرہندر"

"نمستے"

"نمستے"

"اچھا تو آپ ان سے فیصلہ کر لیجئے۔ کہ آپ کس وقت پڑھانے کے لئے تشریف لا سکتے ہیں۔ جو کچھ بھی طے کرنا ہو۔ کتابوں کے بارے میں اور دوسری باتوں کے بارے میں، اچھا"

اور ادھیڑ عمر بابو ڈرائنگ روم کو چھوڑ چلدے۔

"آپ" سرہندر کچھ ہچکچا سا گیا۔

"جی"

"اچھا تو میں سویرے سات بجے آجایا کروں گا" سرہندر کو اس فقرہ کو ادا کرنے میں جتنی دقتیں پیش آئیں اس کا اندازہ سوائے اس کے کوئی نہیں لگا سکتا پھر وہ یکایکی اٹھ کھڑا ہوا۔ "صبح سات بجے۔ نمستے"

"نمستے" لڑکی نے سر جھکا کر جواب دیا۔

سرہندر باہر آیا۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ اس نے زبردست معرکہ مار لیا یہ ملاقات اس کے لئے ایک بہت دشوار گذار مرحلہ تھا لیکن وہ اسے کسی نہ کسی طرح طے کر پایا۔

گھر واپس آیا۔ چھوٹی لڑکی پھر ٹائم پیس کو کان سے لگا کر سن رہی تھی ٹک ٹک ٹک!

"بالکل نہیں۔ ایسا نہیں کرتے اچھا" سرہندر نے لڑکی کو پچکارا اور معصوم مسکرا اٹھی۔

"ماسٹر جی آپ بڑے خاموش انسان ہیں"

"وہ کیسے"

"آپ سوائے پڑھائی کے اور کسی بات کا تذکرہ نہیں چھیڑتے"

"مجھے دلچسپی ہی نہیں"

اور پھر سرہندر اس لڑکی کو پڑھانے میں مشغول ہو گیا۔ وہ محض ایک لڑکی تھی نازوں پلی۔ مگر شریف۔ سرہندر نے اسے ہمیشہ بیباک نظروں سے دیکھا، وہ جانتا

تھا کہ اس کے برابر کرسی پر ایک نوجوان دوشیزہ بولتا ہوا حسن۔ انگڑائی ہینچی ہوئی جوانی بیٹھی ہوئی ہے۔ اس میز پر دو مرمریں چوڑی بھری کلائیاں ہیں اس کے ہاتھوں کے بالکل نزدیک اور ایک خوبصورت چہرہ جو بعض اہم نکتہ سمجھانے وقت بالکل اس کے چہرے کے نزدیک جھک جاتا ہے اور اس لڑکی کے رخسار کی سرخی دیکھ کر اس کے چہرے پر سرخی دوڑ جاتی ہے۔ شاید یہ اس لڑکی کے رخسار کا عکس تو نہیں۔ پھر دو چمکیلی آنکھیں ہر لحہ ہر ساعت اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سوال کرتی ہیں۔ ماسٹر جی یہ سمجھ میں نہیں آیا۔ اسے دوبارہ بتائیے۔ مگر سریندر کو ڈر ہے جھجک ہے لیکن یہ سب مجہول باتیں ہیں' وہ تو صرف لڑکی کو پڑھانے پر مامور ہے' اسے اس سے کیا مطلب' اس کی خوبصورتی سے' حسن سے' نورانی خوشبو سے' وہ محض ایک انسان ہے۔ جسے پیسے کی ضرورت ہے۔ جو اپنا اور اپنے گھر والوں کا پیٹ بھرنا چاہتا ہے اور بس جنسی بھوک' اس نے سنا بہت شدید جذبہ ہے' جو رکتے نہیں رکتا۔ بالکل غلط۔ زیست کو برقرار رکھنے کی اقتصادی بھوک' جنسی بھوک پر غلبہ حاصل کر لیتی ہے۔ افسانہ نگار لکھتا ہے۔ عورت۔ تم عورت کو بالکل پسند نہیں کرتے۔ عورت جنسی بھوک دوزخ کی آگ کو بجھانے کا بہترین ذریعہ اور وہ ہر ایک لڑکی کو غائر نظر سے دیکھتا ہے۔ کہتا ہے لڑکی بہت اچھی ہے۔ شاندار ہے خوبصورت ہے' مگر افسانہ نگار کا قد پانچ فٹ سے کم' چہرہ پچکا ہوا۔ لاغری اور ناتوانی کا نمونہ۔ پھر بھی وہ دیو قامت چھ فٹ لمبی' بالوں میں پھول گوندھنے والی' سینہ تان کر چال چلنے والی لڑکیوں پر مرے مٹتا ہے۔ نہ معلوم کس جذبہ کے زیر اثر۔ لیکن افسانہ نگار پر جنسی بھوک بالکل وقتی ہوتی ہے اور جب اسے دنیا کی مصیبتوں' ازدواجی کلفتوں کا شکار ہونا پڑتا ہے تو یہ جنسی بھوک' بیاہی ہوئی لڑکیوں سے رومانوی کیفیت سے بات چیت کرنے کی تمنا ہمیشہ کے لئے فنا ہو جاتی ہے۔

سریندر کے ایک دوست تھے افسانہ نگار۔ لاغری کا مجسمہ۔

"یار تم کو دنیا میں کس چیز سے شوق ہے۔ کیا تم عورت سے بالکل متنفر ہو؟"

"عورت۔ عورت۔ تمہاری عورتوں نے مجھے تنگ کر دیا۔"

سریندر نے کہا "عورت انسانی زندگی کا اہم کردار ہے۔ مگر اس سے یہ مطلب نہیں کہ تم اس کو صرف نفسانی جذبات کی تسکین کا ایک ذریعہ سمجھو۔ اس کے بالکل برعکس وہ ایک محترم ہستی ہے جس کو تم نے خاص طور پر ہندوستان میں اپنا غلام بنا رکھا ہے۔ تم کہتے ہو کہ تم کو ہر ایک خوبصورت چہرہ دیکھتے ہی محبت ہو جاتی ہے۔ اگر آج عورت یہ کہنے لگے کہ وہ ہر ایک خوبرو انسان پر مرتی ہے۔ تو تم کیا محسوس کرو گے۔"

"لیکن عورت۔ محبت کرنا نہیں جانتی' وہ تو صرف ایک ہی انسان کے پلے بندھ کر اپنی زندگی پوری کرتی ہے۔"

"اور آپ۔ ہر ایک لڑکی سے محبت کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ آپ کے نزدیک کسی نئی شادی شدہ لڑکی میں بھی رومانوی ممکنات نظر آتی ہیں۔ آپ افسانوی دنیا میں اتنا گھر گئے ہیں کہ دنیا کی اصلیت کو گم کر دیا۔ جب آپ دیکھیں گے کہ آپ پر زندگی کی ذمہ داریوں کا بوجھ پڑ رہا ہے۔ تو ساری رومانوی کیفیت زائل ہو جائے گی۔"

یہی بات تھی کہ سریندر پر اس لڑکی کو پڑھاتے پڑھاتے کچھ رومانوی کیفیت طاری نہیں ہوئی۔ اس کا کام تھا کہ محنت کرائے پڑھائے۔ غریب آدمی کی محبت گو بہت شدید تر ہوتی ہے۔ لیکن بہت خاموش اور اثر پذیر۔ کنتو اس کے بالکل نزدیک' اتنی نزدیک کہ وہ اس کو اپنی آغوش میں پناہ دے۔ لیکن شاما وہ اس سے بالکل دور تھی اتنی دور جتنی دور وہ پہونچ نہ پاتا تھا۔

"کنتو۔ شاما' افسانہ نگار۔

افسانہ نگار کو جنسی بھوک نے ستایا ہے۔ کنتو ایک امیر ماں باپ کی لڑکی ہے۔ جو رومان محبت سے ناآشنا ہے۔ اور شیاما ایک غریب ماں باپ کی خوبصورت' جوان شفق ایسے رخسار والی لڑکی۔ اُسے لڑکی کہہ لیجئے یا عورت' لیکن وہ افسانہ نگار سریندر کے دوست کے مطابق صرف جنسی تسکین کا ہی ذریعہ نہیں تھی۔

سریندر کو شیاما سے محبت تھی۔ وہ افسانہ نگار کے دوست کے قول کے مطابق عورت سے متنفر نہیں تھا۔ غریب آدمی صرف ایک غریب لڑکی سے ہی محبت کر سکتا ہے۔ وہ کس طرح سے دہلی کی کناٹ پلیس یا لاہور کی لسنبت روڈ کی مغرور' مغرب زدہ لڑکیوں سے الفت کی پینگیں بڑھا سکتا ہے۔

وہ کنتو کو پڑھانے جاتا تھا۔ تو شیاما کو بانس کی کھپچیوں والے دروازے کے پیچھے اپنی ماں باپ یا بھائی کی موجودگی میں بیٹھا دیکھتا ہے۔ اس کا مکان بالکل سڑک کے کنارے تھا۔ سریندر دیکھتا تھا۔ کہ اس دروازے کے پیچھے بیٹھک ہے۔ سیدھی سادی جس پر ایک بینت کی چٹائی پڑی رہتی ہے۔ دیوار پر دو چار کیلنڈر ہیں کسی میں بانسری والے شیام کی تصویر ہے۔ تو کسی رادھا اور کرشن کی۔ شیاما وہیں بیٹھی بیٹھی کوئی کتاب پڑھتی رہتی ہے شروع شروع میں سریندر کو جھجک تھی کہ ان بانس کی کھپچیوں کی طرف ایک نظر ہی دیکھ لے۔ لیکن اس کی آہستہ آہستہ ہمت بڑھ گئی۔ اس نے دیکھا کہ شیاما ہندی کی کتاب پڑھتی رہتی ہے اور کبھی کبھی اس کے گھر کے نزدیک پہنچتے پہنچتے اس کے معصوم راگ سریندر کے کانوں میں جھنکار پیدا کر دیتے ہیں۔ شیاما کے گیت سریندر کو دنیا کے جھگڑے بکھیڑوں' کلفتوں اور زندگی کی کش مکش سے اس تاروں کی سڑک پر سے بہت اونچا اٹھا لے جاتے ہیں۔ اتنا اونچا جہاں سے وہ اس تیز رفتاری کی دنیا کے شور و غل کو نہ سن سکے۔ اور تاروں کی سڑک صرف ایک پتلی کالی لکیر بن کر رہ جائے۔ لیکن وہ خاموش شیاما کے گھر کے سامنے سے گذر جاتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ کچھ گائے۔ شیاما کے کانوں تک اپنی دل کی آواز پہنچانے کے لئے۔ لیکن وہ کبھی

نہ گا پایا۔ کیوں؟ پرورش، تعلیم، ماحول کا اثر۔ اسے ایسے ماحول میں تربیت ملی تھی جہاں عورتوں کو احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، جو صرف جنسی بھوک کی تسکین کے لئے ہی نہیں پیدا کی گئی ہیں۔

پھر ایک روز وہ شیاما کے گھر کے نزدیک پہنچا۔ دیکھا شیاما دروازے پر کھڑی ہے۔ بھولی بھالی، معصوم۔ اس کے شفق ایسے سرخ رخسار تمتما رہے تھے۔ شیاما کی آنکھ جھپکی اور سر جھکا لیا۔ سرینڈر نے دیکھا شیاما کو جو زمین میں آنکھ گاڑے کھڑی ہے۔ پھر سرینڈر کی آنکھ جھپکی۔ اور اس کی گردن نیچے جھک گئی۔ محبت اور حیا۔ لطافت اور پاکیزگی۔ لیکن صرف سرینڈر مشکل سے وہاں آدھ منٹ ہی تو کھڑا ہوا تھا۔ اور آگے چل دیا۔ شیاما گردن نیچے کئے گھر کے اندرونی حصے کو بڑھ رہی تھی۔ یکایک سرینڈر کو محسوس ہوا کہ اس کا دل گھبرا رہا ہے۔ بالکل اس طرح جس طرح سے ایک مدرسہ سے بھاگے ہوئے طالب علم کا دل اپنے استاد کے سامنے نیچے اوپر ہوتا ہے۔ لیکن سرینڈر کا دل اس وقت ایک مجرم کا دل نہیں تھا۔ بلکہ ایک پریمی کا، ایک ایسے پریمی کا جسے شیاما کو دیکھ کر یک گونہ مسرت حاصل ہوئی۔ اتنی کہ وہ اس کو ضبط نہ کر سکا۔ "شیاما" اور وہ آگے کیا کہے۔ "آؤ میری آغوش محبت میں پناہ میں لو۔ میری زندگی کو بہشت بنا دو۔ میں تمہارے شباب کا خوشہ چین بننا چاہتا ہوں"۔ نہیں اس کے بالکل برعکس "شیاما۔ دیوی۔ دیوی شیاما۔ شاما دیوی"۔ اور کچھ نہیں اور وہ کہہ بھی کیا سکتا تھا۔

اس نے دور سے ہی تو شیاما کو دیکھا۔ اور پھر وہ کنتو کو پڑھانے کے لئے چلا گیا۔ [illegible] ایک روحانی سنسنی محسوس ہو رہی تھی کنتو کو پڑھانے میں مشغول ہو گیا۔ کنتو! ارے کنتو نہیں شیاما۔ اس کے بالکل نزدیک سیدھی سادھی اجلی دھوتی، ہاتھوں میں بسنتی چوڑیاں "شیاما دیوی"!! اور اس کے چہرے پر پسینے کے قطرے نمودار ہو گئے۔

"کیا بات ہے ماسٹر جی؟"

"کچھ نہیں" رومال سے پسینا پونچھتے ہوئے۔ "اچھا تو اب آگے چلئے"۔

کنتو کے مطالعہ کے کمرے میں میز کے آگے جالی دار کھڑکی۔ سہارے سہارے ہری ہری بیل جس پر کوٹھی کے چاروں طرف پھیلے ہوئے باغ والے درختوں پر چہچہاتی بلبلیں آ کر بیٹھ جاتی ہیں۔ بالکل کالی چونچ والی۔ سریلی......

سرینڈر اس کی طرف دیکھتا ہے۔ کنتو بیٹھے کام کئے جاتی ہے۔ بھولی، الہڑ، سادہ لوح۔ جس کے بدن پر باریک دھانی رنگ کا ریشمی دوپٹہ ہے جس کے پیچھے سے نازک سی پتلی قوس وقزح کے رنگ ایسی چوڑیاں جھکتی ہیں اور جن سے پنسل بار بار ٹکرا کر ایک ہلکا سا نغمہ پیدا کر دیتی ہے۔ اسے یہ معلوم نہیں کہ اس بلبل کو سرینڈر شیاما کو دیکھ رہا ہے۔ چلمنوں والے دروازے کے پیچھے بیٹھی ہوئی

شیاما کو............

"شیاما کوک رہی ہے بن میں"۔ سرینڈر کی چھوٹی بہن عمر دس سال شریر۔ گنگنا کر اپنی مدرسے میں پڑھائے جانے والی کتاب میں بلند آواز سے پڑھ رہی ہے۔

"مری"۔ سرینڈر نے اپنی بہن کو ہلکا سا چپت لگا یا۔ اس کی بہن نے منہ بنا دیا۔ اور دیکھتے دیکھتے اس کی آنکھوں میں آنسو جھلکنے لگے۔

"رو وُ مت بہن جی" سرینڈر پچکارتے ہوئے بولا۔ "گاؤ جی کیسے۔ "شیاما۔ شیاما"... دیوی" لیکن وہ کہاں گا پایا۔ صرف کوشش کی تھی نہ گا پایا۔

"ہاں کیسے......کوک رہی ہے بن میں" گویا شیاما کہتے ہوئے اس کی زبان لرزتی ہے جس کے نام سے وہ اس روز واقف ہوا تھا۔ جب چلمنوں والے دروازے کے پیچھے بیٹھی ہوئی شیاما اس کی ماں پکار پکار کر کہہ رہی تھی: "شیاما بیٹی دروازہ کھولو...." ہانپتی ہوئی عورت۔ ادھیڑ عمر۔ جس کی گردن پر سالوں کی ریاضت کی کمائی کا بوجھ ہو۔

سرینڈر نے کوشش کی کہ وہ اس گیت کو گائے۔ اتنے زور سے گائے کہ گھر کی دیواریں، گلی، سڑک، بجلی کے کھمبے، دوکانوں کے بارجے سب گونج اٹھیں "شیاما۔ شیاما..." اور یہ آواز اب سب کو عبور کرتی پہنچ جائے۔ ان چلمنوں والے دروازے کے پیچھے بیٹھی ہوئی شیاما کے کانوں میں۔

"شیاما کوک رہی ہے بن میں"۔

بن میں نہیں۔ کلب کے پیانو روم میں جہاں کنتو پیانو پر بیٹھی ہوئی کوک رہی تھی۔ لیکن اس کی آواز میں سریلا پن تھا مگر سوز نہیں، ایک ایسے جگر کا سوز جس کو محبت کے نیک جذبہ نے اسن اور صلح کے دروازے پر لا کر کھڑا کر دیا ہو۔ ایسا سوز جو کبھی جگر سے نکل کر روح افزا موسیقی میں بلند ہو لوگوں کے کانوں تک پہنچے مگر ایسی محبت گاتی نہیں ہے۔ ایسی محبت میں خاموشی ہی راگ ہے۔ درد بلا نغمہ زا، جنت کے گیتوں سے زیادہ رسیلا۔

کنتو گا رہی تھی اور سرینڈر کے افسانہ نگار دوست بیٹھے ہوئے سن رہے تھے۔ اور پھر۔

"بہت خوب گاتی ہیں آپ۔ بالکل میرے تازہ ترین افسانہ کی ہیروئن کی طرح"....... حضرت نے فرمایا۔

"آپ بہت خوب لکھتے ہیں۔ میں نے آج ہی آپ کے تازہ افسانہ کو پڑھا"....

"آپ کی ذرہ نوازی ہے۔ پسند آیا؟"

"کیوں نہیں۔ کس طرح آپ نے ہیروئن کا نقشہ کھینچا ہے۔"

"یاد آگیا عمریں کلائیاں، آنکھ پر نازک چشمہ، چوڑیاں۔ بیس سالہ لڑکی الہڑ نوجوان، ہیں نہ بالکل آپ ایسی ......"

"جانے دو۔"

کنتو الہڑ نوجوان ارمان اور محبت سے ناآشنا۔ افسانہ نگار عورتوں کا شیدائی۔ کنتو کو بالکل ناسمجھ سادہ لوح کنتو کو رومان کا سبق سکھار ہا تھا۔ کلب کی مغرب زدہ ہوا میں۔

نرسیندر کا وہی روزانہ کا معمول، وہی راستہ جس کے درمیان کھچیوں والے دروازے کی بیٹھک ہے۔ جس کے پاس پہنچنے سے پیشتر اس کا دل دھڑکنا شروع کر دیتا ہے۔ لیکن پھر اس پر ایک نہایت مسرت آمیز روح پرور کیفیت سی طاری ہو جاتی ہے۔ وہ سوچتا ہے بلکہ پرماتما سے دعا کرتا ہے کہ وہ شیاما کو ایک نظر دیکھ لے بلکہ اس کی زیارت کرے۔ دھک! دھک! ایک عجیب ہوتی کھچیوں کا دروازہ آجاتا ہے۔ شیاما چپ چاپ بیٹھی رہتی ہے۔ وہ صرف اس کو ایک نظر سے دیکھتا ہے اور شیاما کے رخساروں پر ایک ہلکی سرخی دوڑ جاتی ہے۔ شاید سرسیندر کی نگاہیں اسے دھوکہ دے رہی ہیں۔ لیکن پھر بھی سرسیندر کو شانتی ملتی ہے۔ اور اسے زندگی میں لطافت نظر آتی ہے ایک ایسی زندگی میں جو اس سڑک کی مانند ہے جس میں جگہ جگہ گڑھے ہیں اور کہیں کہیں سے ہموار ہے۔ سرسیندر نے گڑھوں کو ہی زیادہ عبور کیا ہے۔ اس کی زندگی کی سڑک صرف کہیں کہیں سے ہموار اور شاید اس جگہ تارکول اور سیمنٹ کی سڑک سے بھی زیادہ چکنی، جہاں شیاما اور سرسیندر کی نگاہوں کا سنگم ہوتا ہے۔ سرسیندر اس وقت محسوس کرتا ہے کہ اس کی زندگی کی سڑک کتنی ہموار ہے۔ مگر صرف اس کھچیوں والے دروازے کے سامنے، صرف بیس پچیس گز کا ٹکڑا۔ پھر اس میں کھردرا پن شروع ہو جاتا ہے۔ جگہ جگہ سے پتھر نکلے ہوئے ہیں جس پر پاؤں پڑنے سے لوٹے چھلنی چھلنی ہو جاتے ہیں۔

لیکن یہ سڑک ختم ہوتی ہے کنتو کی کوٹھی پر۔

کچھ دنوں سے سرسیندر نے کنتو میں ایک زبردست تغیر محسوس کیا۔ کنتو سیدھی سادی الہڑ رومان اور محبت سے ناآشنا کنتو وہ ایکدم تبدیل ہو گئی۔ اسے سبق یاد نہیں رہتا۔ وہ سب بات بھول جاتی ہے اس کی آنکھوں میں مستی اور ہاتھوں میں بے چینی ہے۔ سرسیندر حیران ہے اسے پڑھاتے پڑھاتے تین مہینے ہو گئے۔ لیکن ان تین مہینوں میں کنتو میں کچھ تبدیلی نہیں ہوئی۔ مگر اس نے اس روز کنتو کو دیکھا۔ حیران رہ گیا۔ یہ دیکھ کر کہ وہ پڑھائی کے وقت درمیان میں کبھی کبھی جالی دار کھڑکی کے سہارے سہارے جانے والی بیل پر آکر بیٹھی ہوئی بلبل کو دیکھتی رہتی ہے۔ ایک گہری نظر سے۔ ایک نئے انداز سے لکھتے لکھتے پنسلیں اس کے ہاتھ سے ٹوٹ جاتی ہیں۔ سرسیندر کہتا ہے "تم نے یہ یاد کر لیا کنتو؟" "سمجھ میں نہیں آتا ماسٹر صاحب" سرسیندر ایسا انداز سرسیندر محسوس کرتا ہے گویا وہ اپنی ساری زندگی کی پڑھائی کو بھول گیا ہے۔ اسے شیاما سے محبت ضرور ہے۔ لیکن وہ اپنی حاصل کردہ تعلیم کو نہ بھولا مگر کے کارخانے کو چلانے کا خیال اسے ہر دم تنگ کرتا رہتا ہے۔ کنتو ایک نہایت ہی دلاویز لڑکی ہے۔ جس کو اپنے شباب اور آدیشوں کو ہلانے کی ایک نئی ترکیب ہاتھ آگئی ہے۔ جس کی چال میں تیزی ہے۔ اور جس کے چہرے سے بغاوت عیاں ہے۔ بغاوت، سرکشی۔ کوٹھی کی چار دیواری میں نہایت آرام سے گزرنے والی زندگی۔ وہ بھی خالی از لطف زندگی سے۔ جو رومان سے خالی۔ محبت سے عاری۔ ایسی زندگی جو حکومت کے خیال کو پرورش کرتی ہے۔ ایسی حکومت جو اس بات کو بالکل نظر انداز کر دیتی ہے کہ کوٹھی میں صبح تا شام کام کرنے والے مالی کی پرمشقت زندگی کا صلہ اس کی خدمت گزار بیوی کی وہ آلائش سے پاک محبت ہے جس سے وہ دن بھر کی کلفتوں کو بھولتا ہے۔ لیکن سرسیندر اسے کنتو کی بغاوت سے کیا سروکار۔ وہ تو ایک دماغی مشین ہے جو اقتصادی بھوک کی تسکین کے لئے چلتی رہتی ہے۔ اور شاید کچھ دن سے شیاما کو حاصل کرنے کے خیال سے وہ سوچتا تھا کہ وہ جو کچھ کمائے گا۔ اس سے اپنی ہونے والی بیوی شیاما کے لئے دھوتی، جمپر اور دوسری ضروریات بہم پہنچائے گا۔ لیکن اسے پھر خیال آجاتا کہ وہ شیاما کے ساتھ شادی کرنے میں کامیاب ہو سکے گا یا نہیں اور شیاما وہ پھر اس سے اتنی دور ہو جاتی جتنی دور کہ وہ پہنچ نہ سکے۔ کنتو اتنی نزدیک، مگر اسے کنتو سے کیا مطلب۔ اسے امید ہے کہ وہ جب کنتو کو پڑھا کر واپس جائے گا تو اس کھچیوں والے دروازے کے سامنے سے گزرے گا۔ جہاں شیاما بیٹھی۔ رامائن، گیتا پڑھ رہی ہوگی .... شیاما ..... شیاما ....

"شیاما۔ شیاما ...." ادھیڑ عمر عورت چلا رہی تھی .....

دن کے اس وقت سونی سنسان سڑک پر شیاما ایک گائے کے بچے کے پیچھے ہراساں ادھر ادھر دوڑ رہی تھی۔ ہانپ رہی تھی۔ اور شاید اسے اس گائے کے بچہ پر غصہ بھی آرہا تھا۔ بے قصور گائے کے بچے پر جو حیات نو یافتہ کی خوشی میں ادھر سے ادھر چھلانگیں لگاتا پھر رہا تھا۔ سفید بچہ خوبصورت پیارا، چکنی ملائم کھال۔ شیاما بے حال، دھوتی سر سے جدا شانوں پر بے ترتیبی سے پڑی ہوئی۔ سرسیندر کو شیاما دیکھتے ہی رک گئی۔ ایک غیر شعوری جذبہ کے زیر اثر۔ سڑک پر گائے کا بچہ کلیلیں کر رہا تھا۔

"شیا ما۔ شیاما" اس کی ماں برابر چلائے جا رہی تھی۔
شیاما نے اس بچہ کا تعاقب کرنا چھوڑ دیا اور بیٹھک کی طرف چل دی۔ سریندر کھڑا رہا۔ مبہوت۔ اسے خیال نہ رہا کہ اسے کنتو کو پڑھانے جانا ہے۔ اس نے گائے کے تھکے ہوئے بچہ کو کسی نہ کسی طرح پکڑ لیا۔ اور چمکارتا پچکارتا اس کھپچیوں والے دروازے کے پاس لے گیا۔ شیاما سر جھکائے کونے میں کھڑی ہوئی کیلنڈر کی طرف دیکھ رہی تھی۔
"بیٹا۔" عورت ہانپتے ہوئے بولی۔
"یہ آپ کا ہی بچھڑا ہے" سریندر نے بہزار وقت کہا۔
"ہاں بیٹا۔ بیٹھو۔"
"نہیں۔" اور وہ رک گیا۔ وہ شیاما کی ماں سے کیا کہے: "ماتا جی۔"
"ماتا جی" مگر نامعلوم یہ لفظ اس کی زبان پر کیوں نہیں آئے اور وہ صرف یہ کہہ پایا۔ "جی نہیں۔ مہربانی...." کونے میں کھڑی کھڑی شیاما گھر کے اندر جا کر غائب ہو گئی تھی۔
"کون برادری ہو بیٹا؟"
"برہمن۔"
"کہاں رہتے ہو بیٹا؟"
"...... محلے میں رہتا ہوں۔ اس ٹوٹے ہوئے مندر کے پاس۔"
"وہ اونچی ڈیوڑھی والا گھر ہے نا؟"
"ہاں جی۔"
سریندر چاہتا تھا کہ آج شیاما کی ماں سے وہ گھنٹوں بات کئے جائے اس بانس کی کھپچیوں کے دروازے کے پیچھے بنی ہوئی بیٹھک میں۔ لیکن اسے کنتو کو پڑھانے جانا تھا اور جلدی سے ادھر روانہ بھی ہو گیا۔
اس کے قدم کوٹھی کی طرف اٹھ رہے تھے۔ لیکن وہ سوچ رہا تھا کہ شیاما کیوں اتنی جلدی غائب ہو گئی۔ شاید اسے بیٹھک میں فرش تو ہڑپ نہیں کر گیا۔ پھر اسے محسوس ہوا۔ شیاما اگر اس کو اس سیاہی مائل سڑک سے بہشت کی بلندیوں تک پہنچا دیتی ہے۔ تو اس کی ماں بھی ایک نیک عورت ہے۔ جسے دیکھ کر اسے محسوس ہوتا ہے کہ اگر شیاما کو نہیں تو اس کے سائے کو ضرور دیکھ رہا ہے۔ بالکل بجنسہ شیاما کو جوانی کی منزل سے گذر کر ایک ادھیڑ عورت بن گئی ہے۔
سوچتے سوچتے کوٹھی آ گئی۔
کنتو چلا رہی تھی "ارے تم اس گائے کے چھوٹے سے بچے کو نہیں پکڑ سکتے؟"
وہ کنتو کے نزدیک پہنچ گیا۔ غصہ میں بھری کنتو کے پاس۔ جس نے جلدی جلدی...... نمستے ادا کر دی اور پھر مالی کے بارہ سالہ لڑکے نے اس بچھیا کو کنتو کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا۔ اور اس بارہ سالہ لڑکے کے گھٹنوں میں سے خون بہہ رہا تھا۔ چونکہ بار بار بجری کی سڑک پر گرنے اور کھال چھلنے سے روانہ ہو گیا تھا۔
"جا باندھ آ۔ اسے جا کر جلدی سے۔ رسہ مضبوطی سے نہیں باندھتے۔ چلئے ماسٹر جی ابھی آئی......"
شیاما۔ اور کنتو۔ شرمیلی اور غصیلی۔ غریب اور امیر عاجز اور مغرور......
اور سوچتے سوچتے وہ پھر اپنی زندگی کو پالنے کے کام میں مشغول ہو گیا۔

کنتو کا امتحان ہوا۔ اور وہ فیل ہو گئی۔
فیل ہو گئی۔ کیوں؟ سریندر نے محنت سے پڑھایا۔ لیکن کنتو الہڑ نوجوان بغاوت پر آمادہ تھی۔ وہ رومان سے ناآشنا تھی کوٹھی اور کلب کی چار دیواری میں پلی ہوئی لڑکی جس نے ساری عمر بے بس غریب نوکروں پر حکومت جتائی ہو۔ ہر طرح کے آرام مہیا جب اسے محسوس ہوا کہ اس کی زندگی کتنی پھیکی ہے خالی از لطف تو سرکشی پر آمادہ ہو گئی۔ گویا وہ کوٹھی کی چار دیواری کو توڑ کر بھاگ جانا چاہتی تھی۔
سریندر کو ایک ماہ کی پڑھائی کے پیسے وصول کرنے تھے لیکن وہ سوچتا تھا کہ وہ کس منہ سے پیسہ مانگنے جائے۔ جب اس کی ریاضت سے کنتو کامیاب نہیں ہوئی۔ مگر اس نے پھر بھی محنت کی ہے۔ وہ اس کا صلہ ضرور لے گا۔ پھر اسے خیال آ گیا شیاما کا جس کی خاطر وہ ضرور ان روپیوں کو وصول کرنے جائے گا۔ لہذا وہ چل دیا۔ اسی کوٹھی کی طرف جس کے راستہ کے درمیان کھپچیوں والا دروازہ تھا جس کے پیچھے اسکی شیاما دیوی' معصومیت کی دنیا بیٹھی رہتی تھی چپ چاپ آج وہ کھپچیوں والا دروازہ بند تھا اور سریندر کو ایسا محسوس ہوا کہ اس دروازے کے مقابل سڑک ہموار نہیں رہی بلکہ اس میں عمیق گڑھے پیدا ہو گئے ہیں۔ جن میں سے نکلنا ایک دشوار ترین مرحلہ بن گیا ہے۔ آج اس سڑک پر اونچے نیچے ٹیڑھے ترچھے سینکڑوں غار اور گڑھے پڑ گئے تھے۔ اس کھپچیوں والے دروازے اور کنتو کی کوٹھی کے درمیان۔ کوٹھی کے دروازے پر پہنچا۔ لیکن اس کی ہمت نہ پڑی کہ اندر گھسے اور اپنی ایمانداری کی محنت کے پیسے وصول کرے۔ پھر اسے خیال آیا۔ کنتو کا باپ ایک بڑا ڈاکٹر ہے جو بستر مرگ پر پڑے ہوئے مریضوں کو معائنہ کے بعد بھی اپنی فیس وصول کرتا ہے۔ اسے اپنی فیس سے سروکار خواہ مریض بقید حیات رہے یا لقمۂ اجل بن جائے۔ اور سریندر۔ اس نے بھی محنت کی۔ مگر کنتو نے اس سے فائدہ نہ اٹھایا' وہ بھی مجبور تھی لیکن پھر بھی اگر زندگی میں سریندر

نے کچھ حاصل کیا تھا تو ایمانداری، سچائی، شرافت اور آج اس کی ایمانداری مجبور کر رہی تھی کہ وہ اپنی محنت کے پیسے وصول نہ کرے۔ اتنے پیسے جو اس کی زندگی میں کافی اہمیت رکھتے ہیں۔ وہ سوچتا رہا۔ اس کی پیشانی پر پسینے کی بوندیں جمع ہو گئیں اور وہ وہاں سے چل دیا۔ اور کسی پارک کی بنچ پر جا کر بیٹھ گیا

دنیا میں سریندر ایسے انسان بھی زندہ رہ سکتے ہیں۔ کیا وہ اس دنیا میں زندگی بسر کرتا ہے۔ وہ اتنا خاموش کیوں ہے۔ کیا اس کی ضروریات نہیں۔ کیا اپنی زبان سے اپنی محنت کا معاوضہ بھی نہیں مانگ سکتا۔ کیا وہ ایک لڑکی سے محبت کرتے ہوئے بھی اپنا ارادہ کسی غیر پر ظاہر نہیں کر سکتا۔ یہ خیال تھا جو سریندر کو پریشان کر رہا تھا لیکن وہ سنجیدہ انسان تھا اسے معلوم تھا غریب کی محنت دنیا والوں کو آنکھوں میں کھٹکتی ہے۔ غریب انسان کو سخت محنت کرنے کے باوجود مالک کے کام بگڑ جانے پر معاوضہ تو درکنار الٹی دو چار کڑی باتیں پلے پیار کر سنبھالنی پڑتی ہیں۔

"شیاما کوک رہی ہے بن میں۔"

سریندر کی بہن نے سریندر کے کمرے میں قدم رکھتے ہی بلند آواز سے گا گا کر اس کی سمع خراشی کرنی شروع کر دی۔ وہ تو پہلے ہی دنیا سے آزردہ ہو چلا تھا۔

"شیاما۔ شیاما۔ شیاما۔" وہ سنتے سنتے تنگ آ گیا۔

"بھائی صاحب شیاما کوک رہی ہے بن میں۔"

اسکی سمجھ میں نہیں آیا معاملہ کیا ہے۔

"اوہ گوری گوری کلائیاں، پتلی پتلی، بالکل میم کے بچہ ایسی۔ بالکل شرمیلی چپ چاپ بیٹھی رہی۔"

"کون؟"

"شیاما۔ بھیا اب تو اس گھر میں شیاما کوکے گی۔"

سریندر کی ماں نے اسے بتا دیا کہ کس طرح شیاما کی ماں آئی تھی اور سریندر کی اس سے شادی طے ہو گئی ہے۔

آج سریندر کو معلوم ہوا کہ اگر سریندر ایسے انسانوں کا دنیا میں کوئی مدد کرنے والا نہیں تو پرماتما ضرور ہے۔

بیل گاڑی کچی سڑک پر جا رہی ہے۔ سریندر معہ اپنی بیوی شیاما کے پاس بیٹھا ہوا ہے۔ ایک چھوٹی سی بچی گاڑی کے ایک کونے میں آس پاس کے کھیتوں اور درختوں کا دلچسپی سے مطالعہ کر رہی ہے۔

وہ اب ایک گاؤں کے اسکول کا ہیڈ ماسٹر بن گیا ہے۔ اس سے زیادہ پر امن زندگی کیا ہو سکتی ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک اخبار ہے جو اس نے صبح سویرے شہر میں خریدا تھا۔ اخبار پڑھتے پڑھتے یکایک چونک اٹھا۔

"کیا ہوا جی؟"

"کچھ نہیں۔"

اخبار میں لکھا تھا کہ کنتو معہ افسانہ نگار کے غائب ہو گئی۔ شہر کے سب سے بڑے ڈاکٹر کی لڑکی۔

گاڑی اس کچی سڑک پر چلی جا رہی تھی۔ جس میں جگہ جگہ کھڈ اور گڑھے تھے لیکن سریندر کی زندگی کی سڑک اب بالکل ہموار تھی ایک دم صاف ستھری اور ہموار۔

سڑک کے کنارے کنارے ڈھاک کے درخت تھے جن میں شفق ایسے سرخ رنگ کے لال بھبوکا پھول کھلے تھے۔ کھردرے تنے اور معمولی پتوں بھری ٹہنیوں میں خوبصورت ٹیسو کے پھول مسکراتے ہیں اسی طرح اس کی شیاما ٹوٹی پھوٹی کھپچیوں کے دروازے کے پیچھے نسائیت کا پاکیزہ ترین پھول نشوونما پا رہا تھا۔ اور آج وہ سمٹی سمٹائی، گاڑی کے ایک کونے میں بیٹھی ہے، اس کے چہرے پر نور ہے اور آنکھوں میں چمک۔

زندگی ایک شاہراہ ہے۔ جس پر سریندر، کنتو، شیاما، افسانہ نگار سب کا گذر ہوتا ہے۔ سریندر جو ایک ایماندار اور شریف انسان ہے شیاما جس کے جیون کی انمول رتن ہے۔ اگر انسان نہیں تو خدا اس کی مدد ضرور کرتا ہے۔ کنتو۔ رومان اور محبت سے ناآشنا۔ امیر ماں باپ کی لڑکی۔ جسے رومان سے واقفیت پیدا ہوتے ہی ایک عجیب کیفیت طاری ہو گئی اور وہ اس رو میں بہ گئی۔

افسانہ نگار جنسی بھوک، بالکل ذہنی جنسی بھوک نے اسے ستایا تنگ کیا۔

شیاما۔ وہ شروع میں بھی ایک ہندوستان لڑکی ہے اور آخر میں بھی بھارت ورش کی ایک محترم عورت۔

گاڑی ہچکولے کھاتی ہوئی اس سڑک پر جا رہی تھی۔

چوں چوں، چوں۔ .....

بچی نے بقچہ میں سے ٹائم پیس کو اٹھایا اور کان لگا کر وہ سننے لگی۔

ٹک ٹک ٹک ......

گاڑی کے پہیے متواتر ملتے جا رہے تھے چوں چوں ....

پرتھوی ناتھ شرما

لندن سے آداب عرض

لڑائی کا زمانہ ۔ ہر چیز کی قلت ۔ ہر بات میں کفایت ۔ تنگی ترشی سے
گذارہ کرنا ہی پڑتا ہے ۔ پہلے میں کمرے میں تنہا رہا کرتا تھا ۔ اب ایک کمرے
میں ہم چار دوست رہتے ہیں ۔ پلنگ دو ہیں ۔ لیکن دو منزلہ اس طرح چار
بستروں کی جگہ نکل آئی ۔ بالائی منزل والے نے ذرا کروٹ لی تو زیریں منزل
کا بستر خود بخود ہل گیا ۔ نیچے کی منزل والا کسمسایا تو اوپر والے کی آنکھ کھل گئی ۔ رات
کو آسمان پر ہوائی جہاز اور ان کے پیچھے پیچھے اندھیرے آسمان پر بجلی کی لمبی لمبی
شعاعیں جیسے پتلی پتلی انگلیاں آسمان کا سینہ چیر رہی ہوں ۔ خدا جانے ہمارے
ہوائی جہاز ہیں یا دشمن کے آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں ۔ کبھی کبھی ہوائی خطرے
کے سائرن بھی بجتے ہیں ۔ کبھی زور سے بموں کے دھماکے بھی سنائی دیتے ہیں
ان سے کھڑکیوں کے شیشے جھنجھلا اٹھتے ہیں ۔ پچھلے سال ہوائی خطرے کا اعلان
سنتے ہی سب پریشان ہو جاتے تھے ۔ بھاگے بھاگے پناہ خانوں میں پہنچ
جاتے تھے ۔ لیکن ایک سال کی بمباری نے اب عادی سا بنا دیا ہے ۔ بم بھی گریں
تو کوئی پرواہ نہیں کرتا ۔ اب مساوات سی ہو گئی ہے ۔ آج کل ہماری رات خیریت
سے کٹ جاتی ہے ۔ صبح میری چھوٹی سی ٹائم پیس سریلی آواز میں گھنٹی بجاتی
ہے ۔ ڈیرہ دون سے چلتے وقت میرے شاگردوں نے یہ گھڑی مجھے تحفے کے
طور پر دی تھی ۔ افریقہ کے مغربی ساحل پر سے جب میرا جہاز گذر رہا تھا تو ایک
رات یہ فرش پر گر گئی ۔ اور اس کا شیشہ ٹوٹ گیا ۔ میں نے دل میں کہا جب تک
ہندوستان واپس نہیں جاؤں گا ۔ اس کا شیشہ نہیں لگواؤں گا ۔ چنانچہ آج
بھی اس کے شیشے میں بال پڑا ہوا ہے ۔ میرے پلنگ کے بالکل پاس ریڈیو
سٹ رکھا ہے ۔ آٹھ بجے آنکھیں بند کئے کئے اس کی گھنڈی گھما دی آٹھ بجے
صبح کی خبریں سنیں ۔ اندازہ ہو گیا کہ رات بھر دنیا میں کیا ہوا ۔ لڑائی کے زمانے
میں انسان کو خبروں سے کس قدر دلچسپی ہو جاتی ہے ایک ہی خبر بار بار سنتے
ہیں ۔ اخباروں میں پڑھتے ہیں ۔ اس پر بحث کرتے ہیں ۔ لیکن پھر بھی جی
نہیں بھرتا ۔ ابھی میرے تینوں دوست سو رہے ہیں ۔ جلدی جلدی حجامت
بنائی ۔ منہ دھویا ۔ اب ریڈیو پر امریکہ اور اسٹریلیا کا پروگرام چل رہا ہے ۔ امریکی
لہجے میں خبریں ۔ ناچ کے نغمے ۔ گانے ۔ لطیفے ۔ تقریریں ۔

کمرے سے نکلتے ہی باہر سیڑھیوں پر خادمہ نظر آئی ۔ سفید لباس
پہنے فرش صاف کر رہی ہے ۔ یہ اسکاٹ لینڈ کی رہنے والی ہے ۔ عجیب
لہجے میں انگریزی بولتی ہے ۔ اس کا کام مکان کی صفائی ہے ۔ اس لئے
میں اسے مہترانی کہتا ہوں ۔ خادمہ نے گڈ مارننگ کہا ۔ اور ایک ہی سانس
میں موسم کی تفصیل سنا دی ۔ اس کی زبانی مجھے رات بھر کے موسم کا حال اور صبح
کی موسمی خبریں مل جاتی ہیں ۔ اس ملک میں ہر بات موسم سے شروع ہوتی ہے
اور موسم پر ختم ہوتی ہے ۔ ہندوستان میں اگر ہمارے پاس گفتگو کا کوئی موضوع
نہ ہو تو دوسروں کی غیبت یا برائیاں کر کے وقت کاٹتے ہیں ۔ انگلستان میں
اگر وقت کاٹنا ہو تو موسم کا ذکر چھیڑ دو ۔ لیجئے ان کا کام شروع ہو گیا ۔ مکان میں اور
بھی بہت سے لوگ رہتے ہیں ۔ سب ہمارے ہی دفتر میں کام کرتے ہیں ۔
لیکن بہت سے ابھی سو رہے ہیں ۔ شاید رات کو چار بجے تک کام کر کے آئے
ہیں ۔ کھانے کے کمرے میں دو چار مرد عورتیں اور بھی بیٹھی ہیں ۔ کالا لباس
پہنے خادمہ جلدی جلدی ناشتہ لا رہی ہے ۔ سردی میں گرم گرم چائے ۔
چائے اس میں شکر کم ہی کیوں نہ ہو ۔ جسم میں جان سی ڈال دیتی ہے ۔ کمرے
میں کھانے کی کئی میزیں لگی ہوئی ہیں ۔ سامنے میز پر ایک سوئڈن کے رہنے
والے بیٹھے ہیں ۔ سنا ہے کہ کسی زمانے میں ٹینس کے بین الاقوامی کھلاڑی
تھے ۔ لیکن اب بیماری کی وجہ سے صرف تبرک بن کر رہ گئے ہیں ۔ جب دیکھو
چائے کی ایک پیالی لئے گھنٹوں اس کی چسکیاں لگاتے رہتے ہیں ۔ مجھے
دیکھتے ہی بولے آج کی تازہ خبریں سنیں ۔ میں نے خبروں کا خلاصہ سنا دیا ۔
انھوں نے ایک ایک بات کو بہت غور سے سنا ۔ اور پھر مکھن کی ایک بہت
چھوٹی سی مقدار کو بہت بڑے توس پر اس طرح پھیلانے لگے کہ کم سے کم
مکھن زیادہ سے زیادہ روٹی پر پھیل جائے ۔ ان کے برابر دوسری میز
پر ایک صاحب روسی بھوری بیٹھے ہیں ۔ چین بھی ہو آئے ہیں ۔ ان کی نگاہیں
عام طور پر عینک کے شیشوں کے اوپر سے دیکھتی ہیں ۔ غالباً انھیں خطرہ ہے
کہ اگر عینک کے شیشوں میں سے دیکھیں تو بہت ممکن ہے کہ شیشے کثرت استعمال
سے گھس جائیں گے ۔ میری پشت والی میز پر دو عورتیں ہمیشہ اسی جگہ بیٹھتی ہیں ۔
ایک کا قد لمبا ہے اور موزوں جسم دوسری کا جسم بھدا ہے اور قد چھوٹا ۔ اگر ناشتے
کے ساتھ انڈا ملے تو بہت شوق سے کھاتی ہیں لیکن مچھلی دیکھتے ہی فوراً
نہایت پھرتی سے اپنے کوٹ سنبھالتی ۔ بٹوے ہاتھ میں لئے کمرے سے باہر
نکل جاتی ہیں ۔

ناشتہ ختم ہوا ۔ میں ایک بار اپنے کمرے میں پھر گیا ۔ اور دوست
بستر سے باہر نکل چکے ہیں ۔ اور تیسرے دوست کو باہر نکالنے کی کوشش

کر رہے ہیں۔ ان کا اصرار ہے کہ بس اب نکلا۔ ابھی ان کی بحث درمیان ہی میں تھی کہ میں اپنی برساتی لے کر کمرے سے باہر نکل آیا۔ کمرے میں ایک باجہ بج رہا ہے لیکن شاید بحث کی وجہ سے سب اسے بھول چکے ہیں۔ بنگلے کے سامنے سڑک پر ٹھیک اسی وقت دودھ کی موٹر آن کر ٹھہری۔ دو لڑکیاں موٹر میں سے نکلیں دودھ کا بڑا سا برتن دونوں نے پکڑ کر موٹر سے اتارا۔ خدا جانے ہمارے بنگلہ میں رہنے والے کتنا دودھ روز پی جاتے ہیں۔ سامنے والے دروازے پر دھوبی کی موٹر کھڑی ہے۔ اس سے آگے قصائی کی موٹر ملی۔ یہاں کنجڑے قصائی دھوبی سب دکان دار موٹروں میں سامان بھر کر گاہکوں کے ہاں پہنچا دیتے ہیں۔ سڑک کے موڑ پر ایک چھوٹی سی بچی اپنے بھائی کو اسکول جانے پر آمادہ کر رہی ہے۔ بھائی کا جی اسکول جانے کو نہیں چاہتا۔ بہن بھلا پھسلا رہی ہے۔ مجھے دیکھتے ہی بولی۔ دیکھتے نہیں یہ کس شوق سے قدم اٹھائے دفتر جا رہے ہیں۔ اپنی تعریف سن کر میرا نفس موٹا ہو گیا۔ میں نے نہایت غرور سے ننھے میاں کی طرف دیکھا۔ اور زیادہ تیزی سے قدم اٹھانے شروع کر دئے۔

اب میں بڑی سڑک پر پہنچ گیا۔ یہاں سے ہمارا دفتر پورے دو میل ہے۔ سرکاری موٹر بس بھی چلتی ہے۔ لیکن صبح کے وقت ہمیشہ پیدل ہی جاتا ہوں۔ برف پڑے یا بارش ہو۔ مجھے صبح پیدل دفتر جانے میں بہت لطف آتا ہے۔ سڑک پر ایک آدھ دکان ابھی کھلی ہے دکان کے دروازے پر موٹے موٹے حرفوں میں لکھا ہے۔ یہاں سگرٹ نہیں ملتے۔ آج کل اس ملک میں سگرٹوں کی کمی ہے۔ لوگ دکان دار کو بار بار آن کر دق کرتے تھے اس لئے اس نے اب دروازے پر ہی لکھ کر لگا دیا ہے۔ سڑک پر سامنے سے سائیکل پر سوار ایک لڑکی اخبار اچھالتی چلی آرہی ہے۔ پہلے اس کا بڑا بھائی اخبار بانٹا کرتا تھا۔ لیکن جب سے وہ فوج میں بھرتی ہوا ہے۔ یہ کام اس لڑکی نے اپنے ذمے لے لیا ہے۔ ہر ایک گھر کے سامنے بغیر سائیکل سے اترے ایسا نشانہ باندھ کر اخبار پھینکتی ہے کہ سیدھا دروازے کے اندر جا پڑتا ہے۔ پھر اس کی یاد بھی کتنی اچھی ہے۔ جو اخبار جس گھر والے خریدتے ہیں وہی اخبار پھینکتی ہے۔ کیا مجال جو کبھی غلطی کر جائے۔

بڑی سڑک پر دن رات موٹریں چلتی رہتی ہیں۔ آس پاس کے دیہات سے کسان موٹروں میں سبزیاں بھر کر منڈی میں بیچنے کے لئے لاتے ہیں۔ پھلوں کا موسم ہو تو موٹروں پر آلوچے۔ سیب۔ وغیرہ لاتے ہیں۔ بڑی بڑی فوجی لاریوں میں ہوائی جہاز اور خدا جانے کیا کیا کل پرزے ادھر ادھر آتے جاتے رہتے ہیں، کبھی ہسپتال کے موٹر بھی نظر آجاتے ہیں سفید براق موٹر۔ ان پر سرخ صلیب کا بڑا سا نشان۔ موٹروں پر پردے پڑے ہوئے۔ زن سے موٹر گذر جاتا ہے۔ اسے دیکھ کر جسم میں جھرجھری سی آجاتی ہے۔ کبھی بڑی بڑی موٹر لاریوں میں بھرے ہوئے سپاہی بھی جاتے ہیں جب کوئی خوبصورت لڑکی سائیکل پر قریب سے گذرتی ہے تو سب سپاہی ایک آواز ہو کر کوئی گیت چھیڑ دیتے ہیں لڑکی ہاتھ ہلا کر سلام کرتی ہے۔ یا جھینپ کر نظریں نیچی کر لیتی ہے۔ سب سپاہی زور سے قہقہہ مارتے ہیں۔

ٹھیک سوا نو بجے مجھے اسی سڑک پر ایک سائیکل سوار لڑکی ملتی ہے۔ یہ ہمارے گاؤں کے ایک سینما میں کام کرتی ہے۔ اس کا تماشائیوں کو اندھیرے میں ان کی جگہ دکھانا ہے۔ یہ ہر ہفتے مجھے سائیکل پر جاتے جاتے نئے فلموں کا نام بتا جاتی ہے۔ میں ان فلموں کا ذکر اپنے دوستوں سے کر دیتا ہوں۔ اگرچہ ہمارے گاؤں میں دو سینما ہیں۔ لیکن یہ سب اسی لڑکی کے سینما میں جاتے ہیں۔ کیونکہ سینما کی اچھی تصویروں کا ہمیں پتہ بھی نہیں چلتا۔ اگر سینما کے منیجر کو یہ بات معلوم ہو جائے تو وہ لڑکی کی تنخواہ ضرور بڑھا دے۔ کہ یہ اشتہار کا کام بھی کرتی ہے۔

اب میں سڑک کے اس مقام پر پہنچ گیا کہ جہاں میرا راستہ کٹ کر بائیں طرف بڑھ جاتا ہے۔ اور بڑی سڑک آگے نکل جاتی ہے۔ اس راستے کے دونوں طرف سبزیوں ترکاریوں کے کھیت ہیں۔ ان کھیتوں میں موسم کے مطابق مٹر۔ گوبھی۔ آلو۔ گاجریں۔ کدو۔ فرانس بین۔ ککڑیاں کھیرے۔ ٹماٹر بوئے جاتے ہیں۔ اور زمینداروں کو ان فصلوں پر بہت محنت کرنی پڑتی ہے۔ اگر وقت پر بارش نہ ہو تو بجلی کے فواروں سے بارش کی طرح پانی برسا کر کیاریوں کو سینچتا ہے۔ جب فصلیں تیار ہو جاتی ہیں تو بہت زیادہ مزدوری دے کر عورتوں کو سبزیاں توڑنے کے لئے بلواتا ہے۔ اسی لئے ایک کھیرا دس بارہ آنے کو ملتا ہے۔ برابر ہی آلوچوں اور سیبوں کے باغیچے ہیں۔ کھیتوں میں آجکل کھدائی ہو رہی ہے۔ موٹر کار بھی لڑکیاں چلا رہی ہیں۔ انھیں زمینداری فوج کہتے ہیں۔ ان کی خاکی برجس اور سبز رنگ کے گلوبند۔ اونی سوئٹر دور سے نظر آجاتے ہیں۔ اس وقت یہ لڑکیاں دم لینے کے لئے درختوں کے نیچے بیٹھی ہیں چائے کی بوتلیں ان کے ہاتھ میں ہیں۔ اور جیب سے ڈبل روٹی کے ٹکڑے نکال نکال کر کھا رہی ہیں میں سڑک کے ساتھ والی پگڈنڈی پر چلتا ہوں۔ اس سڑک پر راستہ بہت کم چلتا ہے۔ کبھی کبھی کوئی موٹر گذر جاتی ہے۔ اب سڑک ایک پہاڑی پر سے نیچے اتر رہی ہے۔ سامنے سے ایک بڑھیا اپنے کتے کو سیر کرا کے واپس

آرہی ہے۔ اس کا کتا بہت بڈھا ہے۔ لیکن پرانا رفیق ہے اس لئے دونوں نے ایک دوسرے کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ پہاڑی پر چڑھتے ہوئے کتا ہانپ گیا یہ بھی ٹھٹک گئی کتا زبان نکالے ہانپ رہا تھا۔ یہ کھڑی اسے محبت بھری نگاہوں سے تک رہی تھی۔ ایک دن مجھے یہ سڑک پر نہیں ملی۔ دوسرے دن بھی نظر نہیں آئی۔ تیسرے دن میں نے اسے دیکھا تو بہت مغموم تھی اور کالا لباس پہن رکھا تھا میں ٹھہر گیا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یونان کی لڑائی میں اس کا لڑکا مارا گیا۔ خاوند پچھلی لڑائی میں کام آچکا تھا۔ اس روز سے یہ بہت مغموم رہتی ہے۔ اب ہر روز میں اسے گڈ مارننگ ضرور کہتا ہوں۔

اسی راستے پر ایک آدمی ہمیشہ گھاس کاٹتا رہتا ہے۔ بڑا سا چھرا لئے زور سے ہوا میں ہاتھ پھراتا ہے۔ لمبی لمبی گھاس کٹ کر اس کے سامنے گر رہی ہے۔ اس آدمی کی دائیں آنکھ پر ہمیشہ گلابی رنگ کی پٹی بندھی رہتی ہے۔ مجھے دیکھتے ہی ہاتھ روک لیتا ہے اور مسکرا کر بہت زور سے کہتا ہے "گڈ مارننگ گورنر"۔ مجھے اس کا نام معلوم نہیں لیکن میں ہمیشہ گڈ مارننگ رحم" کہتا ہوا آگے نکل جاتا ہوں۔ اب میرا راستہ بڑی سڑک سے آن ملا۔ سامنے سے وہ لوگ آرہے ہیں جن کی رات کی ڈیوٹی تھی۔ رات بھر کام کیا ہے اس لئے سب کی آنکھوں میں نیند کا خمار ہے یہ سب سائیکلوں پر سوار ہیں۔ سڑک پر صرف میں ہی پیدل جا رہا ہوں۔ جب سڑک پر برف جم جاتی ہے تو پاؤں پھسلتا ہے۔ لیکن میں اپنی چھڑی کی مدد سے قدم جماتا پیدل چلا جاتا ہوں۔ سامنے سے آنے والے مردوں کی ڈاڑھیاں بڑھی ہوئی ہیں ٹائی کی گرہ ڈھیلی ہے جلدی جلدی قدم مارتے اپنے اپنے گھر جا رہے ہیں۔ دن بھر سوئیں گے۔ تیسرے پہر اٹھیں گے اور رات کے بارہ بجے سے پھر کام شروع کر دیں گے۔ لڑکیوں نے پوڈر اور غازے کی مدد سے ہر چند اپنے چہروں کو پر رونق بنایا ہے لیکن رات بھر جاگنے سے ان کی آنکھیں بھی سرخ ہیں۔ جب سے گرمی آئی ہے لڑکیاں بہت ہلکے پھلکے لباس پہنتی ہیں۔ یہاں سب کو غسل آفتابی کا بہت شوق ہے۔ سورج کی... شعاعوں سے جس کا جسم گندمی ہو جائے اس کی سب تعریف کرتے ہیں اور یہ شوق جنون کی حد تک پہنچ چکا ہے۔ ایک لڑکی ہاتھ چھوڑ کر سائیکل چلا رہی ہے۔ جب سب کی نظریں اس کی طرف اٹھتی ہیں تو فوراً ہاتھ ہینڈل پر رکھ لیتی ہے۔

سڑک کے دونوں طرف کھیت ہی کھیت ہیں۔ ایک طرف کھیتوں کے نیچے دریا بہتا ہے دریا کیا ہے ہندوستان کی چھوٹی سی نہر سمجھئے، گرمی کے موسم میں تیسرے پہر سے لوگ دریا میں کشتیاں چلاتے ہیں۔ نہاتے ہیں اور بہت سے لوگ شکار کے شوقین کنارے پر بیٹھے اونگھتے رہتے ہیں۔ مچھلی کا شکاری چاہے جمنا کے کنارے بیٹھے یا انگلستان کے کسی دریا کے کنارے اس کی شکل اور اوصاف میں فرق نہیں آتا۔ وہی آنکھوں میں دھندلی سی چمک۔ جھکی ہوئی گردن۔ اور دور پرے ہاتھ دریا کے اس پار پہاڑی ہے۔ اس کی چوٹی پر سے ریل گذرتی ہے۔ کھیتوں میں مزدور عورتیں کام کر رہی ہیں۔ مرد فوج میں بھرتی ہو گئے اس لئے عورتوں سے کام لیا جا رہا ہے۔ ہندوستان کی طرح بہت سے خانہ بدوش قبیلے انگلستان ہی میں آباد ہیں۔ ان کا لباس ان کی شکلیں ہندوستانی خانہ بدوشوں سے بہت ملتی جلتی ہیں۔ ان کی زبان بھی انگریزی نہیں بلکہ ایک خاص بولی ہے۔ کھیتوں کے برابر گھاس کی چراگاہ ہے۔ جب سے گرمی آئی ہے۔ اس میں ایک کاٹ کی بڑی سی گاڑی آن کر لگ گئی ہے۔ اس میں بہت سی لڑکیاں رہتی ہیں۔ گاڑی کے سامنے ان کا سامان پھیلا پڑا ہے۔ چار کے برتن۔ سپرٹ کا چولھا۔ تولئے کبس۔ نہانے کا لباس۔ گاڑی کے اندر زیادہ سے زیادہ تین بستروں کی جگہ ہے۔ لیکن ہر وقت یہاں لڑکیوں کا مجمع لگا رہتا ہے۔ کیا کیا جائے۔ لڑائی کا زمانہ ہے۔ ہر چیز کی قلت ہے۔ ہر بات میں کفایت۔ تنگی ترشی سے گذارہ کرنا ہی پڑتا ہے۔

تیسرے پہر شہر کی سیر کیجئے۔ چھوٹا سا شہر ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے۔ کہ یہ بڑا سا گاؤں ہے۔ لیکن ضرورت کی سب چیزیں مل جاتی ہیں۔ بڑے بازار میں کوئی دو سو کے قریب اچھی بڑی بڑی دکانیں ہیں۔ ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں جو نعمت نہ ملے وہ یہاں اس چھوٹے سے شہر میں مل جاتی ہے، البتہ جب سے روشنی بند ہوئی ہے دکانوں کی رونق ذرا کم ہو گئی ہے۔ پہلے کپڑے والوں کی دکان کے سامنے خاصہ مجمع لگا رہتا تھا۔ لندن کی نئی نئی تراشوں کے نمونے دکھائے جاتے تھے۔ اب وہ پہلے جیسی رونق نہیں رہی۔ ہفتے کے دن تیسرے پہر بازار میں بہت چہل پہل رہتی ہے۔ آس پاس کے دیہات سے ہی لوگ خرید و فروخت کے لئے آتے ہیں۔ بڑے بازار میں تو چلنے کو راستہ نہیں ملتا۔ کبھی کبھی اس بازار میں دس بارہ ہندوستانی جوان بھی نظر آتے ہیں۔ یہ کئی سال سے انگلستان میں رہتے ہیں۔ سب پنجاب کے رہنے والے ہیں، محنت مزدوری کر کے پیٹ پالتے ہیں۔ جب سے جنگ چھڑی ہے ان کا کاروبار چمک رہا ہے۔ لندن سے چھوٹی موٹی بساط خانے کی چیزیں یہ خرید لیتے ہیں اور پھر گاؤں گاؤں پھر کر انہیں بیچ دیتے ہیں۔ اس میں بھی انہیں کافی پیسے بچ جاتے ہیں۔ انگلستان میں رہتے رہتے اب یہ اپنی زبان بھول رہے ہیں عام طور سے انگریزی زبان بولتے ہیں۔ تعلیم کی کچھ یونہی سی شد بد ہے۔ کسی جہاز پر کام

کرتے ہوئے یہاں پہنچ گئے۔ ملک پسند آیا۔ یہیں رہ پڑے۔ ملک خدا تنگ نہیں نہیں کون روک سکتا ہے۔

روز پیدل چلتے چلتے میرا جوتہ گھس گیا۔ نیا تلا لگوانا ہے۔ سامنے ہی چمار کی دکان ہے۔ ہندوستان کے چمار کی دکان نہ سمجھئے۔ انگریزی چمار کی دکان ہے۔ دکان کے باہر شیشے کی الماری میں مرمت کئے چمکدار جوتے لٹک رہے ہیں۔ دروازہ کھول کر اندر گھسا تو دروازے میں ایک گھنٹی لگی ہوئی تھی۔ خودبخود بجنے لگی۔ دکاندار کو اطلاع ہو گئی کہ گاہک آیا ہے۔ سامنے میز پر دو کاریگر کھڑے بجلی کی مشین پر کام کر رہے ہیں۔ سوٹ پہنے۔ گلے میں سفید گردپوش باندھے کہ سوٹ خراب نہ ہو جائے۔ ایک کونے میں ریڈیو سٹ بج رہا ہے۔ موسیقی کی تان پر کاریگر کا ہاتھ جلدی چلتا ہے۔ دوسرے دھیان بٹا رہے تو تھکتا نہیں۔ اس لئے باجہ بجتا رہتا ہے۔ دکاندار نے آگے بڑھ کر مسکرا کر سلام کیا۔ میں نے جوتہ پیش کیا۔ دکاندار نے نہایت غور سے دیکھا۔ اور کہا آپ نے باہر دروازے پر نوٹس دیکھا ہوگا۔ اگست کے پہلے ہفتے میں ہماری دکان کے کاریگر گرمی کی چھٹیاں منانے جا رہے ہیں۔ آپ کا کام پندرہ اگست کو تیار ملے گا۔ اور تلا لگوانے کے گیارہ شلنگ ہوں گے۔ (یعنی تقریباً سات روپے) میں نے کہا بہت اچھا۔ بنا دیجئے۔ دکاندار نے رجسٹر نکالا۔ میرا نام اور پتہ لکھا۔ کاٹ کر رسید میرے حوالے کی۔

چمار کی دکان سے نکلا تو دل میں معاً ہندوستان کا خیال آیا۔ کتنا فرق ہے یہاں کی زندگی میں۔ چاندنی چوک کا بڑے سے بڑا دکاندار بھی گرمی کی چھٹیاں نہیں مناتا۔ اسے ریڈیو کے گانے کب نصیب ہوتے ہیں۔ یہ رجسٹر پر گاہکوں کے نام کب لکھتا ہے اور پھر ہندوستان میں وقت پر کام کب تیار ملتا ہے؟ دل نے جواب دیا۔ حضرت ہندوستان کا چمار تلا لگانے کے سات روپے بھی تو وصول نہیں کرتا۔ سات روپے میں ہندوستان کا چمار اور نئے جوتے بنا دیتا ہے۔

چھ بجے شہر کی سب دوکانیں بند ہو جائیں گی۔ جو کچھ خریدنا ہے جلدی جلدی خرید لیجئے۔ اتوار کو تو سب دکانیں بند رہتی ہیں اس کے علاوہ بدھ کے دن ایک بجے سے بازار بند ہو جاتا ہے۔ گویا دکاندار اور کاریگر کو ہفتے میں ڈیڑھ دن کی چھٹی ملتی ہے۔ یہ قانون دکانداروں نے مل کر خود بنایا ہے۔ اسے کوئی توڑ نہیں سکتا۔

بازار بند ہوتے ہی گاہکوں کی گرم بازاری ختم ہوئی۔ اندھیرا ہوتے ہی گاؤں کے لڑکے بالے اور لڑکیاں سیر کو نکل آئے۔ کچھ بازار کے اس کونے پر کھڑے ہنس بول رہے ہیں۔ کچھ گرجا کے سامنے گا رہے ہیں۔ دور سے کچھ سپاہی گاتے چلے آ رہے ہیں۔ ان کے گانے بھی موسم کی طرح بدلتے رہتے ہیں۔ پچھلے سال جب لندن پر بم برس رہے تھے تو لندن کی تعریف کے گیت گائے جا رہے تھے۔ ہر شخص کی زبان پر تھا "لندن پھر زندہ ہوگا"۔ ہوائی جہازوں میں اڑ کر دشمن سے لڑنے والے سپاہیوں کی زندگی کا کیا بھروسہ۔ ہر وقت ہتھیلی پر جان لئے پھرتے ہیں۔ ان کا گیت تھا "میری محبوبہ میری سلامتی کے لئے دعا مانگو" سمندری بیڑے میں کام کرنے والے ملاح ہری جگ ہیں۔ ان کی زندگی سمندر کی لہروں کی طرح رواں رواں رہتی ہے۔ لیکن ہر جگہ یہ بھی گیت گاتے ہوئے نکل جاتے ہیں "گھبراؤ مت۔ میں پھر آؤں گا"۔

دسمبر کے مہینے میں ایک شام غضب کی برف پڑ رہی تھی۔ سردی کے زمانے میں چار بجے سے سورج چھپ جاتا ہے۔ چاروں طرف اندھیرا تھا۔ سڑک پر سامنے مکانوں کی چھتوں پر ہر جگہ سفید برف جمی ہوئی تھی دو سپاہی ایک عجیب گیت گاتے ہوئے سڑک پر جا رہے تھے معلوم ہوا کہ یہ پچھلی لڑائی کا گیت ہے۔

"میں بمبئی سے آ رہا ہوں۔ میری پیاری میرا انتظار کر۔" میں ریڈیو پر ہندوستان کا ریڈیو سن رہا تھا۔ ہندوستان میں رات کے دس بج رہے ہیں۔ سمندر پار کے ہندوستانی سپاہیوں کے لئے ایک خاص پروگرام شروع ہو رہا ہے۔ اناؤنسر نے ایک ریکارڈ لگا دیا۔

"ڈولے' ڈولے پردے کی نیّا"

کمرے میں آگ جل رہی ہے۔ میں آتش دان کے سامنے ایرانی عبا پہنے بیٹھا ہوں۔ کتاب میرے ہاتھ میں ہے۔ لیکن دل ہندوستان پہنچ گیا دلی۔ جامع مسجد۔ جمنا۔ چاندنی چوک۔ لال قلعہ۔ خواجہ حافظ نے کیا آج ہی کے لئے کہا تھا۔ میں نے ریڈیو کی لہروں سے مخاطب ہو کر کہا۔

اے صبا گر بگذری بر ساحل رود ارس
بوسہ زن بر خاک آں وادی و مشکیں کن نفس

لندن سے دلی کی خدمت میں آداب عرض۔

آغا محمد اشرف۔ ایم۔ اے

دُکھی سلمیٰ

سلامت اور سلمہ کو ایک دوسرے سے محبت ہوئے ایک زمانہ ہو چکا تھا۔

سلامت کی عمر تیس کے لگ بھگ تھی۔ لیکن شکل وصورت سے وہ بیس اکیس کا دکھائی دیتا تھا دبلا جسم خمیدہ شانے بھینچے ہوئے ہونٹ گھنے ابرو۔ آپ اس سے کوئی بات بھی کریں جواب میں اس کے ہونٹوں پہ اک موہوم سی مسکراہٹ آجائے گی۔ لیکن وہ مسکراہٹ عام مسکراہٹ سے کس قدر مختلف ہوتی ہے۔ چاہے آپ اسے مسکراہٹ سمجھ لیں یا ایک ہلکی سی کراہ یہ سراسر آپ کی مرضی پر منحصر ہے۔ کھکھلا کر تو وہ ہنستا نہیں ہنستے ہی تو آنکھوں میں آنسو جھلک آتے ہیں۔ اور قہقہہ ہچکی میں بدل جاتا ہے۔ اگرچہ دفتر کے کام میں وہ مجھ سے کہیں ہوشیار ہے۔ اور میں اکثر اپنے حصے کا کام اس سے کرواتا ہوں لیکن اس کے باوجود نہ جانے کیوں میں محسوس کرتا ہوں گویا وہ ایک قابل رحم آدمی ہے۔ میرا یہ احساس اس حد تک پہنچ چکا ہے کہ جب میں اپنے حصے کا کام کرنے کے لئے اسے دیتا ہوں تو سمجھتا ہوں گویا اس پر کوئی خاص احسان کر رہا ہوں۔ ویسے تو وہ بڑے شوق سے میرا کام کر دیتا ہے۔ لیکن ایک ساعت کے لئے اس کی بھاری بھویں اٹھتی ہیں۔ آنکھیں ڈبڈبا جاتی ہیں اور ہونٹ یوں سمٹ جاتے ہیں کہ میں دل ہی دل میں اپنے آپ کو کوسنے لگتا ہوں۔ لیکن تماشا یہ ہے کہ اگر میں اپنے حصے کا کام اس کے سر نہ ڈالوں۔ تو بھی اس کی خاموش نگاہیں مجھے اس بے اعتنائی پر کوستی ہیں۔ اور میں محسوس کرتا ہوں۔ گویا میں اس سے کوئی بے انصافی کر رہا ہوں اس سمے بھی اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں۔ مگر آنسو پینے میں تو اسے کمال حاصل ہے۔ کمال۔ مصیبت تو یہ ہے کہ آنسو پینے کے لئے یہ ضروری ہے کہ آنسو ہوں جو پئے جا سکیں۔

سلمہ سلامت کی رشتہ دار ہے۔ خالہ زاد ہے یا پھوپی زاد یہ مجھے یاد نہیں، وہ کمبخت حسین بھی ہے بے حد لیکن اس کا حسن کچھ ایسا ہے کہ دیکھ کر خواہ مخواہ دل پہ اداسی چھا جاتی ہے۔ اس کے پاس بیٹھ کر بھی یہی جی چاہتا ہے کہ اس کے فراق میں گیت گنگنائیں اس کی خاطر آہیں بھریں اور اس کے لئے مر جائیں۔ جانے کیا ہوتا ہے اس کے سامنے بیٹھ کر اس کے حسن سے اداسی چھن چھن کر چاروں طرف چھا جاتی ہے۔ اور یہ خیال بھی نہیں آتا کہ وہ محبوبہ جس کی ہمیں آرزو ہے ہمارے پاس بیٹھی ہے یا اس سے پیار کیا جاتا ہے۔ یعنی اس کی موجودگی میں عجیب ترین بات یہ ہے کہ آرزو محبوبہ سے بے واسطہ ہو کر محبت کرنے پر منطبق ہو جاتی ہے ایک بے نام سی بیکلی چھا جاتی ہے ایک دلچسپ سا احساس نامرادی حاوی ہو جاتا ہے گویا کوئی نامعلوم غم اپنی آغوش میں لے کر لوریاں دے رہا ہو۔

ان دنوں سلامت اکثر سلمہ کے گھر آیا جایا کرتا تھا۔ لیکن جہاں تک میں سمجھتا ہوں اسے سلمہ سے محبت نہ تھی۔ وہ بیچارا تو ہر گھڑی اس فکر میں رہتا تھا کہ اس کے چچا اس پر کس قدر مہربان تھے اور انھوں نے اس کی تعلیم پہ اس قدر روپیہ صرف کیا تھا اور ان کی بیٹی نجمہ کتنی حسین تھی اور ان کا ارادہ تھا کہ نجمہ کا سلامت سے بیاہ کر دیا جائے' اپنے چچا کی گذشتہ مہربانیوں کو یاد کر کے اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے تھے —— پھر خدا جانے کیا ہوا پوری تفصیلات سے تو مجھے واقفیت نہیں۔ سلمہ سے سنی سنائی بات کہتا ہوں۔ ایک روز جب سلامت اور سلمہ بیٹھے رو رہے تھے نہ جانے کس بات پر کوئی بات ہوگی۔ سلمہ کا بیان ہے کہ اس کے چچا نے اسے دو سوٹوں کے لئے کپڑا بھیجا تھا اور چچا کی اس مزید مہربانی نے ان کی گذشتہ مہربانیوں کی یاد تازہ کر دی تھی اور وہ ان کی مہربانیوں کا قصہ سناتے ہوئے رو پڑا تھا سلمہ کا بھی جی بھر آیا۔ خیر کچھ بھی ہو یہ تو مسلمہ بات ہے کہ وہ دونوں بیٹھے رو رہے تھے کہ سلمہ کے ابا آگئے۔ انھیں ان دونوں کا مل کر رونا بیحد ناگوار گذرا۔ شاید اس لئے کہ وہ کسی اسکول میں ٹیچر تھے اور ان کا ایمان تھا کہ اگر دو بچے بیٹھے رو رہے ہوں تو ظاہر ہے کہ دونوں نے مل کر کوئی گناہ کیا ہے۔ شاید ان کا یہ قیاس ٹھیک ہو۔

تو صاحب نتیجہ یہ ہوا کہ سلامت میاں تو چلے آئے لیکن ان کے جانے کے بعد باپ نے بیٹی پر سلامت کا الزام لگا دیا اور ڈانٹ ڈپٹ کے علاوہ میز پر چھڑی مار مار کر یہ اعلان کر دیا کہ خبردار جو سلامت کو گھر آنے دیا تو —— اگر سلمہ کی ماں زندہ ہوتی تو شاید اس بات کا نتیجہ اس قدر بُرا نہ ہوتا۔ لیکن اسے مرے ہوئے تو ایک عرصہ ہو چکا تھا اور سلمہ کی دونوں بہنیں بہت چھوٹی تھیں۔ بہرحال ابا کی اس بات پہ سلمہ

بہت روئی اتنا روئی کہ اسے سلامت سے محبت ہو گئی۔ لیکن بے چارے سلامت کو کیا خبر تھی کہ سلمہ نے اس کے لئے رو رو کر اس سے محبت پیدا کرلی ہے۔ وہ بیچارا تو اسی فکر میں ڈوبا رہا۔ کہ اس کے چچا اس پر کس قدر مہربان تھے اور بجنہ کس قدر حسین۔

دو ایک دن کے بعد جب سلمہ نے کہلا بھیجا کہ مجھے شالامار میں ملو تو وہ حیران رہ گیا۔ بھلا شالامار میں ملنے کی کیا ضرورت تھی کہ وہ مجھے بھی اپنے ساتھ لے گیا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی یا بدقسمتی یہ میں نہیں کہہ سکتا۔

شالامار میں وہ ایک بنچ پر بیٹھی انتظار کر رہی تھی۔ اس روز میں نے اسے پہلی مرتبہ دیکھا۔ ہوا میں اڑتی ہوئی لٹوں تلے اک زرد سا کتابی چہرہ کچھ کہتی ہوئی نیم وا آنکھیں اور پتلی پتلی اضطرابی انگلیاں۔ دو فقروں میں ہی اس نے تمام قصہ سنا دیا اور پھر اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

سلامت نے اک آہ بھری اور کہنے لگا "سلمہ مجھے بےحد افسوس ہے کہ میری وجہ سے تم خواہ مخواہ بدنام ہو گئیں"۔

"ہاں خواہ مخواہ" وہ بولی "اسی بات کا تو مجھے دکھ ہے اگر ابا کا شک سچا ہوتا ——"

"لیکن سلمہ تمہارے ابا کیا سمجھ رہے ہیں"؟ اس نے بات کاٹ کر اضطراب سے پوچھا۔

"میں کیا جانوں" وہ بولی —— "شاید ان کا خیال ہے کہ ہم دونوں میں کوئی بات ہے"۔

"بات! بات کیسی؟ لاحول ولا قوۃ!!"

"آپ ہی جانیں" سلمہ نے زیر لب کہا۔ لیکن سلامت اپنے ہی خیال میں کھویا ہوا تھا۔

باغ میں ہوا سے پتے کھڑکھڑا رہے تھے۔ زرد سوکھے ہوئے پتے، ٹہنیاں انگلیاں اٹھائے سرگوشیاں کر رہی تھیں۔ دور روشوں پر چند دھندلی دھندلی شکلیں یوں چل پھر رہی تھیں۔ جیسے کسی ویران مکان میں بھوت اُن کے بے ہنگم قہقہے دیواروں سے جا کر ٹکراتے اور گنبدوں میں سے کوئی چیخ چیخ کر ان کا منہ چڑاتا۔ اور پھر —— پھر وہ چھائی ہوئی اداسی اور بھی گہری ہو جاتی

"اب کیا ہوگا" وہ لمبی آہ بھر کر بولی۔

"ہوگا کیا نہ جانے کیا ہوگا —— مجھے تو تمہاری فکر ہے"۔

"میرا کیا ہے —— جو آپ چاہیں گے وہ ہو جائے گا"۔

"میں میں" وہ گھبرا کر کہنے لگا "میں تو کچھ بھی نہیں چاہتا میں کر ہی کیا سکتا ہوں سلمہ"؟

سلمہ کی آنکھیں اس کالے بھنورے کی طرف دیکھنے لگیں جو پاس ہی پھولوں پر اڑ رہا تھا۔

"مجھے تو یہ افسوس ہے کہ تمہاری زندگی —— اتنا کہہ کر وہ چپ ہو گیا اس کے آنسو اس کے حلق میں پھنس گئے۔

"میری زندگی کا کیا ہے میری زندگی میں دکھ کے سوائے اور ہے ہی کیا مجھے تو آپ کی فکر ہے"۔

"میں میں" وہ گھبرا گیا جیسے یہ بات اسے سوجھی ہی نہ تھی "ہاں خدا جانے چچا کیا سمجھیں گے اور بجنہ کیا کہے گی بیچاروں کو اتنا صدمہ ہوگا" وہ زیر لب بڑبڑایا گویا اپنے آپ سے کہہ رہا ہو۔

"کس بات کا صدمہ" سلمہ کی آنکھیں چوری چوری سلامت کی نگاہوں میں ٹٹول رہی تھیں۔

"ہیں؟" وہ بولا "مجھے معلوم نہیں"۔

خدا جانے کتنی دیر وہ یونہی بیٹھے رہے ان کی موجودگی سے تمام باغ پر اداسی چھا رہی تھی ایسا معلوم ہو رہا تھا گویا وقت چلتے چلتے رک گیا ہو۔ گویا کسی پرانے اجڑے ہوئے جہان کے ملبے سے ایک نیا جہان تعمیر ہو رہا ہو۔ میرا دل بھی بھرا ہوا تھا نہ جانے کیوں اور جی چاہتا تھا کہ سلمہ سے لپٹ کر چیخیں مار مار کر روؤں اور پھر۔ پھر اس جامنی میلی میلی سی دیوار سے سر پھوڑ کر مر جاؤں۔ دل دماغ پر ایک پرکیف بےحسی چھا رہی تھی۔ اعضا گویا میرے قابو سے نکلے جا رہے تھے۔ میں گھبرا کر بڑی کوشش سے اٹھ بیٹھا۔ اور جا کر روش پر ٹہلنے لگا پرندے ابھر ابھر کر فریاد کر رہے تھے سامنے چھوٹے چھوٹے فوارے بیٹھے آنسو بہا رہے تھے اور دیوار کے اس پار بجلی کا پمپ سسکیاں بھر رہا تھا۔

وہ دونوں کئی اک بار شالامار یا مقبرے میں ایک دوسرے سے ملے لیکن ان کی باتیں وہی پرانی تھیں اور وہی اداس انداز۔ سلامت ویسے ہی اپنی بھاری بھوئیں اٹھا کر کہتا "اب کیا ہوگا؟" اور اس کی خمدار کنکھیاں چوری چوری سلامت کی طرف اٹھتیں "جو بھی آپ چاہیں"۔ "میں۔ میں تو کچھ بھی نہیں چاہتا" وہ گھبرا کر کہتا "اچھا جو آپ کی مرضی" اور وہ اک آہ بھر کر چپ ہو جاتی لمبے ننھے ننھے فواروں میں سے ٹپ ٹپ آنسو گرتے۔ ٹہنیاں جھوم جھوم کر سرگوشیاں کرتیں۔ البتہ ان کی وہ پرکیف اداسی میرے لئے اور بھی جاذب توجہ ہوتی گئی اور پس منظر اور بھی اداس۔

شروع شروع میں تو ان کے رویے پر مجھے بےحد غصہ آیا کرتا تھا سلامت کی بےحسی پر میرا دل کھولتا کہ وہ یوں چپ چاپ بیٹھ رہتا ہے جب کہ وہ رو رو کر ہلکان ہو رہی ہوتی ہے وہ پاس بیٹھ کر بھی دور رہتا ہے۔ میں تو یہ چاہتا تھا کہ سلامت سلمہ کو آغوش میں لے لے اسے پیار بھرے لفظوں سے تھپک تھپک کر چپ کرا دے یا اسے چھیڑ چھیڑ کر ہنسا دے اور وہ دونوں ہنس ہنس کر باتیں کریں۔ اور —— لیکن آہستہ آہستہ ان کی

اداسی مجھ پر بھی چھا گئی۔ میرا غصہ ترس میں بدل گیا۔ ایک دلچسپ احساس نامرادی میری رگ رگ میں سرایت کر گیا۔ ان کے پاس بیٹھ کر ان کے دکھ کو اپنا دکھ سمجھنے میں لطف آنے لگا۔ حتیٰ کہ میں ان کی ملاقاتوں کا بے صبری سے انتظار کرنے لگا۔ البتہ کبھی کبھار میرے دل میں دیوانہ دیوار یہ خواہش اٹھتی کہ سلمہ سے لپٹ کر رو دوں۔

آپ مجھ سے واقف نہیں۔ میں طبعاً اس قدر بزدل اور ڈرپوک واقع ہوا ہوں کہ اس ڈر کے مارے کہ میری بزدلی کا حال نہ کھل جائے۔ اکثر بے سوچے سمجھے ایسے دلیرانہ کام کر جاتا ہوں کہ اور تو اور میں خود اپنے کئے پر حیران ہوا کرتا ہوں۔ اگر ہمدردی یا جوش یا کسی وجہ سے بھی میں سلمہ کو اعلانیہ گلے لگا کر رو دیتا تو مجھے اپنے اس فعل پر قطعی تعجب نہ ہوتا۔ لیکن نہ جانے کیوں اس کے سامنے جا کر میری طبعی بیتابی اور گھبراہٹ وقتی طور پر دب جاتی ہے اور ایک ناقابل فہم پُرلذت بے حسی نشے کی طرح چھا جاتی ہے۔ البتہ جب وہ چلی جاتی ہے تو گویا میں جاگ اٹھتا ہوں اور مجھے اور بھی غصہ آتا ہے۔ اپنی گذشتہ بے حسی پر یا اپنے جاگ اٹھنے پر یہ میں نہیں جانتا تھا۔ اسی طرح ان دنوں بھی جب وہ چلی جاتی تو مجھے بےحد غصہ آتا تھا جی چاہتا تھا کہ سلامت کو ایک ایسا طمانچہ دوں کہ میاں کو ہوش آ جائے لیکن سلامت کی قابل رحم اداس صورت دیکھ کر اسے طمانچہ مار دینا خدا کی قسم بڑی ہمت کا کام ہے یہ تماشا ہے کہ طمانچہ مارنے کی بجائے الٹا مجھے اسے تسلیاں دینی پڑتی تھیں گویا قصور میرا ہو اور وہ بیچارا مفت میں بھگت رہا ہو اور وہ کمبخت سارا دن یہی بڑبڑاتا رہتا تھا: "نجمہ کیا سمجھے گی' چچا کیا کہیں گے عجب مصیبت ہے۔"

خدا جانے بات کیسے نکل جاتی ہے۔ لیکن بات نکل ضرور جاتی ہے۔ سلامت کے چچا کو ان چوری چوری ملاقاتوں کا حال معلوم ہو گیا۔ تو صاحب انھوں نے تار دے کر سلامت کو بلایا۔ دو دن کے بعد جب وہ واپس آیا تو اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں اور وہ بار بار بڑبڑاتا "اب میں کیا کروں ——— سلمہ کیا کہے گی۔" نجمہ کی جگہ سلمہ کا نام سن کر میں فوراً سمجھ گیا کہ کوئی بات ہے بات کیا ہونی تھی۔ بس چچا نے اسے بلا کر اس کا اور نجمہ کا نکاح پڑھوا دیا تھا۔ لیکن اپنے منہ سے سلامت نے مجھے یہ بات نہ بتائی۔

اس واقعہ کے بعد جب سلمہ نے اسے ملنے کے لئے بلا بھیجا تو وہ بہت گھبرایا۔ "تم جاؤ قیوم بھائی" اس نے مجھ سے کہا "اسے سمجھا دینا مجھے اس سے بےحد ہمدردی ہے لیکن میں مجبور ہوں۔" اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور وہ میرا ہاتھ تھپکتے ہوئے کہنے لگا "تم تو جانتے ہی ہو میں عمر بھر سلمہ کا ہی رہوں گا۔ مجھے اس سے کوئی جدا نہیں کر سکتا۔ وہ جانتی ہے وہ سمجھ جائیگی۔"

"تم نہیں جانتی سلمہ سلامت میں جرأت نہیں۔ اس کا نجمہ سے نکاح ہو چکا ہے وہ تم سے کھلونے کی طرح کھیل رہا ہے۔ اپنی جوانی پر رحم کھاؤ سلمہ اس کا خیال چھوڑ دو' وہ فضول تمہاری زندگی برباد کر رہا ہے" ہمدردی کے مارے یا خدا جانے کیوں جوش میں میں سلمہ سے کیا کیا کہتا رہا۔ اور وہ چپ چاپ بھیگی بھیگی آنکھوں سے میری طرف دیکھتی رہی۔

"میں جانتی ہوں" وہ بولی۔ "وہ میری خاطر عمر بھر دکھی رہیں گے۔"

"تم ——— تم اپنی زندگی کو جان بوجھ کر برباد کر رہی ہو۔" غصے سے میرا سر گھومنے لگا۔

"میری زندگی کا ذکر چھوڑئیے۔ میری زندگی میں بربادی کے سوائے اور ہے ہی کیا۔ بس میری تو اتنی ہی آرزو ہے کہ نجمہ کی خدمت کروں' ان کی جرابیں دھوؤں ان کے لئے چائے ...... بناؤں ان کی" ———

یہ کہہ کر وہ رونے لگی' اسے روتے دیکھ کر مجھے اپنا غصہ بھول گیا۔ میں بھی آبدیدہ ہو گیا۔ اس پُرلطف اداسی نے مجھے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ پہلو میں ایک پُرکیف درد اٹھنے لگا اور میں یوں گم صم بیٹھا غم کھاتا رہا گویا میری زندگی کا مقصد یہی تھا کہ سلمہ کے دکھ پر غم کھاؤں۔ اور ان دونوں کی ناکامی پر آنسو بہاؤں۔

سلامت کے بیاہ پر سلمہ بہت روئی' گھر پر ابا نے اسے روتے ہوئے دیکھ پایا تو ان کے شکوک از سرنو تازہ ہو گئے اور غصے میں آکر انھوں نے سلمہ کے منہ پر اک تھپڑ مار دیا۔

سلامت اور نجمہ کا نکاح۔ ابا کا تھپڑ اور سلامت کی تبدیلی یہ تینوں باتیں کچھ اس انداز سے یکے بعد دیگرے واقع ہوئیں کہ سلمہ کی محبت عشق کے درجے تک پہنچ گئی۔

ادھر سلامت اپنی تبدیلی کا حکم سن کر ہکا بکا رہ گیا۔ اگرچہ کئی ایک دن سے اس کے انداز سے یہ ظاہر ہوتا تھا گویا وہ کسی بڑے اہم واقعہ کا منتظر اور خواہاں ہے گو واضح طور پر وہ اس اہم واقعہ کی نوعیت سے واقف نہ تھا یعنی اسے معلوم نہ تھا کہ وہ آنے والا واقعہ کیا ہوگا آیا وہ سلمہ کے بیاہ کی خبر سنے گا یا سلمہ کے والد سے پٹ جائے گا۔ یا نوکری سے برطرف ہو جائے گا۔

بہرحال دہلی تبدیل ہو جانے کا اسے خیال بھی نہ آیا تھا۔ خیر جانے سے پہلے اس نے بار بار مجھے تاکید کی کہ سلمہ سے ملتا رہوں اور اسے تسلی دیتا رہوں اور دونوں کو حالات سے آگاہ کرتا رہوں۔

سلامت کے دہلی چلے جانے کے بعد میرا' اور نجمہ کوئی چھ ایک بار ملے ہوں گے ہماری ملاقات کا رنگ ڈھنگ وہی رہا صرف یہی فرق تھا کہ سلامت کی جگہ میں نے لے لی تھی۔ سلمہ کو تو گویا اس بات کا احساس ہی نہ تھا کہ اسکے

روبرو سلامت کی جگہ میں بیٹھا ہوں البتہ ہماری گفتگو سلامت کے متعلق ہی ہوتی۔ سلامت کی بدنصیبی سلامت کی قربانی اور سلامت کی ناکام محبت گویا ہمارے درمیان سلامت کی قبر حائل تھی۔ جب وہ چلی جاتی تو میری طبعی بیتابی اور بھی شدت سے عود کر آتی اور میں دیوانوں کی طرح پھرتا۔ میری صرف یہ خواہش تھی کہ سلامت اور سلمہ کی شادی ہوجائے گویا ان کے اس ملاپ پر میری خوشی کا دارومدار تھا۔ گویا میری زندگی کا مقصد ہی یہی تھا کہ ان کا بیاہ ہو جائے تو صاحب میری یہ خواہش جنون کی حد تک پہنچ گئی۔ لے دے کر صرف وہی چند ایک گھڑیاں آتیں جب کہ میں اپنی اس خواہش کو قطعی بھول جاتا۔ میرا مطلب ہے اس وقت جب سلمہ میرے روبرو بیٹھی ہوتی۔ تماشا یہ ہے کہ سلامت کے خطوں اور سلمہ کے انداز سے اک پرسکون اطمینان اور اک پرکیف ناامیدی کے سوائے اور کچھ ظاہر نہ ہوتا ہو۔ بلکہ سلامت نے توکئی بار واضح طور پر لکھ دیا تھا کہ اگر سلمہ کسی باعزت شخص سے شادی کر کے خوشی خوشی اپنا گھر بسالے تو مجھے کس قدر خوشی ہو۔ لیکن سلمہ ان خطوں کو پڑھ کر مطلقاً حیران نہ ہوتی بلکہ وہ سلامت کی قربانی اور سلامت کی بدنصیبی پر اور بھی روتی۔ ان حالات کے باوجود گویا ان کے بیاہ کے علاوہ میرے لئے دنیا بھر میں کوئی اور فکر ہی نہ تھا۔ آپ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ کن مصیبتوں کے بعد میں نے سلامت کو اس بات پر رضامند کرلیا کہ سلمہ سے بیاہ کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ مجھے یقین ہے کہ رضامند ہونے سے پہلے کئی ایک دن وہ آنسو بہاتا رہا ہوگا اور "اب میں کیا کروں۔ اب میں کیا کروں" بڑبڑاتا پھرا ہوگا۔ بہر حال اس نے اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا۔ اگرچہ عملی طور پر کوشش کرنے کے لئے وہ تیار نہ ہوا تو اس بات کے لئے عملی طور پر کوشش کرنا میرے ہی سپرد ہوا۔

کسی کے بیاہ کے لئے کوشش کرنے کی مجھے چنداں مشق نہ تھی۔ کسی کی بات چھوڑیئے فی الحال تو میں نے اپنے بیاہ کے متعلق بھی کوئی... کوشش نہ کی تھی تو صاحب میں نے فوراً فیصلہ کرلیا کہ مجھے سلمہ کے ابا سے مل کر بات طے کرلینی چاہیئے۔ میں نے اس سلسلے میں ایک مدلل تقریر سوچ لی اور اسے جذباتی انداز سے ادا کرنے کی مشق بھی کرلی اور یہ بھی سوچ لیا کہ اگر وہ یہ کہیں تو یہ جواب دوں گا یہ کہیں تو یہ۔ یہ سب نکات سوچ کر میں ان صاحب سے جا ملا جو نقد چودہ سال سے بچوں کو پڑھا رہے تھے۔ انھوں نے ایک خوفناک کھنکار سے میری ابتدائی تقریر کا سلسلہ توڑ دیا۔ پھر کہنے لگے "میاں معلوم ہوتا ہے تم کوئی پاگل ہو ورنہ میں تمہیں اٹھا کر اس کھڑکی سے نیچے دے مارتا۔ فوراً اس مکان سے باہر نکل جاؤ ورنہ ——؟ حالانکہ ان کی بات ایسی تھی جس کے متعلق مجھے خیال بھی نہ آیا تھا کہ وہ ایسی بات بھی کرسکتے ہیں۔ حالانکہ یہ نکتہ بالکل نرالا اور غور طلب تھا۔ حالانکہ سلمہ اور سلامت کے بیاہ کی خواہش میرے سر پر جنون بن کر سوار تھی پھر بھی خوش قسمتی سے مجھے اس قدر ہوش تھا کہ انھیں فقرہ مکمل کرنے کا موقعہ نہ دیتا تو صاحب مختصر یہ سمجھ لیجئے کہ اس روز بھاٹی دروازے سے قلعہ گوجرسنگھ تک کی مسافت میں نے آٹھ منٹ میں طے کر لی۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ بیاہ شادی کی بات تمام باتوں سے قطعی مختلف ہوتی ہے۔ کہ اس میں نہ دلیلیں کام آتی ہیں اور نہ جذبات۔

اس کے بعد میں نے سلامت کے چچا کو منانا چاہا۔ تو یہ کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑے مجھے۔ سلامت کی زندگی خطرے میں ہے وہ پاگل ہوجائیگا اور جانے کیا کیا۔ لیکن سلامت کے چچا ویسے ہی مطمئن بیٹھے رہے۔ گویا انکی سب سے بڑی آرزو یہی تھی کہ سلامت پاگل ہوجائے اور وہ اپنی بقیہ زندگی سلامت کی دیکھ بھال کرنے میں صرف کر دیں۔ البتہ اتنا ضرور ہوا کہ چچا بھتیجے کی براہ راست اس موضوع پر خط وکتابت شروع ہوگئی۔ کوئی دو سال کے بعد اس کے چچا کو یہ احساس ہوا کہ واقعی معاملہ خاصہ اہم ہے۔ مختصر یہ کہ آخر وہ مان گئے لیکن اس معاملہ میں کوشش کرنا یہ انھیں منظور نہ تھا۔ معاملے میں کوشش کرنے کے لئے مجھے سلامت کے خالو کو منانا پڑا۔ تقریباً ایک سال کے بعد جب یہ بات طے ہوگئی۔ تو سلامت نے رو رو کر نجمہ کی رضامندی کی اہمیت ظاہر کرنی شروع کر دی۔ وہ اس بات پر مصر تھا کہ نجمہ اپنی خوشی سے سلمہ کو سوکن بنانے پر رضامند ہو۔ یعنی میرا مطلب ہے وہ چاہتا تھا کہ نجمہ اس بارے میں سچے دل سے یوں ظاہر کرے۔ گویا سلمہ کو بیاہ کر لانا اس کی اپنی ذاتی آرزو تھی۔ گویا یہی اس کی سب سے بڑی آرزو تھی۔ اس کے علاوہ یہ بھی چاہتا تھا کہ نجمہ بذات خود اس کی منت کرے کہ اگر آپ یہ کام نہ کریں گے تو میری زندگی برباد ہوجائے گی اور پھر وہ نجمہ کی خاطر اس بات کو رو رو کر مان لے۔ تو صاحب جب نجمہ نے بھی سلمہ کے آنے کو گوارا کر نا منظور کرلیا اور سلامت کے خالو نے سلمہ کے ابا سے بات چیت بھی شروع کر دی اور سلمہ کے والد نیم رضامند بھی ہو گئے۔ اور آخری ہاں کہنے سے پہلے انھوں نے سلامت سے ملنے کی خواہش ظاہر کی اور ہم نے اسے تار سے بلا بھیجا تو وہ اتفاقیہ طور پر بیمار پڑ گیا اور ایسا بیمار پڑا کہ چھ ماہ تک لاہور نہ آسکا۔ اس بات پر سلمہ کے ابا چڑ گئے۔ کہنے لگے "ہوں تو وہ کل کا لونڈا ہم سے مذاق کر رہا ہے"۔ اس بات پر وہ ایسے بگڑے ایسے بگڑے کہ صاف انکار کر دیا۔ ادہر جب سلامت کو پتہ چلا کہ وہ بگڑ کر انکار کر بیٹھے ہیں اور خالو بھی ناراض ہے۔ کہ خواہ مخواہ میری بے عزتی کروائی تو وہ بھت ہوگیا اور لاہور چلا آیا۔ لیکن اب اس کے آنے کا کیا فائدہ تھا۔ میں غصے

سے تو بھا ہی بیٹھا تھا میں نے بھی بے حد صلواتیں سنائیں۔ صرف سلمہ ہی تھی۔ جو سلامت کی بیماری اور بدقسمتی پر رو رو کر ہلکان ہو رہی تھی۔ باقی سب لوگ اس کی بیماری پر ناراض تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شالامار کی اداس فضا میں سلامت اپنی نامرادی پر روتا اور سلمہ اسے تسلیاں دیتی اور میں ان کی ناکام محبت پر غم کھاتا اسی طرح ایک ماہ اور گزر گیا اور سلامت کی پندرہ دن کی چھٹی باقی رہ گئی۔ ان ملاقاتوں کے بعد میری وہی آرزو عود کر آئی۔ وہی آرزو۔ سلامت اور سلمہ کا بیاہ اور میں نے ازسرنو اس معاملہ پر سوچنا شروع کر دیا۔

اب اس کے سوائے اور کوئی چارہ نہ تھا کہ مولوی صاحب کو بلا کر ان دونوں کا نکاح پڑھوا دیا جائے۔ سلمہ بیس سال کی ہو چکی تھی اس لئے ایسے نکاح میں کوئی خطرہ نہ تھا لیکن میں نے سلامت کو نہ بتایا کہ وہ انکار کرے البتہ سلمہ کو رضامند کر لیا۔ بس ہم اسی انتظار میں تھے کہ سلمہ کے ابا کہیں باہر جائیں تو میں سلمہ کے مکان پر ہی یہ نیک کام سرانجام دے دیا جائے رضامند ہو جانے کے بعد وہ گھبرا کر کہا کرتی قوم بھائی پھر کیا ہوگا۔ ابا بہت خفا ہوں گے کہیں وہ تو ناراض نہ ہوں گے۔

حسن اتفاق سے سلمہ کے ابا نے چار دن کی چھٹی لی اور کہیں چلے گئے۔ اگلے دن ہی سلمہ نے ہمیں مکان پر بلا بھیجا۔ سلامت مولوی صاحب کو دیکھ کر گھبرا گیا اور جب اسے معلوم ہوا کہ وہ اس کا نکاح پڑھنے آئے ہیں تو اس کا منہ زرد پڑ گیا۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے ہونٹ یوں بند ہو گئے گویا وہ کچھ کہنے سے ڈرتا ہو۔ پردے کے پیچھے سلمہ بھی آ بیٹھی اور مولوی صاحب نے کچھ پڑھنا شروع بھی کر دیا۔ کہ اچانک دروازہ کھلا اور سلمہ کے والد اندر آ گئے انھیں دیکھ کر مولوی صاحب تو لگے اپنا جوتا سنبھالنے باقی سلامت اور میں تو شرم سے زمین میں گڑھ گئے۔

"ہوں تو یہ بات ہے" وہ بولے —— "مولوی صاحب بیٹھے رہیئے آپ اس اوباش لڑکے نے ہماری زندگی حرام کر رکھی ہے۔ بدمعاش!"

"میں میں۔ آپ" سلامت بڑبڑایا۔ اور پھر خاموش ہو گیا پردے کے پیچھے سے سلمہ کے رونے کی آواز آ رہی تھی۔

"شریف لڑکیوں کو پھسلاتا پھرتا ہے حرامی!"

"نہیں جی۔ میں" سلامت نے پھر بولنے کی کوشش کی "آپ کی عزت۔ آپ کی عزت کے لئے میری جان بھی چلی جائے تو بھی——"

"ہماری عزت اسی میں ہے کہ تم جیسے خبیث ہم سے کوئی سروکار نہ رکھیں سنا تم نے۔"

پردے کے پیچھے سے سلمہ نے ایک چیخ ماری انھوں نے لپک کر پردے کو جھٹکا دے کر نیچے گرا دیا۔ سلمہ گٹھڑی سی بنی بیٹھی تھی سر گھٹنوں میں دے رکھا تھا۔

"نالایق چھوکری" وہ گرجنے لگے "ہماری عزت کو خاک میں ملا رکھا ہے ساری عمر بیٹھی روئے گی اس بدمعاش کی باتوں میں آ گئی ہے۔"

"نہیں نہیں جی" سلامت کہنے لگا "میں تو سلمہ کی بہتری کے سوائے اور کچھ نہیں چاہتا"

"ہم خود سمجھ سکتے ہیں کہ ہماری بیٹی کی بہتری کس بات میں ہے —— سنا تم نے ہم قطعی نہیں چاہتے کہ تم اس کی زندگی برباد کرو"۔ سلمہ نے زور سے ایک چیخ ماری اس بات نے انھیں اور بھی بھڑکا دیا "ابھی کیا روتی ہو ابھی روؤ گی —— خدا کی قسم میں تمہیں وہ سبق سکھاؤں گا کہ تم دونوں یاد کرو گے ——" سلمہ نے اپنا سر اٹھاتے ہوئے ایک نظر میری طرف دیکھا پھر مجھے معلوم نہیں —— کمرہ گھوم رہا تھا سلامت نے اپنا سر گھٹنوں میں دے رکھا تھا اور کراہ رہا تھا۔ —— مولوی صاحب عربی میں گنگنا رہے تھے سامنے قاب میں پڑی ہوئی شیرینی ناچ رہی تھی اور پانی سے بھرا ہوا گلاس چھلک رہا تھا سلمہ کے ابا ٹہلتے ہوئے جانے کیا کیا بڑبڑا رہے تھے۔ "تمہیں اس لڑکی کو اپنی زوجیت میں لینا منظور ہے" کسی نے جھک کر مجھ سے پوچھا —— مولوی صاحب اپنے ہاتھ سے مجھے جھنجھوڑ رہے تھے "سنا تم نے" سلمہ کے والد نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "تمہیں میری بیٹی کو اپنی زوجیت میں لینا منظور ہے" پھر خدا جانے کیا ہوا سلمہ کی بھیگی بھیگی ملتجی نگاہیں میری طرف اٹھیں اور بلا سوچے سمجھے میرے منہ سے ہاں نکل گیا۔

سلمہ کو میری بیوی بنے ایک سال ہو چکا ہے اور اب ——

اب میں اکثر دفتر کے بے معنی قہقہوں لاہور کے بازاروں کی اکتا دینے والی چہل پہل اور باجوں گاجوں کے پریشان کن شور سے گھبرا کر گھر کی طرف بھاگ اٹھتا ہوں اور گھر کی اس بے کیف اداسی کی گود میں جو سلمہ کے اردگرد چھائی رہتی ہے میں اور سلمہ ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہتے ہیں وہ روتی رہتی ہے اور میں امنڈتے ہوئے آنسو پیتا رہتا ہوں ہم دونوں مل کر سلامت کی بدقسمتی اور قربانی کا غم کھاتے رہتے ہیں۔ اور مجھے یوں محسوس ہوتا ہے گویا ہم سلامت کی قبر پر بیٹھے ماتم کر رہے ہیں۔ اس سمے گویا وقت ٹھہر جاتا ہے تمام فضا پر اک پرکیف نشہ سا چھا جاتا ہے۔ گویا کسی پرانے اجڑے ہوئے جہان کے ملبے سے اک نیا جہان بن رہا ہو۔

"اف! میری خاطر انھوں نے اپنی زندگی برباد کر لی" وہ کہتی ہے۔

"ہاں —— اب کیا ہوگا" میرے منہ سے خواہ مخواہ نکل جاتا ہے۔

"جو بھی آپ چاہیں"۔ یہ کہہ کر اس کی گردن جھک جاتی ہے اور میرے شانوں پر آ ٹکتی ہے۔

"تمہارا دکھ مجھ سے سہا نہیں جاتا میری دکھی سلمہ!"

(بقیہ بر صفحہ ۱۶۴)

طوائف

تیری مظلومی بدل دے گی یہ فرسودہ نظام
خودسری تسبیح کے دانوں پہ لے گی تیرا نام
ظلم کی دنیا پہ چھا جائے گی جب تاریک شام
وہ بھی دن نزدیک ہیں اے زندگانی کو شباب
مضطرب ہے تیری شریانوں میں روحِ انقلاب

تیری آہیں پھونک ڈالیں گی زمین و آسماں
سینۂ مزدور سے اٹھے گا غیرت کا دھواں
راکھ میں تبدیل ہو جائیں گے سب اونچے نشاں
اک نئی تہذیب کے چہرے سے اٹھے گا نقاب
مضطرب ہے تیری شریانوں میں روحِ انقلاب

کون کہتا ہے گنہ آباد میں بستی ہے تو
کون کہتا ہے خس و خاشاک سے سستی ہے تو
سانپ بن کر عزت و ناموس کو ڈستی ہے تو
میں یہ کہتا ہوں کہ خودداری ہے تیری لاجواب
مضطرب ہے تیری شریانوں میں روحِ انقلاب

بھیک کے ٹکڑوں پہ جینا تجھ کو بھاتا کس طرح
تیرا جوبن ٹھوکروں میں گنگناتا کس طرح
زر کی چوکھٹ پر کوئی گردن جھکاتا کس طرح
تیری غیرت نے دکھائی تجھ کو یہ راہِ ثواب
مضطرب ہے تیری شریانوں میں روحِ انقلاب

تو نے مذہب کو جھکایا دہریت کے پاؤں میں
دخترِ رز گنگنائی ڈاڑھیوں کی چھاؤں میں
کعبہ و بتخانہ کھنچ آئے ہیں تیرے پاؤں میں
تجھ کو سجدہ ہے روا اے اشتراکی آفتاب
مضطرب ہے تیری شریانوں میں روحِ انقلاب

قوم بیچو روح بیچو آن بیچو کچھ نہیں
نوجوانانِ وطن کی جان بیچو کچھ نہیں
اور یہ سستی سی شے ایمان بیچو کچھ نہیں
جسم لیکن بک نہیں سکتا کہ ہے کارِ عذاب
مضطرب ہے تیری شریانوں میں روحِ انقلاب

مذہب و قانون کے ٹکڑے کیے اچھا کیا
شیخ کو دکھلا کے جامِ مے پیے اچھا کیا
باغیوں کو وصل کے ساغر دیے اچھا کیا
تو نے بیباکی کے چہرے سے الٹ ڈالی نقاب
مضطرب ہے تیری شریانوں میں روحِ انقلاب

رات کی تاریکیوں میں عصمتیں بکتی رہیں
کوٹھیوں کی خلوتوں میں عزتیں بکتی رہیں
زر کے انباروں کی خاطر عفتیں بکتی رہیں
بر سرِ بازار لیکن بک نہیں سکتا شباب
مضطرب ہے تیری شریانوں میں روحِ انقلاب

عصمتیں عہدوں کی قیمت پر بکیں تو خوب ہے
خوشنما محلوں کے بدلے گر بکیں تو خوب ہے
ریشمیں پردوں میں چھپ چھپ کر بکیں تو خوب ہے
پیٹ کی خاطر نہ ایسے جرم کا ہو ارتکاب
مضطرب ہے تیری شریانوں میں روحِ انقلاب

صبر اے عصمت کی دیوی صبر کچھ دن اور بھی
دندناتا آ رہا ہے انقلابی دور بھی
بدلے بدلے ہیں جوانانِ وطن کے طور بھی
ماند پڑنے کو ہے زہریلے تمدن کا شہاب
مضطرب ہے تیری شریانوں میں روحِ انقلاب

الطاف مشہدی

رابندر ناتھ ٹیگور

گرودیو

یہ غیر معمولی دل و دماغ اور شدید جذبۂ انسانیت رکھنے والا شاعر ۶ مئی ۱۸۶۱ء کو کلکتہ میں پیدا ہوا اور کلکتہ ہی میں، ۷ اگست ۱۹۴۱ء پنج شنبہ بعد دوپہر ۱۲ بج کر تیرہ منٹ (کلکتہ ٹائم) پر اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اس کی تمام عمر ان بندشوں اور پابندیوں کو توڑنے کی جد و جہد میں صرف ہوئی جو انسانوں کو سچی مسرت اور روحانی آزادی حاصل کرنے میں مانع ہوتی ہیں۔ اس نے اپنے ہم وطنوں (بلکہ تمام دنیا کے انسانوں) کو روحانی ترقی کے نئے امکانات سے روشناس کیا، ان کے لئے نئی راہیں کھولیں اور ان کی محدود نظروں میں وسعت پیدا کی۔ بہت سے شاعر صرف ایک خیالی دنیا اور بہتر زندگی کے خواب ہی دیکھتے دیکھتے مرجاتے ہیں لیکن ٹیگور کے اعلیٰ تصورات کو اس کی زندگی ہی میں عملی صورت اختیار کرنے کا موقع مل گیا۔ "شانتی نکیتن" نہ صرف مقامی علوم و فنون اور ادب اور تہذیب کا مرکز ہے بلکہ یہ خود ٹیگور کے بے پایاں جذبۂ ہمدردی، محبت اور انسانیت کی یادگار ہے کیونکہ (کم از کم) شاعر کی زندگی میں قومی یا نسلی امتیازات کو یہاں جگہ نہ مل سکی۔ اسی طرح "سری نکیتن" زندہ نمونہ ہے اس محبت کا جو شاعر کے دل میں غریبوں اور کسانوں کے لئے تھی۔ ٹیگور کے اعلیٰ اور پاکیزہ خیالات کا نمونہ "شانتی نکیتن" اور سری نکیتن کی صورت میں نہ صرف ہندوستان بلکہ ساری دنیا کے لئے ایک قابل قدر ورثہ ہے ورنہ یوں تو جہاں تک محض خیالات کا تعلق ہے آنے والی نسلیں اس کی تصنیفات سے درس سکون لیتی ہی رہیں گی۔ وہ شاعر ہونے کے علاوہ افسانہ نویس، ڈرامہ نگار، مضمون نویس، نقاش اور انسان اور فطرت کا بہترین نقاد اور ترجمان تھا۔ مختصراً یوں سمجھنا چاہیئے کہ وہ خود ایک "زبردست" روحانی ترقی پیدا کرنے والی طاقت تھا۔ اس کی بے قرار روح جو عمر بھر موجودہ اور آئندہ نسلوں کو روحانی سکون اور "شانتی" مہیا کرنے کی فکر میں سرگرداں رہی اب موت کے آغوش میں ابدی سکون حاصل کر چکی ہے لیکن اس کے کارنامے موجود ہیں جن میں اس کی روح کا عکس موجود ہے۔

یہ بھی فطرت کی ستم ظریفی تھی کہ کلکتہ ایسے تجارتی مرکز کے شور و شغب میں سکون کے متلاشی شاعر کو پیدا کیا ہمیں [illegible] کہ اس شاعر کی ذہنی نشو و نما کیسے ہوئی۔ اور وہ اسباب کیا تھے جنھوں نے اس کے خیالات اور رجحانات کی تشکیل اور تکمیل میں مدد کی۔ اور اس کی زندگی کا وہ کون سا خاص واقعہ تھا جس نے اسے شہر کی دلچسپیوں اور رنگینیوں میں کھو جانے اور اپنا مقصد زندگی فراموش کر دینے سے بچا لیا؟۔

بچپن ہی میں شاعر ماں کے آغوش سے محروم ہو گیا۔ اس عظیم صدمہ کا یہ اثر ہوا کہ اس نے فطرت سے ہم آہنگ ہو کر تسکین پانا سیکھا اور یہیں سے فطرت کے قرب کا اثر اس کے دل و دماغ پر چھانا شروع ہوا۔ مدرسہ جانا شروع کیا، مگر جو شخص فطرت سے درس لیتا رہا ہو اسے مدرسہ کی بے کیف فضا کیسے راس آتی؟ مجبوراً اس کے لئے پرائیوٹ معلم رکھے گئے اور گو ان معلموں نے اپنا فرض ادا کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی لیکن رابندر ناتھ کی اصل تعلیم و تربیت خود فطرت اور زندگی کے مکتب میں ہوئی۔ وہ جوں جوں زندگی کی شاہراہ پر بڑھتا گیا اپنی فطری صلاحیتوں کے مطابق سبق لیتا گیا۔ زمین۔ پانی۔ پہاڑ۔ بادل۔ ہوا ہمیشہ دور سے دور تر ہونے والی افق ——— یہ تھے اس کے اصلی معلم!

اور ان چیزوں نے اس کے فطری "جوش شعر گوئی" کو اور بھی برانگیختہ کیا۔ گو اس کا دماغ "ہمہ گیر" واقع ہوا تھا جس کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ ادب کی کوئی صنف ایسی نہیں جس کی اس نے مشاطگی اور آراستگی نہیں کی لیکن اس کی انفرادی شان کی علمبردار اس کی شاعری ہی ہے۔ وہ اوّل اور آخر "شاعر" ہے ——— فطری اور پیدائشی شاعر!

شاعر کی حیثیت سے ٹیگور کی خاص خصوصیات یہ ہیں ———
بے پایاں تخیل، ایک جذب صادق اور جوش جس کو امنگ یا ترنگ آپ جو چاہیں کہہ سکتے ہیں! ان میں "بصیرت" کو اور شامل کر لیجئے تو اس کی شاعرانہ خصوصیات کا بیان قریب قریب مکمل ہو جائے گا۔

وہ ہر خوبصورت شئے کی طرف مائل ہے اور حسن سے اثر پذیر ہونے کی زبردست صلاحیت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی دقیقہ رس نگاہ اشیاء کی روح تک پہنچ سکی ہے اور اس نے ان الفاظ میں اپنے "لطیف تجربات" کا اظہار کیا ہے جو حسن اور حقیقت سے ہم آہنگ ہیں ——— اس حقیقت سے جو تغیر ناپذیر ہے، اس حسن سے جو ابدی ہے! اس کے کان "نغمۂ سیارگان" سے آشنا ہیں جسے وہ عام فہم انسانی زبان میں پیش کر دیتا ہے۔

اس کی نظموں کی خارجی (صوتی و آہنگی) خوبصورتی کا بیان نہیں ہو سکتا۔ یہ کہنا کافی ہوگا کہ وہ موسیقیت اور آہنگ سے معمور ہیں اور ان کی شیریں نوا میں ایک ایسی لذت ہے جس سے سامعین کے کان کبھی سیر نہیں ہو سکتے۔ یہ خارجی خوبصورتی اور دلکشی اس کی تمام نظموں میں پائی جاتی ہے۔ اور اس اعتبار

سے دنیائے ادب میں اس کا ہمسر ملنا دشوار ہے۔ اس کی نظموں میں ایک سماوی کیفیت ہے، ایک "طاقت پرواز" ہے جو سننے والوں کو بلند یوں پر اٹھا لیتی ہے۔

وہ ہنوز شباب کی ابتدائی منزلیں طے کرنے پایا تھا کہ اس نے اپنے اندر "شاعر" کو بیدار ہوتے ہوئے محسوس کیا۔ یہ کیفیت اتنی زبردست تھی کہ اس کے آگے وہ حدود و قیود جو اس کو محیط کئے ہوئے تھیں بیکار ہو گئیں اس شاعرانہ جوش کو اکسانے والی دو چیزیں تھیں ——— عمیق سمندر کی آواز اور دوری (بُعد) کی کشش۔ اس کا دل یکایک زندگی سے ہمکنار ہونے کے لئے کھل گیا تھا اور اس کے دل کی وسعتوں کا اندازہ انسانی پیمانوں سے نہیں کیا جا سکتا۔ (اسی کیفیت اور شاعرانہ جوش کا ذکر ٹیگور نے "نرجھار بیر سوپنا بھنگا" (کسی ایسی چیز کی آرزو جو دسترس سے باہر ہو) میں کیا ہے جو اس کی اولین اور بہترین نظموں میں سے ہے اور جو اب سے تقریباً نصف صدی قبل لکھی گئی تھی۔ اسی دوری کی تمنا کا اظہار "شودر" میں بھی کیا گیا ہے)

اس کے بعد اس پر ایک "عالمگیر روح" کا انکشاف ہوتا ہے ———
اس ابدی روح کا جوہر شے میں جاری و ساری ہے، اور اب اس کو یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ خود کائنات میں محو ہو جائے اور خود بھی کل کائنات کو اپنے اندر سمیٹ لے۔ "کل" سے دائمی ہم آغوشی حاصل کر لے حتیٰ کہ وہ خود "کل" ہو جائے اور "جزو" کی جزو کی حیثیت سے تمیز نہ کی جا سکے۔

ٹیگور کی شاعری اس نشاط اور سرور سے معمور ہے جس کا منبع خود فطرت ہے۔ فطرت کی رنگا رنگیوں ——— درختوں، پھولوں، دریاؤں وغیرہ ——— میں اس نے ہمیشہ ایک زبردست کشش اور جاذبیت محسوس کی ہے بظاہر فطرت کے ظاہری اختلافات کے باوجود بھی ان میں ایک یکسانیت پائی جاتی ہے کثرت میں وحدت نظر آتی ہے۔ ان اختلافات کی تہ میں فطرت کی روح موجود ہے جس کی خوبصورتی اور کشش الفاظ میں بیان نہیں کی جا سکتی، صرف محسوس کی جا سکتی ہے۔ فطرت کی اس روح نے جو ہم کو ہوا، بادل، شفق اور چاند کی چاندنی میں اتنی اچھی معلوم ہوتی ہے، شاعر کے دل و دماغ پر اتنا زیادہ اثر کیا ہے کہ وہ فطرت کے نغموں کا ساز بن کر رہ گیا ہے اور خود "فطرت کی صدا" اس کی زبان سے ادا ہوتی ہے:-

"میں محسوس کرتا ہوں کہ آسمان کے تمام ستارے مجھ ہی میں
درخشاں ہیں۔ اور کل جہاں کے پھول میرے ہی جسم میں کھلتے
ہیں۔
زمین اور پانی کی تر و تازگی بخارات بن کر
میرے ہی دل کو فرحت بخشتی ہے۔ اور تمام اشیاء کی روح
میرے خیالات پر اس طرح نغمہ سرا ہے جیسے کوئی بانسری
بجائے"!

اس کی نظموں میں "موسم بہار کے پھولوں کو زبان عطا کی گئی ہے" اور "ہوا میں سرسراتے ہوئے پتوں کے زیر و بم کو الفاظ میں مقید اور محصور کر لیا گیا ہے"

موسموں کی تبدیلی کا سماں ٹیگور کے لئے ایک خاص کشش رکھتا ہے اور موسم باراں تو گویا اس کے لئے ہزاروں دلکشیوں اور دلفریبیوں کا دوسرا نام ہے

"موسم گرما کی پہلی بارشوں کا پیدا کیا ہوا "جذبۂ بے اختیار" خزاں کی پکی ہوئی کھیتوں کے اہتزاز اور میرے نغموں کا جزو بن گیا ہے"

طویل موسم گرما کی شدت کے بعد "بخارات کی یہ مجتمع طاقت" شاعر کے ساز دل کو چھیڑ دیتی ہے، اس کی سرخوشی اور سرمستی دبائی نہیں جا سکتی۔ اس کا اظہار قریب قریب مجنونانہ ہوتا ہے۔

فطرت کی روح ایک متعین شکل، ایک زندہ جسم کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ شاعر کی بڑی آرزو رہتی ہے کہ وہ اس کی معیت میں رہے اور اس سے حظ اٹھائے۔ وہ اس مجسم روح میں مل جانا اور گم ہو جانا چاہتا ہے۔

اس کے لئے "حب وطن" بھی ایک زبردست سرچشمۂ الہام ہے مگر یہ محبت تنگ نظر نہیں ہوتی۔ اس کا مقصد دوسری قوموں سے نفرت کرنا نہیں ہوتا۔ وہ دنیا بھر کے انسانوں کا شیدا اور کل عالم انسانیت کا شاعر ہے" (یہ خیال اس کی نظم "پرساسی" میں ظاہر کیا گیا ہے جو اس کی کتاب "شرگہ" میں درج ہے)

"ماہ نو" دلکش مجموعہ ہے گیتوں کا جو بچوں کے متعلق لکھے گئے ہیں بچپن کی جو تصویریں شاعر نے کھینچی ہیں ان کی سادگی قابل تعریف ہے۔ وہ بچہ کے ذہن اور طبیعت کے ہلکے سے ہلکے تغیر تک سے ہم کو روشناس کرا دیتا ہے۔ اس کا مشاہدہ اور تجزیہ نفسی کرنے کی اہلیت بے مثل ہے۔ ٹیگور کی کھینچی ہوئی یہ تصویریں بچپن کی ان تمام تصویروں کے مقابلہ میں زیادہ مکمل اور حقیقت نما" ہیں جن سے ہم واقف ہیں، یا جن کا ہم تصور کر سکتے ہیں۔

وہ خدا پر غیر متزلزل اعتقاد رکھتا ہے۔ اس نے خود پر زور الفاظ میں کہا ہے:-

"ہر مذہبی معاملہ میں شک اور شبہ اور ناامیدی حد درجہ کا
کفران نعمت ہے"!

خدا بچوں سے محبت کرتا ہے:-

"خدا ان کو کھیلتے ہوئے دیکھتا ہے
اور پنڈتوں اور ملاؤں کو بھول جاتا ہے"!
(کرنک شب تاب)

ٹیگور کی منظوم کہانیاں جن کی ایک معتدبہ تعداد "کتھا و کاہنی" میں ہے بے نظیر ہیں

ان میں ایک ایسی بے ساختگی، سادگی اور روانی ہے جو جذبات کو متحرک کر دیتی ہے
ٹیگور دراصل ایک "لریکی" (جذباتی اور غنائی) شاعر ہے۔ اس کی لطافت جذبات فطرت پرستی اس کے اشعار کی نرم و نازک موسیقی کا زیر و بم ——— یہ سب اس کی "داخلی" نظموں ہی میں بدرجۂ کمال نظر آتے ہیں۔ وہ فطری شاعر ہے اور راقم الحروف کا خیال ہے کہ یہ بہت اچھا ہوا کہ ٹیگور نے "ورڈزورتھ" کی طرح اپنے کسی ذہنی جذبہ کو عرصہ دراز کے بعد حافظہ کی مدد سے سکون کی حالت میں یاد کر کے از سر نو زندہ نہیں کیا۔"

اس کی مندرجہ ذیل لریکی نظموں کا درجہ بہت بلند ہے :۔

"ستار تاری" (جو اسی نام کی کتاب میں درج ہے) "شاہ جہاں"۔ "نرجہار سوپنا بھنگا"۔ "یادھو" "یترو دیسا جانترا"۔ "اربا سی"۔ "برشا شیش" (جو شبلی کی نظم "بادِ مغرب" سے کہیں زیادہ بہتر و برتر ہے)

اور "شو درے"

ان میں سے بعض نظمیں تو رومانیت کی روح سے لبریز ہیں بلکہ رومانیت کی جان ہیں۔

ہر بلند شعر کے لئے لازمی ہے کہ اس کا مضمون اور طرزِ بیان دونوں بلند ہوں۔ ٹیگور کی شاعری کا خارجی پہلو (یعنی اندازِ بیان) ترمیم و اصلاح سے بے نیاز ہے۔ الفاظ اور موسیقی کا اس سے بہتر امتزاج ناممکن ہے اور پر لطف یہ ہے کہ خیال (یعنی نفسِ مضمون) کہیں بھی اپنے لفظی پیکر سے نیچا نہیں دکھتا۔ اس کا فلسفہ اپنی گرانباری سے کہیں ہمارے لطیف احساسات کو تکلیف نہیں پہنچاتا مگر اس کی نظمیں محض خیال آرائی ہو کر بھی نہیں رہ جاتیں۔ اگر کوئی چاہے تو شاعر کے تخیل کے پر پرواز کے سہارے خالص فلسفہ کی بلندیوں تک بھی پہنچ سکتا ہے۔ اس کی کثیر التعداد تصانیف میں یہ چیزیں مشترک ہیں ———
جمالِ کائنات، بچوں کی محبت، خدا کی موجودگی اور اس کے حاضر و ناظر ہونے کا احساس!

محض شاعر کی حیثیت سے ٹیگور کا شمار ہر زمانہ اور ہر ملک کے شعرا میں ہوتا ہے۔

کچھ خصائص ——— مثلاً شیرینیٔ کلام، ترنم الفاظ، شدید جذبۂ انسانیت، بصیرت ——— کے اعتبار سے اس کا ثانی ملنا مشکل ہے۔ وہ فطرت کے جلووں کی فراوانی کی تصویر خوبصورتی اور چابکدستی سے کھینچتا ہے۔ اپنی نظموں میں اس نے فطرت کی تلون مزاجی اور نشاط انگیزی کی ترجمانی کی ہے اور وہ ہم کو سطحِ زمین سے بلند اٹھا کر ان اقالیم میں لے گیا ہے جہاں حسن کو زوال نہیں اور مسرت "ابدمدت" ہے جہاں محبت پاک اور بے لوث ہے اور جہاں خدا ہی خدا کی حکومت ہے۔ وہ حسن سے مضبوط پیمانِ وفا باندھے ہوئے ہے اور اس کی پرستش کرتا ہے اور باوجود رنج و الم کے دیے ہوئے احساس کے اس میں کوئی تلخی نہیں پائی جاتی اور حسن سے اس کا ازلی تعلق بدستور قائم رہتا ہے:

"گو تیرے پھول کے کانٹے نے مجھے زخمی کر دیا ہے
مگر اے حسن،
میں تیرا شکر گذار ہوں!"

منظہر عزیز

دکھی سلمہ :۔ (بہ سلسلۂ صفحہ ۱۶۰)

"میرا کیا ہے" وہ زیر لب کہتی ہے۔ "میری زندگی میں دکھ کے سوائے اور ہے ہی کیا"۔ اس کی پتلی باہیں میری گردن میں حمایل ہو جاتی ہیں۔ اور وہ پتلی پتلی انگلیاں دبلے دبے اضطراب سے میرے بالوں سے کھیلتی ہیں۔

اس گہری اداس فضا میں میرے بدن کے رویئیں رویئیں میں اک پرکیف ٹیس اٹھتی ہے۔ میرے پہلو میں اک لذیذ سا درد اٹھتا ہے اور گویا مجھے اپنی گود میں لے کر جھلاتا ہے اور میں محسوس کرتا ہوں کہ کسی نے مجھے اک رنگین نشتر سے چھیڑ دیا ہو اور میرے بدن پر کئی ایک گہرے گھاؤ ہرے ہو رہے ہوں۔ دکھی سلمہ کراہتی ہے اور میں گویا تڑپتا ہوں۔

اے آئی آر دہلی   **ممتاز مفتی**

بے زبان

پانچ سو روپے کے انعام کا اعلان سن کر باری باری سب ہی نے کوشش کی۔ ہندوستانی چابک سوار۔ کابلی پٹھان۔ توپ خانہ کے گورے اور سپاہی۔ ایک کے بعد ایک گنتے ہی گھوڑی پر سوار ہونے کے واسطے سرکس کے دائرے میں داخل ہوئے اور طرح طرح سے کوششیں کیں لیکن گھوڑی پر سوار ہو کر اسے چار قدم چلانا تو درکنار۔ اس کی راس تک چھونا نصیب نہ ہوئی۔ جو بھی آگے بڑھا دونوں کان پیچھے سکیڑ، دانت نکال، ہنہنا کے گھوڑی ایسی کاٹنے کو دوڑی کہ بہت سے تو جب ہی گرتے پڑتے سرکس کی دیوار پھاند باہر بھاگ گئے اور اگر ایک آدھ ڈھیٹ بیت یا چابک گھماتا کھڑا ابھی رہ گیا تو پھر گھوڑی نے گھوم گھوم کے ایسی دولتیاں چلائیں کہ آخر مجبور ہو کر اس کو بھی پشیمان اور شرمندہ باہر آنا پڑا۔

سرکس کے مینیجر نے جو دائرے کی نیچی سی دیوار کے باہر کھڑا تھا چاروں طرف سر گھما گھما کے تماشا دیکھنے والوں کو مخاطب کر کے پھر اعلان کیا ”اتنا جنٹلمین سپاہی اور جوان چاروں طرف ہے۔ کوئی اور آئے آئے! آئے! جس کا ہمت ہو۔ جو کوئی اس گھوڑی پہ بیٹھے گا اور چار قدم چلائے گا سرکس کمپنی اس کو پانچ سو روپیہ انعام دے گا۔“ چاروں طرف کو چوبی۔ کرسیاں۔ اور پھر چھت تک اٹھتی چلی گئی۔ بنچوں پر ہزاروں آدمی بیٹھے تھے سرکس کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ لیکن اب کسی کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ کوئی بھی آئے۔ ہر طرف سب خاموش شرمندہ سے بیٹھے تھے اور ان کے سامنے تماشہ کے چھوٹے سے گول چکر کے بیچ میں۔ چمکدار، سیاہ چکنی چپڑی۔ تندرست۔ نوجوان۔ پھرتیلی چلبلی۔ گھوڑی گردن کو محرابی خم دئے ہنہناتے ہوئے سر کو جھٹکے دید کر۔ اور دم کی چوری جھپکا جھپکا کر اگلے پیر سے زمین پہ ٹاپیں مار رہی تھی۔ اس کی اس حرکت میں فتح کی مسرت حسن کا غرور اور شباب کی پھڑک عیاں تھی۔ اور

اس وقت جب کہ دنیا بھر کی نگاہیں اس سیاہ گھوڑی پر جمی ہوئی تھیں سرکس کا چور دروازہ آہستہ سے کھلا۔ سن سے بھاگتی ہوئی ایک لڑکی ہوا کی طرح آئی بجلی کی طرح اس کا ہنٹر کوندا۔ گھوڑی اچھلی بھڑکی اور بھاگی۔ ہنٹر کوندا اور پھر کوندا گھوڑی جان توڑ۔ سرپٹ۔ سرکس میں چکر لگانے لگی۔ اب سب کی نگاہیں اس سفید نسائی پھڑکی پر جم گئیں۔ بوٹا سا قد۔ دہرا جسم۔ سیاہ بال۔ کھال سے چپٹا چست سرکس کا لباس۔ حسن تھا۔ جادو تھا۔ قہر تھا کہ سحر تھا۔ اس کے ہاتھ۔ اس کے پیر۔ اس کا سینہ اس کی گردن۔ اس کا سر اس کی آنکھیں ہر ایک کشش دل کا مرکز تھا۔ اور کیوں؟ اس لئے کہ وہ ایک مجسمہ شباب تھی۔

اس کی ہر بات میں شوخی تھی شرارت تھی۔ ہاتھوں میں پھڑک تھی پیروں میں تھرک تھی۔ گردن میں لچک تھی۔ آنکھوں میں چمک تھی۔ دنیا اس کو تکتی تھی اور وہ بے خبر تھی۔ ہنٹر گھماتے گھماتے ایک دفعہ وہ لپکی۔ سپاٹے بھرتی گھوڑی پر ہاتھ لگاتے ہی بجلی کی پھرتی سے سوار ہو گئی۔ دونوں ہاتھوں سے کھلے ہوئے بالوں کو سنوارا اور پھر بھاگتی گھوڑی کی ننگی پیٹھ پر کھڑی ہو گئی۔ گھوڑی نے چکر پہ چکر اور تیزی سے لگانا شروع کر دئے۔ اس وقت اس کے کھلے ہوئے سیاہ بال گلابی ربن کی بندش سے آدھے آزاد پیچھے پیچھے پھرپھراتے تھے اس کی چست پیجامہ میں ملفوف گول گول ٹانگیں۔ ہلکے ہلکے لچکتی تھیں۔ دونوں ہاتھ ہوا میں پھیلے ہوئے لہرتے تھے سرپٹ بھاگتی ہوئی گھوڑی پر کھڑی ہوئی وہ ایک رقص سا کر رہی تھی۔ سب کی نگاہیں ادھر ہی لگی ہوئی تھیں۔ وہاں چور دروازہ آہستہ سے پھر کھل چکا تھا چکر لگاتے لگاتے ایک دفعہ ادھر گھوم۔ گھوڑی مع سوار اس کے اندر غائب ہو گئی ...... کئی سکنڈ تک تماشبین سکتے کی سی حالت میں خاموش رہے اور پھر تالیوں کے شور سے آسمان سر پہ اٹھا لیا۔

سرکس کے لکھنؤ آنے کے چند ہی دن بعد سارے شہر میں گھوڑی اور لڑکی کا شہرا ہو گیا۔ ان دونوں کے حسن خوبصورتی شرارت اور شہ سواری پر طرح طرح کے اظہار خیال ہونے لگے اور بیسیوں افواہیں پھیلتی چلی گئیں۔ کسی کا خیال تھا کہ لڑکی آوارہ ہے۔ کوئی کہتا تھا کہ سرکس والوں کی سخت نگرانی کرنا اور کسی کی ہوا تک نہ لگنے دینا۔ مصلحت سے خالی نہیں۔ بعض کا شبہ تھا کہ لڑکی اور مالک سرکس کے گہرے تعلقات ہیں۔ اور بعض کو یقین تھا کہ لڑکی مالک کی بیٹی ہے۔ مگر اصلیت میں یہ سب عقلیہ گدے ہی تھے کیونکہ سرکس کے کارکنوں اور اداکاروں سے ملاقات یا واقفیت کسی کو بھی حاصل نہ تھی۔ سرکس کے چھوٹے بڑے جانور۔ ان کے پنجرے اور کام کرنیوالوں کی چھولداریاں اور سب کے چاروں طرف اونچی اونچی قناتیں کھڑی کر کے ان کو عوام کی نگاہوں سے پوشیدہ کر دیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ سرکس کے مینیجر یا مالک کی اپنے لوگوں پر سخت ہدایت تھی کہ وہ کسی سے نہ ملیں جلیں اور نہ باہر جائیں۔ ایسی حالت میں لکھنؤ کی مخصوص خلقت یعنی شوقین آوارہ منش اور مفلس شرفا۔ قناتوں کے چاروں طرف اور بھی زیادہ چکر لگانے لگے۔ کوئی قناتوں کے نیچے سے جھک کر دیکھتا تھا کوئی درازوں میں سے جھانکتا تھا اور

اس طرح سے اگر کسی کو ہاتھی کے پیروں، شیر کے کٹہرے یا ایک آدھ آدمی کی جھلک نصیب ہو جاتی تو پھر وہ طرح طرح کے چشم دید افسانے بیان کرتا پھرتا تھا۔ ان سب باتوں کا آخر نتیجہ یہ ہوا کہ یہ شہرت نواب محمود علی خاں تعلقدار ڈولیا باد تک پہنچی۔ اور ایک دن وہ خود سرکس کا تماشا دیکھنے آئے جہاں ان کے واسطے نشستیں مخصوص کر کے آراستہ کروا دی گئی تھیں۔ نواب نے سب کرتب حیرت سے دیکھے اور پسند کئے لیکن سب سے زیادہ اس لڑکی اور گھوڑی کا کھیل پسند کیا۔ تماشا ختم ہونے پر انھوں نے اپنی نشست پر منیجر سرکس کو طلب کیا اور بڑی دیر تک ان کے سرکس کی تعریفیں کیں۔ خاص کر اس لڑکی کی یہاں تک کہ انھوں نے انعام دینے کے واسطے لڑکی کو بھی اپنے پاس بلانا چاہا مگر جب منیجر سے یہ معلوم ہوا کہ لڑکی کا تماشا کرنے کے علاوہ باہر آنا ممکن نہیں ہے تو منیجر ہی کے ہاتھ اپنی رسٹ واچ اور پچاس روپے لڑکی کے واسطے انعام بھجوا دئے۔ نہ صرف یہی بلکہ دوسرے روز پھر تماشے میں بہت پہلے سے آگئے منیجر کو بلوایا۔ دنیا بھر کی باتیں اور پھر پھر کے لڑکی اور گھوڑی کی باتیں کرتے رہے لیکن اس وقت منیجر اپنا زیادہ وقت نواب صاحب کو نہ دے سکا۔ اسے تماشے کی جلدی تھی اس لئے چلا گیا۔ تماشا ختم ہونے پر وہ خود ہی پھر آگیا۔ نواب صاحب نے سو سو کے پانچ نوٹ سرکس کو انعام دئے۔ بڑی دیر تک باتیں کیں۔ اتنی کہ رات گئے واپس ہوئے۔ دوسرے روز نواب صاحب نے منیجر کو اپنے محل پر صبح کے کھانے پر دعوت دی۔ نواب صاحب کی اس خاص توجہ اور مہربانی کا مطلب منیجر سرکس بھی پوری طرح سمجھ گیا تھا۔ سو سے اوپر محل پینسٹھ برس کی عمر نواب صاحب کی دولت اور اس کے استعمال سے کون ایسا تھا جو واقف نہ تھا۔ جہاندیدہ جہاں گشت منیجر نے بھی سمجھ لیا تھا کہ یہی موقعہ ہے جو کچھ بھی ہو سکے کما لیا جائے اس لئے اس نے بڑی تدبیر اور دوراندیشی سے کام لیا۔ کھانے کے بعد جب اصل معاملے کی باتیں شروع ہوئیں تو اس نے پہلے تو بڑی ہی پریشانی اور گھبراہٹ ظاہر کی۔ اس بارے میں کچھ سنا ہی نہ چاہتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ لڑکی کا باپ اور بڑا بھائی دونوں ساتھ ہیں سخت نگرانی کی جاتی ہے۔ کچھ کیا ہی نہیں جا سکتا۔ لیکن پھر بعد میں جب اس کو بہت کچھ لالچ دی گئی تو بہت ہچکچاہٹ کے بعد ایک تجویز اس طرح پیش کی:۔

"نواب صاحب آپ کے اخلاق اور مہربانی نے مجھ کو مجبور ہی کر دیا ہے۔ لیکن حضور دیکھیں کہ میں کس قدر خطرناک کام کرنے پر آمادہ ہو گیا ہوں اگر کچھ بھی گڑبڑ ہو گئی تو دس بارہ برس جیل خانے میں چکی پیسنا پڑے گی۔ بہرحال اب جو کچھ بھی ہو آپ کا کام تو پورا کر ہی دوں گا۔ کل اتوار کا تماشا ختم کر کے ہم لوگ پرسوں یہاں سے کانپور جانے والے ہیں۔ آپ پیر کی صبح کو اپنا موٹر خود ہی لے کر ہم لوگوں کی قناتوں کے دروازے پر آئیں اور انتظار کریں۔ لڑکی کی طبیعت کچھ خراب بھی رہتی ہے میں اس سے کہوں گا کہ ڈاکٹر کے پاس جانے کے واسطے موٹر ہے اور اس دھوکے سے لا کر اس میں سوار کر دوں گا۔ اس کو شبہ بھی نہ ہوگا کہ کیا ہو رہا ہے۔ آپ اس سے کوئی بات نہ کریں، خاموشی سے بٹھا کے لئے چلے جائیں۔ محل میں جا کر پھر جو بھی ہو اس کے ذمہ دار آپ ہیں۔ جو کچھ بھی انتظام کرنا ہو کر لیں۔ رہا میرا اور میرے آدمیوں کا معاملہ نواب جو قسمت میں بدا ہو! لڑکی کے غائب ہوتے ہی اس کے باپ اور بھائی میری بوٹیاں نوچ ڈالیں گے۔ نہ معلوم کن کن مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑے۔ تاہم اتنا تو مجھے ضرور ہی کرنا ہوگا کہ لڑکی کے چلے جانے کے بعد پولس میں باقاعدہ اطلاع کروں ورنہ میں کسی طرح نہیں بچ سکتا۔ اس کے باپ اور بھائی کی زبان بند کرنے کے واسطے بھی ہر ممکن طریقہ اختیار کرنا ہوگا اور اس لئے میں حضور سے صاف صاف کہے دیتا ہوں کہ دس ہزار سے کم میں یہ کام کرنے پر ہرگز تیار نہیں ہوں اس میں مجھے کیا ملے گا یہ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ پولس اور اس کے رشتہ داروں کو دے دلا کر کچھ مل گیا تو مل ہی گیا ورنہ گھاتے میں چکی پیسنا تو بدی ہے۔ نواب صاحب میں تو پھر آپ سے التجا کرتا ہوں کہ آپ اس لڑکی کا خیال چھوڑ دیں وہ آپ کے بس کی چیز نہیں۔"

سرکس بیس دن لال باغ میں ٹھہرا۔ اتوار کی شام کو آخری مرتبہ تماشا کر کے پیر کی صبح کو یہاں سے کوچ کا سامان ہونے لگا۔ صبح اندھیرے ہی سائیس گھوڑوں کو لے کر پیدل روانہ ہو گئے تھے۔ باقی جانوروں کے پنجرے چھکڑوں پر لادے جا رہے تھے۔ لوگوں کی چھولداریاں گرا گرا کر سمیٹی جا رہی تھیں، ہر آدمی کسی نہ کسی کام میں مشغول تھا۔ ایک طرف ایک ہاتھی بیٹھا تھا جس پر بہت سامان لدا ہوا تھا اور اس پر چند بندر بندھے ہوئے تھے، اب یہ بھی روانہ ہونے کے واسطے تیار ہو گیا تھا، باقی ہاتھی ابھی یوں ہی کھڑے جھوم رہے تھے۔ منیجر کا چھوٹا سا خیمہ ابھی لگا ہوا تھا اور وہ اس کے سامنے آرام کرسی پر لیٹا نواب صاحب کی آمد کا منتظر تھا۔ ایک آدھ آدمی اِدھر اُدھر سے آکر اس سے کچھ پوچھ گچھ جاتا تھا جس پر وہ ان کو معمولی ہدایتیں بھی دیدیتا تھا اور پھر گھڑی کو دیکھ کر انتظار میں لیٹ جاتا تھا۔ نو بجے کے قریب نواب صاحب کے موٹر کا ہارن بجا۔ منیجر فوراً اٹھ کر قناتوں سے باہر گیا۔ وہاں ایک بہت بڑے موٹر میں جس پر پردے لگے ہوئے تھے۔ نواب صاحب خود کرتہ پیجامہ پہنے ڈرائیور کی جگہ بیٹھے تھے۔ منیجر نے پاس جا کر سلام کیا۔ نواب صاحب کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ چہرہ انبساط سے سرخ تھا۔ مسکرا کر گھبرائی ہوئی آواز میں پوچھا "کہئے!"

منیجر۔ (اطمینان سے) "سب انتظام ٹھیک ہے۔"

نواب صاحب (جلدی سے) "بہتر ہے۔ پھر جائیے جلدی کیجئے۔"

منیجر۔ (نہایت اطمینان سے) "میری طرف سے مطمئن رہیں۔ اب آپ بھی تو مجھے اطمینان دلائیں۔ دیکھئے نواب صاحب اس واقعے کے بعد میرا آپ کے محل پر جانا کبھی طرح ٹھیک نہ ہوگا۔ اور نہ آپ کا یا آپ کے کسی آدمی کا یہی آنا ٹھیک ہوگا۔ دوسرے کسی اور شخص کا بیچ بھی میں پسند نہیں کرتا۔"

نواب صاحب (جلدی سے گدی کے نیچے سے نوٹوں کا بنڈل گھسیٹ کر اور ان کو کھولتے بند کرتے ہوئے) "آپ کی رقم آپ کے اطمینان کے واسطے موجود ہے۔ ایک ہاتھ سے لڑکی کو سوار کیجئے دوسرے ہاتھ سے اپنا معاوضہ لیجئے۔ جائیے جلدی کیجئے۔ میرا یہاں اس طرح زیادہ ٹھہرنا نازیبا ہے۔"

منیجر نے ایک دفعہ نوٹوں پر پھر نظر ڈالی۔ مسکراتا ہوا قناتوں کے گھیرے کے اندر گیا اپنے ڈیرے کے پاس جا کر اس میں جھانکا اور ہاتھ سے اشارہ کیا۔ اندر سے وہی لڑکی وہی تماشا کرنے کا چست لباس پہنے مسکراتی ہوئی نکلی۔ اور منیجر کے پیچھے پیچھے چلدی۔ باہر موٹر کا انجن پہلے ہی سے گنگنا رہا تھا۔ نواب صاحب اسٹیرنگ گیر دونوں ہاتھوں سے تھامے بالکل تیار بیٹھے تھے۔ جونہی یہ دونوں پاس آئے نواب صاحب نے للچائی ہوئی ایک نگاہ جلدی سے لڑکی پر ڈالی۔ اس کے گال سرخ تھے۔ ہونٹوں پر لالی تھی۔ ماتھے پر سے ہوتا ہوا گدی کے چاروں طرف ایک سرخ ربن بندھا تھا۔ اس کے نیچے سیاہ بال کھلے ہوئے شانوں پر پڑے تھے۔ وہ نواب صاحب پر ایک نظر ڈالتی ہوئی مسکراتی موٹر کے پاس آئی۔ منیجر نے دروازہ کھول دیا اور وہ اس میں بیٹھ گئی۔ منیجر دروازہ بند کر کے نواب صاحب کے پاس آیا۔ انھوں نے کھسکتے ہوئے موٹر میں سے نوٹوں کا بنڈل منیجر کو دیدیا۔ اور رفتار بڑھا دی۔ لمحہ بھر میں موٹر سامنے کے موڑ پر گھوم کر نظروں سے غائب ہوگیا۔ قناتوں سے باہر فٹ پاتھ پر منیجر صاحب تنہا مسکراتے ہوئے نوٹوں کے گڈے میں سے پرتیں ہٹا ہٹا کر کچھ دیر دیکھتے رہے اور پھر ان کو پتلون کی جیب میں ٹھونستے ہوئے اندر روانہ ہوئے۔

موٹر سڑک پر۔ غیں غیں ادھر گھوم ادھر گھوم۔ یہ جا وہ جا۔ نکلتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ شہر کا کنارہ آگیا اور اب وہ سیدھا مولیا باد کی طرف روانہ ہوگیا۔ جہاں پوری پختگی اور احتیاط کے ساتھ سب انتظام ہو چکے تھے۔ محل کے زنانے پھاٹک میں جیسے ہی موٹر داخل ہوا۔ بڑا پھاٹک بند کر لیا گیا۔ اس کے اندر کے صحن میں دو چار کیاریاں۔ چند درخت اور پودے تھے۔ ایک طرف تین چار ملازم بیٹھے تھے ایک لمبے دالان کے سامنے اونچا سا چبوترہ تھا موٹر اس کے سامنے رکا۔ موٹی سی ادھیڑ عمر کی ایک ماما چاندی کا ممنون زیور پہنے موٹر کے پاس آئی دروازہ کھولا۔ بڑے ٹھسے سے بولی "اتریئے۔ آئیے میرے ساتھ چلی آئیے" لڑکی اب بھی اسی طرح خاموش مسکراتی ہوئی خوش خوش پھرتی سے اتری اور اس کے پیچھے پیچھے تیزی سے چل دی۔ ماما نے برآمدے کے کونے پر ایک دروازہ کھولا۔ یہ زینہ تھا۔ دونوں اوپر چڑھے ایک اور چھوٹا سا صحن ملا اس کے دوسری طرف ایک بہت بڑا آراستہ کمرہ تھا جس میں زمین پر فرش قالین گاؤ تکئے وغیرہ تھے۔ دیواروں پر بھدی رنگین تصویریں اور بڑے بڑے آئینے تھے ایک طرف ایک بہت بڑی سی سنہری مچھر دان سے ڈھکی ہوئی تھی دوسری طرف تختوں کا چھوٹا سا چوکہ تھا اس پر بھی چاندنی قالین گاؤ تکیہ وغیرہ لگے تھے جا بجا چاندی کے اگالدان رکھے تھے قالینوں کے کونوں پر اگر کی بتیاں جل جل کر خوشبودار دھوئیں سے کمرے کو معطر کر رہی تھیں۔ ایک چوکی پر لوٹا صراحی۔ صابن دانی۔ پیندانی سب چاندی کے رکھے تھے۔ فرش پر گاؤ تکئے کے برابر قالین پر ایک گنگا جمنی پاندان دوسری طرف آبنوسی عطر دان رکھے تھے۔ ایک کونے میں ایک چھوٹی سی میز پر سبز اور سرخ رنگ کے پانخے دار خوان پوش سے ڈھکی ایک سینی رکھی تھی۔ کمرے کی چھت اور دیواریں طرح طرح کے رنگوں سے بنے ہوئے پھول اور پتیوں سے نظروں کو گھائل کئے دیتی تھیں۔ چھت میں رنگین شیشے کے دو جھاڑ لٹک رہے تھے۔ ماما لڑکی کو لئے ہوئے اس کمرے میں داخل ہوئی۔ تختوں کی طرف بیٹھنے کا اشارہ کیا اور الٹے پیروں واپس لوٹ گئی۔

لڑکی نے خوشی سے مسکراتے ہوئے کمرے میں چاروں طرف نگاہ ڈالی۔ ہر چیز کو حیرت سے دیکھا تختوں کے پاس گئی پیر لٹکا کر بیٹھی لیکن فوراً ہی جھک کر آبنوسی عطر دان کو چھوا اور پھر سیدھی ہو گئی چاروں طرف دیکھا کہ کوئی دیکھتا تو نہیں ہے۔ پھر جھک کر عطر دان کے نقوش پر ہاتھ پھیرا۔ نواب صاحب انگنائی کی دوسری سمت کے ایک کمرے میں سے جھانک رہے تھے باہر آکر ہنستے ہوئے اس کمرے میں داخل ہوئے "ہاں۔ ہاں عطر لگاؤ۔ عطر لگاؤ۔ یہ تمہارے ہی واسطے ہے۔" ان کے آنے پر لڑکی جلدی سے سیدھی ہو بیٹھی اور ان کی طرف دیکھ کر زیر لب مسکرائی۔ نواب صاحب نے اور آگے بڑھتے ہوئے کہا "کس غضب کی تمہاری مسکراہٹ ہے" اور۔ اور آگے بڑھے۔ دونوں ہاتھ لڑکی کی طرف بڑھائے۔ آناً فاناً میں لڑکی کے مسکرانے میں تغیر پیدا ہوا ہنسی غائب ہو کر متانت پیدا ہوئی متانت سے پریشانی اور پریشانی سے غصے کے آثار اس کے چہرے پر آئے۔ اب وہ ساکت کھڑی اس سفید بوڑھے کو غصہ سے تک رہی تھی۔ نواب صاحب نے یہ کہتے ہوئے کہ

"دُنیا کا ہر عیش یہاں تمہارے واسطے مہیا کر دوں گا اب تم کو میرا ہی ہو کر رہنا ہوگا۔" پھر اپنا ہاتھ لڑکی کی طرف بڑھایا۔ لڑکی پھرتی سے ایک قدم پیچھے ہٹی دونوں ہاتھ اٹھا کر اپنے چہرے کو رگڑ ڈالا۔ پھر کندھوں پر پڑے ہوئے گیسو سر سے نوچ نواب صاحب کے سامنے زمین پر دے مارا۔ اور اس کے بعد اس نے پہلی مرتبہ اپنی آواز نکالی "آوا وا آ آوا وا وا وا آ" نواب صاحب مجسمۂ حیرت بنے ساکت کھڑے دیکھ رہے تھے۔ ان کے سامنے چودہ برس کی بدہیئت گونگی لڑکی غصہ میں بھری بے ہنگم آوازیں نکال رہی تھی۔ زور زور سے ہاتھ رگڑنے سے اس کے چہرے کا غازہ جابجا سے اڑ چکا تھا جس سے کہ اس کا اصلی سیاہ رنگ چتکبرا ہو گیا تھا۔ چہرے پر ایک زخم کا بدنما داغ داہنے گال سے لیکر کنپٹی تک چلا گیا تھا۔ دوسرا داغ خشخشی بالوں سے آراستہ سر کے بیچوں بیچ نمایاں چمک رہا تھا۔

وہاں نہ باپ تھا نہ بھائی۔ مکروہ صورت لاوارث لڑکی فکر کون کرتا۔ البتہ گھوڑی کی فکر میں سب ہی پڑ گئے۔ کانپور پہنچکر اب ہر ایک کی یہ کوشش ہونے لگی کہ لڑکی کی جگہ وہ لے لے انھوں نے طرح طرح سے اسے رام کرنے کی فکر کی۔ لیکن پیار۔ دلاسا۔ مار پھٹکار کچھ بھی کارگر نہ ہوئے کیونکہ بچپنے سے ان ہی لوگوں نے روزانہ اس کے ہزاروں سوئیاں چبھو چبھو کر اسے دنیا بھر کے انسانوں سے خائف کر دیا تھا یہ لوگ اسے سرکس کے کٹہرے میں لاکر طرح طرح کے لباس بدل کر اس کے پاس آتے تھے اور اس کے سوئیاں چبھویا کرتے تھے۔ اسے معلوم تھا کہ جب تک وہ تھان پر بندھی ہے خیریت ہے اور جہاں اس جگہ سے ہٹی یا آزاد ہوئی سوائے اس لڑکی کے جو بھی پاس آئے گا کسی نہ کسی طرح سوئی ضرور چبھوئے گا۔ اس کو ہر انسان سے دلی نفرت اور عداوت ہو گئی تھی۔ اس کی قدرتی محبت کا رجحان دنیا بھر سے سمٹ کر اس لڑکی پر قائم ہو چکا تھا۔ وہ نوعمر بے زبان جانور عاشق کیطرح محبت کرنے کو بے قرار معشوق کی طرح محبت کئے جانے کا منتظر۔ صرف ایک ہی ہستی اس گونگی لڑکی کی منتظر کالی گھوڑی خاموش کھڑی سر کو جھٹکے دیتی اور دم سے مکھیاں جھلتی تھی۔ نہ آنکھوں میں اشک نہ لب پر فریاد۔ اگاڑی پچھاڑی بندھی کھڑی ہے۔ کبھی دو ایک منہ گھاس کھائی اور کھڑی ہے۔ کان آگے کئے پیچھے سے سر کو جھٹکے دئے۔ دم کی چوری چل رہی ہے۔ خاموش کھڑی ہے۔ اس خاموشی میں انتظار ہے۔ غم ہے اور پھر انتظار ہے۔ اس پر طرح طرح کے ظلم ہوئے۔ طرح طرح کی مار پڑی۔ ہر ہر طرح اس پر سوار ہونے کی کوشش کی گئی۔ مگر اس نے ہمت نہ ہاری۔ اس کو لڑکی کا انتظار تھا۔ وہی اس پر سوار ہو سکتی تھی۔ دوسرے کو کیسے پاس آنے دیتی۔ یہاں تک کہ جب پیروں میں سندے ڈال کر اور منہ پر پھیرا باندھ کر اس کو چلنے اور دلتی چلانے کاٹنے سے بھی بالکل ناکارہ کر دیا گیا۔ تو پھر اس نے دھڑا دھڑا اپنے تئیں کھڑے قد سے گرا گرا دیا لیکن کسی کو سوار نہ ہونے دیا۔ اسی طرح کی دن دن بھر اس پر سختیاں ہوئیں۔ اور جب کبھی لوگوں نے ہار کے جھک مار کے پھر اسے تھان پر لاکے باندھا۔ وہ خاموش کھڑی ہو گئی نہ آنسو نہ آواز نہ سرد آہیں۔ نہ فریاد۔ خاموش! خاموش بے زبان کی ایک وہی زبان خاموشی۔ سر کو دو ایک جھٹکے دئے دم ہلائی۔ خاموش کھڑی ہے گھنٹوں کھڑی ہے۔ دو جھٹکے سر کو پھر دئے دم ہلائی اور کھڑی ہے۔ سرکس والوں میں ادھر یہ ہو رہا تھا کہ "اچھا اب سالی کو جلاب اور فاقے دئے جائیں" ادھر اس نے خود دانہ گھاس چھوڑ دیا۔ بانسوں کی مار سے اور کھڑے قد سے گر گر پڑنے سے بدن پھوڑا ہو رہا تھا۔ لڑکی کی یاد میں دل بیقرار تھا۔ ہر طرف آنکھیں اسی کو ڈھونڈتی تھیں۔ نہ بھوک تھی نہ پیاس اوپری چوٹیں اندرونی غم۔ چند دن اور جو گذرے تو گھوڑی کی صورت ہی اور ہو گئی۔ پھڑکتی تھرکتی موٹی تازی سیاہ چمکتی بچھیڑی کے بجائے سست مری مسلی سیاہ کچی کچی گھڑیا سر جھکائے اونگھتی ہوئی سی کھڑی ہے۔ ٹانگوں میں مکھیاں آنکھوں پر بھنگے چمٹے ہوئے ہیں۔ کبھی دم ہلائی تو ہلائی ورنہ سر نیچا ہے کھڑی ہے۔ عجیب حالت ہو گئی۔ آخر ایک دن جب سرکس کانپور سے بھی کوچ کرنے لگا اس کا نیلام بول دیا۔ پچیس روپے اور مالک سرکس کی جیب میں آئے اور گھڑیا بھی یہاں سے رخصت ہوئی۔ قصہ ختم ہوا۔ چار دن کے بعد بھولے سے بھی کوئی کیوں ان کو یاد کرتا کیسی لڑکی کس کی گھوڑی۔ گھاس کوڑا اس کا کیا پڑا ہے تو پڑا ہے نہیں تو آندھی آئی اڑ گیا۔ پانی آیا بہہ گیا یہ دونوں بھی دنیا کے سمندر میں تھپیڑے کھاتے بہتے چلدئے۔ ایک مشرق اڑا دوسرا مغرب بہا۔ پتھر کی سلیں دل کے عارضہ سے آزاد جیسی صدیوں پہاڑوں پر بیٹھی جیتی ہیں۔

جاڑے جاتے ہیں بہاریں آتی ہیں۔ جگ پہ جگ۔ صدیاں آتی اور جاتی ہیں۔ قومیں پر قومیں آتی ہیں۔ نسلوں پہ نسلیں جاتی ہیں۔ پر یہ بیٹھی بیٹھی تکتی ہیں اور ہم آندھی کے تنکے اب اٹھے جب گرے پل بھر ہی اڑتے ہیں پھر بھی قسمت کے مارے الفت! محبت یاس و حسرت آرزو اور تمنا کا گھروندا یعنی لپ لپ کرتا دل پہلو میں لئے پھرتے ہیں۔ اتفاق نے اکٹھا کر دیا تھا گئے۔ حادثات نے جدا کر دیا الگ ہو گئے۔ نہ اس کا کوئی گھر نہ دوبارہ سرکس کی زندگی کیا تھی صبح کا خواب تھا۔ چونکتے تو کچھ نہ تھا۔ گھوڑی کے لئے یکہ تھا یکہ والا تھا۔ اور کانپور کی سڑکیں گلیاں تھیں۔ ادھر لڑکی کے لئے چولھا تھا برتن تھے۔ سل تھی اور بٹہ تھا۔ اور دو بیبیوں کی خدمت تھی۔ مصالحہ پیسنا برتن مانجھنا۔ کھانا پکانا گھر بھر کو کھلانا۔ بچا کھچا خود کھانا۔ اور پھر اسی کو دھرانا۔ یہی زندگی تھی۔ برس پہ برس گذرے اور برس پہ برس گذرے گونگی لڑکی بے زبان۔ سل پہ بٹہ

دہنیاں مرچیں دونوں ہاتھوں میں پٹہ اکڑوں بیٹھی آگے پیچھے آگے پیچھے ہل۔ ہل ہل من جسیم مصالحہ پیسنے میں لگا ہے۔ اور دل! کمبخت دل! سرکس سیاہ گھوڑی گھوڑی کی محبت بھری نگاہیں۔ اس کی خمیدہ گردن۔ اس کا خوشنما ماتھا۔ اس کا سر گھما کے دیکھنا۔ اسکا تھرکنا۔ اس کو ملنا۔ اس کو گھاس دانہ دینا۔ اس کی دوڑ۔ اس کی سواری اس پر کرتب۔ ہزاروں آدمیوں کا حیرت سے دیکھنا۔ وہ تالیاں! وہ تالیاں۔ جب دنیا تحیر تھی۔ دنیا حیرت کرتی تھی۔ یہی زندگی تھی۔ یہی زندگی کا معراج تھا۔ لیکن یہ سب نہ آنکھیں دیکھ سکیں نہ کان سن سکے۔ لوگوں سے نہاں۔ دنیا سے پنہاں۔ گیلی گادہ لکڑیوں کے دھوئیں میں پھو! کرتے ہوئے کالی چکنی ہنڈیوں کو سرسراتی جاڑے کی راتوں میں مانجھتے ہوئے۔ نہ مٹنے والی اور نہ ٹلنے والی یادیں زبان کو ستاتی تھی۔ جاڑوں میں کٹ کٹ کانپتے ہوئے۔ گرمی میں پسینے سے شرابور ہانپتے ہوئے۔ برسوں برسوں گونگی نے وہی گذرے ہوئے دن یاد کئے پر قسمت نے کسی پہلو کوئی پلٹا نہ کھایا اور زمانہ پلٹا بھی تو کیا پلٹا۔ نہ ماں باپ تھے نہ بھائی بہن۔ نہ رشتے دار تھے نہ ملنے والے۔ شوہر نہیں اولاد نہیں۔ اس کی زندگی میں کوئی تغیر ہو ہی کیا سکتا تھا۔ امید بھی کیا ہوتی تمنا ہی کیا ہوتی۔ بے آسرا بے آرزو دن کٹتے گئے۔ نواب محمود علی خاں نے چیخ چلا کے ندامت اور خجالت کا غصہ نوکروں پر اتار کے لڑکی کو کالے خاں باورچی کے سپرد کر دیا تھا۔ اور ہدایت کر دی تھی کہ گھر سے باہر نہ نکلنے دیں۔ آپ نواب صاحب کے ملازم بقدر حیثیت خود بھی آقا کے قدم بقدم چلتے تھے۔ زیادہ نہیں تو گھر میں دو ہی بیویاں تھیں۔ لڑکی تھی کم عمر۔ ان دونوں نے اس خیال سے کہ کہیں سوتن بن کر نہ گھر کی ہو خوب ہی درگت بنائی۔ چڑھتے شباب میں لڑکی ان کے حوالے کی گئی تھی۔ سگھڑ بیویوں نے سلیقے سے شباب کو بڑھاپے میں بدلنا شروع کر دیا۔ چند سال میں لڑکی سے بڑھیا ہو گئی۔ جوتے کھائے خدمت کرتے پندرہ برس گذر گئے۔

ہم روز دیکھتے ہیں کہ صبح کو ہلکی روشنی میں ہر چیز خوش حال تر و تازہ شاداب ہوتی ہے۔ بھیگی بھیگی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے چلتے ہیں۔ چڑیاں چہچہاتی ہیں۔ پھول مسکراتے ہیں۔ سبزہ لہلہاتا ہے۔ اور پھر چند ہی گھنٹے بعد چوندھیاتی دھوپ میں ہر چیز دکھتی ہے۔ جھلستی ہے ہوائیں گرم اور خاک آلود ہو جاتی ہیں چڑیاں ادھر ادھر چھپ جاتی ہیں۔ پھول نڈھال ہو کر کمھلانے اور گرنے لگتے ہیں۔ ہر بادل پر دھول پڑتی ہے خاک چھاتی ہے۔ دن رات یہی قدرت کے پلٹے ہیں پھر کون سی حیرت کی بات ہے۔ سرکس کی وہ تندرست سیاہ چمکتی شوخ گھوڑی کان پور میں نیلام ہونے کے چند دن بعد یکہ میں جتنے والی گھوڑیا ہو گئی اپنی پیٹھ پر کسی کو نہ بیٹھنے دیا۔ لو کیا؟ گھڑ گھڑاتا بھاری یکہ دم کے پیچھے لگ گیا۔ اب

کھٹ کھٹ گھوڑیا! سٹاسٹ چابک۔ دن بھر شہر کی سڑکیں گلیاں اور اسٹیشن کے پھیرے ہوتے گئے۔ دن بھر کی تھکی شام کو گھر آئی۔ ڈھیر سی ملائی ہوئی۔ تھوڑا دانہ تھوڑی گھاس ملی۔ رات بھر مچھروں نے کاٹا۔ صبح ہوئی پھر جلدی شہر بھر کی خاک چھاننے نہ شباب رکا۔ نہ جوانی ہی آئی۔ اس مار اور محنت سے دونوں ہی بھاگ گئے۔ پھیری سے یکے کی گھوڑیا ہو گئی۔ اسٹیشن پر جبکہ کسی کھڑی اونگھ رہی ہے مزدوری مل گئی سامان رکھ گیا۔ سواریاں بیٹھ گئیں۔ تو یکے والے نے راس کو دو جھٹکے دئے۔ چابک چلایا۔ کھٹ کھٹ کی گھوڑیا نے دم ہلائی۔ سر اوپر نیچے اوپر نیچے ہلایا اور پھر منڈیا نیچے غوطہ میں کھڑی ہو گئی۔ "اوگھوڑی اوگھوڑی۔ او تیرا ناس ہو چل! کھٹ کھٹ۔ کھٹ کھٹ" سٹ سٹ چابک سٹ چابک۔ گھوڑیا نے پھر دم ہلائی۔ سر ہلایا۔ دم ہلائی سر ہلایا۔ اور کھڑی ہے۔ پھر راس کو کرارے جھٹکے دئے گئے "اوگھوڑی اوگھوڑی چل تیرا ناس لگے۔ کھٹ کھٹ۔ کھٹ کھٹ۔ کھٹ کھٹ" اب پیروں سے زیادہ سر کو اوپر نیچے ہلاتی۔ ٹھمک ٹھمک گھوڑی چل پڑی تو اور سٹاسٹ سٹاسٹ چابک پڑنے لگے "چل۔ اوگھوڑی چل چل چل! اوگھوڑی۔ اوگھوڑی تیرا ناس ہو۔ کھٹ کھٹ" اسی کھٹ کھٹ میں گھوڑی کی عمر کٹ گئی۔ پندرہ برس ہو گئے بوڑھی ہو گئی پیر کانپنے لگے۔ راستہ چلنا دشوار ہو گیا۔ ایک روز حسب معمول گھوڑیا یکہ کھینچی ٹھمک ٹھمک چلی جا رہی تھی۔ بازار میں ایک جگہ اسے روکا گیا۔ رک گئی۔ منڈیا نیچی کر کھڑی ہو گئی۔ یکے پر پردے پڑے تھے۔ اس میں دو زنانی سواریاں تھیں ایک مرد ساتھ تھا۔ مرد وہی کالے خاں باورچی تھے بیویوں میں ایک بیوی دوسری گونگی ماما تھی ــــ کالے خاں نے ایک دوکان پر سبز زنانے گرگابی جوتے لا کے پردے کے اندر سر ڈال کے بیوی کو دکھائے ان میں سے دو پسند آئے پہن کر دیکھے پھر ان دو میں سے ایک لینے کو بتا دیا۔ میاں جوتے لے کر پھر دوکان کی طرف چلے۔ بیوی کی نیت اس جوڑے سے اس جوڑے پر ڈانواں ڈول ہوئی۔ اب کیا کرتیں گونگی سے اشارہ کیا بلا میاں کو بلا۔ وہ بیچاری اپنی زبان میں چلائی "آ۔ دادا۔ دا۔ آدا" پژمردہ دل۔ بوڑھی گھوڑی نے برسہا برس کے بعد پھر وہی آواز سنی۔ وہی آواز جو کبھی محبت کا پیغام تھی۔ وہ آواز جس سے زندگی کی گذری ہوئی پر مسرت گھڑیاں وابستہ تھیں۔ یکایک یہ آواز جو آئی۔ گھوڑی چونک دونوں کان پیچھے دبا خاموش کھڑی ہو گئی۔ بازار کی چیخ پکار میں میاں نے آواز نہ سنی۔ اس لئے گونگی نے پھر وہی آواز نکالی۔ گھوڑی نے کان آگے پیچھے ہلاتے ہوئے پھر آواز کو سنا۔ دنیا کی تمام آوازوں میں یہی ایک آواز تھی جو اس سے تعلق رکھتی تھی۔ برسوں برسوں اس کے لئے کان ترستے رہے تھے۔ برسوں ہوئے سے اس آواز کے پھر سننے کی ناامیدی ہو چکی تھی۔ "یہ آواز۔ یہ آواز۔ لڑکی آ گئی۔ مل گئی۔ کہاں ہے؟ چلی جائے گی۔ پھر نہ ملے گی۔ کیا کروں۔ کیا کروں" غالباً کچھ اسی قسم کے خیال گھوڑی کے دماغ میں آئے ہوں گے یا جو کچھ بھی۔ لیکن یہ واقعہ

ہے۔کہ دوسرا کے جو گھوڑی نے اس آواز کو سنا تو پھر یہ معلوم ہوا کہ اس مریل گھوڑی میں کسی نے بجلی بھر دی۔اس نے ایک دفعہ ہنہنا کے تڑپ ماری۔جال میں پھنسے ہوئے جنگلی ہرن کی طرح وہ تڑپی اور پھڑکی۔ دیکھتے دیکھتے ساز کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔گھوڑی آزاد ہو کر بموں میں سے نکل بھاگی کے چاروں طرف پھرنے لگی۔وہ رکتی۔بھاگتی۔کبھی الف ہوتی۔کبھی دولتیاں چلانے لگتی کان سکیڑے۔دانت نکالے۔یکہ کے گرد گھومنے لگی۔چاروں طرف سینکڑوں آدمی جمع ہو گئے تھے۔لیکن سب خوف زدہ بھاگنے کے واسطے تیار دور ہی سے تماشا دیکھ رہے تھے۔ان ہی میں یکے والا اور میاں کالے خاں بھی شامل تھے جو کہ فاصلہ پر ہی سے نمایاں اچھل کود اور بلند ترجملوں سے اپنی وابستگی اس غلاف پوش یکے سے ظاہر کر رہے تھے۔جو کہ اب ٹیڑھا بموں کو زمین پر لٹکائے رکوع کی حالت میں خاموش کھڑا تھا۔اور اس کے اردگرد خوفناک۔وحشی۔کالی گھوڑی اس ارادہ سے طواف کر رہی تھی کہ "اگر کوئی بھی پاس آیا تو جان ہی لے لوں گی"۔ اور سفید پردے کا یکہ بیچ میں عجیب مظلومیت سے ساکت ٹیڑھا جھکا کھڑا تھا۔ دراصل یہ معلوم ہوتا تھا کہ دعا مانگ رہا ہے۔اس کے پردوں کے اندر بھی بالکل خاموشی تھی۔بیوی ڈر کے مارے بیہوش ہو چکی تھی۔گونگی پردے کا ایک کونہ ہٹائے یکہ کے ڈنڈے پکڑے خاموش بیٹھی باہر دیکھ رہی تھی۔آنکھوں سے آنسو جاری تھے جو پیا ہر ایک کے بعد ایک گالوں پر سے بہہ کر ٹپ ٹپ گر رہے تھے۔اس کے چاروں طرف دور ہزاروں آدمیوں کا ہیجان تھا اور ادگرد گھوڑی کے وحشیانہ کرتب تھے۔اس وقت اس نے پھر ایک دفعہ اپنی پرانی دنیا کو زندہ ہوتے دیکھا۔اس کے مردہ ہاتھ پیروں میں ایک روح سی دوڑی۔وہ پردے ہٹا یکہ سے کود سڑک پر لمحہ بھر کھڑی ہوئی۔اور پھر ہزاروں ششدر آدمیوں کے سامنے وہ بدصورت لاغر ادھیڑ عمر کی عورت گھوڑی کی طرف لپکی اور اچھل اسکی ننگی پیٹھ پر بیٹھ گئی۔اس کے ساتھ ہی گھوڑی بھی جدھر اس کا منہ تھا ادھر ہی سیدھی سرپٹ دوڑ پڑی۔لوگوں کی بھیڑ کائی کی طرح پھٹتی گئی اور گھوڑی تیر کی طرح نکلتی یہ جا وہ جا نکل چلی گئی۔

بوڑھی عورت کو لئے بوڑھی گھوڑی بے تحاشا بھاگی۔چوراہوں پر ہوتی جگہ جگہ گھومتی۔بازاروں میں کتراتی۔بھاگتی چلی گئی۔محلوں پر محلے گذر گئے۔اور وہ بھاگتی ہی چلتی چلی گئی۔یہاں تک کہ شہر کا کنارہ بھی آیا اور نکل گیا۔اب لمبی سیدھی کالی روڈ تھی۔اس پر بھی وہ دونوں میلوں میلوں چلے گئے۔پانچ اور دس اور پھر پندرہ میل ہو گئے تو پھر وہ دونوں مسکین بے زبان مسافر اپنی اصلی منزل مقصود کو پہنچ گئے۔جدھر ہم سب دنیا کے مسافر بڑھے چلے جا رہے ہیں۔ پندرہ میل کے بعد بڈھی گھوڑی کے پیر لڑکھڑائے۔سرپٹ بھاگتے میں ٹھوکر کھائی منہ کے بل زمین پر گری۔اس کا بھی سر پاش پاش ہو گیا۔گونگی عورت کی بھی ہڈی ہڈی ٹوٹ گئی۔جس نے کہ گھوڑی سے بھی دس گز آگے پکی سڑک پر پٹخنی کھائی تھی۔

اے دوست! نہ رنجیدہ ہو۔یہی وہ آخری منزل مقصود ہے جس کے حاصل کرنے کے واسطے یہ دونوں جدا جدا جی رہے تھے۔ورنہ اور کیا تھا۔کس کا آسرا تھا۔کس حصول کی تمنا تھی۔شباب لٹ چکا تھا۔جوانی اجڑ گئی تھی۔بڑھاپے میں ایک کہیں دوسرا کہیں کسی نہ کسی طرح راہی ملک عدم ہوتے۔چند منٹ کی ہی سہی آخر یکجائی پھر ہوئی پھر وہی شباب کا شعلہ چند بے نصیب ہوا۔اور یہ ختم بھی نہ ہوا تھا کہ ڈراپ سین ہوا۔

سید رفیق حسین

سچّی کہانی

ایک بات پوچھنا چاہتی ہوں آپ سے۔ بتایئے گا؟

کیوں نہیں؟

سچ سچ بتایئے گا؟

بیشک۔

میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ آپ مجھے بنا تو نہیں رہے ہیں۔

میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا سلمیٰ!

واقعی؟

واقعی۔

میرا مطلب یہ ہے کہ آپ کا التفات روز بروز بڑھتا جاتا ہے اس کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آتی۔ بار بار میرے دل میں یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ شاید آپ مجھ سے مذاق کر رہے ہیں۔ صرف مجھے ستانے کے لئے۔ ورنہ میری طرف آپ کا میلانِ خاطر کوئی معنی نہیں رکھتا۔ میں اپنے اندر کوئی بات بھی ایسی نہیں پاتی جو آپکی گرویدگی کا باعث ہو سکے۔ آج تک کسی نے مجھے "خوبصورت" نہیں کہا۔ انسان اپنے متعلق بہت خوش گمان ہوتا ہے مگر اس کے باوجود کبھی میں نے اپنے آپکو خوبصورت نہیں سمجھا، جب آئینہ دیکھا دل میں یہی آرزو پیدا ہوئی "کاش میں حسین ہوتی"! اگر آپ مجھے بنا نہیں رہے ہیں تو شاید جان بوجھ کر یا نادانستہ طور پر خود اپنے آپ کو فریب دے رہے ہیں۔

قبل اس کے کہ میں تمہارے سوال کا جواب دوں میں تم سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔

پوچھئے۔

تمہارے نزدیک حُسن کا معیار کیا ہے؟

وہی جو ساری دُنیا کے نزدیک ہے۔

مثلاً؟

مثلاً غزالی آنکھیں، ہلالی ابرو، گلابی ہونٹ، شہابی رخسار۔

بس بس، میں سمجھ گیا تمہارا مطلب۔ سلمیٰ! کس قدر غلط اور عامیانہ معیار تم نے قائم کیا ہے۔ حُسن کا یہ معیار اگر صحیح ہوتا تو ساری دُنیا صرف اُن چند خوبرویوں پر مرتی جن کی صفت تم نے بیان کی۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ تمہارے نزدیک غزالی آنکھیں انسان کو دیوانہ بنا سکتی ہیں۔ مگر بہت سے لوگ اُن آنکھوں پر بھی جان دیتے ہیں جو نرگس کی طرح گول اور چھوٹی ہوتی ہیں۔ تم سمجھتی ہو کہ ہلالی ابرو ہی کیوپڈ کی کمانیں ہیں۔ مگر سیدھی بھنویں بھی بے پناہ تیر چلا سکتی ہیں۔ آؤ۔ میں تمہیں بتاؤں کہ حُسن کا حقیقی معیار کیا ہے۔

حُسن درحقیقت نام ہے پسند کا۔ اور دنیا میں پسند دو آدمیوں کی بھی یکساں نہیں ہوتی۔ اس لئے دُنیا میں جتنے انسان ہیں اُتنے ہی حُسن کے معیار ہیں۔ تمہیں اگر کسی نے حسین نہیں کہا تو یہ تمہارا قصور نہیں یہ قصور ہے دیکھنے والے کی نظر کا۔ ہر آنکھ میں یہ صلاحیت کہاں کہ وہ سطح کے نیچے دیکھ سکے۔ تم نے دیکھا ہو گا کہ جاپان کی بنی ہوئی سستی قسم کی رنگین تصویریں عوام الناس کس شوق سے خریدتے ہیں۔ اُن کے نزدیک رنگوں کی شوخی ہی بڑا حُسن ہے۔ نقوش کی لطافتوں اور خطوط کی نزاکتوں کو وہ نہیں سمجھ سکتے لیکن ایک مُبصّر کسی آرٹسٹ کی ایک پنسل ڈرائنگ کو ایسی ہزار رنگین تصویروں سے زیادہ قیمتی سمجھتا ہے عوام الناس اگر اس پنسل ڈرائنگ کی طرف اعتنا نہ کریں تو کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ اس نقشِ سادہ میں حُسن نہیں؟

سلمیٰ! تم اس بانسری کی مانند ہو جس میں ہزاروں میٹھے اور رسیلے نغمے بھرے ہوئے ہیں۔ ایسے نغمے جو اپنے بازوؤں پر بٹھا کر روحوں کو آسمانوں پر لے جاتے ہیں۔ مگر جو شخص بانسری بجانا نہیں جانتا اس کے نزدیک یہ بانسری، یہ رس ساگر، بانس کا ایک ٹکڑا ہے اور بس جو جلانے کے سوا اور کسی کام کا نہیں۔ مگر اس کی قدر اُس سے پوچھو جو اپنے ہونٹوں کو اُس کے لبوں سے لگا کر آبِ حیات برساتا ہے اور کانوں کی راہ سے شراب پلا کر روح کو مست و بیخود بنا دیتا ہے۔

سلمیٰ! تم ایک شعر ہو۔ مگر ایسا شعر نہیں جو لفظی رعایتوں کا گورکھ دھندا ہو۔ جس میں گمراہ و بیمار تخیل نے ہوائی قلعے بنائے ہوں۔ بلکہ ایسا شعر ہو جو گنجینۂ معنی اور خزینۂ اسرار ہے۔ جو ایک نشتر کی طرح دل میں پیوست ہو جاتا ہے۔ جسے سُن کر ذوقِ سلیم جھومنے لگتا ہے۔

شاید اب میرے اور دُنیا کے نقطۂ نظر کا فرق تمہاری سمجھ میں آگیا ہو گا۔ میں نے تمہیں ایک نقشِ سادہ کہا۔ مگر ایسا نقش جس میں ازلی آرٹسٹ نے اپنے موقلم کا کمال دکھایا ہے اور جو رنگوں کے بغیر ہی دلکش اور نظر

فریب ہے۔ لیکن وہ لوگ جن کی نظریں فقط سستے قسم کے شوخ اور بھڑکیلے رنگوں ہی کو سب کچھ سمجھتی ہیں، تمہیں کیونکر حسین کہیں۔ تمہاری سادہ پکاری کو سمجھنے کی صلاحیت قدرت نے مجھے عطا کی ہے اس لئے تم مجھے سراپا حُسن نظر آتی ہو۔

میں نے تمہیں بانسری سے تشبیہ دی۔ میں اس بانسری سے مست نغموں کا آبشار جاری کر سکتا ہوں۔ اس کے میٹھے اور رسیلے سُر میری رُوح کے لئے سکون و مسرت کے خزانے کھول دیتے ہیں۔ اس لئے میں اس کی قدر و قیمت کو سمجھ سکتا ہوں، ناواقف دُنیا کو یہ پریم کی بنسی فقط ایک بانس کا ٹکڑا معلوم ہوتی ہے جو اندر سے خالی ہے اور جس میں جا بجا سوراخ بھی ہیں۔ پھر وہ کیونکر اسے حسین کہے۔

میں نے کہا تم ایک سادہ و پرمعنی شعر ہو اور قدرت نے مجھے شعر فہمی کا ملکہ عطا کیا ہے۔ میں تمہارے حُسنِ معنی کو دیکھ کر بیتاب ہو جاتا ہوں۔ مگر ایک کور ذوق، لفظوں کی صنعت گری کا جویا اس شعر سے کیونکر لذت گیر ہو سکتا ہے۔ پھر وہ تمہیں کیونکر حسین کہے۔

سلمیٰ! میری نظر شراب پر ہے، جام پر نہیں۔ شراب اگر تیز ہے تو چاہے بلوریں ہو چاہے زریں، کچھ فرق نہیں۔ اور اگر شراب ہی شور و مستی نہیں تو میرے نزدیک سونے کا پیالہ بھی مٹی کا ٹھیکرا ہے۔

ظاہر پرستوں کی نظر فانوس کے نقش و نگار سے آگے نہیں بڑھتی اور میں اُس شمع کا پروانہ ہوں جو فانوس کے اندر خاموشی کے ساتھ جل رہی ہے۔

لوگ فقط پنجرے کی تیلیوں کو دیکھتے ہیں کہ آہنی ہیں یا چوبی۔ نقرئی ہیں یا طلائی۔ اور میں اُس خوش نوا طائر کے رس بھری نغموں سے مست ہوں جو اس قفس کے اندر چہچہا رہا ہے۔

سلمیٰ! اب تم خود فیصلہ کر لو کہ میں تمہیں بنا رہا ہوں یا واقعی میری رُوح تمہاری لطافتوں کا صحیح ادراک کر کے اُن میں گم ہو گئی ہے۔ میں خود فریبی میں مبتلا ہوں یا میں نے کافوری بادلوں کے نقاب کے [illegible] واقعی چاند کا پُرضیا چہرہ دیکھ لیا ہے اور اُس کے انوار سے میری رُوح جگمگا اُٹھی ہے۔

پریم پجاری

خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور لکھا کیجئے۔
جواب طلب امور کے لئے ٹکٹ ضرور روانہ کیجئے، ورنہ تعمیل ارشاد ممکن نہ ہوگی۔ (مینجر)

التجا

آج میرا ساتھ دے
درد میرے دل کے اُجلے چاند
آج میرا ساتھ دے
آج میرا ساتھ دے

کروٹوں پہ لے رہا ہوں کروٹیں
جانے غم کی یہ گھٹائیں کب چھٹیں
چھن گئی جو میٹھی نیند والی رات دے
وہ میری کائنات دے
درد میرے دل کے اُجلے چاند
آج میرا ساتھ دے
آج میرا ساتھ دے
درد میرے دل کے اُجلے چاند
آج میرا ساتھ دے
آج میرا ساتھ دے

زندگی کی کاہشوں میں موت ہے
یعنی میری خواہشوں میں موت ہے
مجھکو دے کے موت زندگی کو مار دے
کسی طرح نجات دے
درد میرے دل کے اُجلے چاند
آج میرا ساتھ دے
آج میرا ساتھ دے

فیوم نظر

سامانِ جنگ

(اس افسانہ کا میری زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہے)

ریلوے لائن سے میلوں علیحدہ اور لاری کی سڑکوں سے دُور افتادہ پہاڑوں کے سنگین آغوش میں ریاست ترسی واقع ہوئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہاں ابھی شیاطین کا گذر نہیں ہوا تھا، ہاں فرشتہ روز قلقاریاں مارتے ہوئے آتے تھے، حوریں خرام معصومانہ کرتی ہوئی نازل ہوا کرتی تھیں اور بعض مرتبہ خود دیوتا اُتر کر لوگوں کے ساتھ کھیلا کرتے تھے۔

اس ریاست کا نظامِ حکومت بھی نہ تو جمہوریت کی گندگی سے آلودہ تھا اور نہ آمریت کی کثافت سے ملوث تھا نہ یہاں نازی ازم کا فرعونانہ قہر تھا، نہ فاشسٹیت کا مجنونانہ جبر اور نہ اشتراکیت کی ساحرانہ مہر۔ ایک محسن راجہ چوپال میں رہا کرتا تھا جس کے قبضہ میں بیس آدمیوں کی زبردست فوج تھی، تین ذاتی ملازم اور دوسو روپیہ سالانہ کی آمدنی!

مشکل سے چار سو آدمی بستے ہوں گے ترسی میں۔ ہندو اور مسلمان ملا کر۔ لیکن نہ تو کبھی کوئی مندر جلایا گیا اور نہ کسی وقت کوئی مسجد ڈھائی گئی تھی۔ اُن کو باہمی فساد کے لئے کوئی مواد ہی نہیں ملتا تھا۔ مہاسبھا، کانگریس، مسلم لیگ، انگریز، سوراج، گائے اور باجہ وغیرہ کے "اسرار" اگر کوئی ان کو سمجھانے کی کوشش بھی کرتا تو شاید وہ اس کو نہیں سمجھ سکتے تھے۔ یہ الفاظ اُن کے لئے غیر ارضی تھے۔ وہ صرف دو باتوں کو سمجھتے تھے۔ کھیت جوتنا اور بارش کے لئے دعا کرنا، چنانچہ کھیتوں کی وسعت اور دعاؤں کی فراوانی ان کو اتنا غلہ بخشدیا کرتی تھی کہ ناج ان کے لئے سکّہ، نوٹ اور ہُنڈی بن گیا تھا۔ سُود کی خون آشامی اور ساہوکار کی حیثیت یہاں کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔ ہر شے کا مبادلہ ہوتا تھا۔ اول تو یہاں اشیا ہی کیا تھیں تھوڑا سا ناج تھا، لیکن نہ اتنا کم کی اس کی قلت "یاروں" سے عشق ہی بھلا دے اور نہ اتنی کثرت کہ محض کھانے کے لئے زندگی کی آرزو پیدا ہو جائے۔ حسبِ ضرورت گڑ او ربقدر احتیاج روئی بھی پیدا ہو جاتی تھی۔ ان میں سے کوئی ایسی جنس نہیں تھی جس کا احتکار یا احتباس سرمایہ داری کے بچے پیدا کر دیتا اور نہ مساوات کی ایسی مجہول اسپرٹ تھی کہ اشتمالیت کو تولید کا موقع مل جاتا۔

میں جہانیانِ جہاں گشت میں سے تو نہیں ہوں ہاں غیر آباد خطہ اور پہاڑوں سے مجھے شروع ہی سے دلچسپی ہے۔ چنانچہ جب میں پہلی بار اس عظیم الشان ریاست میں گھوڑے پر سوار اور ہیٹ سر پر رکھے ہوئے داخل ہوا تو یہاں کے لوگوں کے لئے ایک تماشہ بن گیا تھا۔ جوان مجھے تیوریدلکر دیکھ رہے تھے، بوڑھے ہراس آمیز نظروں سے، بچے خوفزدہ آنکھوں سے اور عورتیں آشفتہ چتونوں سے دیکھ رہی تھیں۔

چند منٹ کے بعد مجھے ریاست کی پوری فوج نے جو بیس جرار سپاہیوں پر مشتمل تھی آگھیرا۔ ان کے بھیانک زنگ خوردہ بھالے، ان کی دندانہ دار پُرانی مہیب تلواریں اور اُن کی کُند چھوٹی چھوٹی سی کٹاریں میرے اُوپر چھا گئیں۔ میں نے اپنی آتشبار بندوق کو دیکھا جو چند ہی فیر میں اس لشکر کو بآسانی منتشر کر دینے کا وعدہ کر رہی تھی۔ مگر سیاح کو جنگ سے کیا کام۔ میں اطمینان سے گھوڑے پر بیٹھا رہا۔ آخر ریاست کا جری فیلڈ مارشل میرے قریب آیا اور گرج کر بولا "تم کون ہو؟"

اس کے جواب میں میں نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھا دیا جس کے جواب میں بیس ہاتھ اُٹھے میرے ہاتھ سے مس ہوئے اور مجھے فوراً شاہی دربار میں پہنچا دیا گیا۔

میری یہ کیفیت تھی گویا کوئی سفید آدمی لکھ ہو گی دماکی جنگل میں آگیا ہے۔ زُلو خونخوار و مردم آزار قوم ہے اور یہ لوگ نہایت امن پسند تھے۔

مجھے یہاں کی سادہ زندگی اور قدرتی مناظر اس قدر بھائے کہ میں یہاں چند ماہ کیلئے رہ پڑا۔ سیر و شکار، کبھی باجرہ کی اور کبھی گیہوں کی روٹی، گھی کی غیر معین مقدار وغیرہ کے تو کہنے ہی کیا تھے۔

زندگی کا ایک ہمہ رس معیار بنانا دراصل ہے بڑا مشکل۔ ہر قوم، ہر ملک بلکہ انفرادی طور پر ہر انسان حیات کے چند اصول رکھتا ہے۔ بہت کم ایسے اصول ہیں جو تمام انسانوں میں مشترک ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حیاتِ عامہ کے لئے کوئی مکمل ضابطہ یا لائحہ عمل بنانا انسان کے قبضۂ قدرت سے باہر ہے، اس میں صلاحیت نہیں ہے کہ قانون کے شدائد کا احترام کرے اور اس کی لینت سے جائز فائدہ اٹھائے۔

میں خمارِ گندم کے ازالہ میں زیادہ آداب ملحوظ رکھنے کا عادی نہیں تھا، مگر اس قریہ میں اس نشے سے مخمور ہونا تک گناہ تھا۔ وجہ یہ تھی کہ "خمر"

جائز طور پر بٹا ہوا تھا اور چونکہ میں یہاں کا باشندہ نہ تھا اس لئے اس سے محروم تھا۔ مجھے آلودۂ لذت (آسودۂ لذت تو کیسے کہہ سکتا ہوں) ہونے کیلئے "چوری" کرنے کی ضرورت تھی جس کے امکانات بھی یہاں پر تقریباً معدوم تھے۔

گاؤں سے باہر ایک بہت پرانا مندر واقع تھا جہاں میں شکار سے واپسی پر اکثر ٹھنڈا پانی پینے رُک جایا کرتا تھا۔ اس مندر کے پروہت کے تین تنومند و تندرست جوان لڑکے تھے اور ایک اسی قدر صحت مند لڑکی۔ مجھے پانی پلانے کی خدمت اسی کے سپرد تھی۔ لڑکے بالعموم کھیت پر ہوتے تھے، صرف بوڑھا پروہت باہر ستی کے چبوترے پر پڑا رہتا تھا۔ میں اس کے پاس ضرور رُکتا تھا۔ اگر کبھی سیدھا چلا جاتا تو وہ محبت سے گالیاں دینے لگتا تھا۔

ایک روز مندر پر کوئی میلہ تھا۔ گاؤں کے بہت سے مرد و عورت جمع تھے اور پروہت بھی مع اپنے تینوں بیٹوں کے نہایت انہماک سے پوجا میں لگا ہوا تھا۔ میں شکار کو جا رہا تھا مگر گھوڑے پر سے اُتر کر ستی کے چبوترہ پر تماشا دیکھنے ذرا بیٹھ گیا۔ ابھی مجھے چند ہی منٹ گذرے ہوں گے کہ ایک جوان لڑکی تیزی سے مندر میں سے نکل کر آئی۔ اُس کے تیور بدلے ہوئے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا گویا روشن آسمان پر گھناؤنے بادل آگئے ہوں۔ اس نے آتے ہی میرے پیر میں ایک ٹھوسا دیا اور غصّہ سے اپنی زبان میں بولی "ارے تم ستی دیوی کے چبوترے پر جوتے سمیت بیٹھ گئے ہو۔ یا تو جوتے آتارو یا نیچے اُترو" اُس کے چہرے سے صحت کا خون چھلک رہا تھا۔ میں نے پیار سے اُس کی سادگی کو دیکھا اور بے پرواہی سے بولا "تم کون ہوتی ہو مجھے ٹوکنے والی، پروہت جی تو کچھ کہتے نہیں ہیں"

"میں کون ہوتی ہوں؟ میں پروہت جی کی بیٹی ہوں۔ بلاؤں بھیّا کو وہ ابھی تمہاری ٹانگ پکڑ کر نیچے گھسیٹ لیں گے" او ہو یہ وہ لڑکی تھی جو روز مجھے پانی پلاتی تھی لیکن شکل دیکھنے کی کبھی اجازت نہیں دیتی تھی۔ آج اپنے نشے سے مگر مستحکم اعتقاد کی توہین کے انتقام میں بیباکانہ میرے سامنے کھڑی باز پرس کر رہی تھی۔ آخر میں نے ہنسکر کہا "اپنے بھائی کو کیوں تکلیف دیتی ہو لو تم ہی میری ٹانگ پکڑ کر گھسیٹ لو" اگر قاتل کے آگے سر جھکا دیا جائے تو ضرور اُس کے اُٹھے ہوئے ہاتھ میں رعشہ کی ایک خفیف سی حرکت پیدا ہو جاتی ہو گی۔ اس لڑکی کے خشمگیں تیور میں بھی ملائمت کا خفیف سا بال پڑ گیا۔ تیز آواز سے بولی "کیا کروں روز تم کو پانی پلاتی ہوں نہیں تو کر بتاتی"

"آج تو تم نے نیا جوڑا بدلا ہے۔ یہ لال دوپٹہ تمہارے بدن پر کتنا بھلا معلوم ہوتا ہے" میں نے چُرانے کے لئے مال کا کھوج نکال لیا تھا۔ اب اپنا راستہ صاف کر رہا تھا۔

"جاتی ہوں بھیّا کو بلا کر لاتی ہوں" اُس نے سر سے آنچل اس انداز میں سرکایا کہ میں اُس کے گلے میں انمل بے جوڑ کوڑیوں کی مالا بھی دیکھ لوں۔ عورت کتنی کمزور ہوتی ہے اپنے حُسن کی ستائش کے باب میں۔

"او ہو تمہارے گلے میں یہ مالا کیسی پیاری ہے۔ تم کتنی اچھی نظر آتی ہو اس کو پہن کر" تیوروں پر غصّہ تقریباً سوکھ چکا تھا ہاں اب لجا جاگتی جا رہی تھی۔ حیا آتے ہی توہین مذہب کے انتقام کا مقدس فرض بھی نسائیت پر دانت پیستا ہوا رخصت ہو گیا اور ایک منٹ بعد ہی میری جانب سے گھونگھٹ نکال کر "عورت" چلدی۔

اب مندر کی پاک چہار دیواری میں ایک گناہ آلودہ زبان سے گرمایا ہوا دل معصیت کوشی کی راہ پر پڑ چکا تھا۔ مجھے تین دن تک مندر میں اس نے پانی نہیں پلایا تاکہ میں یہ سمجھ لوں کہ ستی کی بیحرمتی کی سزا ختم ہونے نہیں ہوئی ہے۔ بڈھا ہی کراہتا ہوا اُٹھتا اور اپنے لرزاں ہاتھوں سے مجھے پانی پلا دیتا۔

چوتھے روز میں جب شکار سے واپس آیا تو ایک مرا ہوا تیتر چُپکے سے مندر کی سیڑھیوں پر پھینک دیا اور پروہت کے پاس چبوترہ پر آبیٹھا۔ میری اس حرکت کو اگر کوئی مہاسبھائی دیکھ پاتا تو وہیں سر پھوڑ دیتا یا جواباً فوراً مسجد میں گوشت پھینکنے کا ثواب عظیم حاصل کرنے کی کوشش کرتا۔ اور اگر مسجد کے مولانا اس حرکت کو دیکھ لیتے تو فوراً ہی اعلانِ جہاد فرما دیتے۔

میری اس حرکت کو شاید مندر کی دیوی نے دیکھ لیا تھا تیتر کی ٹانگ پکڑ کر اپنے باپ کے پاس لے آئی اور میری طرف اشارہ کرکے اپنے باپ سے بولی "یہ انھوں نے وہاں ڈال دیا تھا بابا"

بڈھے نے مُردہ تیتر کو دیکھا اور ہنسکر بولا "جا تو اسے دیبی کے چرنوں میں جا کر ڈال دے۔ ان کی اچھا ہوگی تو اس کو جان دیدیگی"

مگر اس کا تو گلا کٹا ہوا ہے بابا جان کیسے پڑیگی اسمیں" سمجھدار لڑکی نے اپنے باپ سے کہا۔

"تمہارے پاس سوئی ڈورا تو ہوگا نا۔ ذرا اس کا گلا سی دو" بڈھا ہنسنے لگا۔

طہارت پر پُرمعصیت حملہ کرنے میں ایک خاص لذت ہے اگرچہ اس میں نقصان معصیت ہی کا ہوتا ہے مگر گناہ جارحیت پسند واقع ہوا ہے۔ میں بھی اُس کی معصومیت کو لوٹنے کے درپے ہو گیا تھا۔

"اچھا تو اب بھیّا جی کو لاکر پانی پلا" پروہت نے اپنی لڑکی سے کہا۔ میں نے تین لوٹے پانی صرف کئے۔ آدھا پیا اور ڈھائی لوٹے سے کھیلتا رہا۔ پروہت حیرانی سے مجھے دیکھنے لگا۔ مگر اس کی لڑکی پیا آرو نے اس کھیل میں بدمزگی کا اظہار نہیں کیا۔

بڈھے کو آج کھانسی بہت تھی اس لئے میں رُک گیا۔ اُس کو مندر میں لے گیا۔ سینے پر تیل وغیرہ کی مالش کی تو اس کو ذرا سکون ہوا۔ بڑی دعائیں دینے لگا۔

"بھیّا تم کہاں سے آئے ہو۔ کون ملک کے رہنے والے ہو تم" اُس نے مجھ سے پوچھا۔

"میرا ملک یہاں سے بڑی دُور ہے بابا۔ کئی سو میل دُور۔ جہاں ریلیں چلتی ہیں۔ موٹریں دوڑی دوڑی پھرتی ہیں اور اُس میں اتنے آدمی بستے ہیں کہ اُن کی بھیڑ میں راستہ چلنا مشکل ہو جاتا ہے۔"

"ہاں میں بھی ریل میں ایک بار بیٹھا تھا۔ اُس وقت رامو (اُس کا بڑا لڑکا) پیدا بھی نہیں ہوا تھا۔ بڑی بُری سواری ہے ریل۔ اُس میں اتنے آدمی بھر جاتے ہیں کہ کھڑے رہنے کو بھی جگہ نہیں ملتی ہے۔ دھرتی ماتا پہ کیسے کیسے بوجھ لاد دیتے ہیں لوگوں نے۔ جب ہی تو بھونچال آجاتے ہیں۔"

"پروہت جی کیا تمہارا جی نہیں چاہتا کہ تم کسی بڑی بستی میں جاکر بس جاؤ۔"

"نہیں بھیّا۔ بڑی بستیوں کی اُلجھنیں ہماری سمجھ میں نہیں آتی ہیں۔ وہاں لوگ بات بات پر لڑتے ہیں۔ بھگوان کے مندر میں ہر ایک کو گھسنے دیتے نہیں۔"

"بابا روٹی کھا لو ٹھنڈی ہو جائے گی۔" پیا آرو نے آکر کہا۔

"بھیّا تم بھی کھا لو۔" پروہت نے مجھ سے کہا۔

"نہیں راجہ میرا راستہ دیکھ رہے ہوں گے۔ اب مجھے چلنا چاہیئے۔ کافی اندھیرا ہو گیا ہے۔"

"پیا آرو بیٹی مجھے بھی ابھی بھوک نہیں ہے۔ تھوڑی دیر میں کھاؤں گا میں بھی۔"

"اچھا تو میں دودھ دوھ لاؤں۔" اُس نے اپنے باپ سے کہا۔

"میں بھی چلتا ہوں پروہت جی۔ تم آج لیٹے ہی رہنا ہلنا جُلنا مت، نہیں تو پھر کھانسی اُٹھ آئے گی۔"

"اچھا بھیّا۔ بھگوان تیرا بھلا کریں۔ جا۔ بڑا اچھا آدمی ہے تو۔" میں مندر کے باہر نکل آیا۔ چوطرف تاریکی پھیل چکی تھی۔ دُور سے گاؤں کی آگ جلتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ میں مندر سے آگے بڑھ کر مویشیوں کے احاطے کے قریب پہنچا تو وہاں پیا آرو ایک گائے کا دودھ نکال رہی تھی۔

"پیا آرو تم اب تک دودھ نہیں نکال چکیں؟" میں نے اُس کے قریب آکر کہا۔

"نہیں۔" لوٹے کو نیچے رکھ کر جواب دیا۔

"لاؤ ہم نکالیں دودھ۔" میں نے اُس کے پاس بیٹھ کر کہا۔

"تمہیں آتا ہے کیا؟" اُس نے پوچھا۔

"ہاں ہاں۔" میں نے اُس کے جسم کو چھو کر کہا۔ معصیت کے بھبکولے سے اندھیرا زیادہ کالا ہوتا جا رہا تھا جس میں معصومیت اتنی دُھندلی ہو گئی تھی جیسے گہرے کنوئیں میں پانی تارا نظر آتا ہے۔ آخر گناہ کی ایک پھنکار سے یہ تارا بھی غائب ہو گیا۔

آج کی شام میری لذت آلودگی کی شام تھی، جس کی شب نے میرے اندر سے روزانہ کا جذباتی سکر بہت بڑی حد تک زائل کر دیا تھا۔ میری خو کی ضد پوری ہو چکی تھی۔ یہاں کی شریعتِ حیات میں یہ شاید پہلا کفر تھا جس کی عفونت سے میرے اسفل حساسات مست ہو رہے تھے۔

بیدینی معمولاتِ مسلمہ سے روگردانی کا نام ہے۔ لیکن "معمولات" مہذب بستیوں میں جاکر اپنی بدہیت کو بدل ڈالتے ہیں۔ چنانچہ میں بھی اصول پرست مگر ناآشنا، حقائق مخلوقات کی نگاہ میں ابھی بیدین نہیں ہوا تھا۔ کیا ہوا اگر ترسی کی مختصر سی بستی کے قوانین کی رو سے میں کافر ہو گیا ہوں۔

یونہی ہم سماج کے قوانین بناتے آئے ہیں یونہی اپنے ہاتھوں پھر اُن کی توہین کرتے رہتے ہیں۔ اور جب تک سوسائٹی اور سیاست کی ایجاد انسان کے سپرد رہے گی یہی ہوتا چلا جائے گا۔ اگر انسانیت اس کی متحمل نہیں ہوتی ہے تو اُس کو آسمانی قانون و ضابطہ ڈھونڈھنا چاہیئے۔

میرا نحوس گناہ پیا آرو کے مستقبل کو سیاہ کر چکا تھا۔ پیا آرو کے افرباء میری جان کے لاگو بن چکے تھے۔ ریاست کی خوشگوار و کشادہ فضا میری گرد اذیت آفریں حصارِ تنگ میں تبدیل ہو چکی تھی چنانچہ ایک اندھیری رات سے فائدہ اٹھا کر میں اپنے گھوڑے پر سوار ہوا اور یہاں سے نکل بھاگا۔

انسان اگر اپنے ہی جیسے انسانوں میں سیاہ کھیل کھیلتا ہے تو اُسکا نباہ ہو سکتا ہے لیکن اگر وہ ناسازگار ماحول میں بھی اپنے طریق عمل پر پابند رہتا ہے تو اُس پر عرصہ حیات تنگ ہو جاتا ہے۔ اچھی باتیں پھر بھی نامساعد

فضا میں زخم کھاتی ہوئی زندہ رہجاتی ہیں مگر بُری باتیں اکثر اچھے ماحول میں دم توڑ دیتی ہیں۔ بوالہیت کی سڑاند میں محماریت کا دم نہ گھٹ سکا تھا لیکن جب محماریت کی خوشبو، تند اٹھی تو اس میں بوجہلیت کی تعفن نہ جی سکی تھی۔

اِس ناقابلِ اعتنا واقعہ کے عرصہ دراز تک میں دُنیا میں اِدھر اُدھر گھومتا رہا حتیٰ کہ تسرسی اور پیارو دونوں کو بھول گیا۔ بیس سال بعد میں ایک دفعہ جنوبی ہند کی طرف ایک پہاڑی علاقہ میں ریل کے اندر سفر کر رہا تھا کہ شام کے وقت ایک بڑا اسٹیشن آیا۔ میں نے باہر سر نکال کر جھانکا تو تختہ پر نظر پڑی۔ اسٹیشن کا نام تسرسی تھا۔ میں دیوانہ وار اُتر پڑا اور باہر نکل کر پھٹے پھٹے دیدوں سے ہر شے کو دیکھنے لگا۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی یہ تو وہی مقام تھا جہاں میں بیس سال پہلے شکار کے لئے آیا کرتا تھا۔ میں لپک کر گاڑی میں آیا۔ جلد جلد اپنا اسباب اُتروایا اور ایک عمدہ سے تانگے میں شہر کی طرف روانہ ہوا۔ تانگے والے سے مجھے معلوم ہوا کہ یہاں سے اٹھارہ سال سے ریلیں دھڑ دھڑاتی ہوئی گذر رہی ہیں۔ یہاں پر کانچ کی ریت کا زبردست خزانہ برآمد ہوا ہے چنانچہ گورنمنٹ نے تین عظیم الشان گلاس فیکٹریاں قائم کی ہیں جن میں سینکڑوں آدمی کام کرتا ہے۔ بہت سے انگریز آباد ہیں اور اب یہاں کی آبادی پچاس ہزار کے قریب ہے۔

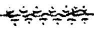
میں کشادہ بازاروں، سر بفلک عمارتوں اور اُن تمام تحیّر خیز چیزوں کو دیکھتا ہوا گذر رہا تھا جنکو سرمایہ پیدا کر دیا کرتا ہے۔ میری نظروں سے مسلم ہائی اسکول، سناتن دھرم کالج، خالصہ ملیٹری اسکول، آریہ پرنٹنگ پریس وغیرہ گذر رہے تھے۔ میں نے یہاں آکر مسجدوں کے سامنے سے پولیس کی حفاظت میں مذہبی جلوس باجہ کے ساتھ نکلتے دیکھے۔ میں نے یہاں انقلاب زندہ باد کے نعرے سُنے۔ میں نے اپنے اِس دورانِ قیام میں ہندو مسلم فسادات کے تماشے دیکھے۔ مجھے یہاں کلکتہ کے بہو بازار کی طرح طوائفوں کے بے شمار کوٹھے نظر آئے۔ اور جس ہوٹل میں میں مقیم تھا اُس کے منیجر نے مجھ سے پیارو چکلہ دار کی سب سے زیادہ تعریف کی جس کے ہاں ہر وقت تازہ اور نیا "مال" ملتا تھا!

یہاں ریل کی وجہ سے کھانے پینے اور پہننے کی اشیا کی اب بیحد فراوانی تھی۔ نفیس اشیا اور دیگر فضولیات کی بھی اسقدر بہتات تھی کہ مل کے مزدور سے لے کر گورنمنٹ آفیسر تک کے لئے وہ لازمۂ حیات بن گئی تھیں۔

یہاں اب رات دن دنگے فساد ہوتے رہتے تھے، روزانہ چوریاں ہوا کرتی تھیں، کثرت سے فحش کاری تھی غرض انسانیت گروہوں میں تقسیم ہو کر عام انسانیت کا خاتمہ کر چکی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ریل اور موٹر میں یہاں بھر بھر کر تہذیب لائیں اور تہذیب ہر شے کی فراوانی۔ اب ہر شے انسان کی روزانہ کی ضروریات سے زیادہ موجود تھی۔ کثرت سے غلّہ آچکا تھا، بیحد کپڑا آگیا تھا، ہر شے لائی جا چکی تھی۔ یعنی تہذیب نے اس بستی کے اندر باہر سے لا کر سامانِ جنگ جمع کر دیا تھا۔

تسرسی کے باہر اب بھی وہ بوسیدہ مندر موجود تھا جہاں بیس سال پہلے آکر میں گناہ کی منڈی کھول گیا تھا۔ بوڑھے پروہت کے دو تنومند لڑکے آتشک سے مر چکے تھے اور تیسرا کثرتِ عیاشی و شراب نوشی کی وجہ سے دق میں مُبتلا ہو کر مندر میں پڑا کھانسا کرتا تھا۔ غرض ہر طرف شیطانی ناچ نظر آرہا تھا۔ اب یہاں فرشتوں کے وجود کا کوئی قائل نہ رہا تھا۔

قیسی رامپوری



چشمِ فسردہ

چندن اور سوشیل شہ نشین میں آبیٹھے۔ برابر کے کمرے میں خود بخود بجنے والا ارغن اپنے سُریلے سُروں میں دلکش نغموں کی بارش کر رہا تھا۔ نچلی منزل کے آگے مختصر سے شاخسار میں رنگ برنگ شاداب پودے ہوا کی لہروں سے اٹھکھیلیاں کر رہے تھے اور تھوڑے فاصلہ پر سمندر، اتھاہ اور ناپیدا کنار سمندر تھکی ہوئی رقاصہ کی طرح ہولے ہولے ہلکورے لے رہا تھا۔

وہ دونوں ایک دوسرے کو دل وجان سے چاہتے تھے۔ خصوصاً سوشیل کو چندن سے بے حد محبت تھی۔ ان کی شادی کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ مگر سوشیل کی وارفتگی اس سطح پر تھی جہاں لوگ بالعموم اپنی رفیقۂ حیات کے ساتھ ایک مدّت دراز گذارنے کے بعد پہنچتے ہیں۔ وہ ابھی نوجوان تھا اور اُس کی زندگی ہمیشہ سے پُر مسرت ومطمئن تھی لیکن وہ سمجھتا تھا کہ یہ سب کچھ اُسے چندن ہی کی بدولت ملا ہے۔ گویا انہوں نے بہت دنوں سے زندگی کے اندھیرے اور اُجالے یکجا بتائے ہیں۔ اور اب وہ زمانے کی گردشوں سے نکل کر چندن کی صحیح قدر ومنزلت کرنے لگا ہے۔ اور چندن اس قدر ومحبت کی تھی بھی مستحق، کیونکہ تعلیم یافتہ اور ترقی پسند ہونے کے باوجود اُس کی سیرت بے انتہا پسندیدہ تھی اور اسکا حُسن دلکش ودلفریب! بات بات میں مُسکراہٹ، اور متانت آمیز شوخیاں اُس کا عام شیوہ تھا۔ خفگی اور بدمزاجی اُسے آتی نہیں تھی۔ غرض وہ سراپا تبسّم زار اور اخلاق ومحبت کا ایک حسین پیکر تھی جس کی دل نشین اداؤں سے سوشیل کا سرمایۂ حیات حد درجہ پُر کیف ومنوّر تھا۔ اس نے چندن کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اور اُس کی بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں میں محبّت کی بے پناہ روشنی جگمگانے لگی۔

”وہ دیکھو!“ سوشیل نے سمندر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”وہ، جہاں سطحِ آب اور دامنِ فلک یکجان ہو رہے ہیں۔ بس اسی طرح ہماری روحیں آپس میں متحد ہوگئیں ہیں! خدا کرے یہ ملاپ ہماری تمام عمر قایم رہے۔ اور ہم دونوں کے دل ہمیشہ ایک دوسرے کی دھڑکن سُنتے رہیں۔“

چندن نے اُس کے بھولے مکھڑے کو نظر بھر کر دیکھا۔ وہ سوچنے لگی ”یہ خاموش محبت آج گویا کیوں ہے؟ آج تک انھوں نے اپنی اُلفت کا یوں کُھل کر اظہار کبھی نہیں کیا۔ ہمیشہ چُپ چاپ چاہتے رہے۔ اور مجھے ان کی بے پناہ چاہت کا اچھی طرح احساس ہے، پھر یہ اظہار کیوں؟“ اور اور جب اُس نے حسبِ معمول ایک دلفریب مُسکراہٹ کے ساتھ ذرا لجا کر کہا۔ ”آج آپ یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟“ تو وہ شرمندہ سا ہوگیا۔ گویا اُسکے مُنہ سے کوئی عریاں بات نکل گئی ہے۔

سمندر کے کنارے ایک ناریل اٹھلاتا، ناچتا، گاہے ڈوبتا، گاہے اُبھرتا، شفق کے دُھندلکے میں سوئے مشرق چلا جا رہا تھا کہ دیکھتے دیکھتے اُس کے چاروں طرف ننھے ننھے گرداب پڑنے لگے اور پہلو میں ایکا ایکی ایک بہت بڑی موج طوفانی شور وغل کے ساتھ ساحل سے آکر ٹکرائی۔ سوشیل کو بڑا لطف آیا اور وہ چندن کو اُٹھاتے ہوئے بولا۔ ”آؤ، وہیں چلے چلیں، موجوں کی شوریدہ سامانی قریب سے اچھی معلوم ہوتی ہے۔“

چندن کھڑی ہونے لگی۔ مگر عین اس لمحہ دُور کسی گوشے سے ایک وحشتناک آواز سن کر وہ رُک گئی۔ تاڑ کے کسی اُجاڑ جھنڈ سے ایک شبخواں پرندہ چیختا، چلّاتا، بار بار اس ڈوبتے ہوئے ناریل کو مڑ مڑ کر دیکھتا جا رہا تھا۔

(۲)

سوشیل کو آنند سے بڑی محبت تھی۔ وہ اس کا عزیز ترین دوست تھا۔ دونوں نے بچپن کے کھیل ایک ساتھ کھیلے اور لڑکپن کی شرارتیں اکٹھی کی تھیں۔ کالج میں بھی باوجود مختلف مضامین ہونے کے وہ ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں ہوئے۔ المختصر دونوں ایک دوسرے کے سچے ہمدرد اور شریکِ راز تھے۔ ایک کے دل پر جو کچھ گذرتی دوسرے کو اس کا احساس ہوتا۔ رنج میں رنج، خوشی میں خوشی، گویا دلی تعلق نے انہیں آپس میں بے حد قریب کر دیا تھا۔ جب تک وہ زیرِ تعلیم اور کشمکشِ حیات سے آزاد رہے، اُس وقت تک اُنہیں کبھی کوئی خاص فکر دامنگیر نہیں ہوا۔ ہمیشہ خوش باش اور بڑی بڑی باتوں کو ہنس کر ٹالتے رہے، مگر غمِ روزگار تو ہنس کر نہیں ٹالا جاتا! غیرتمند شخص کے لئے خواہ وہ دنیا کتنا ہی دولتمند ہو، کمائی کا مسئلہ اور بھی مُشکل ہے۔ وہ جب تک خود اپنی محنت سے روپیہ پیدا نہ کرے اُسے سچّا آرام نہیں ملتا۔ اور فطرت کے اسی تقاضے نے دونوں دوستوں کو عیش وعشرت کے گہوارے سے نکال کر ایک دوسرے سے جُدا کر دیا۔

سوشیل بمبئی میں ملازم تھا اور آندر کلکتہ میں، کسقدر طویل فاصلہ ہے یہ: مشرق و مغرب کی مسافت کتنی گراں معلوم ہوتی ہے! اسی لئے ان دونوں کو ملے ہوتے تین سال ہو گئے ——— اور اب وہ آرہا ہے! آندر، وہی سوشیل کا پیارا دوست! جس سے ملنے کے لئے وہ بار ہا تڑپا کیا، خصوصاً شادی کے موقع پر اس کی یاد کی کوئی انتہا نہیں تھی مگر وہ نہ آسکا۔ ملازمت کی پابندیاں جو ہوئیں! آخر انسان کی آزادیاں اسی قربان گاہ پر تو بھینٹ چڑھتی ہیں! ہاں، تو وہ شام کو آجائے گا۔ سوشیل کی خوشی کا کوئی اندازہ نہیں۔ وہ مسرت سے دیوانہ ہوا جا رہا ہے، گویا سرچشمہ شارق سے سیم و زر کی ایک شفاف چمکدار کرن پھوٹی ہے۔ لیکن...... لیکن اس شادمانی میں ایک سُرخ لکیر بھی تو نظر آتی ہے۔ آندر ایک سراپا راز بن گیا ہے۔ اُس کے آخری خط سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دنیا اور دنیا والوں سے بیزار ہے۔ اُسے کائنات کی کسی شے پر اعتماد نہیں رہا۔ اُس کے نزدیک ہر چیز بے اعتبار اور پُر فریب ہے۔ اُس نے نوکری بھی چھوڑ دی ہے اور ایک جگہ سے دوسری جگہ بس سفر کئے جاتا ہے۔ شاید اُس کی کوئی عزیز ترین چیز کھو گئی ہے۔ اُسے اُسی کی تلاش ہے اور اسی حالت جنون میں وہ ایک بھٹکی ہوئی روح کی طرح سوشیل کے پاس آرہا ہے۔ مگر یہ سوشیل پر بھی پابندی کیوں؟ اُس نے یہ کیوں لکھا ہے کہ "جب تک میں تمہارے پاس رہوں (اور اس کا کوئی یقین نہیں کہ کب تک!) تم مجھ سے کوئی سوال مت کرنا۔ کبھی کچھ نہ پوچھنا۔ میں جانتا ہوں کہ تمہیں مجھ سے جو محبت ہے اُس کی بنا پر تم مجھے مفید مشورہ دو گے۔ صحیح راہ دکھانے کی کوشش کرو گے، لیکن نہیں مجھے کچھ نہیں چاہیئے۔ تمہیں کسی قسم کی خیال آرائی تک کی اجازت نہیں!"

——— اور چندن حیران ہے کہ یہ آندر، سوشیل کا کیسا دوست ہے جو اتنی شرائط اور پابندیاں لگا کر آرہا ہے! پھر بھی سوشیل بے حد مسرور ہے۔ خوشی سے پھولا نہیں سماتا۔ وہ یہ تک بھول گیا ہے کہ آندر نے اُسے بہت سے پرہیز بتائے ہیں جنہیں اُسے توڑنے کی سخت ممانعت ہے۔ وہ اس وقت صرف اُسی کے آنے کی خبر دینے دفتر سے آیا تھا اور سارا خط تفصیل سے سُنا کر پھر واپس چلا گیا ہے۔ شام کو پانچ بجے وہ اُسے اسٹیشن لینے جائیگا۔ پھر دونوں دوست اکٹھے گھر آئیں گے۔

چندن، آندر کو دیکھکر ششدر رہ گئی۔ لمبا تڑنگا نوجوان، گٹھا ہوا جسم، گندمی رنگ، اُبھرے ہوئے خدوخال، گویا حسن و جوانی کا دیوتا ——— مگر نہیں، اُسے اس چیز نے متعجب نہیں کیا کیونکہ اُسکی آنکھیں منظرِ حسن و جوانی کی پہلے سے عادی تھیں۔ سوشیل آندر سے کم خوبرو نہیں تھا۔ ہاں جس بات سے وہ حیرت میں رہ گئی وہ آندر کی شکل و شباہت اور بات چیت کا قرینہ تھا۔ اس کی گفتگو میں بے ترتیبی اور خیالات میں اُلجھن تھی۔ اس کے بدوضع کپڑوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اُن کی طرف سے قطعی بے پرواہ ہے۔ اس کے سر کے بال بُری طرح بڑھے ہوئے تھے اور شیو بھی اُس نے کئی روز سے نہیں کیا تھا۔ پھر بھی چندن نے ایک نظر میں دیکھ لیا کہ یہ شخص اگرچہ مخبوط الحواس معلوم ہوتا ہے مگر زود حس اور شدید احساسات کا مالک ہے۔ اُس کی صحت بیشک تباہ ہو چکی ہے۔ لیکن اس کے نقوش کہہ رہے ہیں کہ ہم تنومندی کے نقیب ہیں، اور ڈاڑھی کے ان بڑھے ہوئے بالوں کے پس پردہ ایک خوبصورت چہرہ ہے جس کی رونق کسی خاص وجہ سے زائل ہو گئی ہے۔ اور اس کی آنکھیں! ——— آنکھوں کا خیال آتے ہی وہ ٹھٹک گئی۔ اور ایک بار پھر اُس نے اُس کی آنکھوں کو دیکھا اور اُن کی ویرانی اس کے دل میں گھر کر گئی۔ اُسے ایک تیر سا لگا اور وہ زیادہ دیر انہیں نہ دیکھ سکی۔ اُس کے دماغ میں خیالات کا سیلاب اُمنڈ آیا۔ آہ! یہ آنکھیں کیسی اُجاڑ ہیں، گویا کسی ناکام محبت کا شکستہ مزار جسکے سرہانے ایک مدھم سا چراغ تک نہیں!

غرض اُس کی آنکھوں نے چندن پر بڑا اثر کیا۔ اس لئے اور بھی کہ جب اس نے پہلے پہل آندر کی ویران آنکھوں کو دیکھا فوراً اس کے سامنے سوشیل کی خوبصورت آنکھیں آگئیں اور اُس کے تمام خیالات و احساسات اُس لمحہ کے لئے رُک کر صرف اس موازنے پر مجتمع ہو گئے۔ ایک طرف سوشیل کی چمکدار، شوخ اور پُر تبسّم آنکھیں تھیں، اور دوسری طرف آندر کی خاموش، اُداس اور پُر حسرت نگاہیں! وہ اس زبردست تقابل کی تاب نہ لا سکی اور سوچنے لگی "آندر کی آنکھیں بھی تو حسین ہیں۔ ان کی ساخت بھی تو اُسی سانچے میں ڈھلی ہے۔ پھر ان دونوں میں اس قدر فرق کیوں ہے؟ اس کی آنکھوں میں اتنی مایوسی اور حسرت کیوں بھری ہے؟ انکی مسکراہٹیں اور شوخیاں کہاں لُٹ گئیں؟"

اس کی حسرتناک نگاہوں کا خیال چندن کو ہر وقت ستانے لگا۔ جب بھی وہ اس سے گریز کرنے کی سعی کرتی، اُسے کوئی آواز یہ کہتی ہوئی معلوم ہوتی "کیوں ناکام کوشش کرتی ہو؟ یہ آنکھیں تمہارے من میں بس گئیں ہیں! اس سے انکار ہے؟" اور وہ چُپ ہو جاتی۔ اور اُسے کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا کہ اُس کے چاروں طرف وہی ویران آنکھیں، وہی حسرتناک نگاہیں فضا میں تیر رہی ہیں۔ وہ اُن سے بچکر بھاگ جانا چاہتی ہے۔ لیکن وہ اُس کا پیچھا کر رہی ہیں۔

ایک دن تینوں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ سوشیل پُرجوش اور محبت بھرے لہجہ میں باتیں کر رہا تھا۔ آنندر بھی کبھی کوئی مختصر سا جواب دے دیتا اور چندن اپنے خیالات میں گُم، اُس کی آنکھوں کو تک رہی تھی۔ اس نے دیکھا کہ اُن پتلیوں میں ایک شعلہ نمودار ہوا اور آناً فاناً بُجھ گیا ــــ اور ساتھ ہی اُس کے دل سے صدا بلند ہوئی۔ "ارے یہ ستایا ہوا معلوم ہوتا ہے! کہیں اس بیچارے کا کسی نے دل تو نہیں توڑ دیا!!"

(۳)

سوشیل کی کوشش ناکام رہی۔ آنندر نے اپنے دل کا بھید کسی طرح ظاہر نہیں کیا بلکہ سوشیل جب بھی زیادہ مُصر ہوا، وہ یا تو بالکل خاموش ہو جاتا یا اُسے اپنا خط یاد دلا کر کہتا "کیا تم مجھ سے اُکتا گئے ہو؟ تم چاہتے ہو میں چلا جاؤں؟" اور پھر اُس کی آواز رقت انگیز ہو جاتی۔ "سوشیل! سچ جانو میں مجبور ہوں۔ میں نے بارہا چاہا کہ تمہیں سب کچھ بتا دوں مگر میری زبان بند ہو جاتی ہے۔ اس لئے تم مجھے میری حالت پر چھوڑ دو۔"

سوشیل کو اس بات کا بڑا رنج تھا کہ وہ آنندر کے کام نہ آ سکا۔ حالانکہ اس کی حالت اب ایسی ہی جیسی آدھی رات کو قبرستان میں کوئی سایہ متحرک ہو، لیکن سوشیل اس کا اتنا گہرا دوست ہوتے ہوئے بھی اس کو زندوں کی بستی میں نہیں لا سکتا۔ وہ دفتر کے اوقات کے علاوہ زیادہ تر آنندر کے ساتھ رہتا بلکہ اس کا دل بہلانے کے لئے دونوں میاں بیوی اکثر اُسے مختلف تفریح گاہوں میں لیجاتے تھے۔ کبھی چاندنی رات میں جوہُو کے کنارے، جہاں سمندر اور ساحلِ سمندر کے پُرکیف نظارے اور زندہ دل دولتمند مردوں اور عورتوں کی خوش فعلیاں حد درجہ دلچسپی کا سامان مہیا کرتی ہیں۔ کبھی چوپاٹی کے کھلے میدان میں جہاں اوسط اور غریب طبقے کے لوگ اپنے جذبۂ سیر یا زبان کے چٹخارے کا اظہار کرتے ہیں۔ کبھی "باغ معلق" کے سرسبز اور انوکھے قطعات میں جہاں کی روشیں اور باغبانوں کی مصوّرانہ چابک دستیاں بے ساختہ داد کی طالب ہوتی ہیں۔ اور کبھی گیٹ آف انڈیا جہاں متلاطم موجوں پر سفینے اپنی بہار دکھاتے ہیں۔ آنندر اپنے میزبانوں کی مدارات کی خاطر ان سب تفریحوں میں حصّہ لیتا تھا، لیکن سوشیل اور چندن سمجھ رہے تھے کہ درحقیقت قدرت کی یہ سب رنگینیاں اُس کا دل نہیں لُبھا سکیں۔

اور چندن کو یہ کُرید سی لگی ہوئی تھی کہ وہ کسی نہ کسی طرح آنندر کے دل کا راز پائے۔ آنندر جتنا بھی اپنی دلی کیفیات سوشیل سے چُھپاتا، چندن کا ارادہ اور بھی مستحکم ہو جاتا کہ وہ اُس کے کُرید سے کبھی ہار نہیں مانے گی۔ آخر چند روز کے بعد اُسے اپنی کوشش میں کامیابی کی جھلک نظر آنے لگی۔

جب تک سوشیل دفتر میں رہتا، چندن کو آنندر کے ساتھ وقت گذارنے کے زیادہ مواقع ملتے اور وہ محض اپنے دل کی خلش مٹانے کے لئے اس امر کی کوشاں ہوتی کہ وہ بے تکلف ہو جائے اور اُس سے کُھل کر بات کرے۔ چنانچہ کبھی کبھی وہ اُسے ساحلِ سمندر پر لیجاتی جو اُن کے گھر کے بالکل قریب تھا اور وہاں کسی طویل قامت دیوار کے سائے میں دونوں بہت دیر تک بیٹھے رہتے۔ وہ اُسے اپنی اور سوشیل کی زندگی کے مختلف واقعات سُناتی اور مُصر ہوتی کہ آنندر ان پر تبصرہ کرے۔ آخر جب آہستہ آہستہ اُن دونوں میں مُغائرت ختم ہو گئی تو آنندر کو محسوس ہونے لگا کہ اُس کا خمار اُتر چکا ہے اور وہ اب چند کروٹیں اور لیکر نیند سے بیدار ہو جائیگا۔ ایکدن جب چندن نے دیکھا کہ آنندر موج میں ہے اور وہ آزادانہ گفتگو کر رہا ہے تو اس نے پھر اُس سے اس عجیب و غریب ہیئت اور حد سے زیادہ خاموشی کا سبب پوچھا ــــ سامنے سے ایک جواں سال اور خوش منظر جوڑا ہنس ہنسکر باتیں کرتا ہوا جا رہا تھا ــــ چندن کا سوال سُنکر آنندر کو ایسا محسوس ہوا کہ برسوں کا بند، پانی کے تھپیڑوں کی تاب نہ لا کر ٹوٹ گیا ہے اور وہ اپنے غم و اندوہ کو مزید ضبط نہیں کر سکتا۔ چنانچہ اُس نے ہوتے ہوئے دُکھی آواز میں سب کچھ سُنا دیا۔ اُس نے اُسے مختصر الفاظ میں بتایا کہ اُسے ایک خوبصورت دوشیزہ سے محبت تھی اور یہ محبت رفتہ رفتہ اتنی پروان چڑھی کہ وہ چند لمحات کی جُدائی بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ یہ تو اُس کی غلط فہمی تھی کملاوتی نے اُس کی محبت کا جواب سچ مچ محبت سے کبھی نہیں دیا۔ وہ صرف اُس کے جذبات سے کھیلتی رہی اور جب آنندر کا جذبۂ عشق منتہا کو پہنچا تو اُس نے یکایک سرد مہری اختیار کر لی، گویا کملاوتی کو بس اسی کا شوق تھا اور وہ اس طرح اس کا دل توڑ کر بیحد خوش تھی۔ حالانکہ آنندر کے یہ سان و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ مایوس محبت بھی ہو سکتا ہے، اور اُس کے حُسن و عشق کی دُنیا اُجڑ کر یوں سراب ثابت ہو سکتی ہے۔ پھر جب کملاوتی کی شادی ہوئی تو اُس کے قلزمِ عشق میں طوفان بپا ہو گیا اور دُنیا کی ہر شے سے اُس کی طبیعت بیزار ہو گئی۔........

چندن گُم سُم بنی سُن رہی تھی اور جبتک وہ اپنا فسانۂ محبت کہتا رہا اُن دونوں کی نگاہیں ایک دوسرے پر جمی رہیں۔

آندر بستر پر لیٹا ہوا بساطِ فلک پر ستاروں کے کھیل دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ ان ستاروں کی تابانی تو عرصہ ہوا مٹ گئی تھی، پھر آج یہ کیوں چمک رہے ہیں؟ ان کی رفتار اور چال میں بھی وہی پہلی سی تیزی اور بانکپن آگیا ہے گویا انکے نورِ حیات کو کسی نے پھر سے درخشانی بخشی ہے .... اور سوچتے سوچتے اس کا خیال آسمان سے زمین اور زمین سے خود اپنے تئیں پر آکر رُکا، جہاں اُس کے نزدیک تمام کائنات سمٹ آئی تھی۔ وہ حیران رہ گیا، آج چندن کی زبان کیسے کھُلی؟ اُسنے اپنا رازِ دلی کیوں ظاہر کردیا؟ اور ہرچند کہ وہ اپنے آپ کو دھوکا دینے کے لئے غلط تاویلیں تراشتا رہا لیکن وہ محسوس کر رہا تھا کہ کرۂ ارض پر وہ بھی ایک ستارہ ہے ——— چندن کی مانند ——— اور اُس کی مٹی ہوئی تابانی از سرِ نو عود کر رہی ہے، اور کوئی دوسرا ستارہ اس کے نورِ حیات کو درخشانی بخش رہا ہے۔

چندن کو بھی نیند نہیں آئی، اُسے اِس بات کا بڑا ملال تھا کہ آندر کی زندگی اُسی کی صنف کے ایک فرد نے تباہ کی ہے۔ اسی لئے بار بار اُس کو آندر کا خیال آتا رہا۔ اُسے اُس سے بیحد ہمدردی تھی بلکہ وہ یہ تک سوچنے لگی تھی کہ کیا اس کا مداوا نہیں ہوسکتا؟ کیا وہ اس زبردست نقصان کی تلافی نہیں کرسکتی جو آندر کو ایک عورت کے ہاتھوں پہنچا ہے؟ شاید عورت ہونے کی حیثیت سے اُس کا فرض ہے کہ وہ آندر کو اس تباہ حالی سے بچائے۔ آندر کی کشتیٔ حیات ایک مستور چٹان سے ٹکرا کر برباد ہوگئی ہے، اُسے چاہیئے کہ وہ اس مصیبت میں اُس کا ساتھ دے، اُسے سہارا دے اور اُسکا ہاتھ تھام کر ساحل تک پہنچا دے۔ پھر خود ہی اُس نے اپنے دل سے سوال کیا "کیا میں اُس کی کوئی مدد کرسکتی ہوں؟ کیا وہ میری مدد قبول کر لیگا؟"

آخر وہ اُس کی مدد پر آمادہ ہوگئی اور اُس نے ارادہ کرلیا کہ وہ اُس کی حالت سنوارنے کی پوری پوری کوشش کریگی۔ اُس کی دُنیا سے بیزاری دُور کردیگی اور اُسے زندگی اور متعلقاتِ زندگی میں دلچسپی لینے کی ترغیب دلائے گی۔

۴

لیکن نہیں، دریا میں طغیانی آگئی اور دھارے کا پانی مصنوعی نہر میں رواں ہونے کی بجائے قدرتی نشیب کی طرف بہہ نکلا۔ چندن کا خیال غلط تھا کہ اُسے آندر سے صرف ہمدردی ہے اور وہ اُسکی حالت بہتر بنانے میں محض انسانی فرض ادا کررہی ہے، دراصل وہ اُسکی مدد کرتے کرتے خود اُس کا سہارا ڈھونڈنے لگی تھی۔

——— بالآخر دونوں نے محسوس کرلیا کہ وہ یکایک نامناسب اور پُرخطر راہ پر گامزن ہوگئے ہیں اور جب نفس تحت الشعور بالائے شعور آیا تو چندن نے بہتیرا چاہا کہ وہ اس راہ کو فوراً چھوڑ دے، یہیں سے واپس لوٹ جائے مگر اب یہ ممکن نہیں تھا۔ اُس کا ہر آگے بڑھتا ہوا قدم اُسے منزل کے قریب لیجاتا ہوا معلوم ہو رہا تھا، اور اُسکا بیقرار دل آندر کا ساتھ چھوڑنے پر کسی طرح راضی نہ ہوتا تھا۔ پھر بھی وہ گھنٹوں اپنی تمناؤں سے برسرِ پیکار رہی اور ہر بار اسی نتیجہ پر پہنچی کہ آندر پر فتح پاکر وہ خود اپنے آپکو ہار چکی ہے۔

آندر کو بمبئی سے وحشت ہونے لگی۔ وہ جلد از جلد چندن کو ہمراہ لیکر وہاں سے روانہ ہوجانا چاہتا تھا۔ مایوسی کی طرح اُس کی محبت میں بھی حد درجہ شدت تھی اور وہ اس میں اسقدر خود فراموش ہوگیا تھا کہ اُسے سوشیل کا مطلق خیال نہ رہا۔ اُسکے فردوسِ تخیل میں سوائے اپنے اور چندن کے کسی کے لئے گنجائش نہیں تھی۔ وہ یکسر بھول گیا کہ جیسے کملاوتی کی جُدائی سے اُسکی زندگی تباہ ہوگئی تھی، چندن کے چلے جانے سے سوشیل پر بھی تباہ کن اثر ہوسکتا ہے۔ اور پھر اُس کے لئے یہ کیا کچھ کم باعثِ اذیت ہوگا کہ اُس کی متاعِ حیات خود اُس کے عزیز ترین دوست کی بدولت لُٹی، جسے اُس نے اپنا، بالکل اپنا سمجھ کر اپنے دامن میں پناہ دی۔

سوشیل چھ بجے کے قریب دفتر سے آتا تھا، مگر آندر بغیر اس سے ملے چار ہی بجے اسٹیشن چلا گیا۔ چندن اُسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی "کس قدر وجیہ اور سجیلا نوجوان ہے" وہ آپ ہی آپ کہتی رہی "اِس خوش وضع لباس میں یہ کس قدر بھلا معلوم ہوتا ہے" اور جب وہ سڑک کے موڑ پر نظر سے اوجھل ہوگیا تو اُس کے تمام جسم میں بجلیاں سی دوڑ گئیں اور اسکا دل بلّیوں اُچھلنے لگا۔

اُس نے آندر کے ساتھ جانا مناسب نہیں سمجھا، وہ یہ نہیں چاہتی تھی کہ اُس کے پُرانے ملازم اور خادمہ کو کسی قسم کا شُبہ ہو، چنانچہ اُس نے آندر سے طے کیا تھا کہ وہ اُس کے جانیکے تھوڑی دیر بعد روانہ ہوگی اور اُسے اسٹیشن پر مِل جائیگی۔ ٹن کی آواز سُنکر اُس نے سامنے دیوار پر دیکھا کہ گھڑی کی سوئیاں تیزی سے آگے بڑھی جارہی ہیں۔

وہ سوشیل کے نام الوداعی خط لکھنے بیٹھ گئی، جس میں اُس نے رُک رُک کر اپنے ارادہ کو بیان کردیا اور نہایت عجز سے اُس سے التجا کی کہ وہ اُسے معاف کردے اور اُسے بھول جائے ..... اُس نے لفافہ بند کردیا اور چلنے کی تیاریاں کرنے لگی۔ تیار ہوکر دمِ رُخصت اُس نے سارے گھر پر آخری نگاہ ڈالی اور انجام کار خط رکھنے کیلئے وہ اپنے شوہر کے کمرے میں داخل ہوئی مگر ——— مگر آرام کرسی پر سوشیل کو بیٹھا ہوا دیکھکر اُسے سناٹا آگیا۔ اُس کے

(بقیہ برصفحہ ۱۹۱)

یہ سڑک

یہ سڑک ــــــــ
سامنے یہ جو ہے کچی سی سڑک
جس پہ استادہ ہیں شیشم کے درخت
پا بگِل صف بستہ
پاسبانوں کی طرح
یہ سڑک ــــــــ
یہ سڑک صاف بھی ہے سیدھی بھی۔
نہ کوئی پھیر نہ موڑ
نہ کوئی پیچ نہ خم
اور نہ خاشاک کے انبار کہیں
یہ سڑک ــــــــ
یہ سڑک جس پہ جوانانِ حسیں محوِ خرام
کاجل آنکھوں میں ہو کاجل میں نشے کے ڈورے
تمتمائے ہوئے گال
بال بکھرے ہوئے بہکی ہوئی چال
اور کلّوں میں دبائے ہوئے پان
یہ سڑک ــــــــ
یہ سڑک خام سہی
شارعِ عام سہی
پھر بھی یہ بات بڑی ہے کہ چلی جاتی ہے
اپنی ہی دُھن میں چلی جاتی ہے
یونہی کلکتہ سے لاہور تلک
یہ سڑک ــــــــ

کبھی تنہائی سے گھبرا کے نکل آتا ہوں
اس سڑک پر جو ٹہلنے کے لئے
ذہن بن جاتا ہے میرا بھی سڑک کے مانند
ایک ایسی ہی سڑک کے مانند
جو چلی جاتی ہے کلکتہ سے لاہور تلک
جس پہ افکار جواں
مثلِ جوانانِ حسیں محوِ خرام
اور اشعارِ رواں
کار کی طرح رواں اور دواں
گرد میں جسکی چھپی جاتی ہے
شعلۂ رُخ کی لپک
شور میں جسکے دبی جاتی ہے
ایک چُوڑی کی کھنک۔
یہ سڑک ــــــــ

(ناتمام)

سندباد جہازی

چشمِ فسردہ (بقیہ بسلسلہ صفحہ ۱۹۰) قدم جہاں تھے وہی جم گئے اور وہ ٹکٹکی باندھکر اپنے شوہر کی نگاہوں کو دیکھنے لگی۔....... یہ ان آنکھوں کو کیا ہوگیا؟ یہ بربادی کا فسانہ کیوں کہہ رہی ہیں؟ ان کی تازگی اور چمک کب مٹ گئی؟ اور.... معاً اس کے تخیل میں اُن دونوں کی آنکھیں آگئیں ــــــــ انادر کی شاداب، متبسّم اور تابناک، اور سوشیل کی فسردہ خاموش ورغمناک!!

صادق الخیری

والے نئے مکان کو۔ یا سامنے والی کھڑکی میں کسی اور کو۔ لیکن وہاں تو کوئی لڑکی نہیں رہتی اور پھر یکایک اس کی نگاہیں میز پر پڑے ہوئے ٹائم پیس پر پڑیں۔ "چھ بجکر ۲۰ منٹ" رضیہ کے لب تھرتھرائے اور اس کے معصوم سے لبوں پر ایک امید بھری مسکراہٹ ہویدا ہوئی اور پھر رضیہ نے کھڑکی کو زور سے بند کر دیا۔

دو ماہ تک کھڑکی کھلتی رہی اور بند ہوتی رہی وہ لڑکا ہر شام اس گلی میں سے گزرتا۔ اور رضیہ کی طرف دیکھتا اور چلا جاتا اور ان دو مہینوں میں رضیہ کی ہیئت ہی بدل گئی۔ اسے ایسا معلوم ہوا۔ کہ وہ زمین سے اٹھکر آسمان پر چلی گئی ہے۔ اب اس کا دل مسرت سے لبریز تھا۔ اور گھر کے کام کاج کرنے میں ایک خاص لطف آتا۔ جب وہ صبح اٹھتی۔ تو آنگن میں چنبارے کے پھول اسکی طرف مسکرا مسکرا کر دیکھتے۔ وہ پھولوں کا گچھا توڑ لیتی اور اسے اپنے نرم نرم گالوں سے لگاتی اور پھر ایک دن گلی کے چوکیداروں نے رضیہ کے باپ سے کہہ ہی دیا وہی جو انھیں کہنا تھا۔ پھر اس دن کے بعد سے کھڑکی بند ہوگئی اور رضیہ کو ایسا معلوم ہوا کہ یہ کھڑکی کبھی نہ کھلے گی۔ باپ کی نگاہیں کہہ رہی ہیں "بیٹی۔ ہندوستانی لڑکی محبت نہیں کر سکتی۔ وہ صرف شادی کرتی ہے اور اس کی ماں کی نگاہیں کہہ رہی تھیں۔ تم نے ہمارے ناموس کو بٹا لگا دیا۔ ہمیں کہیں کا نہ رکھا۔ اپنے ماں باپ کی عزت کا کچھ خیال تو کرتیں اور بھائی کی نگاہیں کہتی تھیں۔ آزادی کا یہ مطلب تو نہیں کہ تم بھی بنو کے بنائے ہوئے راستے پر چلو' یہ راستہ کانٹوں سے لبریز ہے اور پھر میں کبھی یہ گوارا نہیں کر سکتا۔ کہ میری بہن سے کوئی عشق کرے۔ گو میں چاہتا ہوں کہ میں دوسروں کی بہنوں سے عشق کروں۔ ان سے بہنوں کھیلوں.......... لیکن جی چاہتا ہے۔ تمہارا گلا گھونٹ دوں۔

اور پھر ایک دن رضیہ کو خیال آیا۔ کہ وہ ان بندشوں کو توڑ دے۔ ان آہنی سلاخوں کو ریزہ ریزہ کر دے۔ جنھوں نے اس قفس کو ہمیشہ کے لئے بند کر دیا ہے۔ وہ اسے اس وسیع دنیا میں کہیں نہ کہیں ڈھونڈے گی لیکن پھر اسے خیال آتا۔ کہ وہ کہاں ہوگا۔ وہ کیوں چلا گیا۔ اور اب وہ کیوں نہیں آتا۔ وہ آج تک گھر سے باہر کبھی اکیلی نہیں نکلی۔ وہ اکیلی کدھر اور کہاں جائے۔ دنیا اتنی وسیع اور اتنی پھیلی ہوئی ہے۔ یہ اونچے اونچے پہاڑ۔ یہ رات کے لمبے لمبے ڈراؤنے سائے۔ یہ بے معنی اور اونچے اونچے پر اسرار درخت اور یہ سانپ کی کینچلی کی طرح بل کھاتا ہوا دریا۔ یہ بندشیں' یہ آہنی بندشیں' یہ ابدی بندشیں۔ یہ کب ٹوٹیں گی یہ کہاں ٹوٹی ہیں۔

اور جب سے گھر والوں کو اس راز کا علم ہوا ہے۔ انھوں نے کھسر پھسر شروع کر دی ہے۔ ہر روز خفیہ میٹنگیں ہوتی ہیں۔ اور رضیہ سوچتی ہے اور خوب سمجھتی ہے کہ ان سرگوشیوں کا کیا مطلب ہے۔ وہ سمجھتی ہے کہ اسے جلد ہی ہندوستانی سماج کے ہنکا ڈبونے والا لنگر بکیہ [illegible] ہوگا۔ مہندر ناتھ

چراغِ طور

اِک دلِ مغموم کو آنسو بہانا آگیا
ناز والے ناز کرنے کا زمانہ آگیا

انتہائے غم میں بھی مسرور ہوں شاداں ہوں میں
لو مبارک ہو مجھے بھی مسکرانا آگیا

اللہ اللہ مری منزل سے بھی آگے ہو گیا
جس جگہ جھکتے ہیں سر وہ بھی ٹھکانا آگیا

آپ کے جلوے جو بے پردہ نظر آنے لگے
میری نظروں میں سمٹ کر کل زمانہ آگیا

خام کارِ عشق بھی اَب پختہ کارِ عشق ہیں
صدمے سہنا آگئے ہیں غم اٹھانا آگیا

آپ کے نقشِ قدم پر رکھ دی میں نے جبیں
میرے قدموں میں وہیں سارا زمانہ آگیا

میری جانب لے چلا صیاد جب میرا قفس
میں یہی سمجھا کہ میرا آشیانہ آگیا

پاؤں میں لغزش ہے میری بند آنکھیں ہیں مری
ہوش میں بہزاد آؤ آستانہ آگیا

بہزاد لکھنوی

پگڈنڈی

پگڈنڈیاں لُجاتی، ان دیکھی وادیوں میں سے کتراتی چلی جاتی ہیں، دور بہت دُور تک اور بڑھتے بڑھتے آسمان سے جاملتی ہیں، ایک نیلے اور وسیع آسمان سے اور چلنے والے ان پگڈنڈیوں اور آسمان کے درمیان کہیں کھوجاتے ہیں، اس طرح کھوجاتے ہیں کہ نقش قدم بھی پیچھے نہیں چھوڑتے۔!

کتنی پگڈنڈیاں ہیں اور کتنے چلنے والے اور پھر سب کی جدا جدا پگڈنڈی ہے۔ ایک دوسرے سے کہیں بھی تو نہیں ملتے اور اگر ملتے بھی ہیں تو مختلف سمتوں میں جاتے وقت، سب کی جدا جدا پگڈنڈی ہے!

آدمی کا جسم بھی ایک پگڈنڈی ہے جس پر سے زندگی کے مختلف دور گذر جاتے ہیں، بچپن، جوانی، بڑھاپا اور جھریوں کی شکل میں اپنا راستہ چہرے پر چھوڑ جاتے ہیں اور پھر کبھی لوٹ کر نہیں آتے، سب کھو جاتے ہیں، اس زمین اور آسمان کے درمیانی خلا میں، ہوا کے ایک لطیف کرہ میں، پگڈنڈی بھی اور چلنے والے بھی۔ سکھیا پگڈنڈی تھا کہ راہی؟ کچھ خبر نہیں!

بہت کم لوگ جانتے تھے کہ سکھیا افق پر نظریں جمائے گاؤں سے باہر جانے والی پگڈنڈی کو ہر وقت کیوں گھورتا رہتا ہے اور کبھی کبھی اپنے چہرے پر ہاتھ پھیر کر ایک خیال میں کیوں غرق ہو جاتا ہے، سوچتا رہ جاتا ہے یہاں تک کہ پگڈنڈی اس کی نگاہوں کے سامنے ناچنے لگتی ہے اور بل کھاتی ہوئی دور کہیں آسمان میں جا کر جذب ہو جاتی ہے۔

سائے مختصر سے طویل اور طویل سے مختصر ہو کر چھپتے رہے، راستہ میں اُگے ہوئے بہت سے پرانے پیڑ سرکش ہواؤں کی تاب نہ لا کر زمین پر گر پڑے اور ان کی جگہ نئے درختوں نے لے لی، کتنی ہی جگہ پگڈنڈی نے کھسک کھسک کر اپنا راستہ بدل لیا، راستوں کی شکلیں بدل گئیں، مکانوں کی ساخت تبدیل ہو گئی، دن رات تھک تھک کر اون سے بدلتے رہے مگر سکھیا کی کبھی نہ تھکنے والی آنکھیں اس پگڈنڈی پر سے نہ ہٹیں جس پر سے کبھی وہ اپنی زندگی کی ایک خوشی لے کر آیا تھا۔

سکھیا کی زندگی پگڈنڈی کے ساتھ ساتھ بدلتی جا رہی تھی مگر فرق صرف اتنا تھا کہ پگڈنڈی کے سائے کے لئے نئے درخت پرانوں کی جگہ اُگ آئے تھے مگر سکھیا، سکھیا کی زندگی جس پگڈنڈی پر سے گذر رہی تھی اس پہ کوئی سایہ نہ تھا۔ افق کی ایک پتلی سی دھندلی نقرئی لکیر اس کا سرمایہ تھا، اس کی نگاہوں کا مرکز، آسمان اور زمین کا سنگھم!

راتوں کو آسمان میں بھٹکنے والے تارے ٹھوکریں کھا کھا کر اس سے کہتے،

"وہ اب نہیں آئیگی"، مگر سکھیا ان پر نظریں جما کر انہیں گھورنے لگتا اور انہیں ٹوٹتا دیکھ کر اس کی نگاہیں ان کا تعاقب کرتیں لیکن وہ نظروں سے اوجھل ہو کر کہیں گہری تاریکی میں کھو جاتے اور وہ سوچنے لگتا، اسی طرح ایک خوبصورت تارا ٹوٹ کر کبھی اس کی گود میں بھی گرا تھا مگر پھر اسی طرح یک بیک ایک اندھیرے میں اوجھل ہو گیا، اس کی حد نگاہ سے دور، اس کے ادراک سے کہیں پرے اور پھر اس کی نگاہیں ان راستوں پر جم جاتیں جن راستوں سے وہ اسے دلہن بنا کر لایا تھا۔ وہ اب سنسان تھے، سنسان اور اداس اور وہ اُداس راستوں کو دیکھنے لگتا، اس پگڈنڈی کو، کیا خبر اسے کبھی اس کی یاد آجائے اور وہ چلی آئے، اپنے سکھیا کی یاد!

سکھیا کو کبھی کسی نے نہاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا، وہ پانی سے ڈرتا تھا گویا وہ سلگتی ہوئی راکھ کا ایک ڈھیر تھا جو پانی پڑتے ہی سن سے بجھ کر رہ جائیگا۔ ایک میلا سا اسی کا ہم عمر حقہ دن رات اس پر فرمائشی قہقہے لگاتا رہتا تھا، قریب دہکتے ہوئے اپلے کا دھواں پگڈنڈی کی طرح بل کھاتا ہوا اس کے سر پر منڈلاتا رہتا تھا اور وہ اپلے اور حقہ کے درمیان راکھ کے ڈھیر کی طرح پڑا رہتا تھا، ایک سلگتے ہوئے راکھ کے ڈھیر کی طرح!

دن میں کئی بار کوا اس ٹوٹی ہوئی منڈیر پر آن بیٹھتا جس پر ایک بوسیدہ سی بلی ایک پرانے چھپر کو ٹانگے ہوئے تھی۔ اس کی کائیں کائیں پر سکھیا ایک دم چونک پڑتا۔ پگڈنڈی تالاب کے کنارے کنارے مڑتی ہوئی دور کھیتوں میں کھو جاتی، دور تک پھیلے ہوئے کھیتوں میں اور راستہ کی دھول اس کی نگاہوں کا حجاب بن کر انہیں واپس لوٹا دیتی، مایوس، ناکام، اور وہ سوچنے لگتا اور سوچتا رہ جاتا" بہت سی پگڈنڈیاں ہیں، ان گنت، لاتعداد، راستہ بھول جانا کوئی بڑی بات نہیں، وہ بھی راستہ بھول گئی ہے، جانے کب سیدھے راستہ پر پڑے، جانے کب واپس آجائے!

گاؤں بدل گیا ہے، گاؤں والے بدل رہے ہیں، زندگی آہستہ آہستہ پگھل رہی ہے، اس کے ساتھی بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں کیا خبر وہاں بھی روحوں کا ملاپ ہوتا ہو، روحوں کا ملاپ! اور وہ خواہ مخواہ مسکرانے لگتا جیسے دبی ہوئی چنگاری پر سے راکھ ہٹ جاتی ہے۔ اُسے یہاں اب کون پہچانے گا، وہ ابھی اس کا انتظار کرے گا، جانے وہ کب واپس آجائے!

اس کے نزدیک کوڑے کا ایک ڈھیر لگ گیا تھا، گرد و پیش کی ہر شئے کوڑے کے ایک ڈھیر میں تبدیل ہوتی جا رہی تھی، آہستہ آہستہ گرنے والی

منڈیر تنکا تنکا کر کے جھڑنے والا چھپر کا پھونس، دھیرے دھیرے سلگنے والے اپلے اور خود سکھیا کا رفتہ رفتہ بجھنے والا جسم سب کوڑے کے ایک ڈھیر میں بدلتے جا رہے تھے مگر وہ ان تمام چیزوں سے بیگانہ تھا۔ اس کی زندگی کے صبح شام اس کے سامنے پھیلی ہوئی پگڈنڈی پر سے، رینگتے چلے جا رہے تھے۔

چاند اسے راتوں کو تنہا بیٹھا ہوا دیکھ کر سمجھاتا "سکھیا اب وہ کبھی نہیں آئیگی، اب وہ کسی اور کی آغوش میں ہے، تیری پہنچ سے بہت دور"۔ مگر سمجھاتے سمجھاتے خود پھیکا پڑ جاتا۔ ترش اور ٹھنڈی ہوائیں اس کے بدن میں کچو کے دیتیں، موسم آتے اور چلے جاتے مگر سکھیا۔ رفتہ رفتہ بجھنے والا راکھ کا ڈھیر اپنی جگہ پڑا رہتا اور ذرا سی آہٹ پر اونگھتے اونگھتے چونک پڑتا راتوں کو پچھلے پہر کسان اپنے ہل لئے ہوئے، بیلوں کو ٹکٹکاتے، پگڈنڈی پر حسین گیت بکھیرتے ہوئے گذر جاتے اور وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دھند لکے میں تکنے لگتا۔

"کیا خبر وہ ان رسیلے گیتوں ہی کی چھاؤں میں چپکے سے چلی آئے، اپنے سکھیا کے پاس"!

گاؤں کے لڑکے اسے چاچا کہا کرتے تھے، سکھیا چاچا، وہ کبھی کبھی اس کے گرد آن کر اکھٹے ہو جاتے، "سکھیا چاچا کوئی کہانی کہو، اچھی سی" اور کوئی بیچ میں بول پڑتا "سکھیا چاچا کیا دن میں کہانی کہنے سے مسافر راستہ بھول جاتے ہیں"؟

سکھیا یک لخت چونک پڑتا اور نظریں پگڈنڈی پر جما دیتا جو درختوں کی چھدری چھاؤں میں پڑی ہانپتی رہتی تھی، ویران، خاموش اور وہ پھر پوچھتا اس کے شانوں کو جھنجھوڑ کر، "بتاؤ نا سکھیا چاچا کیا دن میں کہانی کہنے سے مسافر بیچ بیچ راستہ بھول جاتے ہیں"؟ اور وہ اپنی تھکی ہوئی بجھی بجھی نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھتا، "ہاں بیٹا دن میں کہانی سنانے سے مسافر راستہ بھول جاتے ہیں، اپنے راستہ سے بھٹک جاتے ہیں، دن میں کہانیاں نہیں کہا کرتے، جاؤ شام کو سنائیں گے"۔ اور پھر اسی طرح شام ہو جاتی۔

یاد آتے پر غیر مہذب گندے اور میلے بچوں کا ہجوم شور مچاتا ہوا پھر اس کے گرد اکھٹا ہو جاتا۔ ایک چلم اتار کر الٹ دیتا اور آگ کرید کر تمباکو جملتے ہوئے کہتا، "سکھیا چاچا ابھی نا شروع کرنا میں تمہارے لئے چلم بھر لوں"۔ سکھیا نرم نرم نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ کر گردن ہلا دیتا۔ بچے اسکے گرد سکڑ کر بیٹھ جاتے اور وہ حقہ کی نے پکڑ کر اسے آواز دیتا،

"کیا سناؤں"؟ اور وہ قہقہہ لگا کر جواب دیتا۔

"آپ بیتی"۔

اس کی نگاہیں تاروں بھرے آسمان اور دھندلکے میں ڈوبی ہوئی پگڈنڈی پر سے گذرتی ہوئیں بچوں کے چہروں پر جم جاتیں، غیر مہذب اور جاہل بچوں کے چہروں پر جنہوں نے غلامی، خدمت اور مشقت کا بار اٹھانے کے لئے جنم لیا تھا، یہی تحفہ نسلاً در نسلاً دینے کے لئے جس طرح انہوں نے یہ سب کچھ ورثہ میں پایا تھا۔ اس کی آنکھیں ان کے چہروں پر گڑ جاتیں، معصوم کھلونے، غم مستقبل کی خوراک!

بچہ اسے خاموش دیکھ کر جھنجھوڑتے، "سناؤ نا سکھیا چاچا اب تو رات ہو گئی"۔ وہ اپنی ٹوٹی ہوئی سانسوں کو جوڑ کر ابھارتا، اپنی زندگی کی طویل داستان ماضی کے انبار میں سے کرید کر نکالتا اور آخری فقرہ پر آن کر رک جاتا،

"مگر وہ اسے چھوڑ کر چلی گئی"!

کوئی بچہ بول اٹھتا، "مر گئی ہو گی سکھیا چاچا بیچاری"؟

"نہیں نہیں"! سکھیا ایک کرب کے عالم میں چیختا۔

کوئی دوسرا بچہ بلا سوچے جواب دیتا، "بدصورت ہو گا سکھیا چاچا وہ آدمی"! اس کا ہاتھ فوراً اس کے چہرے پر جاتا، ایک موٹی سی ناک، موٹے موٹے ہونٹ، اندر کو دھنسی دھنسی آنکھیں، لمبوترا منہ، پھیلا ہوا دہانہ، چھدری ڈاڑھی اور گالوں کی جھریوں میں سے گذرتا ہوا لرز کر حقے کی نے پر آن گرتا۔ اس کا منہ پھیلا رہ جاتا اور پتھرائی پتھرائی نگاہیں پگڈنڈی کے آخری نقطہ پر جم کر رہ جاتیں اس کی سانس اس کے سینہ میں الجھنے لگتی اور آنکھیں آنسوؤں کو ترسنے لگتیں۔

اس کی آخری اُمید پگڈنڈی اس کے سامنے اسی طرح پھیلی ہوئی تھی، خشک، سادہ، بل کھاتی ہوئی اور بچوں کا کہا ہوا فقرہ اس کے لئے بالکل بے معنی ہو کر رہ جاتا، بالکل بے معنی، مردہ، بے جان! اور پھر زندگی کی اتنی طویل امید کو وہ ناسمجھ بچوں کے ایک فقرے پر ختم کر بھی کیسے دیتا؟

وہ مجسم آنکھیں بن کر افق کے اسی درمیانی راستہ کو گھورنے لگتا۔ خزاں کی آمد مردہ، زرد زرد پتوں کا ایک ڈھیر پگڈنڈی پر لگا دیتی، بے ترتیب اور بے کفن پتوں کا ایک ڈھیر! اور راہ گیروں کے پاؤں انہیں روندتے ہوئے گذرتے۔ درختوں کی ننگی شاخیں مایوس باہوں کی طرح پھیلی رہ جاتیں یہاں تک کہ ان میں رفتہ رفتہ شگوفے پھوٹ آتے اور سکھیا بھی کائنات کے اس تسلسل سے اپنی زندگی کو مطابق کرنا چاہتا تھا!

پتوں کی لاشیں ریت کے باریک ذرات میں تبدیل ہو جاتیں اور پگڈنڈی اسے پھر اک روشن ستارہ نظر آنے لگتی جس کی روشنی میں اس کی امیدیں پڑی سسکتی رہتی تھیں اور ابھی تک دم توڑنے کی نوبت نہ آئی تھی۔ گاؤں کے لوگ اسے پاگل تصور کرنے لگے تھے، ایک بے ضرر پاگل۔ اس کے ہم عمر کبھی کبھار ادھر سے گذرتے وقت اس پر ایک نظر ڈال کر رک جاتے، ٹھنڈی چلم اور اسے کسی خیال میں غرق دیکھ کر آواز دے لیتے،

"سکھیا کیا آگ بجھ گئی" ؟

سکھیا اپنی جستجو انگیز نگاہیں اٹھا کر ان کی طرف دیکھتا اور اس کی ڈوبتی ہوئی سی نظریں پوچھتی معلوم ہوتیں،

"تم ابھی تک جی رہے ہو، بلا مصرف، کیوں" ؟

اور پھر ایک جنبش کے ساتھ پہلو بدلتا،

"آگ کہاں بجھی"

"دھواں تو ہے نہیں" ؟

"اب آگ ہی آگ رہ گئی ہے" اور سر د حقہ میں خواہ مخواہ کش لگانے لگتا،

"تیرا چھپر بھی کھسک گیا سکھیا، اس کا پھونس جھڑ گیا"

"ابھی سایہ تو ہے، میرے لئے بہت ہے"

"تو بھی کیا ہے سکھیا، یہ منڈیر ٹوٹ گئی ٹھیک کرا لے نا" !

"ہاں اسے پھر نئے سر سے بساؤنگا" اور اس کی نگاہیں تالاب کے کنارے کنارے بل کھاتی ہوئی پگڈنڈی پر جا پڑتیں۔

"سکھیا کتنا کوڑا چڑھ گیا، جھاڑو بھی نہیں دیتا تو"

"جھاڑو تو وہی آن کر دیگی"

"پگلا" "وہ ہنس دیتا" "وہ نہیں آئیگی"

سکھیا منہ پھیر کر بیٹھ جاتا اور پگڈنڈی کے مدوجزر میں اپنا سکون تلاش کرنے کی کوشش میں مصروف ہو جاتا۔

وہ دور تک بڑبڑاتا ہوا چلا جاتا، پگلا، حقہ ٹھنڈا پڑا ہے کہتا ہے آگ نہیں بجھی، کہتا ہے اب آگ ہی آگ رہ گئی ہے، وہ آئیگی، پگلا" !

"پگڈنڈی کہیں سے شروع ہوتی ہو اور کہیں ختم ہوتی ہو مگر راستہ میں سکھیا کا گھر تو پڑتا ہے، جب ندی چڑھتی ہے تو گیا بیچ کے کھیت سوکھے رہ جاتے ہیں" سکھیا اپنے آپکو چپکے سے تسلی دے لیتا تھا مگر اسے یہ معلوم نہ تھا کہ جب ندی بہت چڑھ جاتی ہے تو کھیتوں کے ساتھ گاؤں بھی ڈوب جاتے ہیں، ندی آگے بہ جاتی ہے اور لاشیں سڑنے کے لئے پیچھے چھوڑ جاتی ہے!۔

سکھیا کی دھندلی آنکھیں افق پر جم کر رہ گئیں۔ رفتہ رفتہ سلگنے والا راکھ کا ڈھیر سرد پڑ گیا۔ آہستہ آہستہ بڑھنے والا کوڑے کا انبار، ٹھنڈا ادھ جلا اپلا، ٹوٹا ہوا چھپر اور گرتی ہوئی منڈیر اسے پکارتے رہ گئے،۔ سکھیا، سکھیا، سکھیا!!

پگڈنڈی گھومتی، بل کھاتی روز اسکے دروازے کے سامنے آکر ٹھہر جاتی ہے اور آواز دیتی ہے "سکھیا" !۔ ٹوٹی ہوئی منڈیر حیرانی سے منہ پھاڑے ہوئے اسے دیکھتی رہ جاتی ہے اور خاموشی سے پوچھتی ہے،۔ "کیا وہ آگئی" !

پگڈنڈی بغیر جواب دئے واپس لوٹ جاتی ہے اور کہیں دور گہرے نیلے آسمان میں جذب ہو جاتی ہے!

اختر الایمان

غزل

ایضار وعدہ تم کسی عنواں نہ کر سکے
وہ بات کیوں کہے جسے انساں نکر سکے

قاتل کو شاد کام رگِ جاں نکر سکے
اُس زندگی پہ خاک! جو قرباں نکر سکے

کچھ اس طرح وہ دل کی تباہی پہ ہنس دئے
ہم بھی یقین حال پریشاں نکر سکے

اوسکی سیاہ بختی کے قربان جائیے
جگنو بھی جسکے گھر میں چراغاں نکر سکے

وہ کام کر گئی تری اک جنبش نگاہ
برسوں میں جس کو گردش دوراں نکر سکے

اس سے وحشت اچھا کہ آباد ہو سکا
اس گھر کو کیا کریں جسے ویراں نکر سکے

ڈر تھا کہ روشنی میں نہ آجائے ظلم حسن
وہ یوں سر مزار چراغاں نکر سکے

دل چاہتا ہے درد اور اک زندگی کا درد
یعنی کہ جس کا موت بھی درماں نکر سکے

اس ماہتاب حسن کو اظہار کیا کروں
جو میری کالی راتوں کو تاباں نکر سکے

اظہار رامپوری

چراغ کے نیچے

اُس کے چہرے پر تھکاوٹ کے آثار تھے۔

کمرے کی تصویروں میں سے سب سے زیادہ دلکش وہ تصویر تھی جو اُس کے سامنے دیوار پر آویزاں تھی۔ اس میں ایک نوجوان ہندو دوشیزہ جس کو مصوّر کی رنگ آمیزیوں نے قیامت کی خوبصورت بنا دیا تھا، ایک مندر میں دیوتا کے سامنے آرتی کر رہی تھی۔ دیوتا اتنا بدصورت تھا جتنی وہ خوبصورت تھی۔ وہ جواہرات سے اتنا زیادہ گھناؤنا ہو گیا تھا، جتنی رنگوں کی آمیزش سے وہ زیادہ رعنا ہو گئی تھی۔ راجستھانی شمعدانوں کی زرد زرد روشنی اور اگر کے نیلے نیلے دھوئیں میں مندر ازل کی صبح کے متبرک دھندلکے کے اندر ڈوبا ہوا تھا۔ اس نیلی نیلی مدھم فضا پر لڑکی کی نیلی نیلی ملول آنکھوں نے تقدیس کی شعاعوں سے جادو سا کر دیا تھا۔ پائنس پر لگی کے روشن دیئے اس کے خوبصورت زرد چہرے کی زردی اور خوبصورتی کو زیادہ واضح کر رہے تھے ———

اُس کی حساس نظریں اس تصویر کی لطافتوں میں گم ہو گئی تھیں۔

تھکا ہوا دماغ راحت کا متلاشی!

اُس کی عمر اتنی زیادہ تو نہ تھی۔ اور اس کو خونی دباؤ کا موذی عارضہ بھی نہیں تھا۔ لیکن پھر بھی احتیاطاً اُس نے بڑے بڑے لیڈروں کی عادت کے مطابق بمبئی پہنچنے سے پہلے استقبالیہ کمیٹی کے سیکرٹری کو لکھ دیا تھا کہ اس کی آمد پر کسی غیر معمولی جلوس کا انتظام نہ کیا جائے۔ اور اس کی رہائش کا انتظام کسی ایسے مقام پر ہو جہاں سکون اور راحت نصیب ہو سکے۔

جُوہو۔ بمبئی کے قیامت خیز ہنگاموں سے دُور، فطرت کی سکون سے لبریز آغوش میں ——— وہ جُوہو کے ایک شاندار بنگلے کے خوبصورت ڈرائنگ رُوم میں ایک آرام کرسی پر بیٹھا تھا، اُس کی تھکاوٹیں تصویر کی لطافتوں میں کھوئی ہوئیں!

تمام دن ملنے والے اُس کو پریشان کرتے رہے ہیں۔ اور اگر اس کو خونی دباؤ کے آغاز کا اندیشہ نہ ہوتا تو اب بھی اس کے پاس زائرین بیٹھے ہوتے اُس نے عورتوں کے ایک وفد سے ملاقات کرنے کے بعد ملازم کو کہہ دیا تھا کہ وہ اب وہ کسی سے نہیں مل سکتا۔ وہ عورتوں کے اُس وفد سے بھی ملنے سے انکار کر دیتا اگر وہ عورتوں کا وفد نہ ہوتا ——— گری ہوئی بہنوں کا وفد۔

وہ بازاری عورتوں کو "گری ہوئی بہنیں" کہتا تھا۔

ملاقات کرنے والوں میں سے "گری ہوئی بہنوں" کے وفد نے اُس پر سب سے زیادہ اثر کیا تھا۔ غالباً جذبات کی اس شدت نے اُس کو سامنے کی دیوار پر تصویر کی طرف زیادہ مائل کر دیا تھا۔ لڑکی کے چہرے کی خوبصورت زردی اور افتادہ بہنوں کے وفد کی زرد خوبصورتی میں مناسبت تھی۔ وہ دیکھ رہا تھا۔ اور دیکھتا رہنا چاہتا تھا۔

کانگریس کے سالانہ اجتماع کے موقعے پر اُس کی صدارتی تقریر تیار تھی۔ رواں سال کے لئے کانگریس کا صدر ہونے کی حیثیت سے موجودہ سال کا پروگرام بھی اُس نے مرتب کر لیا تھا۔ افتادہ بہنوں کے ساتھ ملاقات کرنے کے بعد اسکو تقریر اور پروگرام میں کچھ کمی سی محسوس ہونے لگی۔ مصیبت زدہ کمزور صنف کے لئے ہمدردی کا یہ خیال گھڑی کی ٹِک ٹِک کے وزن کے نیچے زیادہ لطیف ہو گیا۔ سامنے کی دیوار پر تصویر کی فنی نزاکتوں نے اس خیال کو ایک شدید جذبے میں تبدیل کر دیا۔ اور اس کے سامنے ہندوستان کی مظلوم عورتوں کا تخیل اس قدر وسیع ہو گیا کہ اس کو اپنی تقریر اور پروگرام پر دوسری نظر ڈالنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اُس نے اپنی تقریر میں عورتوں کے موضوع کو جگہ دے دی اور کانگریس کے پروگرام میں نسوانی مصیبتوں کے نام سے ایک اور دفعہ شامل کر دی۔ چندے کی فہرست میں چندے کی سب سے زیادہ رقم ۵۰۰۰ روپے تھی۔ اُس نے . . . ۵ روپے کے نیچے سُرخ پنسل سے لکیر کھینچ دی۔

کلاک نے دس بجا دئے۔

باہر چاندنی تھی۔ چاندنی میں اونچے اونچے ناریل کے درخت تھے۔ درختوں میں بیضوی شکل کے بڑے بڑے ناریل تھے۔ سمندر تھا۔ سمندر میں موسیقی تھی۔ موسیقی میں راحت تھی۔

وہ دریچے کے پاس کھڑا تھا۔

گویا افتادہ بہنیں اس کے سامنے کھڑی تھیں۔ زرد چہرے، بال کھلے، لباس ماتمیں، آنکھوں میں آنسو۔ سمندر کی موجیں ریت کے چمکدار ذرّوں کی سیڑھیوں سے اُن کے پاؤں چومنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

اُس کے پیچھے دروازہ کھُلا۔ ملازم اندر داخل ہوا۔

"آپ سے ایک عورت ملنا چاہتی ہے۔"

"عورت!"

"جی"

"میں نے تم سے کہا تو تھا میں اب کسی سے ملنا نہیں چاہتا"

"میں نے اُس کو بہت سمجھایا رات بہت گذر چکی ہے۔ ملنے کے لئے یہ اچھا وقت نہیں۔ وہ بہت تھکے ہوئے ہیں۔ پھر تم سے تو وہ ملنے کے لئے کبھی رضامند

نہیں ہوں گے۔ اب آدھی رات کے وقت! ایک عورت سے ملاقات! میں نے تو ڈرتے ڈرتے اور بھی بہت کچھ کہہ دیا۔ شاید وہ خفا بھی ہوگئی ہو۔ میں نے کہا۔ اگر کوئی سادہ جیسی عورت ہوتی تو کوئی بات نہیں تھی۔ اُن عورتوں کی طرح سادہ جو دن کے وقت یہاں آئی تھیں۔ سُرخی، پاؤڈر، سرمہ، سگریٹ اور معلوم نہیں کیا کیا کچھ اِن تمام چیزوں کے ساتھ وہ تم سے ملنا کہاں گوارہ کریں گے۔ وہ تو ولایتی بناوٹ سے نفرت کرتے ہیں۔ اور پھر بڑے بڑے لیڈروں کی ایک ایک حرکت لوگوں کی نظروں میں رہتی ہے۔ آج کل کے زمانے میں جبکہ ہوا بولنا جانتی ہے، دیواروں نے بھی اخباروں کی نمائندگی اختیار کرلی ہے۔ اگر کل کے اخباروں میں سب سے بڑی خبر یہ ہوئی ——— بمبئی، ۲۵ر نومبر ——— سید رؤف کانگریس کے صدر کو کل آدھی رات کے وقت ایک خوبصورت عورت کے ساتھ ——— "

لیڈر کو ملازم کا لہجہ اور لمبی تقریر پسند نہ آئی۔ اُس نے محسوس کیا کہ اگر اُس کو روکا نہ گیا تو اس کی تقریر زیادہ لمبی اور اس کی زبان زیادہ دراز ہو جائیگی

"بنسی! تم ٹھیک کہتے ہو۔ اُس عورت سے کہہ دو۔ میری طبیعت اچھی نہیں ہے اُس کو اِس وقت ہرگز ——— "

دروازہ کھلا۔ ایک عورت اندر آکر دروازے کے پاس کھڑی ہوگئی۔ عمر سے اُدھیڑ اور کسی قدر فربہ۔ بناوٹی آرائشوں سے جوان اور بہت خوبصورت لیڈر کی آنکھیں اُس کے چہرے پر پتھر بن گئیں۔ وہ پہاڑ سے لڑھک کر نیچے گرنے والے برف کے تودے کی طرح سفید ہوگیا۔ بنسی کی حیرت کی کوئی انتہا نہ تھی۔

عورت نے تمکنت کے انداز میں کہا۔ "ملازم! تم جاؤ"

دروازے پر پہنچتے تک بنسی کی حیرت شکوک میں تبدیل ہوگئی۔ بنسی کے چلے جانے کے بعد لیڈر کے پتھر سے بنے ہوئے ہونٹوں میں جنبش آئی۔

"عزیزہ!"

"شکریہ! آپ نے مجھے پہچان لیا۔ ۲۰ سال کی لمبی جدائی کے بعد"

"تم کہاں ہو؟ کیا کرتی ہو؟"

"آپ کو میری پرائیویٹ زندگی کے متعلق سوالات کرنے کا کوئی حق نہیں ہے"

"بہت بدل گئی ہو، عزیزہ!"

"معاف کیجئے! میرا نام عزیزہ نہیں۔ اب میں مسز تارکا ہوں"

"تم نے اپنا مذہب تبدیل کرلیا ہے؟ تم نے کسی ہندو سے شادی کرلی ہے، عزیزہ؟"

"نہیں۔ میں نے اپنا مذہب تبدیل نہیں کیا۔ اور نہ ہی میں نے ابھی تک شادی کی ہے"

"پھر تم مسز تارکا کیوں کر بن گئیں؟"

"مجھے اپنے پرانے نام سے نفرت ہوگئی تھی ——— عزیزہ ——— چھوٹا سا، معصوم سا نام۔ جس سے کنوارپن کی بو آتی ہے۔ جس میں رعنائی سموئی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ رعنائی، کنوارپن، معصومیت اور چھوٹی عمر۔ جو عورت کو مرد کے پیروں میں روندے جانے کے لئے اُکساتے ہیں۔ اِسی قسم کے سنگدل پیروں کی ٹھوکریں کھا کھا کر جب میری آنکھیں کھلیں تو میں نے دیکھا کہ شادی شدہ عورت اور غیر شادی شدہ عورت کے درمیان سوسائٹی کی بنائی ہوئی کاغذ کی ایک نازک سی دیوار ہے، جس میں مَیں نے جذبات کی وارفتگی میں جگہ جگہ شگاف کر دئے ہیں۔ دیوانہ وار تلاش کے بعد بھی میرا ہم سفر مجھے نہ مل سکا میں نے غصے کی ایک بے پناہ جنبش سے کاغذ کی اُس دیوار کو مسمار کر دیا۔ دوسری دُنیا میں مَیں نے اپنے آپ کو زیادہ آزاد، زیادہ تجربہ کار اور زیادہ طاقتور پایا۔ دولت کی گھنگھور گھٹاؤں میں مجھے مذہب اور قانون کھلونے معلوم ہونے لگے میں نے اپنا نام بدل کر مذہب اور قانون کا مذاق اُڑانے کی کوشش کی ہے"

لیڈر کو معلوم ہوگیا کہ وہ اُن عورتوں میں سے نہیں جو اُس کے پاس دن کے وقت وفد کی صورت میں آئی تھیں۔ اُس کے لفظوں میں طاقت تھی۔ اُس کی گفتگو میں انتقام تھا۔ رات کے اِن مضمحل لمحوں میں اُس کا دماغ استدلال کی ضربیں برداشت کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔

"عزیزہ! ———"

"عزیزہ نہیں۔ مسز تارکا"

"مسز تارکا! مجھے تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی ہے۔ میں تم کو آزاد، تجربہ کار، طاقتور اور دولتمند دیکھ کر بہت خوش ہوں۔ مجھے افسوس ہے میں تمہاری دلچسپ گفتگو سے محروم رہوں گا۔ رات بہت گذر چکی ہے اور مَیں ——— "

وہ بے پروا انداز میں آرام کرسی پر جاکر بیٹھ گئی۔

"عزیزی اے مسز تارکا میں مجبور ہوں میں بہت تھکا ہوا ہوں"

"زیادہ گذری ہوئی رات میں، تھک کر چور چور دماغ پر ہتھوڑے کی چوٹیں زیادہ کارگر ہوتی ہیں"

لیڈر سمجھ نہ سکا۔ وہ سمجھنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ پھر بھی اُس نے دو تین لمحے اُس کو سمجھنے میں صرف کر دئے۔ اور جب وہ پھر بھی نہ سمجھ سکا، تو اُسے افسوس ہوا کہ اُس نے نیند کے بہت قیمتی لمحے ضائع کر دئے۔

"تم کیا کہنا چاہتی ہو، مسز تارکا؟"

"سید رؤف! میں آپ سے پوچھنا چاہتی ہوں کہ کیا یہ سچ ہے آپ عصمت فروشی کے خلاف ایک مستقل تحریک شروع کرنے والے ہیں؟ اور آپ کل کے اجلاس میں پبلک کو اپنے ارادے سے مطلع کریں گے؟"

"ایک رہنما کی حیثیت سے یہ میرا اخلاقی فرض ہے، مسز تارکا!"

"رہنما!"

طنز کے زہریلے اثرات کو چھپا لینے کی کوشش میں لیڈر کی نظریں اضمحلال کے ایک احساس کے ساتھ عزیزہ کے چہرے سے پاؤں کی طرف سفر کر گئیں۔ اور اُس کے دائیں پاؤں کے انگوٹھے کے پاس گڑھا کھود کر زمین میں دفن ہوگئیں۔ خاموشی کے اس جانکن وقفے نے حالات کی نزاکت کو کسی قدر ملائم کر دیا۔

"تم اِس تحریک کو پسند نہیں کرتیں؟ عزیزہ!"

"مجھ کو افتادہ بہنوں سے بہت ہمدردی ہے۔"

"اس لئے اس تحریک میں تم میرے ساتھ ہو؟"

"اس لئے میں اِس تحریک کو حقارت کی نظر سے دیکھتی ہوں۔"

"لیکن ــــ لیکن ــــ"

"میں عورتوں کے معاملات میں مرد کے دخل کو برداشت نہیں کر سکتی۔"

"کیوں؟"

"مرد کے نزدیک عورت کی نجات اُس کی غلامی میں ہے۔"

"تم شادی کے رشتے کو غلامی کہتی ہو، عزیزہ؟"

"ایسی نظروں سے جو دلوں کے آر پار ہو جایا کرتی ہیں عزیزہ نے لیڈر کی طرف دیکھا۔

"ــــ یہ تم بول رہے ہو؟ تم؟ سید رؤف!"

سید رؤف کا سر جھک گیا۔

پھر جب دوسری دفعہ اُس کو آنکھیں اٹھانے کی جرأت ہوئی تو اس کی نظریں کلاک کی طرف چلی گئیں۔

"بہت رات گذر چکی ہے عزیزہ!"

"عزیزہ! عزیزہ! اُف مجھے کتنی نفرت ہے اس نام سے۔ میں تمہیں کس طرح بتاؤں کہ میرا نام عزیزہ نہیں۔ میں مسز تارکا ہوں۔ جب میں تم کو سید رؤف کہتی ہوں۔ رُوفی نہیں کہتی۔ پھر تم مجھے عزیزہ کیوں کہتے ہو۔ مسز تارکا کیوں نہیں کہتے۔ ۲۰ سال پہلے تم روفی تھے۔ میں عزیزہ تھی۔ اب تم سید رؤف ہو۔ میں مسز تارکا ہوں۔"

لیڈر اپنے دائیں ہاتھ کی پہلی انگلی سے اپنے انگوٹھے کے ناخن کو زور زور سے رگڑنے لگا۔ اُس کی آنکھیں کشمکش کے اس نظارے کو بے چینی سے دیکھتی تھیں۔ گویا وہ کسی سوال کا جواب چاہتی ہیں۔

"تم جا سکتی ہو، مسز تارکا!"

وہ آرام کرسی سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"ہاں میں جا رہی ہوں! ــــ"

آنے والی راحت کے احساس کو دکھانے کے لئے وہ کھڑکی سے سوئچ بورڈ کی طرف چلا گیا۔ اُس نے کمرے کے سب سے بڑے درمیانی بلب کو بجھا دیا۔ اب کمرے کے اندر ایک کونے میں صرف ایک ٹیبل لیمپ روشنی دے رہا تھا۔ سامنے کی دیوار پر وہ ہندو دوشیزہ کی تصویر پھیکے پھیکے اندھیرے میں ڈوب گئی۔ وہ سوفے پر جا کر بیٹھ گیا۔ اُس کے پیچھے کھڑکی کے پردے ہوا میں کسی دیوانے آدمی کے قہقہے کی طرح پھڑ پھڑا رہے تھے۔

"آپ کو اپنی نیند کی فکر دامنگیر ہے۔ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ دنیا میں ایسے بھی ہیں جن کے نزدیک رات کی نیند بھٹکتی بھی نہیں؟"

"میں جانتا ہوں"

"کون؟"

"میں"

"اور کوئی نہیں؟"

لیڈر ایک غیر معلوم جذبے کے ساتھ کرسی سے اُٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ اور جذبات سے لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے عزیزہ کی طرف جانے لگا۔ عزیزہ اُس سے دُور رہنے کے لئے پیچھے کی طرف ہٹنے لگی۔ ٹیبل لیمپ کی روشنی میں پہنچ کر وہ میز کے پاس کرسی پر بیٹھ گئی۔ لیڈر کرسی کے بازوؤں پر ہاتھ رکھ کر اس کے اوپر جھک گیا۔

"کیا کہتی ہو؟"

"میں کہتی ہوں نیند سے محروم رہنے والے تم ہی نہیں ہو۔ اور بھی ہیں!"

"کون؟ ــــ تم؟ ــــ سچ کہتی ہو؟ ــــ تم آج یہاں کیوں آگئی ہو، عزیزہ! ــــ بھرے ہوئے زخموں کو ہرا کرنے سے کیا فائدہ؟ ــــ میں نے تم کو بھلانے کی بے حد کوشش کی ــــ ۲۰ سال تک ــــ اس رات کے اس لمحے تک میں کامیاب تھا ــــ اور کامیاب رہنا چاہتا تھا ــــ عزیزہ! تم آج یہاں کیوں آگئی ہو ــــ عزیزہ! عزیزہ! ــــ"

عزیزہ کا چہرہ غصے سے لال ہوگیا۔

"سید رؤف! بکواس بند کرو! زبان کو قابو میں رکھو! مجھ سے دُور ہٹ جاؤ۔ میں کانپ رہی ہوں۔ میرا دایاں ہاتھ میرے قابو سے باہر ہے۔ میں ایک زہریلی عورت ہوں۔"

اُس نے کرسی کے بازوؤں سے ہاتھ اُٹھا لئے۔ اور اپنے کھسیانے پن کو
عزیزہ کی سُرخ نظروں سے بچا کر ——— عزیزہ نے اُسی غصّے کے انداز میں کہا۔
۲۰ سال تک ——— ۲۰ سال کے طویل عرصے تک ——— ایک ایک
لمحہ ——— ہر ہر لحظہ ——— صبح سے شام ——— شام سے صبح ——— میں
تم سے نفرت کرتی رہی ہوں۔ نفرت کرتی ہوں۔ اور نفرت کرتی رہوں گی
——— ۲۰ سال تک ——— ۲۰ سال کے طویل عرصے تک ——— ایک ایک
لمحہ ہر ہر لحظہ ——— صبح سے شام ——— شام سے صبح ——— تمہاری
یاد میرے پہلو میں کانٹا بن کر کھٹکتی رہی ہے۔ کھٹکتی ہے۔ اور کھٹکتی رہے گی۔
——— رؤف! تو اس دنیا کی بدترین ہستی ہے! ——— تیرا ہر رونگٹا دوزخ
کی آگ کا انگارہ ہے ——— تیری شہرت ——— تیری عظمت ——— تیری
ہر دل عزیزی ——— دُکھے ہوئے دلوں کے بے شمار ناسور ہیں ——— آج
تو نے میری سوئی ہوئی آگ کو پھر جگا دیا ——— آج تو میرے جذبات کے ساتھ
پھر کھیلنا چاہتا ہے۔ اُنہیں الفاظ کے ساتھ۔ اُنہیں جذبات کے ساتھ۔ اُسی
شدت سے۔ اُسی انداز سے ———"

——— وہ آرام کرسی پر آ بیٹھا۔

خاموشی۔ خاموشی۔ اور پھر ———

"میں غلط فہمی کے لئے شرمندہ ہوں، مسز تارکا! مجھے تمہاری
گالیوں سے راحت ہوتی ہے۔"

وہ اُٹھ کر ٹہلنے لگی۔ اس طرح شاید اس کے غصے کی شدت میں کمی
واقع ہو گئی۔

"میں نے کہا تھا تمہیں رات کو نیند نہیں آئے گی کیونکہ تم سمجھتے ہو
کہ انڈین نیشنل کانگریس کے صدر ہونے کی حیثیت سے تمہارے اوپر تمہاری
قوم کی اتنی ذمہ داریاں ہیں کہ ان کا بوجھ تم کو سونے نہیں دیتا۔ اور میں رات
کو نیند سے محروم رہوں گی کیونکہ کانگریس کی آئندہ پولیسی جس کی بنا پر تم
کل کے اجلاس میں رکھنے والے ہو، میرے مستقبل کے لئے موت کا پیغام
ہے۔"

"مسز تارکا! میری کانگریس کے پروگرام میں کوئی ایسی چیز نہیں جس
سے کسی جماعت کے کسی فرد کو نقصان پہنچے۔"

"انہوں نے میرے خلاف بغاوت کی ہے۔"

"کس نے؟"

"جن کو تم گری ہوئی بہنیں کہتے ہو۔"

"گری ہوئی بہنیں!"

"وہ میرا سرمایہ ہیں۔ وہ میری زندگی ہیں۔ اگر تم ان کو مجھ سے چھین لوگے
تو میں تباہ ہو جاؤں گی۔"

"میں سمجھا نہیں۔"

"وہ بازار میں کھڑی ہو کر اپنی عصمت بیچتی ہیں۔ اور میں اُن کے پیچھے
کھڑی ہو کر اُن کو بیچتی ہوں۔"

لیڈر کو زیادہ حیرت نہیں ہوئی۔ وہ اُس کی گفتگو سے پہلے ہی سمجھ گیا
تھا کہ وہ ایسی ہی عورتوں میں سے کوئی ہو سکتی ہے۔

"تم عصمت فروشی کی تجارت کرتی ہو؟"

"مسز تارکاز بال روم، مسز تارکاز کیبارے، مسز تارکاز ڈانسنگ ہال،
مسز تارکاز بیوٹی ٹریٹمنٹ، مسز تارکاز آرکسٹرا، مسز تارکاز میوزک کلاسز،
مسز تارکاز مساج انسٹی ٹیوشن، ہندوستان کے تمام بڑے بڑے شہروں میں
میرے مرکز کھلے ہوئے ہیں۔ میں نے ہندوستانی حُسن فروشی کو مہذب مغربی
انداز پر تنظیم دینے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اور اب یہ ذلیل پیشہ ذلیل
پستیوں سے نکل کر معزز سطح پر آ گیا ہے۔ میں اپنی ملازموں کو اتنی ہی تنخواہ
دیتی ہوں، جتنی کوئی یورپین سٹینو ٹائپسٹ کسی آفس سے لیتی ہوگی اور جتنی
ہمارے گریجوایٹ کلرکوں کو ریلوے کے دفتروں سے ملتی ہے۔ یعنی ۵۰ روپے
سے لے کر ۱۵۰ روپے تک۔"

لیڈر کے لئے یہ باتیں حیرت انگیز تھیں۔ وہ کرسی سے اُٹھ کر سوئچ بورڈ
کے پاس گیا۔ اور کمرے کا سب سے بڑا مرکزی بلب روشن کر دیا۔ کمرے کے
وہ کونے جن میں اندھیرا چھایا ہوا تھا اُجالے میں آ گئے۔ عزیزہ ٹیبل لیمپ کی
روشنی میں بیٹھی تھی۔ ٹیبل لیمپ کا شیڈ ٹیبل لیمپ کی روشنی کو یکجا کر کے عزیزہ
کے چہرے پر پھینک رہا تھا۔ جس طرح سامنے کی دیوار پر پانس کے دئیے
اپنی ضو ہند دوشیزہ کے چہرے پر بکھیر رہے تھے۔ لیڈر نے ایک لمحہ دریچے
میں سے باہر دیکھا۔ ہلکی نیلی چاندنی گہرے نیلے سمندر سے کھیل رہی تھی۔ ہلکی
نیلی چاندنی اور گہرا نیلا سمندر ——— وہ پلٹ کر دہلیز کے سہارے کھڑا ہو گیا۔ ٹیبل
لیمپ کے شیڈ نے ٹیبل لیمپ کو سرچ لائٹ بنا دیا۔ سرچ لائٹ عزیزہ کے جسم
کے ایک ایک کونے میں پہنچ گئی۔ دماغ کے پہاڑوں میں۔ دل کے غاروں میں۔
جگر کی وادیوں میں۔ اُسے یاد ہے پہلے وہاں ایک سرسبز وسیع میدان تھا۔

"مجھے تمہارے ساتھ ہمدردی ہے، مسز تارکا!"

"کیا میں اُمید کر سکتی ہوں، کہ آپ کانگریس کے ہونے والے اجلاس
میں عورتوں کے متعلق کوئی ریزولیوشن پیش نہیں کریں گے؟"

"کانگریس کے ہونے والے اجلاس میں عورتوں کے متعلق ریزولیوشن
پیش ہوگا۔"

"آپ کو مجھ سے اتنی ہمدردی ہے کہ آپ مجھ کو تباہ کرنے پر آمادہ ہیں۔"

"تم مسز تار کا ہو"

"آزاد، تجربہ کار، طاقتور اور دولتمند"

"گری ہوئی بہنوں میں سے ایک"

"سید رؤف! تم کو میری شخصیت کے متعلق رائے زنی کا کوئی حق نہیں۔ تمہارے اور میرے زندگی کے نظریوں میں فرق ہے۔ جس فرق کی بنا پر تم مجھے گری ہوئی کہتے ہو، اُسی فرق کی بنا پر میں تم کو گرا ہوا کہہ سکتی ہوں۔ تمہاری سوسائٹی کے فیصلے عجیب ہیں۔ اگر عورت اپنے پاؤں پر کھڑی ہو، تو وہ اس کو گری ہوئی کہتی ہے۔ اور اگر عورت اپنے آپ کو مرد کے پیروں کی ریکھا سمجھے تو وہ اس کو سربلند سمجھتی ہے۔ تمہاری سوسائٹی کی یہ کھوکھلی بنیادیں ایک دن تمام عمارت کو منہدم کر دیں گی ــــ"

تاکہ اُس کے غصے میں اضافہ ہو جائے، وہ کرسی سے اُٹھ کر ٹہلنے لگی۔

"اُف!...... تمہاری بھدی شکل...... مجھے تم سے ...... میں...... میں چاہتی ہوں...... اگر میرے پاس ریوالوار ہوتا تو میں تم کو شوٹ کر دیتی...... اور...... اور ۲۰ سال کی انتقام کی بھڑکتی ہوئی آگ بجھ جاتی ــــ"

وہ کرسی کی بیک کو پکڑ کر کھڑی ہو گئی۔

"تم جیسی ذلیل ہستی کے پاس زیادہ دیر تک ٹھہرنا، میں اپنی ہتک سمجھتی ہوں۔ میں جاتی ہوں"

وہ دروازے کے پاس پہنچ کر ٹھہر گئی۔ اور پلٹ کر کہنے لگی۔

"لیکن جانے سے پہلے میں کچھ پوچھنا چاہتی ہوں"

"پوچھو۔"

لیڈر اپنے آپ کو فارغ سمجھ کر آرام کرسی پر بیٹھ گیا۔

"میں پوچھنا چاہتی ہوں تم گری ہوئی بہنوں کو اُٹھانے کے لئے کیا کیا طریقے استعمال کرو گے؟"

"میں پبلک میں اس کے خلاف پراپیگنڈہ کر کے اپنی کانگریس منسٹری کے نام احکام جاری کروں گا کہ وہ تمام ایسے ادارے بند کر دیں جو ہمارے اخلاق کے لئے مُضر ہیں"

"میری تحریک لوگوں میں زیادہ مقبولیت حاصل کرے گی"

"تمہاری تحریک؟"

"میں کل کو تمہاری تحریک کے خلاف ایک تحریک قائم کرنیوالی ہوں"

"لیکن ــــ"

"اور کامیابی کا سہرا ہم دونوں میں سے کس کے سر ہوگا، میں جانتی ہوں"

"کس کے سر؟"

"میرے"

"کیوں"

"تمہاری تحریک لوگوں کے چندے کی محتاج ہے۔ میرے پاس اپنی تحریک کے لئے بے اندازہ روپیہ ہے"

"کیا...... ۵ روپے اس تحریک کے لئے کافی نہ ہوں گے؟"

"...... ۵ روپے"

"چندے کی فہرست میں سب سے زیادہ رقم...... ۵ روپے ہے۔ میں نے وہ رقم اس تحریک کے لئے وقف کر دی ہے"

وہ سوچ میں پڑ گئی۔ آہستہ آہستہ کمرے کے درمیان میں آگئی۔

"کیا میں جان سکتی ہوں کانگریس کو...... ۵ روپے دینے والا کون ہے؟"

"کیا ضرورت ہے؟"

"میرا خیال ہے میں اُس کو جانتی ہوں۔ اُس نے آج صبح ...... ۵ روپے کے چیک کا ذکر کیا تھا"

وہ اُٹھا، میز کے پاس گیا۔ دراز کھولی۔ فہرست نکالی۔ اور پڑھنے لگا۔

"حکیم جی لقمان جی اینڈ کو"

"حکیم جی لقمان جی اینڈ کو کا نوجوان پروپرائٹر ابراہیم جی!"

"وہ آج دن کو مجھ سے ملنے آیا تھا"

وہ اب بھی نیچے کار میں میرا انتظار کر رہا ہے۔ وہ مجھے اپنی کار میں یہاں لایا تھا۔ وہ جھوٹا، ریاکار! وہ کمینہ دغا باز!"

"کیوں گالیاں دیتی ہو؟"

"وہ میرے بغیر ایک منٹ نہیں رہ سکتا۔ اُس نے مجھے اپنی ایک پوری بلڈنگ رہنے کے لئے دے رکھی ہے۔ وہ میری وجہ سے تمام شہر میں بدنام ہے۔ وہ مجھ پر ہزار جان سے نثار ہے۔ وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے"

"نوجوان خون نے اُسے اندھا کر دیا ہوگا"

"نہیں وہ اسمبلی میں ایک سیٹ کے لئے مرتا ہے"

"ــــ لیکن اسمبلی سے تمہارا کیا تعلق؟"

"دراصل وہ میرے رسوخ اور میری دولت سے محبت کرتا ہے۔ میرا رسوخ اور میری دولت اُس کے لئے ووٹر پیدا کر سکتے ہیں۔ غالباً اس کو میری وراثت کا بھی لالچ ہے۔ میں بمبئی کے سب سے زیادہ امیر انسانوں میں سے ہوں۔ میرے پاس بمبئی میں ۱۴ شاندار بلڈنگیں ہیں۔ بے شمار لمیٹیڈ کمپنیوں میں میں حصوں کی مالک ہوں۔ مسز تار کا کے نام سے ہندوستان کے تمام بڑے بڑے شہروں میں میرے ادارے کھلے ہوئے ہیں۔ میں نے کبھی اندازہ نہیں

لگایا کہ مجھے کتنی آمدنی ہے۔ لیکن میں یقین کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ میری آمدنی ۳ لاکھ روپے سالانہ سے کم نہیں۔ یقیناً اس کو امید ہوگی کہ میں اس سے پہلے مرجاؤنگی ــــــ"

لیڈر کے سنجیدہ چہرے پر بہت دیر کے بعد معمولی سا تبسم آیا۔

"سید رؤف! اپنے آپ کو دھوکا مت دو۔ اس نے کانگریس کو .... ۵ روپے کی گرانقدر رقم اس لئے نہیں دی کہ وہ قوم کا سچا ہمدرد اور خیر خواہ ہے۔ بلکہ اس لئے کہ ایسا کرنے سے وہ آئندہ الیکشن میں کانگریس کے ٹکٹ پر اسمبلی کے لئے امیدوار کھڑا ہونے کا خواہشمند ہے۔ اور اگر کانگریس نے اس سلسلے میں اس کی کوئی مدد نہ کی، تو مت سمجھو کہ اس نے کانگریس کو .... ۵ روپے کا چک دیا ہے۔ روپے نہیں دئے۔ میں اس کے پروگرام سے واقف ہوں۔ وہ اس چک کو منسوخ کرکے یہی رقم مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کھڑا ہونے کے لئے مسلم لیگ کو ادا کرنے پر آمادہ ہو سکتا ہے!!

"ہوں!"

"بہرکیف میں خوش ہوں کہ تمہاری تحریک میرے رحم پر ہے۔ تمہارے چندے کا سرچشمہ میرے قبضے میں ہے۔ تمہاری شکست میرے بائیں ہاتھ کا کام ہے۔ میں آنکھ کے ایک اشارے سے .... ۵ روپے کا وہ چک منسوخ کرا سکتی ہوں"

"پھر تم ایک کمزور کردار کے آدمی سے اتنی دلچسپی کیوں رکھتی ہو؟"

"کیونکہ میں ایک طاقتور شخصیت کی عورت ہوں۔ اور ہر اُس انسان کو پسند کرتی ہوں جو میرے پاؤں کی ٹھوکر کو خندہ پیشانی سے برداشت کرکے میرے لئے راستہ چھوڑ دے۔"

"اگر حکیم جی لقمان جی اینڈ کو کے نوجوان پروپرائٹر کو معلوم ہو جائے کہ تم اُس کے متعلق اتنی بُری رائے رکھتی ہو تو کیا پھر بھی وہ تمہارے اشاروں پر رقص کرنا گوارا کرتا رہے گا؟"

باہر سے آواز آئی۔

"نہیں"

دروازہ کھلا۔ حکیم جی لقمان جی اینڈ کو کا نوجوان پروپرائٹر اندر آگیا۔ وہ ایک سیاہی مائل سوٹ میں تھا۔ اُس کی حرکتوں میں ایکٹروں کا سا انداز ہے۔

لیڈر اُٹھ کھڑا ہوگیا۔ مسز تارکا ٹیبل لیمپ کی روشنی میں میز کے پاس کرسی پر بیٹھ گئی۔

"سید رؤف! میں نے کانگریس کو .... ۵ روپے کی گرانقدر رقم مسز تارکا جیسی بدمعاش عورتوں کو نابود کرنے کے لئے دی ہے۔ اور جب تک آپ کو آپ کے اخلاقی جہاد میں پوری کامیابی حاصل نہ ہو جائے، میں کانگریس کو اس سے بھی بڑی بڑی رقمیں دینے کا وعدہ کرتا ہوں۔ مسز تارکا جیسی جھوٹی، مکار، کمینی دغاباز عورتیں!"

مسز تارکا کی نظریں نیچی ہوگئیں۔

لیڈر کے منہ سے ایک لمحہ تک ایک لفظ نہ نکلا۔

"معلوم ہوا ہے کہ آپ دیر سے یہاں ہیں" آخر لیڈر نے کہا، "آپ اندر کیوں نہ آگئے، مسٹر ابراہیم جی!"

"میں برآمدے میں آپ کی باتیں سُن رہا تھا۔ اُس مکار عورت کی باتیں"

"مسز تارکا نے مجھے بتایا ہے کہ آپ اُن کو اپنی کار میں یہاں لائے ہیں"

لیڈر نے کرسی پیش کرتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال تھا کہ میں اُس سے محبت کرتا ہوں" وہ بیٹھنے کی بجائے کرسی کی ٹیک پکڑ کر کھڑا رہا۔

"صرف خیال؟"

"صرف خیال۔ جذبہ نہیں۔ خیال ایک کھلونا ہے جو ہمارے دماغ میں ہمارے ہاتھوں سے بنتا ہے۔ وہ ہماری اپنی آفرینش ہے ہم کو اُس پر پورا اختیار ہوتا ہے۔ ہم جب تک چاہتے ہیں اُس کھلونے کے ساتھ کھیلتے ہیں۔ اور جب اُس سے سیر ہو جاتے ہیں تو اُس کو توڑ پھوڑ کر پھینک دیتے ہیں۔ اور جذبہ فطرت کا ایک تقاضا ہے۔ وہ کبھی کبھی زلزلے کی طرح آتا ہے اور ہمارے جسمانی قوتے کی تمام عمارتوں کو بنیادوں سے ہلا کر اکھاڑ پھینکتا ہے۔ وہ ہماری خودداری کے شیرازے کو اس قدر نقصان پہنچاتا ہے کہ ہم اپنے محبوب کے پاؤں کی ٹھوکر کو خندہ پیشانی سے برداشت کرکے اس کیلئے راستہ چھوڑ دیتے ہیں"

لیڈر نے فتح کے ایک مبہم سے احساس کے ساتھ مسز تارکا کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے بائیں ہاتھ کی کہنی کو میز پر رکھ کر اپنا سر ہاتھ کی ہتھیلی پر رکھے ہوئے بے پروائی سے بیٹھی تھی۔ اُس نے لیڈر کی نظروں کا جواب دینے کی پروا نہیں کی۔

"اور اب آپ کا کیا خیال ہے؟ مسٹر ابراہیم"

"اب میں سمجھ گیا ہوں کہ مسز تارکا ایک بازاری عورت ہے صرف ایک بازاری عورت!"

"مسز تارکا کے اُن الزامات کے متعلق جو انہوں نے تمہارے خلاف قائم کئے ہیں آپ کیا کہتے ہیں؟"

"مسز تارکا نے میرے متعلق حقیقت بیان کی ہے۔ مجھے دو قسم کی زندگیاں بہت مرغوب ہیں۔ محبت کی زندگی اور سیاست کی زندگی۔ ہمیشہ

محبت کی دنیا میں رہنا اور ہمیشہ سیاست کی دنیا میں رہنا۔ دونو زندگیوں کی سب سے بڑی خوبی تلون ہے۔ ایک عورت تسکین نہیں دیتی تو دوسری مل جاتی ہے۔ ایک پلیٹ فارم پسند نہیں آتا تو دوسرا موجود ہوتا ہے۔ یعنی محبت اور سیاست میں ہر ایک چیز جائز ہے۔ محبت اور سیاست میں میرے مخصوص انفرادی نظریوں کو جو ایک مدت سے مذہب اور سوسائٹی کی قید سے مفرور ہیں، پناہ مل سکتی ہے۔ میں شہرت کا دلدادہ ہوں۔ دولت سے اسمبلی اور اسمبلی سے شہرت، بیسویں صدی کی تاریخ میں سب سے زیادہ اُبھرے ہوئے نقوش ہیں۔ میں قدموں کے انہیں نشانوں پر چلنا چاہتا ہوں میں نے کانگریس کو ..... ۵ روپے اس لئے دئے ہیں کہ میں اُس کے ٹکٹ پر اسمبلی میں پہنچ سکوں۔ اسمبلی میں پہنچ کر شہرت صرف چند قدم آگے رہ جاتی ہے۔ کسی نامور پروفیسر سے دس تقریریں، ۵ روپے فی تقریر کے حساب سے لکھوا کر اسمبلی کی سٹیج پر ایکٹ کر دینا کافی ہے۔ اور یہ بھی درست ہے کہ اگر کانگریس اس معاملے میں میری مدد نہ کرتی، تو میں یہی چیک منسوخ کر کے مسلم لیگ کو دے دیتا۔ لیکن اب میں محسوس کرتا ہوں کہ میری منزل کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ مسز تارکا ہے۔ اور میں خوش ہوں کہ انڈین نیشنل کانگریس کا پریذیڈنٹ اخلاقی وجوہات کی بنا پر مسز تارکا کو کچل ڈالنے کا ارادہ کر کے میرے خلاف ہونے والے پراپیگنڈے کے سرچشمے کو نابود کرنے پر آمادہ ہے میری دولت کے خزانے اُس کے لئے کھلے ہیں۔"

لیڈر کے ہونٹوں پر ابراہیم کی گفتگو کے فصیح اور غیر مبہم انداز سے تبسم آگیا۔

"میں مسز تارکا کو صرف یہ بتانے آیا تھا کہ میں جا رہا ہوں۔"

"کیا آپ مجھے کچھ کہنے کی اجازت نہیں دیں گے؟ مسٹر ابراہیم۔"

"کہئے۔"

"روشن پہلو کے علاوہ ہر ایک چیز کا ایک تاریک پہلو بھی ہوتا ہے۔ میری تحریک کا بھی۔"

"کیا؟"

"مسز تارکا تباہ ہو جائیں گی۔"

"بڑا اچھا ہوگا۔"

"نہیں، ابراہیم یہ انسانیت سے بعید ہے۔"

"ہونے دو۔"

"میرے پاس ایک تدارک ہے۔"

"کیا؟"

"شادی۔"

"کس کی شادی؟ کس کے ساتھ شادی؟"

"مسز تارکا کے ساتھ تمہاری شادی۔"

دردناک سسکیوں نے دونو کو یکلخت اپنی طرف کھینچ لیا۔ مسز تارکا میز پر اپنے بازو میں اپنا چہرہ چھپائے رو رہی تھی۔ ایک لمحہ دونو اُس کی طرف حیران نظروں سے دیکھتے رہے۔ پھر لیڈر آہستہ آہستہ جا کر مسز تارکا کے پاس کھڑا ہو گیا۔ ابراہیم کرسی کو مناسب جگہ پر کر کے اُس پر بیٹھ گیا۔ مسز تارکا کی سسکیاں زیادہ گہری ہوتی جا رہی تھیں۔ لیڈر نے دلجوئی کے لہجے میں کہا۔

"ہم کو تمہارے ساتھ ہمدردی ہے، مسز تارکا۔"

مسز تارکا نے ضبط کی کوشش چھوڑ دی۔

"میں مجبور ہوں، مسز تارکا۔ ورکنگ کمیٹی فیصلہ کر چکی ہے ہمیں اجتماعی مفاد کے لئے انفرادی قربانیاں برداشت کرنا پڑتی ہیں۔ مجھے تمہارے مستقبل کا پورا خیال ہے، مسز تارکا۔ میں کوشش کر رہا ہوں کہ ہمارے اصلاحی اقدام کے بعد تمہیں کوئی تکلیف نہ ہو۔"

مسز تارکا نے اپنا سر اوپر اُٹھایا اور بھیگی ہوئی سُرخ آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔

"فریب خوردہ انسان! کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ تیری تحریک کی کامیابی مجھ کو رُلا رہی ہے؟"

"تم کو ناکامی نے پاگل بنا دیا ہے، مسز تارکا!"

"میرے رونے کی وجہ تیری کامیابی نہیں کیونکہ مجھے یقین ہے کہ تُو ابراہیم کی مدد سے بھی کامیاب نہیں ہو سکتا ـــــ میری رونے کی وجہ ـــــ میرے رونے کی وجہ ـــــ"

جذبات نے اس کی زبان بند کر دی۔ اس نے پھر اپنا چہرہ اپنے بازو میں چھپا لیا۔

"میرے رونے کی وجہ کچھ اور ہے!"

"کیا؟"

"آج ـــــ زندگی میں ـــــ دوسری دفعہ ـــــ مجھے ـــــ شادی کی خواہش محسوس ہو رہی ہے ـــــ معلوم نہیں ـــــ کیوں معلوم ـــــ نہیں ـــــ کیوں"

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"تمہاری شادی ہو جائے گی، مسز تارکا!"

"مسز تارکا نہیں، عزیزہ۔ میں عزیزہ ہوں۔ مجھے عزیزہ کہو، روفی، عزیزہ کہو مجھے، روفی، روفی ـــــ"

"میں شادی کرنا چاہتی ہوں ـــــ ابراہیم کے ساتھ ـــــ"

لیڈر کا حوصلہ عود کر آیا۔ اُس نے کہا۔

"حکیم جی لقمان جی اینڈ کو کا نوجوان پروپرائٹر تم سے شادی کرنے کے لئے تیار ہے، عزیزہ!"

ابراہیم چونک پڑا۔ "لیکن ——"

مسز تارکا نے اپنا سر اُٹھا کر کہا۔ "لیکن میں اُس کے ساتھ شادی نہیں کر سکتی۔"

لیڈر نے پوچھا۔ "کیوں؟"

"وہ میرا بیٹا ہے۔"

"عزیزہ!"

"میرا بیٹا اور تمہارا بیٹا!"

ابراہیم کھڑا ہو گیا۔ لیڈر لڑکھڑا کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ مسز تارکا نے اپنا چہرہ اپنے بازوؤں میں چھپا لیا۔

"۲۰ سال ہوئے ایک دن مجھے معلوم ہوا کہ میں تمہاری شہوانی بدعنوانیوں اور اپنی معصوم غلطیوں کا بوجھ اُٹھائے پھرتی ہوں۔ تمہارے اصرار پر میں اپنے ماں باپ کو چھوڑ کر تمہارے ساتھ یہاں آ گئی۔ بیکاری کے دن تھے۔ عدم تعاون کا زمانہ تھا۔ بیکاری نے تم کو جیل کی روٹیوں کی طرف دھکیل دیا۔ عدم تعاون نے تم کو لیڈر بننے کا خواہشمند بنا دیا۔ تم دو سال کے لئے قید ہو گئے۔ میں اکیلی رہ گئی۔ اجنبی اور وسیع دنیا میں اکیلی —— نہیں۔ اکیلی نہیں —— ہم دو —— قانون کے مجرم۔ مذہب کے گناہگار —— لیکن میں کب تک چھپتی پھرا کرتی۔ میں نے بمبئی میں رئیسوں کے سب سے بڑے سوداگر حکیم جی لقمان جی کو اپنی ساری کہانی سُنا دی۔ لاوارث سوداگر کو مجھ سے ہمدردی ہو گئی۔ ہسپتال میں اُس نے میرے تمام اخراجات برداشت کئے۔ میں نے اپنے جگر کے ٹکڑے کو ۱۰۰۰۰ روپے میں اُس کے ہاتھ بیچ دیا۔ ۱۰۰۰۰ روپے سے شروع کی ہوئی بزنس ۳۰۰۰۰۰ روپے سالانہ کی آمدنی تک پہنچ گئی —— ۱۰ دن کا معصوم بچہ بڑا ہوتے ہوتے ۲۰ سال کا ہو گیا۔ حکیم جی لقمان جی اینڈ کو کا نوجوان پروپرائٹر ابراہیم۔"

بےچین، روح فرسا خاموشی کمرے میں چھا گئی۔

آخر لیڈر نے محسوس کیا کہ زیادہ لمبی خاموشی واقعات کو اُس کے اور بھی زیادہ خلاف کر دے گی۔

"ابراہیم ——"

ابراہیم نے کرسی کی بیک پر ایک مضبوط گرفت کے ساتھ اور ایک انتہائی تُند انداز میں کہا۔

"سید رؤف! تم ایک معصوم ہستی کو گناہوں کے غار میں دھکیلنے کے ذمہ دار ہو۔ تم سے انتقام لیا جائیگا۔"

"ابراہیم! تم اتنی جلدی ایک آوارہ عورت کی باتوں پر ——"

"کمینے سید! اب جھوٹ بول کر اپنے جرم میں اضافہ مت کر۔ مجھے معلوم ہے کہ میں حکیم جی لقمان جی کا بیٹا نہیں ہوں۔ میں کسی غیر معلوم عورت سے خریدا گیا تھا۔ اور پھر تو نے خود اپنے جرم کا اقرار کیا ہے۔ تھوڑی دیر ہوئی تو اُس کرسی کے بازوؤں پر ہاتھ رکھ کر مسز تارکا پر جُھکا ہوا تھا۔ اور کہہ رہا تھا۔ —— عزیزہ! تم کیوں آ گئی ہو۔ ۲۰ سال سے میں تم کو بھلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ تم نے پھر زخم ہرے کر دئے۔ وغیرہ وغیرہ۔ میں نے اس جذباتی سین کی فوٹو لے لی ہے۔ کانگریس کو ۵۰۰۰۰ روپے کا جو چیک دیا گیا تھا۔ منسوخ کیا جاتا ہے۔ اب یہ ۵۰۰۰۰ روپے تیرے خلاف پراپیگنڈہ کرنے میں صرف ہوں گے۔ ہندوستان کے تمام اخباروں میں اس فوٹو کے ساتھ تیرے مکروہ کردار کے متعلق مضامین شائع کئے جائیں گے۔"

لیڈر کا سر صوفے کی بیک پر گر پڑا۔

مسز تارکا اپنا سر اُٹھائے ابراہیم کی گفتگو سُن رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو خشک ہو گئے تھے۔

ابراہیم نے مسز تارکا کی طرف ملائمت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"مسز تارکا اب تم خوش ہو؟"

"نہیں"

"کیوں؟"

"کیونکہ تم مجھے مسز تارکا کہتے ہو۔ ماں نہیں کہتے۔"

"میں اپنی ماں کی تلاش میں نہیں تھا۔ تم یہ کہانی نہ سناتیں تو اچھا تھا۔"

"کیا کہتے ہو ابراہیم؟"

"تم نے میری زندگی دشوار کر دی ہے۔ اب مجھے اسمبلی کے لئے ایک ووٹ بھی نہیں مل سکیگا۔"

وہ باہر چلا گیا۔

"ابراہیم! ابراہیم!" وہ چلاتی ہوئی اُس کے پیچھے بھاگی لیکن دروازے کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔

"سید!"

وہ ابھی تک صوفے کی بیک پر سر رکھے ہوئے پڑا ہے۔ اُس کی آنکھیں بند ہیں۔

"سید! تیرا چلایا ہوا تیر اب میرے دل کی گہرائیوں سے بھی آگے چلا گیا ہے۔ اور درد کی تمام شدتوں کو فتح کر لینے کے بعد آج ایک دفعہ پھر مجھے درد کی کسک محسوس ہو رہی ہے —— لیکن میں پھر بھی مطمئن

ہوں میرے سینے میں انتقام کی آگ بھڑک بھڑک کر سرد ہوگئی ہے۔ میں نے اپنی پیاس بجھالی ہے ـــــ سُن اسید! سُن! میری راحت کو چھین لینے والے! میری تسکین کو برباد کر دینے والے! میں نے بھی تیری شہرت، تیری عظمت، اور تیری عزت کو خاک میں ملا دیا ہے ـــــ"

وہ اُسی طرح بے جان بے حرکت پڑا ہے۔

"کل الفنسٹن کالج کلکتے کے الفنسٹن ہوسٹل سے، تیری لڑکی ایک ہندو لڑکے کے ساتھ بھاگ کر میرے پاس آئی۔ آج صبح ۱۱ بجے میں نے اُن کی سول میرج کروا دی ہے۔"

ـــــ مسز تارکا باہر چلی گئی۔

ایک زلزلے کی طاقت کے صدمے نے اُس کی آنکھیں کھول دیں۔ کمرے کے اندر زرد زرد روشنی میں نیلا نیلا غبار اُڑ رہا تھا۔ کمرے کی تمام چیزیں ٹوٹ پھوٹ کر اس زردی مائل نیلے غبار میں تیرتی پھر رہی تھیں۔ ہوتے ہوتے زرد روشنی نیلے غبار میں مدغم ہوگئی۔ فضا میں ازل کی صبح کا دھندلکا نمودار ہوگیا۔ ہر چیز خلا کی غیر محدود وسعت میں حلول ہوگئی۔ صرف ایک چیز نظر آرہی تھی ـــــ دُور ـــــ ہزاروں میل کے فاصلے پر ـــــ مدھم مدھم ـــــ پانس کے دیوں کی روشنی میں ایک ہندو دوشیزہ کا چہرہ ـــــ صرف چہرہ ـــــ اور کچھ نہیں۔

انور

آواگون

(۱)

کل جو آدھی رات کو دیکھا ہے میں نے ہم نشیں
دیکھتا کیا ہوں کہ حلقے ظلمتوں میں، نور کے
پھر یہ دیکھا چند روحیں جیسے بل کھاتی ہوئی
چاند کی جیسے شعاعیں عالمِ ظلمات میں
کچھ بگولے روشنی کے کچھ شرارے نور کے

تجھ سے وہ کیوں کر کہوں، کب آئے گا تجھ کو یقین
کھا رہے ہیں دمبدم دُھندلی فضا میں پیچ سے
دائروں میں جا رہی ہیں رقص فرماتی ہوئی
اس طرح تھیں چند لہریں اس اندھیری رات میں
پھر رہے تھے کوندتے میری نظر کے سامنے

(۲)

یہ تھیں روحیں قالبِ انساں سے جو ہو کر جدا
حلقۂ ظلمات میں کھوئی سی گھبرائی ہوئی
لیکن ان کو آسماں پہ راستہ ملتا نہ تھا

ڈھونڈتی پھرتی تھیں ایوانِ سکوں کا راستہ
اڑ رہی تھیں آسماں کی سمت لہرائی ہوئی
روکتی تھیں ظلمتیں ان کو، دباتی تھی ... ہوا

طاقتِ پرواز تھی ان میں، مگر مجبور تھیں
آسمانوں تک پہونچنے سے یہ سب معذور تھیں

(۳)

تو بھی سمجھا، راز کیا تھا؟ آ بتاؤں ہم نشین!
جسم گو یہ چھوڑ دیتی ہیں فنا ہوتی نہیں
اس فضا میں رات دن چکر لگاتی ہیں یونہیں
ناچتی تھیں رات کو جو صورتِ برق و شرار

اصل میں روحیں فضاؤں سے کہیں جاتی نہیں
گردرہتی ہیں کبھی ہم سے جدا ہوتی نہیں
اک نئے قالب میں جبتک لوٹ کر آتی نہیں
اصل میں "یہ آزاد روحیں" تھیں قطار اندر قطار

تو یہ کہتا ہے کہ روحیں لوٹ کر آتی نہیں
میں یہ کہتا ہوں یہ دنیا سے کہیں جاتی نہیں

جلال ملیح آبادی

کاکڑاں کا تیلی

اڑہائی روپے! مولو نے طنز سے سر ہلا کر اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔ ان نگاہوں سے جو گویا کہہ رہی تھیں، کہ کمبخت تانگے والے کی عقل شائد ٹھکانے نہیں رہی۔

ابھی مشکل سے آٹھ ساڑھے آٹھ کا وقت ہوگا، لیکن دن پہاڑ سا نکل آیا تھا۔ سورج عین سر پہ معلوم ہوتا تھا۔ گرمی اتنی تھی کہ دم گھٹا جاتا تھا۔ گرد کی ہلکی سی دھند چاروں طرف چھائی ہوئی تھی۔ اور اس وجہ سے شعاعیں اگرچہ سیدھی نہ پڑتی تھیں، تو بھی جسم کے برہنہ حصوں میں نوکیں سی چبھتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔

مولو نے اپنی بڑی سی پگڑی کو ٹھیک کیا ——— جسے اس کی بیوی نے رات ریٹھوں کے پانی سے دہویا تھا۔ اور چاولوں کی کنجی کو پکا کر کلف دیا تھا۔ اور جسے رحماں اور لہراں، اس کی دونوں بیٹیوں نے دونوں طرف سے پکڑ کر آنگن میں چکر لگا کر سکھایا تھا ——— پھر اس نے اپنی لمبی سفید ڈاڑھی پر جو ہونٹوں کے پاس سے پیلی ہوگئی تھی۔ ہاتھ پھیرا، گٹھڑی کو بائیں کندھے پر کرکے، دریں تہمد کو ذرا سا جھٹکا دیا اور چل پڑا۔

بیباں، اس کی بیوی نے سامنے جاتے ہوئے تانگے کے پیچھے اڑتی ہوئی دھول میں آنکھیں جما دیں۔ اور بولی "اڑہائی روپے، اس سے تو پندرہ دن تک گھر کا گذارہ چل سکتا ہے، کچھ نہیں تو رحماں اور لہراں کے دوپٹے آسکتے ہیں، یا پھر میرے ننھے چراغ کی کئی کرتیاں بن سکتی ہیں"

اور اس نے گود میں لئے ہوئے ابلی ابلی، سوجی سوجی آنکھوں والے اپنے کالے سیاہ لڑکے کو محبت سے چوم لیا۔

جوتے کے ساتھ گرد اڑ کر مولو کے تہمد پر پڑ رہی تھی۔ رات اس کی بیوی نے اس کے کپڑوں کو دہویا اور نیل دیا تھا ——— جو شائد رات کی تاریکی میں زیادہ دے دیا گیا تھا۔ کیونکہ تہمد کی سفیدی میں ہلکی سی نیلاہٹ صاف دکھائی دے رہی تھی۔ اور جوں جوں گرد پڑتی تھی اور بھی نمایاں ہو رہی تھی۔

مولو نے پھر ایکبار تہمد کو جھٹکا دیکر اسے ذرا اوپر اٹھا کر ٹھونس لیا۔ ان سلے تانگے والوں نے سڑک کا ستیا ناس کر دیا ہے، مٹی میدہ بن گئی ہے، اور اس نے بیوی سے اور اس کے پیچھے چلی آنے والی دونوں لڑکیوں اور سات آٹھ سال کے بچے سے کہا کہ وہ سب سڑک چھوڑ کر مینڈھ مینڈھ ہو کر چلیں۔

⁂

لیکن وہاں تو صرف تانگے ہی چلتے تھے۔ جب مولو تین چار میل چل کر بھیلووال کے پاس پہنچا۔ جہاں ایک لاری بھی چلتی تھی۔ اور بکریوں اور بھیڑوں کا ایک ریوڑ "میں میں، بھیں بھیں" کرتا ہوا قصبہ سے نکلا، اور رات بھر باڑے میں بند رہنے کے بعد چنچل اور شوخ بکریاں، جو ابھی مائیں نہ بنی تھیں اور جن کے تھن اتنے بھاری نہ تھے کہ ان کے نیچے تھیلی لگانے کی ضرورت پڑے اور زندگی کی تلخ حقیقتوں سے نا آشنا میمنے، قلانچیں بھرنے لگے تو مولو کو اس میدے کی حقیقت کا احساس ہوا۔ گرد اس طرح اڑی کہ اس کے لئے آنکھ کھولنا اور مڑ کر اپنے بیوی بچوں کو دیکھنا مشکل ہو گیا۔

جب طوفان کچھ تھما اور بکریوں اور بھیڑوں کی آوازوں کو دباتی ہوئیں چرواہوں کی فحش گالیوں کی کرخت آوازیں حد سماعت سے پرے چلی گئیں تو مولو سڑک کو پار کرکے، دوسری طرف گیہوں کے کٹے ہوئے کھیت میں جا کھڑا ہوا گٹھڑی اس نے اتار کر زمین پر رکھ دی، اور تہمد اور قمیص کو اچھی طرح جھٹک کر اس نے سر سے پگڑی اتاری اور اسے اچھی طرح جھاڑا۔ قمیص کے دامن کو الٹا کرکے اس سے منہ پونچھا۔ پھر پگڑی باندھی اور اپنے بیوی بچوں کو آواز دی۔ کہ وہ بھی سڑک کے اس کنارے آجائیں۔

گرد بائیں طرف زمین اور آسمان کے درمیان جاکر معلق ہوگئی تھی۔ جوں جوں ریوڑ آگے جاتا تھا۔ اس کی لکیر بڑہتی جاتی تھی ——— اس بڑہتی ہوئی لکیر کی طرف دیکھ کر اور دل ہی دل میں چرواہوں کو کئی فحش گالیاں دیکر آخر مولو نے کہا — "بدتمیز، نہیں جانتے کہ راستے میں شریف لوگ جارہے ہیں۔ ذرا خبرداری کردیں، کہ سبھی ایک طرف ہو جائے بس اڑے چلے جاتے ہیں، جیسے کوئی مہم سر کرنے جا رہے ہوں ——— حرام زادے ——— اور اس نے اپنی مونچھوں کو دوبارہ پیار دیتے ہوئے ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرا۔

شریف سے مولو کا کیا مطلب تھا؟ شائد یہ بات اسے خود بھی معلوم نہ تھی۔ وہ کاکڑاں کا تیلی تھا۔ گاؤں کے اس کنارے، جہاں بڑ کا ایک مہیب درخت بڑھ کر آدھے جوہڑ کو اپنے سایہ میں لے چکا تھا، اس نے ایک چھوٹا سا کولہو لگا رکھا تھا۔ بارش ہوتی، تو جوہڑ کا پانی اس کے کولہو کے قریب تک آجاتا، بارش کی وجہ سے راستہ مسدود ہو جاتا۔ ٹانگیں گھٹنوں تک کیچڑ میں دھنس جاتیں اور جوہڑ کے کنارے لگے ہوئے کوڑی کے ڈھیروں کی عفونت بڑ کے سایہ کی نمی سے، جیسے وہیں جم کر رہ جاتی، لیکن اپنی زندگی کے پچپن سال مولو نے اسی کاکڑاں میں گذارے تھے، گاؤں سے بیس میل پرے کیا ہوتا ہے، اس کی اسے کوئی خبر نہ تھی۔ زندگی میں شائد دو چار ہی ایسے موقع آئے تھے، جب اسے ایسے دھلے ہوئے کپڑے پہننے میسر ہوئے ہوں ——— عید کے موقع پر وہ یقیناً ہر سال کپڑے بدلا کرتا تھا۔ لیکن اس کا کپڑے بدلنا یہی ہوتا۔ کہ ننگے بدن رہنے کی بجائے وہ اس دن قمیص بھی

پہن لیتا یا بیباں دھیلے کے ریٹھے لیکر انہیں مل ڈالتی ـــــ ورنہ اس کی عمر تو تیل میں سنے کالے، چکٹ کپڑوں میں گذر گئی تھی۔ جس طرح پاس رہتے ہوئے بھی جوہڑ کے غلیظ پانی اور اس کے کنارے لگے ہوئے کوڑی کے ڈھیروں میں اس کے لئے کوئی عفونت نہ رہی تھی، اسی طرح تیل اور پسینے سے تر گندے، میلے، خستہ اور بوسیدہ کپڑوں کے لئے اس کا احساس بالکل مر گیا تھا۔ اور رہی گردو تیل کے کام سے اس گاؤں میں گذر اوقات کی صورت نہ دیکھ کر اس نے وہیں کولہو کے ایک طرف چاک لگا رکھا تھا۔ جہاں وہ گھڑے، کوزے، ڈولے، دوریاں اور مٹکے بنایا کرتا تھا ـــــ ذات سے وہ کمہار تھا یا تیلی اس بات کا اسے خود بھی علم نہ تھا۔ اپنے دادا اور پھر اپنے باپ کو اس نے یہی کام کرتے دیکھا تھا۔ اور جب سے اُس نے ہوش سنبھالا تھا۔ وہ یہی کئے جا رہا تھا، جب اس کے ہاتھ تیل میں نہ ہوتے تو مٹی میں ہوتے۔ رہی تعلیم سو قرآن پاک کی کچھ آیتوں کے علاوہ، جو وہ بڑی محویت سے غلط تلفظ کے ساتھ پڑھا کرتا تھا اس نے وہ سب گالیاں سیکھی تھیں، جو اس کے دادا، پھر باپ اور پھر بڑے بھائی دیا کرتے تھے ـــــ لیکن آج اس مٹی اور اس ماحول کے خلاف، جس میں وہ پیدا ہوا، پلا اور پروان چڑھا تھا، اس کے دل میں جو ایسا نفرت کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ اور وہ ان ننگے بدن، غلیظ تہمدوں میں ملبوس چرواہوں کو بدتمیز سمجھنے لگا تو اس کی وجہ تھی۔ وہ اپنے اس چھوٹے بھائی کے لڑکے کی شادی میں شامل ہونے کے لئے جا رہا تھا، جو لاہور میں رہتا تھا۔ اور دیہاتیوں کی نظروں میں شہر والے شریف یعنی باعزت ہوتے ہیں۔ اور چونکہ وہ شریف آدمی کے لڑکے کی شادی میں جا رہا تھا، اسلئے خود بھی شریف تھا۔

...

دبیرو کے نزدیک ایک کھال پانی سے بھری ہوئی مزے سے رینگ رہی تھی۔ مولو نے اسے پار کیا، پھر گٹھڑی رکھ کر بچے کو ہاتھ بڑھا کر پکڑ لیا۔ اور اور اس کی بیوی چھلانگ مار کر ادھر آ گئی۔ رحماں پہلے خود آ گئی اور پھر اس نے فجے کو پار آنے میں مدد دی، لیکن نہراں کے جوتے کی کیلی ابھر آئی تھی۔ اور اس کی دائیں ایڑی میں زخم سا ہو گیا تھا۔ دھرتی گرم لوہے کی طرح تپ رہی تھی۔ اسلئے وہ ننگے پاؤں چلنے کا حوصلہ نہ کر سکی تھی۔ اور ایڑی اُٹھائے، اپنے دوپٹے سے گردن کے پسینے کو پونچھتی ہوئی چلی آ رہی تھی ـــــ اور بہت پیچھے رہ گئی تھی۔

اری تو پیچھے ہی لنگتی چلی آ رہی ہے۔ چلا نہیں جاتا تجھ سے؟ اور لمحہ بھر کے لئے اپنی شرافت کو بھول کر اس نے ایک فحش گالی اپنی اس لڑکی کو دے ڈالی۔

"مجھ سے چلا نہیں جاتا۔ میخ نکل آئی ہے" اس نے رونکھی آواز میں کہا۔

مولو نے گٹھڑی اُٹھا کر کنارے کے ایک جامن کے درخت کے نیچے رکھ دی۔ اور بولا "لا ادھر میں اس میخ کو ٹھیک کر دوں۔ ابھی گیارہ بارہ میل ہیں جانا ہے"۔

بیباں اپنے آنچل سے اپنے آپ کو ہوا کرتی ہوئی وہیں درخت کے نیچے گھاس پر بیٹھ گئی اور ننھے کو دودھ پلانے لگی۔

رحماں نے کھال کے پانی سے منہ دھو لیا۔ اور گیلا ہاتھ فجے کے منہ پر پھیرا۔ اور نہراں نے وہاں پہنچ کر جوتے اپنے باپ کو دے دئے اور خود لنگڑاتی لنگڑاتی آ کر اپنی ماں کے پاس بیٹھ گئی۔

مولو نے میخ کو دیکھا۔ اس کی پتلی سی نوک، جس کا زنگ زخم کی نمی سے صاف ہو گیا تھا، کسی ناگن کی طرح سر اُٹھائے چمک رہی تھی۔ کہیں سے ایک اینٹ کا ٹکڑا ڈھونڈ کر مولو نے اس کو توڑ دیا۔ اسے کند کر دیا۔ پے در پے چوٹوں سے اسے بہت زیادہ اندر کو دھکیل دیا۔ اور پھر منہ پر پانی کے چھینٹے مار کر تہمد کی اُلٹی طرف سے منہ پونچھتا ہوا، کچھ لمحے سستانے کے لئے اپنی بیوی کے پاس آ بیٹھا۔

"اڑھائی روپئے" اس کی بیوی نے کہا "جیسے ہمارے گھر روپوں کی بارش ہوتی ہو، اور پھر دیکھو، اپنی تو جیسے ہو سو ہو، وہاں جائیں گے تو کیا خالی ہاتھ جائیں گے حسن خاں کے بچوں کیلئے بھلا کچھ نہ لیجائیں گے"۔

یہ حسن خاں، جو اپنی زندگی کے پینتیس برس تک گاؤں میں، صرف حسنو کہلاتا رہا۔ لاہور میں ایشور سنگھ گورنمنٹ کانٹریکٹر کا میٹ تھا۔ جب لوہو کے پاس نہر بنی اور ٹھیکیدار ایشور سنگھ ادھر آیا تو نہ جانے کس طرح (مولو آج تک اس بات کو نہیں سمجھ سکا) حسنو جا کر اس کے مزدوروں میں شامل ہو گیا ـــ چھ آنے روزینہ۔ پھر ٹھیکیدار ایشور سنگھ نے اس کے کام سے خوش ہو کر اسے پانچ روپے مہینے پر میٹ بنا لیا۔ اور پھر آٹھ کر دئے، اور جب اس کام کو ختم کر کے ٹھیکیدار ایشور سنگھ لاہور چلا گیا۔ تو اپنے اس معتبر میٹ کو بھی ساتھ ہی لے گیا۔ گاؤں میں ایکبار جب وہ آیا، تو اس نے چوڑے پائنچوں کی شلوار، بوسکی کی دھاری دار قمیص، اور سر پر گلے دار صافہ پہن رکھا تھا۔ جس کا طرّہ ایک پھول کی طرح کھلا ہوا تھا ـــ اسی دن سے حسنو، حسن خاں بن گیا تھا۔ اور اسی کے لڑکوں کے لئے مٹھائی لیجانے کا خیال بیباں کو تھا۔

اس جامن کے سایے میں بیٹھے بیٹھے اپنی تہمد کی گانٹھ سے مولو نے سب پیسے نکالے، اکثر پر تیل اور مٹی کی کالی تہ جم گئی تھی، اور اگرچہ زمین سے نکال کر تہمد میں باندھنے سے پہلے اُنہیں اچھی طرح دھو لیا گیا تھا۔ تو بھی تہمد کا وہ حصہ، جس میں اس نے اُنہیں باندھا تھا۔ کالا ہو گیا تھا۔

اگرچہ وہ گھر سے اُنہیں گن کر لایا تھا۔ پھر بھی گھاس پر تہمد کا ایک پلّا بچھا کر اس نے اُنہیں دوبارہ گنا۔ چار روپے اور کچھ آنے تھے، اور یہ رقم اس نے بڑی مشکل سے پیسہ پیسہ کر کے دو سال میں جمع کی تھی۔ جونہی حسنو کا لڑکا آٹھ سال کا ہوا اور اس کی سگائی ہوئی کہ انہیں اسبات کی فکر ہوئی، کہ اس کا نکاح بس اب نزدیک ہی ہے، اس لئے اُنہیں کچھ نہ کچھ پس انداز کرنا چاہئے۔

اور چونکہ حستو نے یہ بات واضح کر دی تھی کہ لڑکے کی شادی وہ اب لاہور ہی میں کریگا، اس لئے دو سال سے وہ اس کے بیاہ کی بات سوچ رہے تھے۔ پچھلے برس وہ صرف دو روپے بچا سکا تھا۔ اور اس سال صرف یہ دو روپے اور کچھ آنے اور ان دو برسوں میں اس نے محنت بھی کم نہ کی تھی۔ جتنی سرسوں وہ حاصل کر سکتا تھا، اس نے حاصل کی تھی۔ اور جتنا تیل ارد گرد کے پانچ دس گاؤں میں بیچا جا سکتا تھا، اس نے بیچا تھا۔ اور اپنی سپلائی کو بڑھانے کیلئے اس نے سرسوں میں توریا ملانے سے بھی پرہیز نہ کی تھی۔ پھر فصل کے دنوں میں اس نے کٹائی کا کام بھی کیا تھا۔ اور پیروں کے میلوں میں گھڑوں اور مٹکوں کی دوکان بھی لگائی تھی لیکن اس پر بھی وہ گذشتہ دو برس میں یہی کچھ بچا سکا تھا۔ اور بے سالن کی سوکھی روٹی سے زیادہ انہیں کبھی کچھ میسر نہ ہوا تھا ـــــ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس شادی کے خیال سے اس نے اپنی بیوی اور بیٹیوں کو گبرون کی ایک ایک قمیص اور دریس کی ایک ستھنی سلوادی تھی۔ خود بھی ایک تہمد اور صافہ لیا تھا۔ اور فجے کو بھی چھوٹا سا تہمد لے دیا تھا۔ لیکن ان سب کیلئے تو وہ بھیلو شاہ کا قرضدار تھا۔ جس سے اس نے وعدہ کیا تھا کہ اگلے سال وہ جتنا تیل نکالے گا، سب اس کی دوکان میں ڈال دیگا۔

وہیں جامن کے نیچے بیٹھے بیٹھے مولو حساب لگانے لگا۔ "اگر وہ اٹاری سے جاکر چڑھیں تو چار چار آنے تو موٹر کے لگیں گے۔ اس طرح ساڑھے چار ٹکٹوں کے . . . .

لیکن بیباں نے اس کی بات کاٹ کر کہا "ساڑھے چار کیسے؟ فجے کا ٹکٹ کس طرح لگ سکتا ہے، ابھی کل کا تو بچہ ہے، تم اسے گود میں اُٹھا لینا۔"

"یہ موٹر والے ایک ہی شیطان ہوتے ہیں، اگر مانگیں گے تو،" مولو نے کہنا شروع کیا۔ "سُنا ہے تین سال سے بڑے کا ٹکٹ لگتا ہے۔"

"ہاں لگتا ہے" بیباں بولی "وہ نہ مانگیں تو بھی تم دے دینا۔"

"تو خیر،" مولو بولا "ایک روپیہ ہی سہی، پھر لاہور شہر ہے، وہاں حستو کی شان ہوگی پیدل گھسٹتے ہوئے تو اس کے ہاں نہ جایا جاسکیگا۔ پڑوسی نہ کہیں گے۔ کیسے بھکمنگے رشتے دار ہیں۔ تین چار آنے تانگے پر بھی نہیں خرچ کر سکے۔"

بیباں کو خود بھی اس بات کا یقین تھا۔ اور اپنے بچوں کو بھی اس نے یہی یقین دلایا تھا۔ کہ چچا کے گھر سے انہیں بہت کچھ ملیگا۔ اس لئے اس نے کہا "ایک روپیہ کی مٹھائی حستو کے بچوں کے لئے بھی لے جانا۔ جب وہ ہمارے بچوں کو اتنا کچھ دیں گے تو ہم کس طرح خالی ہاتھ جائیں گے۔"

اور وہیں بیٹھے بیٹھے انہوں نے حساب لگایا کہ اس طرح سب خرچ نکال کر ان کے پاس بارہ آنے ایک روپیہ بچ جائیگا۔

تب ہی لہراں نے اچانک کہا۔ "میرے پاؤں میں چھید ہو گیا ہے، میرا جوتا گھس گیا ہے، مجھے ایک جوتا لے دینا۔"

رحماں بولی "مجھے ایک چنری کی ضرورت ہے، چچا کی لڑکی کے سامنے کیا میں یہ پھٹی ہوئی چنری پہنونگی۔"

فجے نے کہا "ابا ہم تو بوٹ لیں گے۔"

"چلو ہٹو" ـــــ بیباں نے ایک جھڑکی دی۔ "سات آٹھ دن وہاں رہنا ہے، تو کیا اپنے پاس ایک کانی کوڑی تک نہ رکھیں گے۔ پھر گرمی کی بہار ہے راستے میں شربت لسی کی ہی ضرورت پڑ جاتی ہے۔"

.. ..

لوپوکے کے پاس انہیں ایک تانگہ جاتا ہوا ملا۔ لیکن جب اس نے اٹاری کے پانچ پانچ آنے فی سواری مانگے۔ تو مولو نے کچھ جواب نہ دیا۔ تہمد کو پھر اوپر ٹھونس کر، پگڑی کے شملے سے گردن اور مُنہ کا پسینہ پونچھکر اور گٹھڑی کے بوجھ سے آہستہ آہستہ دبنے والی گردن کو اٹھا کر وہ چل پڑا۔

لہراں اور فجے نے ایک بار کہا "ابا تانگہ"

کڑک کر مولو نے اسے چپ کرا دیا۔ بیباں نے بھی بچے کو کندھے سے لگا کر مُنہ میں انگلی ڈال کر اسے بہلاتے ہوئے . . . . او . . . . کرنا شروع کر دیا۔ اور جب اس پر بھی بچہ نہ مانا۔ تو قمیص کے بٹن کھول کر اپنی چھاتی نکال کر اس کے منہ میں دیدی۔

.. ..

سڑک بالکل کچی تھی ـــــ سڑک تو اسے نہ کہا جا سکتا تھا۔ کسی زمانے میں وہاں ضرور سڑک ہوگی۔ لیکن اب تو اس کی وسعت کو دیکھ کر اس پر گرد کے کسی ایسے دریا کا گمان ہوتا تھا۔ جس کے دونوں کنارے وسیع ہوتے ہوتے ارد گرد کی ویران زمین سے جا ملے تھے۔ ہاں دونوں طرف پر اللہ کے بے سود، ٹیڑھے ٹیڑھے، سوکھے اور بدصورت درخت اس سڑک کے وجود کا پتہ دیتے تھے۔ اور کہیں کہیں کوئی ببول کا درخت، اپنی کانٹے دار شاخوں کو سڑک پر پھیلائے ہوئے تھا۔ کہ اگر کہیں گرمی کی تمازت سے جلتا ہوا کوئی شخص سایے میں آنے کی کوشش کرے۔ تو اس کی پگڑی اتر جائے یا اس کا چہرہ زخمی ہو جائے۔

لہراں کے جوتے کی میخ پھر نکل آئی تھی۔ اور زخمی ایڑی کو وہ اور بھی زخمی کر رہی تھی۔ اس لئے اس نے جوتے ہاتھوں میں اُٹھا لئے تھے۔ گرد دہکتی ہوئی راکھ کی طرح جل رہی تھی۔ اور بار ہا جب گرد میں ٹخنوں تک پاؤں میں دھنس جاتے تو سارے جسم میں ایک جلن کی لہر سی دوڑ جاتی۔ لیکن میخ کی چبھن سے ٹیس کی جو لہر دوڑتی تھی۔ وہ شائد جلن کی اس لہر سے کم تکلیف دہ تھی۔ لیکن وہ چلی جا رہی تھی۔ پر اس کے باوجود وہ سب سے پیچھے تھی۔

اور مولو اب بھی سب سے آگے تھا۔ اتنی عمر ہو گئی، مولو کبھی اس سڑک پر نہ آیا تھا۔ اگر اسے معلوم ہوتا کہ یہ سڑک اتنی ویران اور اتنی واہیات ہے، تو وہ کبھی اس طرف کا رُخ نہ کرتا۔ خصوصاً اس وقت جب بچے اس کے ساتھ ہوتے۔

اس کے کولہو پر توبڑ کا گھنا سایہ تھا۔ اور کبھی کبھار اردگرد کے دیہات میں تیل لیکر جانے یا پھر میلے ٹھیلے کے دنوں میں مٹی کے برتنوں کی دوکان لگانے کے سوا وہ کبھی گاؤں سے باہر نہ گیا تھا۔ اس نے کبھی اس طرف کا سفر نہ کیا تھا۔ اسکی دنیا تو بڑے ایک گھنے پیڑ کے سایے میں بستی تھی۔ جہاں جلتی ہوائیں بھی سرد ہو جاتی تھیں اور دوپہر کی دہوپ بھی ٹھنڈک پہنچاتی تھی۔ اور کبھی جب وہ خدا کے حضور میں سر جھکاتا۔ تو اس کا وجود اس کے دماغ میں آتا۔ وہ کچھ بڑ کے گھنے پیڑ کی طرح کا ہی ہوتا —— بڑی بڑی لمبی شاخوں والا۔ سایے دار۔ تپتے دلوں کو ٹھنڈک پہنچانے والا۔ بے شمار گھونسلوں کو اپنی شاخوں میں چھپائے ہوئے۔ لیکن یہ تپتی ویران دنیا۔ ہریالی کا ایک تنکا تک نہیں۔ اور اس کے درمیان کسی جلتے ہوئے تیر کی طرح، جلتی تپتی، جلاتی اور تپاتی ہوئی یہ سڑک! — اگر اسے معلوم ہوتا تو کبھی اپنے بچوں کو یوں ساتھ نہ لاتا — کبھی بھی نہ لاتا۔ لیکن اس خیال کو اس نے فوراً اپنے دل سے نکال دیا۔ اور وہ پھر اکڑ کر چلنے لگا۔ تہمد کو جھٹکا دینے یا قمیص کو جھاڑنے کا خیال وہ کب کا بھول چکا تھا —— کوئی سائیکل سوار یا بھولا بھٹکا راہی بھی گذرتا تو اس پر گرد کی تہ چھا جاتی۔ لو کبھی اِدہر سے چلتی اور کبھی ادہر سے، اور کبھی کبھار کوئی بگولا، مٹی اڑاتا ہوا گذر جاتا —— تہمد کا نیلاہٹ لئے ہوئے سفید رنگ اب مٹیالا ہو گیا تھا۔ پگڑی کی وہ دمک نہ رہی تھی اور کپڑوں کی الٹی طرف سے چہرے یا گردن کا پسینہ پونچھنے کی بجائے اب وہ سیدہی طرف کو ہی کام میں لانے لگا تھا۔

اس سے کچھ فاصلے پر اس کی بیوی چلی جا رہی تھی۔ اس کی تمام تر کوشش بچے کو پچکارنے کی طرف لگی ہوئی تھی۔ پھر رحماں تھی — اپنے خیالات کی دُنیا میں مست، شائد اپنے پڑوسی گوالے نورے کا خیال اُسے اس چلچلاتی دہوپ کی شدت کو محسوس نہ ہونے دیتا تھا۔ اس کی انگلی ننھا سے فجی چلا آ رہا تھا — جسے کبھی وہ اُٹھا لیتی تھی، اور کمر، کندھا یا بازو تھک جانے پر پھر اتار دیتی تھی — اس کا پھول سا چہرہ کمہلا گیا تھا، ہونٹ سوکھ گئے تھے، گندے، میلے ہاتھوں سے بار بار مُنہ کا پسینہ پونچھنے کی وجہ سے چہرے پر کئی داغ لگ گئے تھے، اور اس کی چال بتدریج دھیمی ہوتی جا رہی تھی۔

نہر کے پل کو پار کر کے مولو نے دیکھا —— دائیں طرف ایک گھنا پیڑ ہے۔ مادہ بڑ کا —— جس کا تنا بہت اونچا نہیں اُٹھتا۔ موٹی موٹی لمبی لمبی شاخیں سر کو چھوتی ہوئی چھتری کی طرح پھیلتی جاتی ہیں۔ اس کی شاخوں پہ دو مور بیٹھے ہیں، بے فکر اور مست! ان کے لمبے لمبے چمکیلے پنکھ دھرتی کو چھو رہے ہیں اور دور کسی کنوئیں کی گادھی پر بیٹھا ہوا کوئی جاٹ ہیر وارث شاہ الاپ رہا ہے —— اس کی سریلی، باریک لیکن اونچی آواز اس ویران خاموش دوپہر میں گونجتی، لہراتی ہوئی، اس تک آ رہی تھی۔

گھر آ نناناں نے گل کینی، بھابی اِک جوگی نواں آیا نی
کنیں اوسدے درشنی مندراں نے تے گل ہیکلا عجب سہایا نی

ماضی کی بھولی بسری منزلوں کو پار کر کے آنے والی یاد کی طرح، نوخیز جوانی کے دن مولو کی آنکھوں کے سامنے پھر گئے، جب وہ اپنے بڑ کی موٹی شاخ پہ بیٹھ کر، یا کسی آم یا جامن کے درخت سے پیٹھ لگائے، 'ہیر وارث شاہ' گایا کرتا تھا۔ اور اس کے جی میں آئی کہ وہ پورے گلے سے تان لگائے:—

پھرے ڈہونڈدا وِچ حویلیاں دے۔ کوئی اوس نے لال گنوایا نی
ہیرے کِسے رجونس دا اوہ پُتر، روپ ندھ تھیں دون سوایا نی

لیکن یہ تان اس کے جی میں ہی رہی۔ اپنی لمبی ڈاڑھی، اپنے شریف لباس اور اپنے پیچھے چلے آنے والے بچوں کا اسے خیال آ گیا۔ اور اس کے دل سے ایک لمبی سانس نکل گئی۔

قریب قریب روتے ہوئے سوکھے گلے سے فجے نے کہا "ابا مجھے پیاس لگی ہے، ابا مجھے اُٹھا لو"

اور مولو نے پیچھے مُڑ کر دیکھا" لہراں بیچاری تھک کر پہ اللہ کی ایک ٹیڑھی سی جڑ پہ بیٹھ گئی تھی۔

"مر گئی وہاں ہی تو"، کڑک کر مولو نے کہا۔

لہراں اُٹھی اور لنگڑاتی لنگڑاتی چلنے لگی اور پھر اس نے مُڑ کر اپنے بیٹے کو ڈانٹا۔ کہ ذرا دم لے، وہ سامنے تو چوگاواں نظر آ رہا ہے، وہیں تمہیں لسی پانی پلائیں گے۔

اور چوگاواں تک تو وہ دونوں کسی نہ کسی طرح چلتے گئے تھے، لسی پانی سے زیادہ ان کی تسکین کا باعث یہ خیال تھا کہ ابا وہاں سے ضرور تانگہ لیگا۔ لیکن جب کچھ سستا لئے اور سوکھی روٹی اور نبل کے پکوڑوں کو، جو انکے ابا نے اڈے سے لئے تھے پانی کی مدد سے پیٹ میں پہنچانے کے بعد انہیں پھر مارچ کا حکم ہوا، تو وہ چل تو پڑے، لیکن مارچ نہیں کر سکے، چوگاواں سے ونی کے تک اس مارچ میں کئی ہالٹنگ سٹیشن آئے، جبکہ وہ ایک بیمار تھکے ہوئے گھوڑے کی طرح اڑ گئے اور جھڑکیاں، گالیاں، یا ایک دو بار چانٹے کھا کر پھر چل پڑے۔ لیکن ونی کے کے موڑ پر جو وہ رُکے، تو پھر نہیں بڑھے؛ تھپڑ کھانے کے بعد بھی فجا ٹس سے مس نہ ہوا۔ اور گالیاں کھا کر بھی لہراں بیٹھی دوپٹے سے آنسو پونچھتی رہی۔

مولو نے تانگے والے سے بالکل ہی نہ پوچھا ہو، یہ بات تو نہ تھی۔ پوچھا تھا، لیکن بغیر سوار ہونے کے خیال سے اور یہ معلوم کر کے کہ لوپوکے سے چوگاواں تک وہ گرد کا سمندر پار کرنے کے باوجود ابھی تک کرائے میں صرف ایک آنے کی تخفیف ہوئی ہے۔ اور آگے سڑک پکی ہے اور کہیں کہیں شیشم کے درخت بھی ہیں، وہ چل پڑا تھا۔

تھپڑ کھا کر فیجا رونے لگا، لیکن اُٹھا نہیں، تب بیباں نے اسے پیار دیکر اٹھانا چاہا اور ننھے کو رحماں کے حوالے کرکے اسے گود میں لے لیا، ماتھے پہ ہاتھ پھیرتے ہی وہ سہم کر پکار اُٹھی۔

"دیکھو تم اسے مار رہے ہو، اس کا پنڈا تو بھٹی بنا ہوا ہے"

اور تب بخار کے زور سے تپے ہوئے اپنے لڑکے کے چہرے کو دیکھ کر مولو پگھل اُٹھا۔ اور اس نے بادل ناخواستہ ایک جاتے ہوئے تانگے والے کو روکا۔ اور اٹاری کا کرایہ پوچھا۔

"چار چار آنے"

"چار چار آنے! لیکن اتنا تو چوگاواں سے مانگتے تھے"

"تم کیا دیتے ہو؟"

"ایک ایک آنہ لے لو۔ تین ساڑھے تین میل ہم چل بھی تو آئے ہیں"۔

"تو وہیں سے جا کر چڑھ جاؤ" اور تانگے والے نے ہنٹر گھمایا۔ اور "او تیری ماں مر جائے" کہتے ہوئے اسے گھوڑے کی پیٹھ پر جمادیا۔

"چھ چھ پیسے لے لو" مولو بولا

لیکن گھوڑا اچھل پڑا۔

"دو آنے"

"اڑھائی آنے" اس نے حلق کی پوری آواز سے کہا۔

تانگہ کافی دور جا کر رُک گیا۔ سواریاں تو پوری تھیں، لیکن "جاتے چور کی لنگوٹی ہی سہی" کے مصداق، تانگے والے نے یہ دس بارہ آنے چھوڑ دینے مناسب نہ سمجھے۔

اگرچہ جہاں دو کی جگہ تھی وہاں چار بیٹھے، اور سانس تک لینا مشکل ہو گیا لیکن پھر بھی یہ کہنا بے جا نہیں کہ سب نے تانگے میں بیٹھ کر سکھ کی سانس لی۔

. . . . . .

جب پلک جھپکتے ہی (کم سے کم مولو کو ایسا ہی معلوم ہوا) اٹاری کا موڑ آ گیا اور تانگے والے نے کہا۔ کہ اگر جلدی لاہور کی لاری پکڑنا چاہتے ہو تو یہیں اتر جاؤ تو مولو کے دل کو دھکا لگا۔

"اڈہ آ گیا؟" اس نے پوچھا

"اڈہ تو آگے ہے، لیکن یہاں اتر جاؤ گے تو جلدی موٹر مل جائے گی۔ نہیں تو اڈے پر بہت دیر تک بیٹھنا پڑیگا۔ وہاں اور لوگ بھی تو ہوتے ہیں اور آجکل ٹریفک پولیس بھی بڑی سخت ہو گئی ہے"

یہ ٹریفک پولیس کیا بلا ہے، یہ بات مولو کی سمجھ میں نہیں آئی ہے بھویں تریہ کر تانگے والے کی طرف دیکھتے ہوئے وہ بولا "یہ سب چالاکیاں میں سمجھتا ہوں!

لیکن جب تانگے میں بیٹھی ہوئی، دوسری دو سواریاں بھی وہیں اتر پڑیں۔ اور دوسروں نے بھی کہا کہ اگر لاری جلدی پکڑنی ہو تو یہیں اتر جاؤ، تو وہ بھی اتر پڑا۔ لیکن گرج کر بولا "بس یہیں تک لانے کے تم بارہ آنے مانگتے ہو"

تانگے والے نے کہا "تمہاری مرضی ہے، تم اڈے تک چلے چلو"

مولو کا جی چاہ رہا تھا کہ اس پاجی تانگے والے کو اُٹھا کر سڑک پر پٹک دے۔ اس نے چیخ کر کہا "تم لٹیرے ہو"

تانگے والے نے ہنٹر اُٹھایا "زبان سنبھال کر بات کرو میاں!"

اس وقت بیباں تانگے سے اتر کر دونوں کے درمیان آ گئی "طیش میں نہ آؤ بھائی، ہم پیسے مار کر لے نہ جائیں گے، آدمی آدمی تو دیکھ لیا کرو تم!"

مولو کچھ کہنے ہی لگا تھا کہ یہ سنکر گالی دینے کی بجائے اس نے وہی کالے سیاہ ۴۸ پیسے تانگے والے کے ہاتھ پر گن دئے۔ اور بچوں کو اتارنے لگا۔

"۱۲ آنے تو اسے دے دئے اب وہاں کس طرح کام چلیگا" بیباں نے جیسے اپنے آپ سے کہا۔

مولو چیخ کر کچھ کہنے ہی لگا تھا کہ اس کی نظر اپنے ننھے بچے کی طرف چلی گئی۔ جس کا چہرہ بخار کی شدت سے اور بھی سیاہ ہو رہا تھا۔ اس نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا، پھر کرتا اُٹھا کر پیٹ کی حرارت دیکھی "جسم تو اس کا جل رہا ہے" اس نے کہا، اور پھر ایک آتی ہوئی موٹر سے بچانے کے لئے، اپنے بیوی بچوں کو ایک طرف کرکے، وہ اُنہیں سائے میں لے چلا۔

"ارے مولو، تم کدھر؟" حیرت سے درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے ایک شخص نے پوچھا، جو مولو کے گاؤں ہی کا تھا۔

اداس آواز میں مولو نے کہا "حسن کے لڑکے کی شادی ہے، وہیں جا رہا تھا۔ کہ راستے میں لڑکوں کو بخار نے آ دبایا"

"کہاں جا رہے ہو، وہاں؟"

"وہاں! چھہر میں ٹھیکیدار لیٹور سنگھ رہتا ہے، وہیں جانا ہے، نہ ہو گا بھائی، تانگہ لے لیں گے، تین چار آنے دے دیں گے"

"تین چار آنے" وہ ہنسا، "تم لاہور کبھی گئے نہیں، ارے بھائی وہاں ایک روپیہ سے کم میں تانگہ نہ جائیگا"

مولو نے ان نگاہوں سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔ جو شائد کہہ رہی تھیں۔ کہ ایک روپیہ کی مٹھائی حسن کے بچوں کے لئے بھی لینی ہے، اور پھر واپس آنے کے لئے بھی پیسے چاہئیں اور بیباں کی نگاہیں شائد کہہ رہی تھیں کہ اس موٹے تانگے والے نے یونہی ہمارے بارہ آنے لوٹ لئے۔

"تم کدھر آئے تھے مہر خاں" مولو نے پوچھا۔

"بھیلو شاہ کی بوریاں سٹیشن پر چھوڑنے آیا تھا"

"تو اب واپس جا رہے ہو"

"چلا ہی آرہا ہوں، یونہی ذرا دم لینے کے لئے رک گیا تھا۔"

تب پھر مولو نے میاں کی طرف اور پھر ماں نے مولو کی طرف دیکھا۔ اور مولو نے کہا "کیا کہوں یار، حتو نے تو بہتیرا کہا تھا کہ بیوی بچوں کے ساتھ آنا، لیکن یہاں آتے آتے بچے بیمار ہو گئے ہیں۔ فجا اور چراغ بخار سے تپ رہے ہیں اور لہراں کا پاؤں زخمی ہو گیا ہے، سوچتا ہوں کہیں تکلیف بڑھ نہ جائے شادی کا معاملہ ہے کھانے پینے میں پرہیز رہتا نہیں۔ اور پھر وہاں وہ بات تھوڑے ہی ہے، جو اپنے گھر میں ہے۔"

"یہ ڈاکٹر سالے تو اچھے بھلے کو بیمار کر دیتے ہیں۔"

"ارے بابا ان تک ہماری پہنچ کہاں۔" اور پھر ایک بار اپنی بیوی کی طرف دیکھ کر مولو نے کہا "تم ایک مہربانی کرو مہر خاں، ان سب کو واپس لے جاؤ۔ مجھے تو جانا ہی ہو گا۔ کل بارات چڑھیگی۔ لیکن ان سب کو تم لے جاؤ۔"

اور پھر اس کے جواب کی انتظار کئے بغیر اس نے بیوی بچوں کو بہل گاڑی پر چڑھانا شروع کر دیا۔

مہر خاں گاڑی پر آبیٹھا۔

"راستے میں سبیلو وال کے حکیم نرنجن داس سے کچھ دارو لیتی جانا" گاڑی کے پیچھے چلتے چلتے مولو نے اپنی بیوی سے کہا۔

اس وقت، دور سڑک پر امرتسر کی طرف سے ایک لاری آتی ہوئی دکھائی دی۔

مولو نے جلدی جلدی اپنے بچوں کو پیار کیا۔

فجے کی جلتی ہوئی پیشانی کو چوما۔ "تمہارے لئے ہم بوٹ لائیں گے۔"

لہراں کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ "تمہارے لئے نیا جوتا لائیں گے۔"

رحماں کو ڈانٹا۔ "بچوں کا خیال رکھنا اور ماں سے لڑنا نہیں۔"

پھر گٹھڑی اٹھائے، بھاگتا ہوا سادہ سڑک پہ آ کھڑا ہوا، اور اس نے آتی ہوئی لاری کو روکنے کے لئے ہاتھ بڑھا دیا۔

اوپندر ناتھ اشک

سزائے اعتبار

(۱)

یقیں ان کے وعدے پہ میں کر چکا ہوں
خلش زار دل میں سکوں بھر چکا ہوں

سحر کی بڑی دھوم سے شام کی ہے — گھنیری سیاہی بڑے کام کی ہے
تمنائیں کچھ گدگدا سی رہی ہیں — امنگیں مری لڑکھڑا سی رہی ہیں
جواں سال جذبات بل کھا رہے ہیں — ابھی سے مجھے خواب سے آرہے ہیں
کڑے ہاتھ نبضوں پہ میں رکھ رہا ہوں — نشاطِ نفس کا مزہ چکھ رہا ہوں
وہ آنکھوں میں مستور رعنائیاں ہیں — نگاہیں مری مست انگڑائیاں ہیں
وہ طوفان دل کی طرف بڑھ رہا ہے — کہ رگ رگ پر اک نشہ سا چڑھ رہا ہے
تصور کی زلفیں بکھرنے لگی ہیں — خیالوں کی پریاں اترنے لگی ہیں

دھڑکتا ہے دل خوف سے دہائیں دہائیں
کہ آتے ہوئے وہ کہیں رک نہ جائیں

(۲)

میں پر نور خلوت سرا دیکھتا ہوں — محبت کو چھایا ہوا دیکھتا ہوں
گل تازہ گلدان میں ہنس رہے ہیں — مری دل کی سب دھڑکنیں قہقہے ہیں
امیدوں پہ ہے عالم رقص طاری — حسیں بلبلے جیسے موجوں پہ جاری
مرے دل میں محشر کی یوں لہر اٹھی ہے — کہ تصویر الٹی ہوئی چوم لی ہے
مجھے آج ظلمت سے نفرت نہیں ہے — اجالوں کی کوئی ضرورت نہیں ہے
تصور سے یوں دل کو بہلا رہا ہوں — کہ جیسے میں خود ان کے ساتھ آرہا ہوں
جوانی کا طوفان روکے ہوئے ہوں — محبت کا ہیجان روکے ہوئے ہوں

مگر قلب کیوں بیٹھتا جا رہا ہے
مجھے سوئے ظن سا ہوا جا رہا ہے

(۳)

نگاہوں سے رنگینیاں اڑ گئی ہیں — یقیں کی قوی گردنیں مڑ گئی ہیں
امنگوں کی بارش بھی اب تھم گئی ہے — تمناؤں پر برف سی جم گئی ہیں
ہوس دیر تک جاگ کر سو گئی ہے — تنفس کی رفتار کم ہو گئی ہے
سب اٹھے ہوئے سیل واپس چلے ہیں — قدم جوش کے ریت میں دھنس چلے ہیں
یہ بوڑھے زمانے کو کیا ہو گیا ہے — کہ ہر گام پر لڑکھڑانے لگا ہے
یہ پھولوں پہ زردی سی کیوں چھا گئی ہے — مگر کیوں امیدوں کی بل کھا گئی ہے
یہ دنیا سے نفرت سی کیوں ہو چلی ہے — اجل سے محبت سی کیوں ہو چلی ہے

مرے دل میں مایوسیاں بڑھ رہی ہیں
مرے حال پر قہقہے مارتی ہیں

مخمور جالندھری

یونانی علم الاصنام کی ایک جھلک

دنیا کے عہد عتیق کی تاریخ پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان نے ہمیشہ ماورار عقل تصورات کو حقایق کی طرح تسلیم کیا ہے، جس بزم میں مافوق العادت اور مابعد الطبیعات کے چراغ جلتے ہیں، عقل و تجربہ کی نگاہ کو وہاں کچھ بھی نظر نہیں آتا، انسانی شعور عقل موجود فی الخارج اور عقل موجود فی الذہن کے درمیان تگ و دو کرتا رہتا ہے، اور جس طرف کی کشش زیادہ وزنی ہوتی ہے، اُسی طرف کو جھک جاتا ہے۔ آدمی فطری طور پر "غیر شعوری" اور "بے عقلی" کی زندگی گذارنا نہیں چاہتا، لیکن قدرت نے انسان میں ذوقِ جستجو کی بجلی کو سمو دیا ہے، جو اُسے چپلا نہیں بیٹھنے دیتی اور وہ اپنے گرد و پیش، ظاہر و باطن اور تحت و فوق کے متعلق کچھ نہ کچھ سوچتا ہی رہتا ہے، اور اکتشاف و جستجو کی اس منزل میں انسان کو نفسی کیفیات کی ایسی دشوار گزار اور حیرت کُن وادیوں سے گذرنا پڑتا ہے، جہاں عقل و شعور کے بازو شل ہو جاتے ہیں۔

انسان نے کائنات کو تجریدی نقطۂ نگاہ سے، یعنی کائنات کے تشخصات کو حذف کر کے، اس کی کلی یا عمومی صورت ذہن میں رکھ کر، جب کبھی سوچا ہے تو اس کے تجربات و مشاہدات اور عقلی تصورات نے اس کا ساتھ نہیں دیا۔ ہاں! وہ نفوس قدسیہ جن کی وحی و الہام نے رہنمائی کی، وہ اس بھید کو سمجھ گئے، لیکن جو اس عطیۂ قدرت سے محروم رہے، یا جنہوں نے تعلیماتِ ربانی سے بے نیاز رہنے کی کوشش کی، انہوں نے قلب و ضمیر کی جھوٹی تسکین کے لئے بہت سی باتیں اپنے ذہن سے تراش لیں، اور وہی خود تراشیدہ باتیں آگے چل کر، قومی روایات کی بنیاد اور پس منظر بن گئیں، علم الاصنام کی بنیاد بھی ان ہی روایات پر قائم ہے، جو بعض قوموں کا مذہب بن گئی ہیں۔

یُونان جو فلسفہ قدیم کا امام سمجھا جاتا ہے، اور جس کے متعلق دنیا میں مشہور تھا کہ وہاں عقل و دانش سبزے کی طرح اُگتی ہے، اور آسمانی حکمت کا مینہ برستا ہے، اس کا قدیم علم الاصنام بھی اُن روایات سے لبریز ہے، جن کی تجربہ اور مشاہدہ نفی کرتا ہے۔ وہی یونان جو فکر و نظر کے بغیر تنکا بھی نہیں توڑتا اور جہاں جہاں قدم قدم پر عقلی دلیلیں طلب کی جاتی ہیں، ایسی باتوں پر بھی ایمان رکھتا ہے جو عقل کی دسترس سے بہت دُور ہیں۔

کوہستانی دیوتا

ہومر یونان کا وہ مایہ ناز شاعر ہے، جس کی تصنیف "الیڈ" کو اہل یونان آسمانی صحیفہ کی برابر سمجھتے ہیں، افلاطون جیسے مقبول اور مشہور فلسفی نے اپنی مشہور عالم کتاب "جمہوریت" میں ہومر کی مخالفت کی، مگر اس مخالفت کے باوجود ہومر کی شہرت کا آفتاب گہن میں نہ آسکا۔

یونان کے صوبہ تھلی میں ایک پہاڑ کی چوٹی سب سے زیادہ اونچی ہے، اس پر ہر وقت بادلوں کا ہجوم اور گھراؤ رہتا ہے۔ کوہستانی بلندی کا یہ تاریک منظر بہت زیادہ دلچسپ ہے، ہومر کا عقیدہ تھا کہ اس قلۂ کوہ پر تازیوس نامی مہا دیوتا، جس کو لوگ جوپیٹر بھی کہتے ہیں، بہت سے دیوتاؤں اور دیویوں کے ساتھ وہاں رہتا ہے، اور جب بھی ان کا دل سیر کرنے کو چاہتا ہے تو یہ اپنے کو بادلوں میں لپیٹ کر، آسمان کی طرف اُڑ جاتے ہیں۔ ہندوستان میں آکر یہی مہا دیوتا **تازیوس** غالبًا بارش کا دیوتا بن گیا۔ اگر ہومر آج زندہ ہوتا تو جرمنی کے طیارہ بازوں سے ضرور پوچھتا کہ یونان پر حملہ کرتے وقت اُن دیوتاؤں سے تمہاری ملاقات تو نہیں ہوئی!

ہم اپنے بچپن میں بڑی بوڑھیوں کی زبانی سُنا کرتے تھے کہ چاند میں بڑھیا بیٹھی ہوئی چرخہ کات رہی ہے، اگر ہومر کا عقیدہ صحیح ہے، تو چاند کی بڑھیا کے وجود سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔

سکندر تخت یونان پر

سکندر اعظم کے باپ فیلقوس کا قتل یونانی تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے، مخالفین کی جماعت فیلقوس کے خاندان کو مٹا دینا چاہتی تھی اور حکومت کو کمزور کرنے کیلئے بغاوت، دہشت انگیزی اور لاقانونیت کے آثار و اسباب پیدا کئے جا رہے تھے۔ یہ حالت دیکھ کر ملک کے اہل فکر اور ارباب سیاست نے کارنتھ میں مجلسِ شوریٰ منعقد کی اور کسی اختلاف کے بغیر یہ بات طے پائی کہ سکندر کو اُس کے مقتول باپ کا جانشین بنایا جائے، آخر کار سکندر کے سر پر تاج رکھدیا گیا، اور اسی دن سے یونان کی تاریخ کا ایک نیا باب شروع ہو گیا۔

سکندر کے مخالفین اب بھی ریشہ دوانیاں کر رہے تھے، چنانچہ الیریا میں مُنظم طور پر بغاوت کی گئی، سکندر فوراً دار الحکومت سے روانہ ہوا اور ان شعلوں کے بجھانے کے لئے، اس کو دریائے ڈینیوب کے ساحل تک جانا پڑا۔ دشمنوں نے اس کی غیر موجودگی سے بروقت ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور ایتھنز کے باشندوں نے، قرب و جوار کے شورش پسندوں کو لیکر بغاوت شروع کر دی، سکندر کو پتہ لگا تو وہ بجلی کی طرح واپس آیا اور ایک ہی حملہ میں باغیوں کو پسپا کر کے، اُن کے زور کو ہمیشہ کے لئے توڑ دیا۔

سکندر کا باپ!!

یہی سکندر جو اس قدر بہادر اور صف شکن تھا، اور اس کے ساتھ علم و فلسفہ کی سرپرستی کرتا تھا، جب

ایرانؔ پر آخری حملہ کرنے کے لئے روانہ ہونے لگا، تو روانگی سے قبل، برکت لینے کیواسطے جوپیٹر ایمن دیوتا کے مندر میں پہونچا۔ یہہ عبادت گاہ صحرائی لیبیا کے پُربہار دامن میں واقع تھی، بہت دور تک سبزہ چلا گیا تھا، اور خودرو پودوں پر کثرت سے پھول لدے ہوئے تھے۔

سکندر نے دیوتا کے مجسمہ کے پیروں میں تلوار اور ڈھال رکھدی اور نہایت ادب سے جھک کر دیوتا کی مرمریں پنڈلیوں کو بوسہ دیا۔ اسی مندر میں ایک نہایت ہی بوڑھا کاہن رہتا تھا، جو کہانت کے زور سے اگلی، پچھلی باتیں بتایا کرتا تھا۔ بوڑھے کاہن کی سب لوگ تعظیم کرتے تھے، اور اس کے فتوے کو تیر قضا سمجھتے تھے۔

—— تمہیں لوگ فیلقوس کا بیٹا کہتے ہیں —— بوڑھے کاہن نے سکندر سے کہا۔

—— لوگ کیا کہتے ہیں —— ! میں فیلقوس کا ہی بیٹا ہوں۔ سکندر نے قدرے درشت لہجہ میں جواب دیا۔

—— لوگ نادان ہیں، ظاہر پرست ہیں —— کاہن مُسکراتے ہوئے بولا۔

—— یہہ تم کو کیا ہوگیا ہے! جو ایسی مجہول اور مُبہم باتیں کرتے ہو —— سکندر نے کہا۔

سکندر! بے صبر نہ ہو، تیزی میں نہ آؤ، میں جانتا ہوں کہ تم کون ہو۔

لوسُنو! تم نے اُس مقدس دیوتا کا نام سُنا ہوگا جس نے سانپ کی شکل اختیار کرلی تھی - - - - - - - - کاہن الجھی ہوئی ڈاڑھی کو سُلجھاتے ہوئے بولا۔

اس مقدس دیوتا کو یونان کا بچہ بچہ جانتا ہے —— سکندر گھبراکر بولا۔

تمہاری ماں اولمپیاس اور وہ دیوتا چند گھنٹے خلوت میں رہے تھے۔ تم اُسی دیوتا کی اولاد ہو، اور وہی خلوت تمہارے وجود کا سبب ہے فیلقوس، تمہارا باپ نہیں ہے —

کاہن یہہ جملے دہراتے ہوئے، مندر کے تاریک حجرے میں چلا گیا، اور سکندر کی خوشی سے باچھیں کھل گئیں، کہ وہ دیوتا کی اولاد ہے اور عام لوگ اس کی برابری نہیں کرسکتے۔

دوشیزگی کی لوٹ

یہہ تصورات یونانیوں میں بہت عام ہوگئے تھے کہ دیوتا خوبصورت لڑکیوں پر عاشق ہوکر خوش فعلیاں کرتے ہیں۔ ان عقاید نے عبادت گاہوں کے پجاریوں کی نفسانی خواہشوں کے اُبھرنے اور پورا ہونے کے خوب مواقع بہم پہونچائے۔ دیوتاؤں کے نام پر دوشیزگی کی لوٹ مچی ہوئی تھی، یونان سے گذر کر یہہ فتنہ روما میں بھی پہونچ گیا۔ وہاں بھی یہہ افسانہ مشہور تھا کہ رہی سلویا نام کی ایک کنواری لڑکی، پانی کی گاگر لیکر، چشمہ کی طرف جارہی تھی، لڑکی بہت خوبصورت تھی، اسکا اٹھان قیامت کا تھا، مارس دیوتا کی اُس پر نظر پڑگئی، نگاہیں دوچار ہوئیں اور دیوتا نے دل پھینک دیا۔ دیوتا کی راہ محبت میں کون رکاوٹ ڈال سکتا تھا، وہ سب کچھ ہوا، جو ہونا چاہئے تھا، لڑکی کے بطن سے ایک بچہ پیدا ہوا، جسے لوگ رومیولس کہنے لگے، اور اسی رومیولس نے شہر روما کو آباد کیا۔

افلاطون کی ماں

افلاطون کے نسب کے متعلق بھی یہہ کہانی مشہور تھی کہ افلاطون کی ماں پیرکیٹونی کی شادی نہیں ہوئی تھی — اپالو دیوتا نے اس کو کہیں دیکھ لیا، اور وہ اس معصوم پر دل وجان سے فریفتہ ہوگیا، اور اس عشق کا نتیجہ **افلاطون** کے وجود کی شکل میں ظاہر ہوا۔

یونانی اس آسمانی نسب پر فخر کرتے تھے، یونانی علم الاصنام پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یونان کے دیوتا بڑے دل پھینک اور ہوس پرست واقع ہوئے تھے۔ کیا عجب ہے کہ بھارت ورش کے کوکا پنڈت کو جنسیات کا علم اور کچھ "آسن" یونانی دیوتاؤں سے پہونچے ہوں۔

دیویوں کی عشقبازی

یونان کے دیوتا جس طرح کنواری لڑکیوں کو زینتِ آغوش بناتے تھے، اسی طرح وہاں کی بعض دیویاں بھی، خوبصورت نوجوان سے دل لگاتی تھیں۔ چنانچہ حُسن وجمال کی مشہور دیوی وینس ایک نوجوان پر جس کا نام اڈانس تھا عاشق ہوگئی۔ اتفاق کی بات کہ وینس کے محبوب نوجوان اڈانس پر جنگلی سُور نے حملہ کردیا، اور اڈانس مجروح ہوگیا، وینس نے اڈانس کے زخموں پر آسمانی شراب کے قطرے ٹپکائے لیکن اڈانس زخموں سے جانبر نہ ہوسکا، اڈانس تو خیر مرگیا، مگر آسمانی شراب کے جو قطرے زمین پر گر پڑے، ان کے اثر سے نرگس کے پھول پیدا ہوگئے۔ اس افسانہ کو ذہن میں رکھ کر، غالب کا یہہ مطلع تو پڑھئے؎

سب کہاں کچھ لالہ وگل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کچھ پنہاں ہوگئیں

ہندوستان کے علم الاصنام میں بھی بعض پھولوں کی پیدائش کے متعلق اس قصہ سے ملتے جلتے افسانے مشہور ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ دُنیا ہمیشہ سے اسی رنگ وبو کے پیچوں میں الجھی رہی ہے، علامہ اقبال نے جو "دین فطرت" کی طرف تمام دُنیا کو بُلاتا تھا، کچھ سوچکر ہی کہا تھا۔

کر بُلبُل وطاؤس کی تقلید سے توبہ
بُلبُل فقط آواز ہے، طاؤس فقط رنگ

ماہر القادری

جوانی کا جنازہ

گاؤں کے پچھم کی طرف پہاڑیوں کی ابھرتی اور پھیلتی ہوئی قطاروں کی دھندلی چوٹیوں پر وہ بھیڑیں چرایا کرتا تھا۔ طلوعِ آفتاب کے ساتھ ہی وہ تنگ اور ٹیڑھی گلیوں میں سے بھیڑیں ہنکائے نکلتا۔ اس کے ایک ہاتھ میں بنسری ہوتی اور دوسرے میں ایک پوٹلی جس میں گذشتہ شام کی دو روٹیاں اور ایک موٹی سی پیاز ہوتی۔ پتلی پتلی پتھریلی پگڈنڈیوں پر زیرِ لب گنگناتا، سست رفتار بھیڑوں کو ایک قطار میں چلنے کے احکام صادر کرتا وہ اوپر ہی اوپر چڑھا جاتا اور جب مشرقی افق پر سورج نیزہ بھر بلند ہو جاتا۔ اور بہت دور نیچے گاؤں کی چھتوں پر بہت دیر تک سونے والے کبرو کروٹیں بدل کر اٹھ بیٹھتے، تو وہ ایک خاص چوٹی پر پہنچ جاتا۔ بھیڑیں ادھر ادھر بکھر جاتیں اور وہ لانبی گھاس کے لہراتے اور جھومتے ہوئے پودوں میں ایک پتھر اور اپنی پگڑی کا تکیہ بنا کر لیٹ جاتا اور بنسری سے ایسے ایسے سُریلے سُر نکالتا کہ بہت پرے ڈھلانوں پر بکھرے ہوئے جھونپڑوں کے دالانوں میں رنگ برنگی اوڑھنیاں پھڑپھڑانے لگتیں اور یہ رسیلی تانیں دیر تک نشیب و فراز میں گھومتی رہتیں۔ نیلے آسمان پر اڑتے ہوئے بادل تھم جاتے اور سورج کی تیز شعاعیں تھرتھرا کر موسیقی کے نشے میں جیسے لڑکھڑانے لگتیں۔

دوپہر کو وہ نیچے ایک جھرنے پر چلا جاتا۔ باسی روٹیوں اور پیاز کو جھرنے کے شفاف پانی کی مدد سے حلق سے نیچے اتارتا۔ بھیڑیں دھوپ سے گھبرا کر آس پاس جھاڑیوں کے تلے جمع ہو کر چھدری چھاؤں کی پناہ لینے لگتیں اور وہ وہیں جھرنے کے کنارے ایک سفید، ٹھنڈی اور چوڑی چٹان پر لیٹ جاتا اور بہت دیر تک سویا رہتا۔ یہ جھرنا ایک گہری کھاڑی میں تھا اس لئے یہاں دھوپ بہت کم آتی اور اکثر وہ شام سے بہت تھوڑے لمحے پیشتر ہی اُٹھتا۔ اور پھر وہیں منہ ہاتھ دھو کر بنسری سنبھالتا اور بھیڑیں ہنکائے واپس گاؤں آجاتا!

یہی اس کا معمول تھا اور یہی اس کی زندگی۔ اس کی مثال بالکل اس دربان ایسی تھی جو ایک طویل و عریض محل کی ایک بہت لمبی غلام گردش میں صبح سے شام تک ٹہلتا رہتا ہو اور پھر اپنے گھر جا کر صبح کے انتظار میں سو رہتا ہو۔

اور پھر ایک روز کا ذکر ہے کہ اس غلام گردش کی دونوں طرف کی سنگین دیواروں میں دو چار ننھی ننھی کھڑکیاں سی پیدا ہو گئیں۔ بھیڑیں آگے لگائے جب پنگھٹ کے قریب سے گزرا جو اس کی راہ میں پڑتا تھا۔ تو اسے وہاں ایک لڑکی دو بھری ہوئی گاگریں سامنے رکھے، حیران و پریشان اِدھر اُدھر دیکھتی نظر آئی۔ روزانہ سینکڑوں لڑکیاں اُسے پنگھٹ پر نظر آتی تھیں۔ اور اس کے خیال میں ان لڑکیوں کا مصرف صرف یہ تھا کہ پانی بھریں۔ روٹیاں پکائیں۔ باہر کھیتوں میں اپنے بھائیوں کو کھانا پہنچا آئیں۔ باجرے کی فصل سے چڑیاں اڑانے کے لئے دن دن بھر کھڑی دھوپ میں سڑتی رہیں۔ اور پھر جب اُن کے والدین کے پاس کچھ رقم اکھٹی ہو جائے۔ یا کوئی مہربان مہاجن قرضہ دینے پر رضامندی ظاہر کرے تو ان کا بیاہ ہو جائے اور وہ کسی اور گھر میں جا کر انہیں فرائض کی بجا آوری میں مصروف ہو جائیں! اُس نے سوچا، شاید یہ لڑکی اپنی کسی سہیلی کے انتظار میں کھڑی ہے، اور وہ سہیلی شاید ابھی تک دودھ بلو رہی ہو گی۔ یا دہی دیر میں جما ہو گا۔ یا شاید وہ بکریاں دوہ رہی ہو گی کیونکہ بکریاں باہر جانے سے بس ایک دو لمحے، پیشتر ہی دوہی جاتی ہیں۔ تا کہ دودھ کا ایک حقیر سا قطرہ بھی اُن کے تھنوں میں نہ رہنے پائے، اسی لئے صبح کو گھروں سے نکلی ہوئی بکریوں کے تھن پرانے چیتھڑوں کی طرح لٹکتے نظر آتے ہیں! یہی باتیں سوچتا جا رہا تھا کہ لڑکی کی آواز آئی "اے بھائی۔ ذرا یہ دو گاگریں تو رکھ دے میرے سر پر!"

اس نے سوچا۔ یہ عجیب لڑکی ہے کہ دو گاگریں زمین سے اٹھا کر سر پر نہیں رکھ سکتی۔ پہلے ایک گاگر سر پر دھر لے۔ پھر جھک کر دوسری کو کولھے پر لٹکا لے۔ اور گھر چلی جائے۔ آگے رستے میں کھیت پڑتے ہیں۔ بھیڑوں نے ادھر کا رُخ کر لیا تو فساد ہو جائے گا کھیتوں کے رکھوالے سے۔ پچھلے دنوں بھی وہ گلیوں میں پڑا پڑا آتا پھرتا تھا کہ غونٹ ہر اُس کھیت میں بھیڑیں ہانک دیتا ہے جو پگڈنڈی کے آس پاس لہلہا رہے ہوں!

"ارے بھائی۔ سنتے ہو؟ یہ دو گاگریں ـــــ..."

اور غونٹ پلٹ کر بولا "اچھا اچھا!"

آگے بڑھ کر اس نے ایک گاگر اٹھائی اور اس کے سر پر دھر دی۔ بوجھ کی وجہ سے اس کی گردن کی رگیں تن گئیں اور گالوں پر ہلکا گلابی سا پسینہ پھوٹ نکلا۔ "بڑی کمزور چھوکری ہے" اس نے سوچا "اس عمر کی لڑکیوں کو میں نے تین تین گاگریں اٹھا کر گھوڑی کی طرح دوڑتے دیکھا ہے۔ اس کے سر پر دوسری گاگر رکھ دی گئی تو یہ ٹوٹ جائے گی بزدل اونٹنی کی طرح!"

مسکرا کر بولا "پہلی گاگر ہی نے تیرے ہوش اڑا دئے ہیں۔ اب اس دوسری گاگر سے تیرا دم ہی نہ نکل جائے"

اور وہ شرما کر بولی "میں بیمار ہوں بھئی۔ مجھے دس روز سے بخار آتا ہے، اُٹھا لے جاؤں گی۔ لے اب اُٹھا دو ورنہ ہی گا گر ہے۔ وہ دیکھ تیری بھیڑیں عطا کے کھیتوں میں گھس گئی ہیں!"

بھیڑیں سرسبز کھیتوں میں گھس کر مزے سے چر رہی تھیں۔ اور پرلی طرف پہاڑی پر سے خوفناک گالیوں کا ایک گرجتا ہوا سیلاب اُمڈ رہا تھا! گھبراہٹ میں عونت نے گاگر پکڑا کر جو نہیں اوپر اُٹھائی تو گاگر کی چکنی سطح پر اس کی اُنگلیاں نہ جم سکیں۔ وہ اس کے ہاتھوں سے پھسل کر لڑکی کے پاؤں پر جاگری اور خون کی ایک پتلی سی دھار اس کے انگوٹھے سے نکل کر پنگھٹ کے پانی میں گھلنے لگی!

"واہ رے گبرو" وہ آنکھیں مٹکا کر بولی "تو تو غلاموں کمہار سے بھی زیادہ نالائق نکلا۔ گاگر بھی توڑ دی۔ پاؤں بھی زخمی کر دیا۔ اور کھڑا مجھے بگلوں کی طرح گھور بھی رہا ہے۔ پگلا!"

اور عونت دبے پاؤں پنگھٹ سے ہٹ کر پگڈنڈی پر آگیا اور بھیڑوں کو کھیتوں سے نکالنے کے لئے بگٹٹ دوڑا۔ اُدھر سے کھیتوں کا رکھوالا بھی پہاڑی پر سے نہایت تیزی سے اُتر آرہا تھا۔ اور بھیڑیں مزے سے چپڑ چپڑ چر رہی تھیں!

کھیت کے قریب جا کر اس نے دو چار پتھر اُٹھائے اور بھیڑوں پر پھینکے۔ بھیڑیں تتر بتر ہو کر اِدھر اُدھر دوڑ گئیں اور پھر پگڈنڈی پر اکٹھی ہو کر ایک دوسرے سے لگ کر یوں چلنے لگیں جیسے اون کا ایک بہت بڑا ذخیرہ آپ ہی آپ کنکروں پر اوپر کی طرف کھسکتا جا رہا ہو۔ پلٹ کر عونت نے پگڈنڈی کا رُخ کیا ہی تھا کہ کھیتوں کے رکھوالے عطا نے زور سے ہانک لگائی "ابے کہاں تک جائے گا تو مجھ سے بچ کر؟ کمینے۔ یہ تیرے باوا کے کھیت ہیں کہ تو اپنی ماؤں کو اِدھر بھیج دیتا ہے؟"

عونت تو جہاں تھا وہیں کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ گاؤں کے اتنے گرانڈیل گبرو کو یہ بڈیوں کی مٹھی عطا یوں گھرک دے۔ گرج اُٹھا "منہ سنبھال کر بات کر عطا ورنہ لٹا دوں گا تختے کی طرح۔ جوان تیرے میرے کھیت کو کیا جانیں۔ دو چار تنکے چر لیے انہوں نے تو قیامت نہیں ٹوٹ پڑی۔ اس کے بدلے شام کو میرے گھر آکر ایک سیر آٹا لے جانا"

عطا، جو پہلے ہی ہانپ رہا تھا۔ بے دم ہو کر بولا "ابے کیا میں تکڑ گدا ہوں کہ تیرے گھر آکر آٹے کی بھیک مانگوں۔ بھرے گھر ہیں اناج کے دو دانے نہیں اور نواب صاحب مجھے بھیک دے رہے ہیں۔ اب تیرے اپنے تو بیسیوں کتے میرے گھر کی دہلیز دھونے پھر رہے ہیں۔ اگر پھر کبھی تیری اِن ماؤں میں سے ایک بھی ——— !"

اور عونت نے غضبناک ہو کر ایک پتھر اٹھایا اور تڑاخ سے عطا کے گھٹنے پر دے مارا۔ یوں آواز پیدا ہوئی جیسے کسی کتے نے کوئی بہت مضبوط ہڈی توڑ دی ہے، عطا کے کپڑے خون سے لت پت ہو گئے۔ چوٹ کی شدت سے لڑکھڑا جانے کے بہانے سے اُس نے تیزی سے ایک پتھر اُٹھایا اور گھما کر عونت کی طرف پھینکا جو پینترا بدل ایک طرف کود گیا اور پتھر سیدھا رینگتی ہوئی بھیڑوں میں جا گرا جو "با آ آ آ۔ با آ آ آ" پکارتیں آس پاس ڈھیریوں پر چڑھ کر نتھنے پھڑکانے لگیں۔

عونت، جواب دونوں ہاتھوں میں نکیلے پتھر اُٹھائے ہوئے تھا۔ عطا کو ڈپٹ کر بولا "دیکھ چھوکرے۔ اگر تو نے ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو سمجھ لے کہ تیری موت کے اس فرشتے نے تیری کنپٹی ادھیڑ کر رکھ دی" اور اس نے پتھر کو ہوا میں اچھالا "پلٹ کر وہاں پہاڑی پر چڑھ جا اور کھیتوں کی رکھوالی کر۔ شیر کی مونچھ کترنا آسان نہیں۔ سمجھے؟ تیری ان شعلے برساتی ہوئی آنکھوں سے غلاموں کمہار ہی خوف کھائے تو کھائے۔ گاؤں کا کوئی اور گبرو تو تجھے اپنے نتھنے کا بال بھی نہیں سمجھتا!"

اور یہ کہہ کر جیسے عونت نے لڑوں کا وہ ہار جو پنگھٹ والی چھوکری نے اس کے گلے میں ڈال دیا تھا۔ اتار کر عطا کے منہ پر دے مارا!

عطا پلٹ کر جاتے ہوئے بولا "سمجھ لوں گا تجھ سے سمجھ لوں گا"

"کیا سمجھے گا تو؟" عونت پگڈنڈی کی طرف مڑتے ہوئے بولا۔ "چھپکلی اگر اژدہے کو دھمکی دے تو اژدہے کا کیا بگڑ جائے گا"

"خیر سمجھ لوں گا" عطا بولا۔ آمد پر جب عونت آس پاس بکھری ہوئی بھیڑیں اکٹھی کر رہا تھا اور عطا پہاڑی کے دامن پر پہنچ چکا تھا تو اس نے عونت کو ایسی گونجیلی اور فولادی گالی دی۔ کہ تمام پہاڑیاں بجنے لگیں۔ جیسے تانبے کی چادروں پر ایک دم پتھروں کا مینہ برس پڑے، عونت نے گھوم کر عطا کی طرف دیکھا اور پھر اس زور سے قہقہہ لگایا کہ تانبے کی چادروں پر پتھروں کی ایک بار پھر موسلا دھار بارش ہو گئی۔ گالی کا جواب قہقہہ! یہ اس کے نزدیک سب سے بڑی گالی تھی!

اور جب وہ گھاس سے ڈھکی ہوئی پہاڑیوں پر پہنچا۔ تو حسب معمول پتھر اور پگڑی کا تکیہ بنا کر لیٹ گیا۔ بنسری لبوں سے لگائی۔ اس کی سانس غیر ارادی طور پر بنسری سے چیخ بن کر نکلتی آس پاس نشیبوں میں ڈوب گئی۔ اور عونت نے محسوس کیا جیسے اس چیخ میں کسی کی آواز آئی ہے "غلاموں کمہار"

سینے کے اندر چڑ چڑ سی ہونے لگی جیسے کوئی کباب بھون رہا ہو انگاروں پر۔ اُٹھ کر اِدھر اُدھر گھومتا ہوا ایک خوبصورت نوخیز بھیڑ کو

گود میں اٹھا کر اس کے بالوں میں منہ گھسیڑے بہت دیر تک سوچتا رہا۔ ارے وہ غلاموں کمہار جس کی ایک آنکھ پچک کر خدا جانے کہاں گم ہو گئی ہے اور جس کے سامنے کے چار دانت مدت سے غائب ہیں۔ ارے وہی غلیظ غلاموں جو مجھے ملتا ہے اور میرے گھٹنوں کو چھوتا ہے، تو مجھے اس سے گھن سی آنے لگتی ہے، وہ کمبخت جس نے ایک بار اپنے تازہ تازہ تیار کئے ہوئے گیلے گھڑے پر بیٹھے ہوئے کوے کو پکڑ کر اس کی گردن کو دانتوں نے چبا ڈالا تھا۔ ارے وہی غلاموں کہا ——— !"

اور پھر پھیرٹ کو گود سے اتار کر اس نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ آنکھیں ناک۔ لب۔ ٹھوڑی۔ سینہ۔ باہیں۔ پنڈلیاں۔ سب کو ٹٹولا۔ اور پھر اکڑ کر بولا۔ "کہاں غونث کہاں غلاموں کمہار ——— کہاں راجہ بھوج کہاں گنگو تیلی ——— لڑکی نے مجھے اچھی طرح نہیں پہچانا!"

پتھر اور پگڑی کا تکیہ بنا کر وہ پھر اپنی لانبی گھاس میں لیٹ گیا۔
جونہی بنسری سے ایک دو سُر نکلے تو اُسے محسوس ہوا جیسے ہر طرف ان دیکھی روحیں چیخ چیخ کر "غلاموں۔ غلاموں۔ پکار رہی ہیں۔ بنسری کو زور سے زمین پہ پٹخ دیا۔ اور سینے کو بے تابانہ ملتے ہوئے بولا "اونہہ! ——— غلاموں تو جیونٹا ہے میرے سامنے۔ یوں چٹکی میں مسل دوں! میں نے عطا ایسے اکڑے ہوئے نوجوان کے دُم لگا دی۔ غلاموں بے چارا تو میری اس چھنگلیا کی مار ہے!"

مگر اس کی رگ رگ میں جیسے بالوں بھرے کیڑے رینگ رہے تھے۔
اس روز وہ جھرنے کے کنارے چوڑی چٹان پر کھانا کھانے بیٹھا تو ایکا ایکی اسے خیال آیا "یہ اتنی بڑی پیاز ہے۔ اچھے اچھے پہلوان اسے دو ہتھیلیوں میں رکھ کر نہ توڑ سکیں اور میں ——— میں ———!" اور اُس نے پیاز کو ہتھیلیوں میں جما کر دبایا۔ نچلا ہونٹ دانتوں میں جکڑ لیا اور پھر کڑوے لعاب کی ایک دھار چوڑی چٹان پر سنگتی جھرنے میں گرنے لگی۔ غونث نے جب اپنی گرفت ڈھیلی کی تو پیاز بھوسہ بن چکی تھی۔ اس نے بہت زور کا قہقہہ لگایا۔ اور پھر روٹیوں کو وحشیوں کی طرح نگلنے لگا۔ اوپر سے جھرنے کا پانی پینے کے لئے جھکا ہی تھا کہ اُسے جھرنے کے آئینے میں اپنا چہرہ نظر آگیا۔ موٹی موٹی آنکھیں۔ ننھی ننھی مونچھیں۔ لال رنگ۔ لہراتے بال ——— اُس نے مسکرانے کے لئے اپنے لبوں کو جنبش دی ہی تھی کہ ایک طرف سے ایک بڑا سا مینڈک لپکا اور جھرنے میں کود کر تہ کی طرف تیر گیا۔ سطح پر ننھی ننھی لہروں کا جال سا بچھ گیا۔ اور غونث نے اپنے سلوٹیں پڑے عکس کو دیکھ کر یوں محسوس کیا جیسے یہ مینڈک غلاموں کمہار تھا جس نے اُس کے چہرے پر دُنیا جہان کی لعنتیں چپکا دیں! مینڈک کو پکڑنے کے لئے وہ جھرنے میں کود گیا۔

تہ پر بیٹھی ہوئی مٹی نے اِدھر اُدھر بکھر کر سارے پانی کو گدلا کر دیا اور مینڈکوں کا ایک غول اپنی لمبی لمبی ٹانگیں پھیلاتا دور کسی نامعلوم تہ کی طرف لپک گیا۔
اس روحانی کرب سے اس کے دماغ میں جیسے لوہے کا من بھر کا ٹکڑا ناپ کر پھٹنے کی حد تک پہنچ گیا۔ اور پھر وہ ایک جھرنے سے دوسرے جھرنے تک۔ دوسرے جھرنے سے اوپر چوٹی کی جھاڑیوں کے پاس ——— جھاڑیوں سے دور اندھیری کھاڑیوں میں گول مول پتھروں کے انبار کے قریب ——— وہ گھومتا پھرا۔ اور جب سورج پچھم کے پہاڑوں پر سرسوں سی بکھیرنے لگا تو وہ گاؤں کو پلٹا۔ پنگھٹ کے قریب پہنچا تو ادھر سے غلاموں کمہار دو گدھے ہانکے آرہا تھا۔ جان بوجھ کر غونث نے اس کے قریب سے گزر کر اس کے شانے سے شانہ بھڑا دیا۔ اور پھر کڑک کر بولا "اے اندھا ہے تو۔ ابھی ایک آنکھ تو سلامت ہے تیری۔ راہ دیکھ کر نہیں چلتا؟" اور غلاموں ہاتھ جوڑ کر بولا "غلطی ہو گئی ملک۔ بھول ہو گئی۔ بخش دے"

"کمینہ!" ——— غونث نے جیسے دماغ میں سے من بھر لوہا اور رگوں میں سے بالوں بھرے کیڑوں کو گھسیٹ کر پرے پٹخ ڈالا ہے! پنہاریاں ایک دوسرے سے پوچھنے لگیں "اری کون ہے یہ؟" ——— "غونث ہے نا۔ محبت خاں کا لڑکا!" ——— "بڑی آگ ہے اس میں!" ——— اور ایک بڑھیا نے اپنے سن کی رعایت سے ایک جھوٹ تول دیا "بڑا بھلا چھوکرا ہے۔ غلاموں کی موت آئی تھی کہ اس کی راہ میں آگیا۔ سنا ہے اس نے پرسوں ایک بیل کے گھونسا مارا اور وہ زمین پر بچھ گیا۔ ٹانگ تک نہ کھینچی کمبخت نے!" ——— اور ادھر سے ایک ادھیڑ عمر کی پنہاری بولی "اری یہی تو ہے جس نے عطا کا کلا دھن دیا ہے آج!" ——— سب لڑکیاں دانتوں تلے انگلی دبائے بہت دیر تک غونث کو دیکھتی رہیں جو اب نہایت تیزی سے گلی کا موڑ کاٹ رہا تھا!

اور غونث سوچتا جا رہا تھا "اس چھوکری کو کتنی غلطی ہوئی ہے شاید غلاموں کمہار کا لفظ یونہیں بے مطلب اس کے لبوں سے ٹپک پڑا تھا۔ وہ اگر اب یہاں پنگھٹ پر ہوتی اور میری گرج سنتی تو اسے معلوم ہو جاتا کہ غونث کوئی معمولی دل گردے والا نوجوان نہیں ہے ——— اس نے کاندھے جھٹکا کر سینہ تان لیا اور جب گھر آیا تو خلافِ معمول تن کر چلنے سے اس کی کمر دُکھ رہی تھی!

رات پھر وہ یہی سوچتا رہا کہ کاش وہ لڑکی وہاں پنگھٹ پر موجود ہوتی۔ اور پھر گاگر لوٹ گئی تو میرا کیا قصور تھا۔ خود گاگر کے پیندے پر سبز سبز چکناہٹ لپٹی ہوئی تھی۔ اُس پر نور ستم کا ہاتھ بھی نہ جم سکتا۔ سارے گاؤں میں کسی کو خاطر میں نہ لانے والا اب اس کے سامنے آنکھیں تک نہ اٹھا سکیگا۔

اس کے نزدیک تو ہیں ——— میں ——— "اور ساری دُنیا کے بزدل جانور اس کے سامنے آتے" اور دُمیں ہلاتے کہیں غائب ہو گئے!

اور جب صبح اُٹھ کر اس نے باڑے سے بھیڑیں نکالیں اور پنگھٹ کے پاس سے گزرا تو وہی لڑکی اسی حالت میں کھڑی نظر آئی۔ غونث کو دیکھ کر اس نے منہ پھیر لیا اور کسی اور راہ چلتے کے انتظار میں دوسری طرف دیکھنے لگی۔ کہ اچانک غونث اس کے قریب آ گیا۔ "لاؤ میں گاگریں سر پہ رکھا دوں"

اور وہ تن کر پلٹی "میں اپنی گاگروں کی دشمن ہوں کیا۔ جا اپنی راہ لے!"

غونث نے لجاجت سے کہا "اری تیری اُس گاگر کے پیندے سے سبز چکناہٹ لپٹی ہوئی تھی۔ ورنہ میرا ان سے کونسا بیر ہے۔ میں تو شرمندہ ہوں کہ تیری گاگر بھی توڑی۔ تیرا پاؤں بھی زخمی کیا۔ اور تیری نفرت بھی خرید لی۔ میں تو بہت شرمندہ ہوں۔ میں نے پانچ پانچ من کے پتھر ایک ہاتھ پہ اٹھا کر گھمائے ہیں اور کنکروں کی طرح پرے پھینک دئے ہیں۔ یہ گاگر کیا چیز ہے میرے سامنے۔ لا!"

اور اس نے ایک گاگر اٹھا کر لڑکی کے سر پہ دھر دی اور دوسری کو کچھ اس انداز سے پہلی گاگر پہ جمایا کہ کوئی آواز نہ آئی۔ لڑکی کے قدم تک نہ ڈگمگائے لڑکی کو یوں محسوس ہوا جیسے اوپر سے کسی نے پھول پھینک دیا ہے۔ وہ مسکرائی "واہ رے۔ آج تو غضب ڈھا دیا۔ تو نے گاگر رکھی بھی ہے سر پہ؟ مجھے تو کچھ پتہ تک نہیں چلا۔"

اور غونث کے ماتھے پر مسرت کا پسینہ پھوٹ نکلا۔ بولا "مجھے کل کی بات کے لئے معاف کرنا۔ دراصل اس گاگر کی قسمت ہی میں پھوٹنا لکھا تھا ورنہ ——— "

"کوئی بات نہیں" لڑکی نے جاتے ہوئے کہا "غلاموں کمہار زندہ ہے تو گاگروں کی کیا پرواہ ہے!" اور غونث کے دل کو جیسے کسی نے چٹکی سے نوچ لیا ہے، گھبرا کر لڑکی کی طرف دیکھا جو کھلکھلا کر ہنس پڑی اور غونث بھی قہقہہ لگانے پہ مجبور ہو گیا۔ اور یونہی غیر محسوس طور پہ غونث نے اس کے مسکراتے ہوئے لبوں کے گوشوں کی مبہم کپکپاہٹیں اپنی آنکھوں میں بسا لیں اور پھر جب ادھر بھیڑوں کی طرف دیکھا تو وہ کل کی طرح کھیتوں میں مزے سے چر رہی تھیں۔ بھاگا بھاگا وہ کھیت کے قریب پہنچا ہی تھا کہ چٹان کی آڑ سے عطا نے اٹھ کر اس پہ پتھروں کا مینہ برسا دیا۔ اور جب اس نے آنکھیں کھولیں تو اپنے گھر کھاٹ پہ لیٹا ہوا تھا۔ اس کے سر، بانہوں، سینے اور پنڈلیوں پہ پٹیاں بندھی ہوئی تھیں اور چہرے پہ صرف ہونٹ اور آنکھیں کھلی تھیں۔ اور پھر سب سے پہلے اُس کے ذہن میں پتلے پتلے ہونٹوں کے دلآویز نقوش ابھرے جن کے مبہم گوشے پھڑک رہے تھے اور پھر اُسے عطا یاد آگیا اور پھر ——— پھر ———!

"پھر کیا ہوا؟" اس نے آس پاس کھڑے ہوئے لوگوں سے پوچھا۔

اور اس کی ماں جو پائنتی پہ بیٹھی رو رہی تھی۔ بولی "کیا ہوا! کچھ نہیں ہوا! بس عطا نے اپنی موت کو آپ بلایا ہے۔ تو اچھا ہو لے میرے لال۔ پھر میرے پاس اس کے وہ ہاتھ کاٹ لانا جن سے اس نے تجھ پہ پتھر پھینکے، میں انہیں بھون کر بلی کے آگے ڈال دوں گی، بیچاری کئی روز کی بھوکی ہے۔"

غونث نے پوچھا "لیکن مجھے وہاں سے اٹھا کون لایا؟"

اور اس کی ماں بولی "اس وقت شاید پنگھٹ پہ شریف خاں کی لڑکی مہتاب پانی بھر رہی تھی۔ تمہاری لڑائی کا شور سنا تو بھاگی بھاگی آئی اور سارے گاؤں کو اطلاع دی۔ خدا بھلا کرے بےچاری کا۔ ہم سب وہاں پہنچے تو تُو پتھروں پہ لہولہان پڑا تھا اور وہ شیطان کا بچہ عطا غائب تھا۔ ہم پہ مہتاب نے احسان کیا ہے، بےچاری میرے پاس ابھی تک بیٹھی رہی۔ ماں بھی ساتھ تھی اُس کے۔ اگر وہ ہمیں اطلاع نہ دیتی تو ——— تو ——— " اور غونث کی ماں کی آواز بھرا گئی۔

غونث مسکرا کر بولا "تو گدھ ہیں اور کوّے اور ——— " وہ زور سے ہنسا۔ "خیر دیکھا جائے گا۔ دیکھ لوں گا۔ اچھا!" ——— اور اس کی آنکھیں آہستہ آہستہ بند ہونا شروع ہو گئیں۔ اور جب ان کے پوری طرح بند ہونے میں صرف ایک ذرا سی جھپکی کا وقفہ تھا تو غونث مسکرانے لگا۔ اُسے سامنے چھت پہ مہتاب کے کپکپاتے ہوئے ہونٹ تیرتے نظر آئے، اور پھر ان میں حرکت ہوئی ——— اور انہوں نے کہا ——— یہ اس خواب کی ابتدا تھی جو شام تک سوتے ہوئے غونث کے خیالات پہ منڈلاتا رہا۔ وہ دلآویز خواب جس کے ختم ہو جانے پہ جب اُس نے آنکھیں کھولیں تو اُسے دھچکا سا لگا۔ اور وہ چیخ کر بولا "مجھے سونے دو!" ——— اور آس پاس کھڑے ہوئے لوگ سرگوشیاں کرنے لگے "بیچارے کے دماغ پہ اثر پڑا ہے" اور پھر قریب ہی کھڑے ہوئے غلاموں کمہار نے یہ بات چوپال پہ جا کر کہہ دی کہ غونث کا دماغ چل گیا ہے، اور پھر گلی گلی یہی تذکرے ہونے لگے کہ "غونث دیوانہ ہو گیا ہے۔ بےچارہ غونث!"

لیکن غونث دیوانہ نہیں ہوا تھا۔ اس نے تو شعور اور احساس کے اس وسیع کرے میں قدم دھرا تھا جہاں ہر طرف روشنیاں اور دھندلکے آپس میں لپٹے پڑے تھے۔ اور جہاں رات اور دن کے سکوت اور ہنگامے آپس میں دست و گریباں تھے۔ بیماری کے ایام میں اس نے بہت سی باتیں سوچیں بہت عجیب عجیب باتیں۔ اگر یوں نہ ہوتا تو کیا ہوتا۔ اور اگر یوں ہو جائے تو کیا ہو جائے۔ اور اگر کچھ بھی نہ ہو تو کیا ہو، اس کے دماغ پہ بےشمار لامتناہی

تار پھیل گئے، لیکن یہ تار شفاف تار تھے کبھی کبھی وہ تاباں مستقبل کے سامنے آکر چاند کی کرنوں کی طرح جگمگا اٹھتے اور کبھی مبہم سوچوں کے دھندلکوں میں لپٹ کر دھوئیں کی باریک، دھاریاں بن جاتے، اس کی ماں اُسے اکثر بتاتی کہ آج پھر مہتاب اپنی ماں سمیت اس کا حال پوچھنے آئی تھی۔ اور عونت کی نبضیں یوں دھڑکتیں جیسے اس کے زخموں کے کھرنڈ پر کوئی ہُد ہُد بیٹھا ٹھونگیں مار رہا ہو، ان تمام دنوں میں عطا اُس کے ذہن پر بہت کم اُبھرا۔ اور جب ابھرا تو اپنے لال لال دیدے پھیلاتا پھر انہیں گہرائیوں میں ڈوب گیا!

اور پھر ایک روز ایسا بھی آیا کہ جب مہتاب آئی تو وہ جاگ رہا تھا' کواڑ کو پار کر کے جب اس کی نظریں صحن میں گھومتی ہوئی دیوار تک پہنچیں تو اچانک اس کے زخموں پہ وہی آن دیکھا ہُد ہُد چونچ تیز کرنے لگا! اس کی پتلیوں پر ایک آبی پردہ سا پھیل گیا۔ اور پھر جب اُس نے آنکھیں ملیں تو اُسے مہتاب نظر آگئی۔ نیچی نظریں کئے۔ پاؤں کے انگوٹھے کے زخم پہ تنکا پھیر رہی تھی۔ اور پھر جب اس کی پلکیں جنہوں نے اس کے گالوں پر سائے پھیلا رکھے تھے۔ اُٹھیں، تو عونت نے یوں محسوس کیا۔ جیسے ساری کائنات اوپر اُبھر کر فضاؤں میں معلق ہو گئی ہے! جیسے سپیرے نے سانپوں بھرے پٹارے پر سے ڈھکنا اُٹھا دیا ہے اور سانپ لہرا لہرا کر آس پاس رینگتے پھر رہے ہیں۔ جیسے کسی تشنہ لب کی اوک میں کسی غیر محسوس ساقی نے آب کوثر کے مٹکے انڈیل دئے ہیں ——— جیسے بہت سی باتیں اس کے ذہن میں آئیں۔ مہتاب کی پلکیں جھپک کر پھر اُٹھیں۔ ادھر اُدھر گھوم کر اس کی نگاہیں عونت پہ جم گئیں اور عونت نے اتنی طویل انگڑائی لی کہ اس کی چھاتی پہ بندھی ہوئی پٹیاں ڈھیلی پڑ گئیں۔ اور پھر مہتاب جانے کے لئے اُٹھی۔ اپنے پرانے میلے آنچل کو تان کر سینے پر پھیلاتی۔ بوسیدہ جوتے گھسٹتی۔ دو تین ادھر جھکی ہوئی لٹوں کو اُدھر کانوں کے پیچھے جماتی، جب وہ عونت کی کوٹھڑی کے سامنے سے گزری تو عونت نے اپنے خشک گلے سے ایک کھڑکھڑاتی ہوئی آواز نکالی۔

"اچھی ہو مہتاب ؟"— مہتاب ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی اور پھر گھوم کر ایک طرف ہو گئی اور ایک انگلی کے ناخن کو اپنے دانتوں سے جیسے کترنے لگی۔ مہتاب کی ماں اندر عونت کے پاس آگئی، اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا۔ اور اس کی ماں کو مخاطب کرتی ہوئی بولی "لے، اب تو اچھا ہے تیرا لال۔ مُنہ پر لالی آ رہی ہے"

اور عونت کی ماں ناک پر انگلی دھرتی ہوئی بولی "لالی میرے لال کے چہرے سے گئی ہی کب تھی! —— دو چار خراشیں تھیں۔ کل پرسوں تک دوڑنے بھاگنے لگے گا۔ بوڑھے باپ کو پہاڑوں پر جانے کی تکلیف سے بچا لے گا، اور —— اے مہتاب بیٹی اندر آ جا۔ باہر دھوپ میں کھڑی کیوں جل رہی ہے؟"

اور مہتاب اندر آگئی۔ اور عونت کے سینے کے زخموں میں پھر ہزار لمبی لمبی نکیلی چونچیں چبھنے لگیں!

"اچھے ہو عونت ؟" اس نے پوچھا۔ اور اس کے سارے جسم کا خون اس کے گالوں میں سمٹ کر یوں تمتمانے لگا جیسے پکے پھل کی طرح اسکا رس آپ ہی آپ رسنے لگے گا۔ اُس کے مرمت شدہ جوتے کے دو ایک ٹانکے ادھڑ گئے تھے۔ جس میں سے اس کی مرمریں جلد کی ایک شعاع سی نکل رہی تھی!

اور عونت دم بخود لیٹا سوچنے لگا۔ کہ یہ مردوئے خود پانی کیوں نہیں بھرتے۔ خود کھانا کیوں نہیں پکاتے۔ کڑکتی دوپہروں میں خود چڑیاں کیوں نہیں اڑاتے۔ یہ نازک نازک پھول۔ یہ نور میں ڈھلی ہوئی پتلیاں کیا ایسے کاموں کے لائق ہیں! —— اور اس نے دل ہی دل میں موجودہ گھریلو نظام کو بدلنے کے کئی دہقانی طریقے سوچے۔

پھر مہتاب اور اس کی ماں چلی گئیں۔ اور عونت دو چار دنوں کے بعد صحن میں گھومنے پھرنے لگا!

ایک روز لاٹھی ٹیکتا چوپال پر گیا تو اُسے سامنے عطا بیٹھا نظر آیا۔ لاٹھی اُٹھی اور زمین کی طرف جھک گئی۔ اور اس نے سوچا کہ انتقام کے شعلوں پر پانی چھڑکنے کا یہ موقع نہیں، پنگھٹ کے قریب والے کھیت ہی اس مطلب کیلئے موزوں رہیں گے۔

اور پھر جب وہ مدت کے بعد بھیڑیں ہنکائے ان کھیتوں کے قریب سے گزرا تو اُسے عطا دور پہاڑی پر کھڑا نظر آیا۔ اور پھر آن کی آن میں وہ پہاڑی کی پرلی طرف اتر گیا۔ ایک لمحے کے لئے اس کا جسم غصے سے تپ کر انگارہ بن گیا لیکن اُسے ان فروعی باتوں کے متعلق سوچنے کی فرصت نہیں تھی۔ اُس نے اس تپش پر خنک بوندیاں سی برسانا شروع کر دیں۔ مہتاب کے ہونٹوں اور آنکھوں اور گالوں کے ہولے بار بار سامنے نیلے آسمان پہ تیرنے لگے!

چوٹیوں کی تیز اور ٹھنڈی ہوائیں اپنے بچھڑے ہوئے دوست کی بلائیں لینے لگیں۔ وہ گھاس میں پتھر اور پگڑی کا تکیہ بنا کر لیٹا ہی تھا کہ اچانک اُسے کمر میں کوئی چیز چبھی۔ کروٹ بدل کر دیکھا تو زور سے قہقہے لگا کر بولا۔ "ارے امیری بنسری!" —— اُس نے اپنی گرد آلود بنسری اُٹھالی۔ اور چمکتی ہوئی آنکھوں سے اس کا جائزہ لیا۔ اچانک دو چار ٹڈیاں اس کے اندر سے نکلیں اور پھدکتی ہوئی گنجان گھاس میں غائب ہو گئیں۔ اور اس نے ایک اور قہقہہ لگایا۔ "میری مظلوم بنسری! ٹڈیاں گھس گئیں تجھ میں؟ گرد جم گئی تجھ پہ؟ ارا رے!" اور اس نے پگڑی کے ایک پلو سے اُسے جھاڑا۔ "ارے بچھڑی ہوئی پیاری چیزوں سے مل کر کتنی خوشی ہوتی ہے!" —— اور زبان کی نوک سے ہونٹوں کو تر کر کے اُس نے بنسری بجائی۔ بنسری بلبلانے لگی۔

جیسے کہہ رہی ہے "چھوڑ دے ظالم۔ پھینک دے مجھے۔ بڑا آیا پیار کرنے والا۔ میں اب یہیں اچھی ہوں۔ لاش پہ آبِ حیات چھڑکتا ہے! ارے ہٹ دے۔ دیکھ تو دھوپ نے میرا روغن ہی اکھیڑ پھینکا ہے!"

غونث بنسری کی باتیں سمجھ گیا۔ اُسے بغل میں دبا کر وہ جھرنے پہ آیا۔ اور ٹھنڈی صاف چٹان پہ بیٹھا ہی تھا کہ اُسی چٹان کی اوٹ سے ایک شعلہ سا اُٹھا۔ ایک مجسم شعلہ۔ گھبرائی ہوئی مہتاب! جس کی آنکھوں کے کٹوروں سے خوف، حیا اور مسرت کے خمار چھلک رہے تھے، اور جس کے اماوس کی راتوں ایسے کالے بال اس کے پھٹے پرانے دوپٹے کی گرفت سے نکل کر اس کے سینے کے نشیب و فراز پہ لہرا رہے تھے!

"تم؟" غونث بولا۔ اور بنسری اس کی بغل سے نکل کر چٹان پہ کھڑ کھڑاتی نیچے گیلی مٹی میں جا گری۔ اور پھر اُسے بنسری کا ـــــ اس بچھڑی ہوئی پیاری چیز کا خیال نہ رہا۔ اس کے سامنے اب بنسری سے زیادہ رسیلی چیز کھڑی تھی۔ مہتاب۔ کے لبوں پہ گھبرائی ہوئی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ ہراساں اور متذبذب مسکراہٹ۔ جیسے وہ مسکرانا چاہتی بھی ہے اور مسکرانا نہیں بھی چاہتی!

"تم مہتاب؟" غونث نے چٹان پہ گھٹنوں کے بل بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ارے تم؟" اور مہتاب کے لبوں میں حرکت آئی جیسے بند کلی سے بھونرے کے نکلتے وقت نرم پنکھڑیاں تھرتھرا جاتی ہیں۔ "ہاں میں"

"تم کہاں؟" ـــــ آس پاس چرتی ہوئی بھیڑیں آنکھیں جھپکانے لگیں!

"گھاس کاٹنے آئی ہوں" اس نے زمین پہ سے رستی اور درانتی اٹھاتے ہوئے کہا۔

"لیکن تمہیں گھاس نہیں کاٹنی چاہئے؟"

"کیوں؟"

"تمہارے ہاتھ کھردرے ہو جائیں گے!"

اور مہتاب مسکرا دی۔ لیکن اس مسکراہٹ میں گھبراہٹ یا تذبذب نہ تھا۔ یہ تو صاف ستھری نئی نئی صبح کی طرح بے داغ مسکراہٹ تھی۔ اور پھر غونث بھی مسکرانے لگا۔ اور ان مسکراہٹوں کے تصادم سے جو شعلہ ٹوٹا وہ دونوں کے دلوں کو جھلستا اُن کے رگ و پے میں سرسرانے لگا ـ!

"عطا بڑا ظالم ہے" مہتاب بولی۔

"میں اُسے مزا چکھا دوں گا کسی دن" غونث تن کر بولا۔

"لیکن تم قید ہو جاؤ گے" مہتاب بولی۔

"ہونے دو قید۔ سینے میں یہ سلگتا ہوا تنور تو ٹھنڈا ہو گا" اس نے اپنی چھاتی پہ ہاتھ مار کر کہا۔

"لیکن ٹھنڈے تنوروں میں روٹیاں نہیں پکتیں۔ سڑ جاتی ہیں یا لٹک کر نیچے راکھ میں گر جاتی ہیں"

"کیسی روٹیاں؟" غونث نے حیران ہو کر پوچھا۔

اور مہتاب مسکرا کر بولی "ارے! میں کیسی بات کہہ گئی!"

لیکن غونث سوچنے لگا کہ واقعی وہ عطا کو اس کے کئے کا پھل دینے کی دُھن میں قید ہو جائے گا۔ اور پھر یہ مہتاب ـــــ یہ مہتاب ـــــ یہ مہتاب! اس کے خیالات مہتاب سے پرے نہ جا سکے۔ یہیں ہجوم ہو گیا ان کا۔ نہیں۔ وہ قید نہیں ہو گا۔ خدا بڑا منصف ہے۔ وہی عطا سے نبٹ لے گا!

اور یوں اس کے سینہ کا تنور یخ بستہ ہو کر رہ گیا!

اس نے مہتاب کے لئے گھاس کاٹی۔ گٹھا باندھا۔ اور پھر اُس کے پاس آ کر بولا "میں اُٹھا لاؤں گا یہ گٹھا۔ تم تھک جاؤ گی"

"میں نہیں تھکتی۔ ایسے دو گٹھے اُٹھا لیتی ہوں میں!"

"اچھا!" ـــــ اور غونث نے ہنستے ہوئے گٹھا اُٹھا کر اس کے سر پہ دھرا تو وہ بے طرح ڈگمگا گئی۔ اور چلائی "ارے ذرا ہلکا کر اسے، اس میں پتھر تو نہیں لپیٹ دئے تو نے"

قہقہوں سے یہ ٹھنڈی کھاڑی گونج اُٹھی۔ غونث نے گٹھا کھول کر اُسے ہلکا کیا۔ اور پھر جب مہتاب جانے لگی تو وہ بولا "مہتاب۔ گھاس کاٹنے اودھر ہی آ جایا کر۔ یہاں میں تجھے مدد بھی دوں گا اور پھر یہاں گھاس بھی عام ہے!"

"گھاس تو پوربی پہاڑیوں پہ بھی عام ہے" وہ گٹھے کو پیچھے ہٹا کر اُسے دیکھتے ہوئے بولی "لیکن میں اِدھر ہی آ جایا کروں گی"

اور غونث کی سانسیں فرطِ مسرت سے آپس میں گتھم گتھا ہو کر رہ گئیں!

مہتاب روز وہاں آنے لگی۔ دن ڈھلے تک جھرنے کے آئینے میں دونوں کے عکس کانپتے رہتے۔ دیر تک وہی باتیں ہوتی رہتیں جو حضرت وارث شاہ، ہیر کے قصے میں لکھ گئے ہیں۔ اور پھر ایک روز عہد و پیماں بھی ہوئے۔ چھلے بھی بدلے گئے۔ کپکپاتے ہوئے ہونٹ بھی ایک دوسرے کو چھو گئے، زلفیں بانہوں پہ بکھر گئیں۔ اور گال سے گال بھی ملے۔ یعنی وہی کچھ ہوا جو ایک لڑکی لڑکے کی محبت کے دوران میں ازل سے ہوتا آیا ہے اور ابد تک ہوتا جائے گا۔

اور پھر اچانک یورپ کی قیامت خیز جنگ چھڑی۔ رکروٹنگ افسر

اس گاؤں میں بھی آئے، نوکری کی دُھن میں غونث بھی لنگو ٹا کھینچ امیدواروں کی قطار میں کھڑا ہوگیا۔ اور جب صاحب اس کے مقابل آئے۔ تو بولے "وَل یہ جوان بڑا لڑاکا معلوم ہوتا ہے۔ اس کا سارا باڈی زکھم زکھم ہے۔ وَل ٹم جوان کا نام مانگٹا ہے"

"غونث" وہ بولا۔

"گھونس" صاحب نے ایک کاغذ پر کچھ لکھا اور اسی قطار میں کھڑے ہوئے عطا نے اپنے ایک ساتھی کو ٹھوکا دے کر کہا "کچھ سُنا —— گھونس!"

اور غونث کے سینے کے بیچ بستہ تنور سے دو چنگاریاں سی اُبھر کر بجھ گئیں۔

صاحب جب عطا کے مقابل آئے تو بولے "وَل۔ ٹم لوگ کا چھاتی اس ماسپھک ہے" اور انہوں نے ہاتھ کی انگلیاں تان کر ہوا میں ایک بالشت بنائی "اس ماسپھک سے بھی توڑا اکم۔ ٹم لوگ نامرڈ ہے" —— عطا قطار سے باہر دھکیل دیا گیا۔

اور غونث ہنسی ضبط کرتے ہوئے قریب کے نوجوان کا ہاتھ دباتے ہوئے بولا "ارے سُنا تو نے؟ —— نامرد!" اور عطا کی چھاتی اور بھی سمٹ گئی!

اُس روز شام کے بعد غونث نے غلاموں کمہار کو اپنے ہاں بلایا۔ اور بولا "لے بھئی۔ ایک کام کر۔ لیکن کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے پائے۔ ورنہ ہم تم دونوں کل قبروں میں پڑے سڑ رہے ہوں گے۔ لے یہ پانچ روپے۔ اِدھر شریف خاں کے گھر چلا جا۔ شریف خاں اور اس کی گھروالی باہر ایک شادی پہ گئے ہوئے ہیں۔ ان کی بیٹی مہتاب ہے نا۔ وہ بیٹھی ہوگی دالان میں۔ اُسے میرا نام کہیو۔ ہے نا؟ پھر اُسے یہ چھلا دکھا دیجو۔ سمجھے؟ اور پھر کہیو۔ کہ اُدھر گاؤں کی اُتری کھاڑی میں —— وہ تمہارے آدمی سے کچھ ہٹ کر —— بس وہیں آجائے وہ —— اور کہیو۔ کہ غونث بھرتی ہوگیا ہے فوج میں —— جا! لیکن دیکھیو۔ اگر کسی کو پتہ چلا تو یہ دو چار بچے کھچے دانت بھی توڑ ڈالوں گا۔ لے بھاگ جا"

اور غلاموں پانچ روپوں کا نوٹ مٹھی میں دباتے ہوئے بولا "ارے ملک۔ کیسی باتیں کرتا ہے تو۔ کمبخت فرشتوں کو بھی پتہ نہ چلے۔ ہم نے یہ جو یہیں دھوپ میں سفید نہیں کیں" —— غلاموں کے ڈاڑھی نہیں تھی!

غونث دیر تک اندھیری کھاڑی میں بیٹھا گول گول سنگریزوں سے کھیلتا رہا۔ اور پھر جب نیا نیا چاند دُور اندھیرے غاروں میں گر گیا تو مہتاب آنکلی بھیگی ہوئی آنکھیں۔ بھیگی ہوئی پلکیں۔ بھیگے ہوئے گال بھیگا ہوا آنچل بسسکیاں بھرتی دھڑام سے غونث کے قریب گر گئی!

غونث نے بڑھ کر اُسے اُٹھایا اور بولا "اری صبر کر۔ لوٹ آؤں گا میں۔ پہلے یہیں جبل پور میں سکھلائی ہوگی ہماری۔ پھر میں چھٹی پہ آؤں گا۔ اور پھر —— پھر سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا پگلی!"

"ہاں۔ میں پگلی" وہ روتی بسورتی بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "اور تو بڑا دانا۔ سولہ سترہ ٹھیکریاں قبول کرلیں اور مجھے پرے پھینک دیا۔ تجھے تو چاندی پیاری ہے۔ میں تو یونہی تم سے چمٹی پھرتی رہی —— چاندی کا اتنا شوق تھا تو مجھے کہتا۔ میں چکی پیس کر تجھے اتنی رقم کما دیتی۔ یہ لے اپنا چھلا" —— اس نے انگلی سے چھلا اُتارنے کی کوشش شروع کردی۔

"اری۔ تو تو دیوانی ہوگئی ہے مہتاب" غونث نے تسلی دیتے ہوئے کہا "نوکری کرنا ہی پڑتی ہے پگلی —— سرکار کو ضرورت ہے ہماری —— اور پھر تم جانتی ہو میرا ابا بہت بوڑھا ہو چکا ہے —— اب میں ہی تو کمانے والا ہوں سارے گھر میں"

"بڑا کماؤ کہیں کا!" مہتاب بولی "یہ کمبخت چھلا نہیں اُترتا ورنہ میں تجھے واپس دے دیتی۔ تو اُدھر عجیب عجیب ملکوں میں چلا جائے گا مرنے سے دودھ پیئے گا۔ گوشت کھائے گا۔ ہر مہینے تیری جیب بھاری ہوتی جائے گی۔ میری یاد چاندی کے ڈھیر تلے دبتی جائے گی۔ میری کب پروا کرے گا تو!"

اور غونث نے مہتاب کے گال تھپتھپاتے ہوئے کہا "اری تو تو میرے دل میں بسی رہے گی مرتے دم تک۔ تو تو میری زندگی ہے پگلی —— دیوانی۔ تو تو میری خوشی ہے۔ تیرے ہی لئے تو اپنی جیبیں بھرلاؤں گا میں —— اور پھر جب دو بھیگے ہوئے لب۔ دو تپتے ہوئے لبوں سے ملے تو مہتاب کی ہچکیاں بند ہوگئیں اور غونث کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں!

"اب تم روئے؟" وہ بولی "مجھے یاد رکھو گے نا۔ مجھے یاد رکھنا سمجھے۔؟"

اور غونث گھٹی ہوئی آواز میں بولا "اری اتنی پیاری چیز کو بھلا دوں تو موت سے پہلے مر جاؤں! بس کل دس مہینوں کی بات ہے" اور پھر غونث نے دس چٹکیاں بجا کر کہا "یوں گزر جائیں گے یہ دس مہینے"

مہتاب بولی "میرا تو دسویں چٹکی کے انتظار میں کلیجہ منہ کو آنے لگا تھا۔ اور تم دس مہینوں کے لئے جا رہے ہو۔ لیکن دیکھو۔ مجھے یاد رکھنا سمجھے۔؟"

اور پھر دوسرے روز غونث جبل پور روانہ ہوگیا۔

وہاں اس نے امیدواروں کے بہت سے نوجوان پائے جنہیں ٹھیک

کی مشق کرتے ہوئے اس نے کئی بار اپنے ایوانوں میں مہتاب کو مسکراتے دیکھا اور پھر اپنے آپ کو بھی انہیں گونجتی چھتوں کے نیچے ٹہلتا محسوس کیا!

بہت ہولے ہولے گذرے یہ دس مہینے۔ اور جب آخری دن آیا تو غونث نے یوں محسوس کیا جیسے دس چٹکیاں بجانے سے بھی زیادہ تیزی سے یہ دس مہینے لڑھک گئے ہیں!

اُس روز سب سپاہی بازاروں میں گھروں کے لئے سودا خریدنے گئے۔ تو غونث ایک بازار کے پرلے سرے پر کپڑے کی ایک الگ تھلگ دکان میں جا گھسا اور بولا "آنکھ کے نشے کی قمیص۔ زنانہ۔ اور ململ کی چادر۔ زنانہ۔ اور جارجٹ۔ دوپٹے کے لئے۔ لاؤ دکھا۔ جلدی"

اور دکاندار اپنی بڑی بڑی بھوری مونچھوں کے پیچھے مسکرایا "شادی ہونے والی ہے بابوجی!"

سیٹھ نے جیسے غونث کا عزیز ترین راز اس کے سینے سے کھینچکر فرش پر پٹخ دیا ہے۔ گھبرا سا گیا۔ بولا "ہاں ہاں۔ کسی کی شادی ہونیوالی ہے۔ لے ذرا جلدی کر"

قیمتی ریشمی کپڑوں کی پوٹلی بغل میں دبائے وہ اپنی بارک میں آیا۔ اسے ٹرنک میں سب چیزوں کے نیچے چھپا دیا۔ اور پھر اس روز کمبخت گاڑی بڑی دیر سے آئی۔ اور جب چلی تو کچھوے کو مات کرتی تھی۔ اور لاری بے چاری کے تو جیسے چاروں پیئے پنکچر تھے۔ اور پھر قصبے میں اُتر کر ٹرنک سر پر رکھا وہ اس تیزی سے گاؤں کی طرف چلا کہ دوسرے سپاہی اُسے دیکھ کر بہت دیر تک قہقہے لگاتے رہے۔ ؟

گاؤں میں داخل ہونے سے پہلے رستے میں اتری کھاڑی پڑتی تھی۔ اس کی سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگی۔ اور پھر غلاموں کمہار کا آوا اور پھر غلاموں کی آواز "دور بلائیں میرے ملک کی۔ دُور بلائیں۔ ارے دن کو عید کا چاند دکھائی دے رہا ہے مجھے۔ ٹھہر جا ملک۔ میں اٹھاؤں ٹرنک"

اور جب غونث نے غلاموں سے ہاتھ ملا کر ٹرنک نہایت بے دلی سے اس کے سر پر رکھا تو اُسے یوں محسوس ہوا جیسے ریشمی کپڑوں کی پوٹلی اچھل اچھل کر ٹرنک کے ڈھکنے کو پھاڑ کر باہر نکل جانا چاہتی ہے۔ اور ناچنا چاہتی ہے غلاموں کے سامنے۔ اور کہنا چاہتی ہے کہ ہم جبل پور سے آئے ہیں!

"شام کو آئیو میرے پاس۔ سمجھے؟" گھر کے قریب پہنچ کر غونث بولا "اور اب یہ ٹرنک مجھے دیدے"

[illegible] کا وعدہ کر کے واپس چلا گیا۔ گھر آ کر غونث ماں باپ سے مل کر چوپال پر نکل گیا۔ کئی دوستوں کو گلے لگایا۔ لمبا کلف لگا طرہ ہوا میں پھیلا ہوا تھا۔ اور لٹھے کی چادر قدم قدم پہ پیچ کھا رہی تھی

—— اور پھر وہ کالی گرگابی اور وہ گلابی واسکٹ اور وہ پتلی سی چھڑی!

—— اسے ایک جگہ چین ہی نہیں آتا تھا۔ کبھی اس گلی میں جا رہا ہے، کبھی اس گلی میں۔ کبھی یہاں بیٹھا ہے کبھی وہاں۔ کبھی گھر میں ہے تو کبھی آوے کے پاس —— اور ایک بار تو وہ اتری کھاڑی میں بھی جھانک آیا!

خدا خدا کر کے شام ہوئی۔ غلاموں آنکلا۔ اور جب دس روپوں کا نیلا نوٹ اس کی انگلیوں میں اٹکا دیا گیا۔ تو اس کی بیٹھی ہوئی آنکھ بھی پھڑک گئی "کہو" وہ بولا۔

"ارے تو ابھی تک نہیں سمجھا!" غونث بولا "مہتاب کی بات بھول گیا تو؟"

"کبھی کبھی کبھی!" وہ دو ایک جھولتے ہوئے پیلے دانت نکال کر ہنسا "کبھی کبھی۔ قرآن کی قسم میں بھول گیا تھا۔ خیں خیں خیں خیں! کئی بار گلیوں میں مل جاتی ہے، لیکن وہ بات تو بالکل اُتر گئی یاد سے، عمر گذر گئی ہے نا۔ یہ اپنے اپنے زمانے کی باتیں ہیں۔ کہاں آئے وہ۔ ؟"

"وہیں"

"اچھا وہیں!" —— اور پھر جب بہت دیر تک ریشمی کپڑوں کی پوٹلی بغل میں دبائے کھاڑی میں بیٹھا وہ اندھیرے میں ابھرتے ہوئے موہوم دھبوں کو گھورتا رہا تو کنکروں پر کسی کے چلنے کی آواز آئی۔ وہ کھسک کر ایک گول سے پتھر کے پیچھے چھپ گیا۔

"ارے ملک۔ کدھر گیا تو؟" گاموں کی بھیانک آواز آئی!

اور غونث کی امیدوں کے ایوان اینٹ اینٹ ہو کر بکھر گئے۔ پتھر کی اوٹ سے نکل کر پوچھا "کدھر ہے وہ؟"

"خیں خیں خیں خیں!" وہ ہنسا! "ارے ملک۔ ڈر گیا تو؟ وہ آج گھر پہ نہیں ہے، میں اس کے باپ کے پاس کچھ دیر بیٹھا رہا۔ اور یونہیں باتوں باتوں میں پوچھ لیا کہ کدھر گئی مہتاب بیٹی۔ بولا "کسی سہیلی کے ہاں گئی ہے"

"اچھا تو پوچھئے سہی" غونث نے مری ہوئی آواز میں کہا "اُسے صبح صبح موقع پا کر کہیو کہ اُدھر پچھمی پہاڑیوں میں بڑے جھرنے کے کنارے مجھے ملے۔ لیکن دیکھ۔ مجھے آ کر یہاں بتا جائیو کہ اس سے بات ہوئی ہے یا نہیں۔ مفت میں ٹانگیں نہ نکالتا پھروں"

رات جوں توں کر کے گذر گئی۔ سفر کی تکان کی وجہ سے اس کی آنکھیں کئی بار آپ ہی آپ بند ہو جاتیں، مگر پھر اس کے دل پہ جیسے کوئی گھونسا لگا دیتا۔ اور وہ کروٹ بدل کر پو پھٹنے کا انتظار کرنے لگتا!

پو پھٹی۔ مشرقی افق پہ پگھلی ہوئی چاندی کا سیلاب سا اُمڈنے لگا

اور پھر سورج نے اپنا سر اُٹھایا۔ پھر جھونپڑوں میں زندگی جاگ اُٹھی۔ غونث اُٹھ کر مکان سے باہر غلاموں کی راہ دیکھنے لگا۔ اور آخر وہ گلی کے موڑ پر سر جھکائے آتا نظر آیا۔

غونث نے چھوٹتے ہی پوچھا "بول بھی۔ اتنی دیر کیوں لگا دی؟"

اور وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے بولا "ادھر آ جا ملک۔ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں"

لیکن اس وقت اگر دیواروں کی آنکھیں بھی ہوتیں تو غونث صبر نہ کر سکتا بولا "یہیں سب کچھ کہہ ڈال۔ ملی؟"

"ہاں۔ ملی" اس نے مایوس لہجے میں جواب دیا۔

"پھر؟"

"پھر باتیں ہوئیں"

"کیا باتیں ہوئیں؟"

"بہت باتیں ہوئیں۔ میں نے تمہارا پیغام سنایا۔ تو بولی "اچھا آ گیا ہے وہ لیڈا! —— معاف کرنا ملک۔ اُسی کے الفاظ دہرا رہا ہوں —— کہنے لگی آ گیا ہے وہ؟ وہ چاندی سونے کا بھوکا چھوکرا۔ جسے عطا نے کتے کی مار دی تھی اور باؤلا کر دیا تھا۔ وہ اب مجھ سے کیا چاہتا ہے، اُسے جا کر کہہ دے کہ میں تیرا انتظار کب تک کرتی۔ تین سو دن تک کون راہ دیکھتا تیری؟ تو نے تو ستر ہ ٹکلیوں سے بھی مجھے ہیٹا سمجھا۔ میں اب عطا کی ہوں۔ تیرے دشمن عطا کی۔ جس نے نوکری پر جانے سے صرف میرے لئے انکار کر دیا۔ اور ——"

جیسے تنور میں سوکھی ہوئی لکڑیوں کا انبار جھونک دیا جائے تو دہوئیں اور آگ کا ایک فلک بوس طوفان ابھر جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح غونث کے منہ سے یہ جملہ نکل گیا "لیکن اُسے تو صاحب نے نکال دیا تھا"

اور غلاموں بولا "یہ تو تو کہہ رہا ہے نا ملک۔ آگے بھی تو سُن۔ بولی۔ جا کر اُسے کہہ دے۔ کہ میں اس عطا کی ہوں جس نے مجھے آنکھ کے نشے کی قمیص اور جارجٹ کا ——"

"لیکن" غونث بات کاٹ کر فریادوں بھرے لہجے میں بولا "لیکن میں بھی تو اس کے لئے یہی کپڑے لایا ہوں" اور اس نے بغل میں دبائی ہوئی پوٹلی ہاتھ میں لے لی۔

"مگر ملک" غلاموں نے جیب سے کچھ نکالتے ہوئے کہا "تو بعد میں آیا ہے۔ تو پرانا ہو چکا ہے اس کے لئے۔ تجھ پر دس بہنوں کی گرد جم چکی ہے نا —— اور لے۔ یہ دس روپے —— یہ میرا حق نہیں"

"یہ تیرا حق ہے۔ اسے اپنے پاس رکھ" غونث بولا۔ اور پھر پوٹلی بغل میں دبائے ہوئے گاؤں سے باہر نکل گیا۔ چپ چاپ۔ بھوت کی طرح۔ وہ ناک کی سیدھ میں چلتا گیا۔ حیران غلاموں اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ اور پھر جب وہ دونوں گرجتے ہوئے نالے کے قریب پہنچے تو غونث بولا "ایک بھاری پتھر لے آ غلاموں"

"کس لئے؟"

"تو لے تو آ" وہ غلاموں کو گھورتا ہوا بولا۔ اور پھر جب غلاموں ایک بھاری پتھر اُٹھا لایا۔ تو غونث نے آنکھ کا نشہ اور ہل جل اور جارجٹ کو پتھر پر لپیٹا۔ کلف لگے طرے کو پھاڑ کر کپڑوں کو پتھر پر کس کر باندھ دیا۔ اور پھر شعلے برساتی ہوئی آنکھوں سے اُس گول مول گٹھڑی کو گھورا۔ اُسے اُٹھایا۔ سر پہ گھمایا اور پھر گرجتے بہتے نالے میں دھم کی آواز آئی اور سینکڑوں بلبلے ابھر کر تیز رفتار لہروں پہ دور بہہ گئے!

"یہ کیا ملک؟" غلاموں چلایا۔

"یہ میری جوانی کا جنازہ تھا" غونث بولا۔ اور پھر اس نے پچھمی پہاڑیوں کا رخ کر لیا۔ غلاموں منہ کھولے وہیں نالے کے کنارے کھڑا اپنی آنکھ جھپکتا رہا۔ اور غونث پہاڑیوں پر لڑکھڑاتا ہوا اُسی جھرنے کے پاس آیا۔ اسی چٹان کے قریب بھیگی ہوئی زمین پہ بیٹھ گیا۔ اور پھر یونہی بھیگی مٹی کریدنے لگا!

دو چار لمحوں کے بعد وہ اچانک بھڑک کر پیچھے گر گیا۔ اس کی انگلیوں سے کوئی ٹھنڈی گول سی چیز مس ہوئی "سانپ!" وہ پکارا۔ اور آس پاس تمام پہاڑیاں فوراً فوراً چیخ اٹھیں "سانپ۔ سانپ!"

"نہیں نہیں۔ میری بنسری!" غونث بولا۔ آگے بڑھ کر اس نے مٹی کو وحشیانہ طریقے سے کرید کرید کر دور پھینک دیا۔ اور پھر اس کے ہاتھ میں کالی بد نما بنسری کانپ رہی تھی "میری بھولی بسری بنسری!" وہ بولا۔ اور اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں زبان کی نوک سے ہونٹوں کو تر کیا اور بنسری کو ان کے قریب لا کر سانس دی۔ بنسری سے ایک ہولناک سی پھنکار بلند ہوئی اور اس میں سے گیلی مٹی کا ایک سانپ سا نکل کر جھرنے میں جا گرا۔ اور پھر ذرہ ذرہ ہو کر تہ پہ بیٹھ گیا۔

احمد ندیم قاسمی

پریم کی اندھی

(۱)

ہوت کی جوت والے تارو کیا دیکھتے ہو۔ نرمل چاندنی۔ میرا دل میلا نہ کر سکھی! کچھ نہ پوچھ کہ مجھ پر کیا بیتی ہے؟ کیا بیت رہی ہے اور کیا، نجانے، ہون جانے، ابھی بیتنے والی ہے؟ میری کچی آنکھیں اور وہ گدرایا ہوا بدن ابھرا کمزور ہاتھ اور ران کے دامن کی مضبوط گرفت! جھوٹ، بالکل جھوٹ!! وہ سنبھلے ہوئے، میں گری ہوئی۔

کئی برس کا ذکر ہے۔ میں انجان، بھولی۔ اپنے بچپن سے کھیلتی ہوئی۔ چمن میں پھولوں کے پودوں پر سے تیتریاں پکڑ رہی تھی۔ اکیلی، بھونروں کے سوا کوئی بھنبھنانے والا بھی نہ تھا۔ میں کیا جانوں کدھر سے وہ آگئے۔ اوپر سے اترے یا کسی درخت کے تھالے میں سے نکل آئے اور کھڑے کھڑے بولے۔ کس سے بولے؟ کون جانے! میں نے آواز سنی۔ صرف آواز۔ آپ ہی آپ کہہ رہے تھے "آج یہ نیا بوٹا کہاں سے آیا۔ سارے پھول اپنا روپ کھو بیٹھے، کلیوں نے چٹکنا چھوڑ دیا، بھونرے ادھر ہی جھکے ہوئے ہیں۔ کوئی تارا تو ٹوٹ کر نہیں گر پڑا! تیتریوں کی رانی کہیں نہ آگئی ہو۔ کس سے پوچھوں؟ زبان تالو سے چمٹی جاتی ہے۔ سانس بیٹھا۔ میں نہیں سماتا۔ دل دھڑکے جاتا ہے۔ اُف وہ!"

میں کب بولتی، کیوں بولتی؟ مجھ سے تو کچھ وہ کہہ نہیں رہے تھے!

پھر وہ دو قدم آگے سرکے، ہنسے اور کہنے لگے "آج تو ۲۸ تاریخ ہے، چاند کیسے نکل آیا؟ چودھویں کا چاند! ارے مار ڈالا! بال ہیں کہ بے موسم کے بادل۔ کیاری کیاری پھرنے والوں کو کیا خبر کہ بوٹے چلا نہیں کرتے۔"

میں بہری تو نہ تھی۔ سوچتی رہی کہ یہ کس سے باتیں کر رہے ہیں۔ سمجھنے کے دن نہ تھے۔ وہ مڑے اور "اچھا نہ بولو نہ جواب دو لو جاتے ہیں" کہتے ہوئے جدھر سے آئے تھے چلے گئے۔ میں اب بھی کچھ نہیں سمجھی۔ لیکن ان کے پیچھے چلی۔ آسمان دھندلا ہو گیا۔ تاروں نے گھونگٹ نکال لئے۔ میں دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔

(۲)

گرمی، گرمی کے بعد برسات، برسات کے بعد جاڑا آیا۔ گاؤں میں میری شادی کی دھوم تھی۔ میرا باپ مکھیا تھا۔ مہمان جمع ہوئے۔ میں دلہن بنی منڈھا چھایا گیا۔ برات آئی۔ کیا دیکھتی ہوں کہ وہ دولھا بنے مسکرا رہے ہیں۔ میرے کانوں میں آواز آئی "اب کنول کی یہ کلی میرے پریم کے ساگر میں کھلے گی۔"

میں بالی، مورکھ، گاؤں کی رہنے والی، وہ جوان، وہ دھوان۔ کالج کے پڑھے ہوئے۔ میری بولی، ان کی بولی میں فرق۔ آواز کانوں میں پڑی، دل میں اتری پر سمجھ میں نہیں آیا کہ ان کا مطلب کیا ہے اور کس سے کہہ رہے ہیں۔

انہوں نے لوگوں سے چھپ کر مجھے دیکھا۔ میرے من میں گدگدی سی ہوئی۔ میں لجیا گئی۔ وہ ہنسنے لگے۔

دل بچھڑنے کے لئے مل رہے تھے۔ صبح کو میں ان کے ساتھ جاتی۔ رات کے اندھیرے میں جانے کیا ہوا ان کی آنکھیں بدل گئیں۔ خاصے سوئے تھے ہنستے بولتے نیند آئی تھی۔ ابھی سویرا نہیں ہوا تھا کہ ودھوا ہو گئی۔ سُنا کہ بیری ناگن نے ڈس لیا۔

برات دلہن کے بدلے اپنے دولہا کی ارتھی لے کر روانہ ہوئی۔ میں کیا روتی، کس کو روتی اور کیوں روتی۔ وہ میرے ہوتے تو مجھ سے باتیں کرتے۔ میری گود میں مرتے۔ اور شمشان میں اپنے ساتھ مجھ کو بھی لے جاتے۔

(۳)

رات دن ہونے اور دن رات ہونے کے لئے بنائی گئی ہے۔ موسم بدلے، کتنے بدلے۔ یہ سمجھو کہ لڑکپن جوان ہوا۔ جوانی ڈھلی۔ بجلی چمک چمک کر ماند پڑ گئی۔ سورج نکلا اور چھپا۔ کئی دفعہ پھول کھلے، مرجھائے اور گر پڑے۔ مگر میرے باغ میں بہار کی رت کیا جانے کیوں نہیں آئی۔

میں، سہیلی! کیا پوچھتی ہے، برہا کا جلا ہوا روکھ ہوں! بہار آتی ہے، آیا کرے۔ بسنت پھولتی ہے۔ سدا پھولے، پرماتما نے مجھ کو رُت میں اندھا کیا ہے۔ کیا نظر آئے۔

پھلواری میں صبح شام دونوں وقت گئی۔ آبادی کو چھان مارا۔ تالاب میں غوطے لگائے۔ جنگلوں جنگلوں پھری۔ کہیں تو وہ بیرن ملتی۔ بہن سوکن پے کا جلا پا برا ہوتا ہے۔ اس پاپن ناگنی کو بہت ڈھونڈا جس نے ان کی آنکھیں مجھ سے پھیر دیں۔ کیا پاتی؟ کسی نے اس کا کھوج نہ بتایا۔

مدتیں گزر جانے کے بعد اب بھی میں اپنی کیاریوں میں جاتی ہوں۔ سب کہتے ہیں، کیا اپنے کیا پرائے کہ یہ ودھوا ہو کر باغوں میں پھرتی ہے۔ کھلتی ہوئی کلیاں، ہنستے ہوئے پھول۔ اڑتی ہوئی تیتریاں، گاتے ہوئے بھونرے، کیا میرے لئے عیش کا سامان ہو سکتے ہیں؟ نہیں۔ آہ میری سہاگن سہیلی نہیں۔ لوگوں کی نری تہمت ہے۔

میں باغ میں جاتی ہوں لالے کے داغ سے اپنے دل کا داغ ملانے۔

مرجھائی ہوئی کلیوں سے اپنے دامن کی کلی کا مقابلہ کرنے۔ رتوں کو آتے جاتے دیکھنے
بیری دنیا پھر بھی نہیں مانتی۔ اچھا بہن! میں باغ میں جانا بھی چھوڑ دونگی جہاں ان کو دیکھا تھا۔ پھولوں کی پوجا بھی نہیں کروں گی۔ پھولوں کی سہیلی ہیں پوجا کرتی ہوں۔ وہ آخر دم تک ان کے گلے کا ہار رہے۔

(۴)

میں نے سپنا دیکھا۔ یہ سارا سنسار ہی سپنا ہے۔ ہم سب کسی کا سپنا ہیں۔ اچھا تو سکھی میں نے ان کو سپنے میں دیکھا۔ کیا دیکھا وہ پیپل پر سے کنوئیں کی جگت کو دیکھ رہے ہیں۔

میرا پنگھٹ اجاڑ تھا۔ پریم کی ٹھلیا پھوٹ چکی تھی۔ ٹھیکرے بھی روندن میں آ کر تتر بتر ہو گئے تھے۔

آنکھ کھلتے ہی گھڑا اٹھا۔ پانی بھرنے چلی۔ سپنا دیکھا تھا کنوئیں کے پاس ڈھوروں کے پانی پینے کی ناند سے لگی کھڑی تھی۔ گھاٹ خالی ہوتا تو جگت پر چڑھ کر ڈول ڈالتی۔

ان کے طرح طرح کے روپ میری آنکھوں کے سامنے آ رہے تھے۔ میں اپنے کو بھول گئی۔ سب پانی بھر کر چلے گئے۔ میں کھڑی کی کھڑی رہی۔ ڈول والا ڈول بھی لے گیا۔ میں نے پانی نہیں بھرا۔ کیسے بھرتی؟ سپنے کا سماں آنکھوں کے سامنے تھا۔ کنوئیں کے اندر سے کوئی بولا "آؤ آؤ۔ دونوں ساتھ ساتھ پانی بھر کر چلیں گے۔" انہوں نے آواز دی تھی۔ کیسے ٹھیرتی؟ دھم سے کود پڑی۔

پانی کے بلبلوں پر ان سے باتیں کر رہی تھی کہ بیریوں نے وہاں بھی چین نہ لینے دیا۔ سُن لی میری کہانی سکھی۔ اب مجھ کو ان کے پاس جانے دو وہ مجھے بلا رہے ہیں۔ میں انہیں دیکھ رہی ہوں۔ کنوئیں کے باہر آ کر سب الگ دوران کی برات رُکی کھڑی ہے۔

اشرف صبوحی دہلوی

تاثرات

۱

جوانی کے نشاط انگیز نغمے ؎ ؎ — نہ گاؤ۔ بس نہ گاؤ۔ اب نہ گاؤ
میں آوازِ شکستِ دل سنوں گا — کوئی ٹوٹا ہوا بربط بجاؤ ؎ ؎

۲

رہی اک عمر سے جس کی تمنّا — مجھے وہ کام کرنا آگیا ہے
تیری امّید میں جیتا رہا ہوں — مجھے واللہ مرنا آگیا ہے

۳

اڑا جاتا ہوں سپنوں کی فضا میں — خموشی کے سروں میں گا رہا ہوں
وہ آنکھیں مُند گئیں۔ وہ سانس اکھڑی — مجھے آواز دو ــــ میں جا رہا ہوں

۴

تمہیں معلوم کیا پستی کی باتیں — فلک پر یہ چمک کیا۔ یہ دمک کیوں
ستارو۔ اے ستارو۔ اے ستارو! — چھڑکتے ہو مرے دل پر نمک کیوں

۵

تمہارا کام ذکر اللہ سے، — عقیدت ہے مجھے اُس رشکِ مہ سے
یہ اپنا اپنا اندازِ نظر ہے، — کبھی دیکھو اُسے میری نگہ سے

۶

نہیں یہ کاروبارِ آشنائی ؎ — کہ تیرا ناز ہے مجھ سے جدائی ؎
مجھے اپنا پتہ بتلا کے چھپ جا — مبارک ہو تجھے ساری خدائی

احمد ندیم قاسمی

دو اسٹیشنوں کے درمیان

گاڑی کی ٹھک ٹھک مدھم ہوتی جا رہی تھی، امرتسر کا اسٹیشن آنے والا تھا، میرے حواس ابھی تک اچھی طرح نہیں سنبھل سکے تھے۔

ہندوستان میں ریل گاڑی کا سفر اور وہ بھی تیسرے درجے کا۔ میں تو اس ایک رات کے سفر کو ایک سال کی قید مشقت سے بھی سخت اور دشوار گذار سمجھتا ہوں۔ جب میں لاہور اسٹیشن پر اس گاڑی میں سوار ہونے کے لئے پہونچا تو وہاں پہلے سے ہی بہت زیادہ بھیڑ جمع تھی۔ گاڑی جانے سے پون گھنٹہ پہلے اسٹیشن پر پہونچ جانے کے باوجود اندر گھسنے کیلئے انتہائی کوشش کرنی پڑی۔ پنجاب کلکتہ میل میں تیسرے درجے کے صرف تین ڈبے ہوتے ہیں۔ دو مردانے اور ایک زنانہ۔ زنانہ ڈبہ تو تقریباً خالی ہی تھا کیونکہ ہندوستانی مرد اپنی عورتوں کو اُن کے اپنے کیا، خدا تک کے بھروسے پر چھوڑنے کو تیار نہیں۔ دونوں مردانہ ڈبوں میں خوب بھیڑ بھڑکا تھا۔ بہت کوشش اور کافی معرکہ خیز جدوجہد کے بعد میں اور ڈیڑھ درجن کے قریب اور مسافر اس ڈبے میں گھسنے میں کامیاب ہو گئے۔

ڈبے کے ایک طرف جلی عبارت میں لکھا ہوا تھا "۳۵ مسافروں کے واسطے" لیکن اس میں اتنے مرد عورتیں اور بچے بھرے پڑے تھے کہ گننا از حد مشکل تھا۔ پنجاب کلکتہ میل میں تیسرے درجے کے سو میل سے کم سفر کی اجازت ہی نہیں۔ سب لمبے سفر کے مسافر تھے نشستوں کے اوپر کے سب تختے سامان سے لدے ہوئے تھے اور نیچے بھی بستر، ٹرنک سوٹ کیس، ہینڈ بیگ، گٹھڑیاں بڑی بے ترتیبی سے بکھری پڑی تھیں آدھے کے قریب مسافر نشستوں پر سکڑ سکڑ کر بیٹھے ہوئے تھے اور کچھ فرش پر پڑے ہوئے سامان پر۔ باقی مسافر دونوں طرف کے دروازوں کے درمیان کھڑے تھے۔

گاڑی چلی۔ کچھ دیر تو تو میں میں، گالی گلوچ ہوئی اور بہت سے مسافروں نے کسی نہ کسی طرح اپنے لئے آہستہ آہستہ جگہ بنا ہی لی۔ میں پریشان تو پہلے ہی تھا اس بھیڑ اور دھکم پیل نے میرے غم زدہ دل کو اور بھی بے حال کر دیا۔ گھبراہٹ سے میرا سر چکرا رہا تھا، منہ پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں، ٹانگیں کانپ رہی تھیں اور میں چھت سے لٹکتی لوہے کی زنجیر کو پکڑے سر نیچے لٹکائے، آنکھیں موندے ایک مبہم سی سوچ کے غلبہ میں بے حس کھڑا تھا۔

لاہور تین برس کے بعد آنا ہوا تھا۔ مجھ سی ہی بدنصیب بہن کے تپ دق سے مرجانے کی خبر ملنے پر آنا پڑا اور میں بڑے بے بس طور پر یہ حساب لگا رہا تھا کہ ان قرض لئے ہوئے پندرہ روپے کی گرانبار رقم کو جو اس آنے جانے پر خرچ ہو گئی ہے، ادا کرنے کے لئے ایک بائیس روپے ماہوار پانے والے کلرک کو کتنے مہینے یا برس اپنا پیٹ کاٹنا پڑے گا۔ پھر یہ خیال کہ میں اپنی عزیز بہن کو موت کے خلاف جنگ کرنے میں تین چار روپے مہینہ کی دوائیوں کی مدد تک نہیں پہونچا سکا، مجھ پر لعنت ملامت کرنے لگا اور کبھی کبھی مجھے اپنے پرانے ہم جماعت اور از حد نزدیکی دوست راجندر کمار کھنہ کا خیال آ جاتا جس سے میں لاہور میں مل نہیں سکا تھا۔

آٹھ مہینے ہوئے اُس کی شادی کا دعوت نامہ آیا تھا۔ اس مبارک موقع پر شریک ہونے کے لئے لاہور آنے کا کرایہ تو کیا مبارکباد کا خط لکھنے کے لئے پانچ پیسوں کا بمشکل انتظام ہوا تھا۔ اب میں لاہور آیا ہوا تھا تو اُس سے ملنے کی کچھ اور کوشش کرنی چاہیئے تھی۔ تین سال ملے ہو گئے تھے۔ اور معلوم نہیں قسمت کب ادھر لائے یا کبھی بھی نہ لائے۔ پھر یہ خیال کہ خدا مجھ پر اس سے زیادہ اور کیا مہربانی کر سکتا ہے کہ مجھے اس زندگی کی لعنت سے آزاد کر دے بڑے بھیانک طریقے سے میرے ذہن میں ابھرنے لگا۔

اسی طرح عرصہ گذر گیا۔ گاڑی بھاگتی ہوئی اٹاری کے اسٹیشن سے گذر گئی۔ مجھے بے حس کھڑا دیکھ کر کئی مسافر میری طرف متوجہ ہو گئے۔ ان میں سے ایک نے میرے پرانے زنگ خوردہ ٹرنک کو سامنے سیٹوں کے درمیان رکھ دیا اور میرا بازو ہلا کر مجھے اپنی طرف متوجہ کیا اور اُس ٹرنک پر بیٹھ جانے کے لئے کہا۔ میں جسمانی طور پر بالکل چور ہو چکا تھا۔ میری آنکھیں لاتعداد تھکے ہوئے اُونگھتے مسافروں کو دیکھ کر اور بھی بے حس ہو گئیں اور میں شکریہ ادا کرنے کی زحمت کئے بغیر ٹرنک پر جا بیٹھا۔

میرے قریب بیٹھے ہوئے مسافر میرے گھبرائے ہوئے پریشان چہرے کو بغور دیکھنے لگے اور اس بدحواسی کا مطلب تلاش کرنے لگے۔ مجھے بھی اپنی حالت پر پشیمانی محسوس ہوئی اور میں اپنے حواس سمیٹنے لگا۔ کھڑکی میں سے آتے ہوئے ٹھنڈے جھونکے میری مدد کرنے لگے۔

میری بائیں کھڑکی کے برابر والی نشستوں پر ایک سکھ نوجوان بیٹھا

ہوا تھا۔ دُہری کشتی نما پٹیالوی پگڑی، اچھا سا قیمتی سوٹ، ہم رنگ ٹائی اور قمیص، میک اَپ سے اُس نے بھی بہت سے فیشن ایبل سکھ نوجوانوں کی طرح مہاراجہ پٹیالہ کے چھوٹے بھائی معلوم دینے کی کوشش کی تھی۔ اُس کے ساتھ ایک اس کا ہم عمر نوجوان بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے کشادہ بالائی لب پر مونچھوں کی جگہ ایک پتلی سیاہ لکیر تھی۔ گیبرڈین کے کپڑے کی پتلون۔ چیک دار ریشمی قمیص جس کے نوک دار کالروں میں نکٹائی کی ڈھیلی گرہ قمیص کے درمیانی بٹن تک لٹکی ہوئی تھی۔ اس کے آگے ایک سکھ جاٹ پھنس کر بیٹھا ہوا تھا۔ بالکل فوجی قدو قامت۔ اُوپر کی طرف اُٹھا کر باندھی ہوئی ڈاڑھی، سفید پگڑی، قمیص پاجامہ، اور نوکدار دہقانی جوتی۔ اس کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر کی بھورے مٹیالے رنگ کی عورت۔ اس کے سات نیم برہنہ فاقہ زدہ بچے اور اُس کا چودہ پندرہ روپیہ ماہوار پانے والے ریلوے قلیوں کی موٹی نیلی وردی پہنے ہوئے خاوند۔ یہ سب گز ڈیڑھ گز جگہ میں سکڑ کر بیٹھے ہوئے تھے۔ میرے دائیں طرف ایک بے حال سی بڑھیا ٹانگیں پیٹ میں سکیڑے اور اپنی ٹھوڑی کو گھٹنوں پر ٹکائے کسی درد بھری سوچ میں محو تھی۔ جگہ جگہ پیوندوں سے لپی ہوئی میلی دھبے دار گھگھری، بوسیدہ قمیص، سر پر گاڑھے کی غلیظ متعفن چادر اُس کے پوپلے مُنہ میں رُخساروں کی ڈھیلی جھریوں بھری چمڑی اتنی اندر دھنسی ہوئی تھی کہ اُس کے دونوں جبڑے علیحدہ علیحدہ معلوم دیتے تھے۔ اوپر والا حصّہ نچلے سے بالکل علیحدہ۔ اس پر احتیاط سے رکھا ہوا۔ اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ابھی یہ بُڑھیا ہلی اور وہ گرا۔ اُسکے ساتھ ایک عجیب سی ہیبت ناک صورت والا آدمی بیٹھا ہوا تھا جس کی عمر کا اندازہ لگانا از حد مشکل تھا۔ اُسے دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ کسی تپ دق سے مرے ہوئے آدمی کے زرد پنجر کو قبر سے کھود کر اُس پر چمڑی چڑھا دی گئی ہے۔ اُس کے چہرے سے ایسا معلوم پڑتا تھا کہ اسکی کبھی ڈاڑھی مونچھیں اُگی ہی نہیں۔ گہرے تاریک گڑھوں میں چھپی ہوئی مجرمانہ آنکھوں کو بے ڈھنگ طور پر باہر اُبھری ہوئی رُخسار کی ہڈیوں نے اور بھی ڈراؤنا بنا دیا تھا۔ اس کے آگے ایک ۲۹۔۳۰ سال کی عورت جو شکل وصورت سے انتہائی غریب معلوم ہوتی ہے اپنی گود میں دو بچے لٹائے بیٹھی تھی۔ اُس کے بعد ایک تعلیم یافتہ سنجیدہ مزاج نوجوان۔ سادہ لباس میں ملبوس اور ایک ویسی ہی سادہ خوبصورت لڑکی بالکل ساکت اور خاموش اُنکے پیچھے اُونچے نیچے بے ڈھنگے بے ترتیب سروں کا ہجوم تھا اور آخر میں مختلف قسم کے سامان کی دیوار۔

میں نے سادہ لباس والے نوجوان کی طرف دیکھا اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں نے پہلے بھی اِسے کہیں دیکھا ہے۔ میرے قریب بیٹھے ہوئے گیبرڈین کی پتلون والے نوجوان نے مجھے بڑے دوستانہ اور بے تکلف انداز میں مخاطب کرتے ہوئے کہا: کیا بات ہے مسٹر، بڑے بوکھلائے ہوئے ہو۔

میں نے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے ایک بے دل تھکی ہوئی مسکراہٹ میں اپنے لبوں کو کھول دیا اور اُس کے سوال کو خاموشی میں ڈوب جانے دیا۔ وہ میرے ہاتھ سے کہانیوں کی کتاب لیکر اُس میں سے ایک کہانی پڑھنے لگا۔

اِتنے میں گاڑی امرتسر اسٹیشن میں داخل ہو رہی تھی میں بھی دوسرے مسافروں کی طرح پلیٹ فارم پر مجمع کی طرف دیکھنے لگا۔ پٹرول راشن ہو جانے سے لاریاں بسیں اب بہت کم ہو گئی ہیں اور ریلوے اسٹیشنوں پر پہلے سے بھی بہت زیادہ بھیڑ ہوتی ہے۔

گاڑی جب پلیٹ فارم پر کھڑی ہوئی تو مسافر، قلی، خوانچہ فروش بے تحاشہ ڈبّوں کی طرف لپکے۔ خوب دوڑ دھوپ دھکم دھکّا، چیخ پکار ہر طرف ابتری، پریشانی، گھبراہٹ دکھائی دے رہی تھی۔ ڈیڑھ دو درجن مسافر ہمارے ڈبّے کی طرف بھی بڑھے اور دونوں طرف کے دروازے کھولنے کی کوشش کرنے لگے۔ ایک طرف کا دروازہ تو بالکل اسباب سے جما ہوا تھا! دوسرے دروازے پر خوب دھکّے پر دھکّے پڑنے لگے۔ باہر والے مسافر دروازہ کھولنے اور اندر گھُسنے کی کوشش کر رہے تھے اور اندر دروازے کے قریب کھڑے مُسافر اُسے بند ہی رکھنے پر زور لگا رہے تھے۔ جھگڑا تکرار، گالیوں کی بوچھاڑ، غصّہ اور رُعب سے بھرے ہوئے الفاظ۔ خوب رسّہ کشی اور زور آزمائی ہو رہی تھی۔ کئی مسافروں نے کھڑکی میں سے ہی ٹرنک بستر گٹھڑیاں بغیر کسی قسم کی احتیاط کے اندر پھینکنی شروع کر دیں۔ کئی جلد باز کھڑکیاں پکڑ کر اندر لپک آئے۔

بیڑیوں اور ہتھکڑیوں کی جھنکار سُنائی دی۔ ایک کھدّر پوش نوجوان کو حراست میں لئے ہوئے دو سپاہی اپنے لئے جگہ تلاش کر رہے تھے۔ وہ ہمارے ڈبّے کے دروازے کی طرف بڑھے۔ رُعب دبا سے دروازہ کھلوا کر اندر داخل ہوئے اور اُن کے پیچھے تمام ہجوم کسی نہ کسی طرح اندر آ گھسا۔ اور پھر وہی بہرہ کر دینے والا جھگڑا شروع ہوا۔ سپاہیوں نے ایک ٹرنک پر سوئے ہوئے بچّے کو اُٹھوا کر اپنے بیٹھنے کے لئے جگہ بنا لی اور کھدّر پوش نوجوان چھت سے لٹکتی زنجیر کو پکڑ کر کھڑا ہو گیا۔ پلیٹ فارم کے دوسری طرف والے دروازے سے بھی ایک بلا ٹکٹ سفر کرنے والا سادھو، ایک پیشہ ور دوائی فروش اور ایک بسنتی لباس والا یتیم خانہ والا لڑکا گاڑی کے اندر آ گئے۔

نشستوں کی درمیانی جگہ بالکل اسباب اور مسافروں سے بھر گئی تھی۔ بھیڑ اور جھگڑے سے دم گھٹنے اور جی متلانے لگا۔ ابھی تک لڑتے جھگڑتے مسافروں کی چیخیں مدھم نہیں ہوئی تھیں۔

گاڑی چلی ہوا لگی۔ دم میں دم آیا۔ ایک شخص نے اُس کھدّر پوش قیدی کے لئے بھی جگہ بنا دی۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ وہ خالصہ کالج امرتسر میں ایم۔ اے کا طالب علم ہو اور سرہند میں طالب علموں کے جلسے میں تقریر کرنے کے الزام میں گرفتار کرکے اُسے لیجایا جارہا تھا۔

سر سے پاؤں تک بسنتی کپڑے پہنے ہوئے یتیم خانہ کا لڑکا چندہ اکٹھا کرنے کی صندوقچی کھٹکھٹا کر زور زور سے چلّانے لگا: "اے مسافر جانے والو دیکھنا منہ پھیر کر۔ کس لئے ہم کھڑے ہیں راستہ گھیر کر۔ گُل گیا گلشن گیا بلبل کی سواری آگئی۔ اب جگر کو تھامنا میری بھی باری آگئی" اتنے میں دوا فروش بھی مونچھوں کو تاؤ دیکر اور بیگ کھول کر تیار ہو چکا تھا۔ اُس نے اپنی چھڑی سے یتیم لڑکے کو خاموش رہنے کا حکم دیا۔ پھر وہ دو روپے تولہ بکنے والا خالص اصلی کسوٹی پر ٹھیک اُترنے والا امریکن سونا جو بقول اُس کے غریبوں کا پردہ امیروں کی شان ہے۔ صابن اور کریمیں جس سے ہر ہندوستانی عورت پریچہرہ فرنگن کی مانند گوری چٹی بن سکتی ہے۔ ممیرے کا سرمہ، جادو کی انگوٹھی اور گندی دوائیں بیچنے لگا۔ ہر ایک کی تعریف میں اُس نے راگ الاپے، اس کے بعد اُس نے اِن چیزوں کو فروخت کرنے کی کوشش کی۔ زور دیا۔ التجا کی پھر بھی جب ناکامیاب رہا تو مایوس نظریں اِدھر اُدھر دوڑا کر دوسرے ڈبے کی طرف لپک گیا۔

میں سادہ اور سنجیدہ نوجوان کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے دماغ پر زور دے رہا تھا کہ میں نے اُسے اپنے دوست راجندر کمار کھنہ کے ساتھ تو نہیں دیکھا۔ نیلی وردی والا قلی اپنے کالے سفید بھورے بالوں کی کھچڑی ڈاڑھی مونچھوں کو زرد لیس دار دانتوں سے کاٹ اور چبا رہا تھا۔ میری دائیں طرف بیٹھی ہوئی بڑھیا نے ہڈیوں کے ڈھانچے سے پوچھا "بیٹیا کیا تم بیمار ہو؟"

اس نے اپنے دائیں بازو کو بڑے آہستہ سے اوپر اٹھایا اور درمیانی انگلی سے اپنی بھوں کو کھجانے لگا۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ گنگنایا "ہندوستان میں کون بیمار نہیں۔ بہن یہ بیماری تو زندگی کی نشانی ہے۔ زندگی کی نشانی۔ جب دم ہی نہ ہو تو بیماری کیا خاک ہو گی" اسکے بعد وہ کھوکھلی، مذاق سے خالی ہنسی ہنسی میں ہچکولے کھانے لگا۔

یتیم لڑکے نے صندوقچی کو کھٹکھٹا کر پھر چلانا شروع کیا "پیارے بھائیو، پیارے سجنو، آپ لوگوں کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اناتھوں کا یتیموں کا کیا حال ہوتا ہے، کبھی یہ تھے لال ماں باپ کے۔ آج ہیں یہ محتاج آپ کے۔ کبھی یہ دھن وان تھے دولت والے تھے۔ سکندر جب چلا دُنیا سے دونوں ہاتھ خالی تھے۔ آگاہ اپنی موت سے کوئی بشر نہیں۔ سامان سو برس کا ہے پل کی خبر نہیں۔ سراسر سونا بھرا تھا لنکا کی دیواروں میں۔ ایک رتی سونا نہ ملا اُس راون کو مرتی بار میں، جگ میں مٹھی باندھے آئے تھے ہاتھ پسارے جاؤ گے۔ نہ کچھ ساتھ لیکر آئے تھے نہ کچھ ساتھ لیکر جاؤ گے"۔

دائیں طرف کے کونے میں جھگڑے کی آوازوں کا شور یکایک تیز ہو گیا۔ ایک مسافر نے اپنے ٹرنک کو اوپر تختے پر پڑے ہوئے بستر پر ایسے اٹکا رکھا تھا کہ اس کے گرنے کا ہر وقت احتمال تھا اور نیچے بیٹھا ہوا مسافر اس پر اعتراض کر رہا تھا کہ اگر یہ ٹرنک گر پڑا تو اُس کی گردن ٹوٹ جائے گی۔ ٹرنک والا یہ رٹ لگائے جا رہا تھا کہ اگر اُسے اپنی گردن کی اتنی فکر ہے تو نیچے سے اُٹھ جائے، وہ خود وہاں بیٹھ جائے گا۔ ابھی یہ جھگڑا ختم نہیں ہوا تھا کہ دوسری طرف شور مچنا شروع ہو گیا۔ ایک کوڑھی لولا شخص وہاں نیچے فرش پر ہی بے احتیاطی سے تھوکے جا رہا تھا اور دوسرے مسافر اُس سے کھڑکی کے باہر تھوکنے کے لئے کہہ رہے تھے لیکن وہ بالکل نہیں مانتا تھا حتیٰ کہ ایک شخص نے کان پکڑ کر اس کا سر کھڑکی سے باہر نکال دیا۔ اور وہ زور زور سے رونے چیخنے اور گالیاں دینے لگا۔

پھر تو تو میں میں شروع ہوئی۔ پولیس کے سپاہی سستی بیڑیوں کے لمبے لمبے کش لگا کر دھوئیں کے بادل اُگل رہے تھے۔ ناک منہ سے دھوئیں کا طوفان نکل رہا تھا اور ایسا معلوم ہونے لگتا کہ اُن کی آنکھوں تک سے دُھواں نکل رہا ہے۔ ڈبے میں انتہائی بھیڑ ہونے کی وجہ سے بڑا گھمس تھا۔ بیڑیوں کا کڑوا دُھواں اندر ہی چکّر کاٹنے لگا۔ جس سے دم اور بھی گھٹ رہا تھا۔ ایک سکھ نے سپاہیوں کو بیڑیاں پینے سے منع کیا لیکن وہ نہ مانے۔ اُلٹا اُسے ڈانٹنے لگے۔ اس پر ایک اکالی جو خاموشی سے گٹھڑیوں میں چھپا بیٹھا تھا باہر نکل آیا۔ کچھ دیر گرما گرم جھپٹ ہوئی اور سپاہیوں نے بیڑیاں باہر پھینک دیں۔ ایک مسافر نے کہا کہ "سردار جی جتنی آپ نفرت تمباکو سے کرتے ہیں اگر انگریزوں سے کرتے ہوتے تو نہ یہ فرنگی رہتے اور نہ اِن پولیس والوں کی اکڑ"۔

میں نے ایک جمائی لی اور پھر مسافروں کے چہروں پر ایک سرسری سی نظر ڈالی۔ مختلف لوگوں کے بے جان، بے حس چہروں پر اُونگھتی ہوئی پریشانی میرے ذہن میں مختلف قسم کے جذبات کو سہلانے

لگی۔ میری پیٹھ کے پیچھے بیٹھے ہوئے دو مسلمان نوجوان اس بات پر زور دار بحث کر رہے تھے کہ یہ چاوڑی بازار، ہیرا منڈی اور دوسرے بازارِ حُسن عموماً ہر شہر میں وہاں کی جامع مسجد کے قریب ہی کیوں ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ ایک موٹا بوڑھا مارواڑی اور اُس کی نوجوان بیوی بیٹھی ہوئی تھی۔ بیوی کی ہاتھی دانت کی سُرخ چوڑیاں اُس کے نئے سہاگ کی گواہی دے رہی تھیں۔ پوچھنے پر سیٹھ جی نے بتایا کہ اُنکے ہاں کوئی لڑکا نہیں جس لئے دوسری شادی کرنی پڑی جب اُس سے پھر پوچھا گیا کہ کیا اس کے ہاں پہلی بیوی سے کوئی بچہ پیدا ہی نہیں ہوا تو اُس نے بڑے گھریلو انداز میں جواب دیا کہ اس کی پہلی بیوی کے ہاں بچے تو ایسے پیدا ہوتے ہیں کہ جیسے مشین سے کھلوتے نکلتے ہیں لیکن کوئی زندہ نہیں رہتا۔ دوسری طرف کی کھڑکیوں کے قریب ایک دھوتی پوش مہاشہ بڑے ہمدردانہ اور دوستانہ انداز میں ہر ایک کے حالات پوچھ رہا تھا۔ ہر ایک کے ساتھ ہمدردانہ ہو رہا تھا ہر ایک پر ہمدردی اور شفقت برسا رہا تھا۔ بغیر جواب کی اُمید یا انتظار کے ہر ایک سے سوال کر رہا تھا۔ اس کی ان سب حرکتوں میں ایک بے بس مشینی پابندی اور باضابطگی تھی۔

وہ سنجیدہ سادہ نوجوان اس بحث و مباحثہ کے شور و غوغا سے غیر متاثر، کھڑکی سے باہر ابھی ابھی نکلے ہوئے چاند کی روشنی میں بھاگے جاتے تار کے کھمبوں اور لہروں کی طرح اُونچے نیچے حرکات کرتے تاروں کی طرف ٹکٹکی لگائے ہوئے تھا۔ پھر مجھے اپنے دوست "راجندر کمار کھنہ" کا خیال آیا اور میں سوچنے لگا کہ مجھے اُسے ڈھونڈنے کی کچھ اور کوشش کرنی چاہئیے تھی۔ گھر کے پتہ پر پوچھ کر لوٹ آنا کافی نہیں ہونا چاہئیے تھا۔

یتیم لڑکا اپنی طرف کسی کو متوجہ نہ دیکھ کر آگے سرک آیا اور ایک ٹرنک پر کھڑا ہو کر زور زور سے چیخنے لگا "آپ بھائیوں کو معلوم ہوگا کہ ایک فقیر چار گھر مانگ کر پیٹ بھر سکتا ہے، ایک ودھوا چار گھر مانگ کر اپنا پالن کر سکتی ہے، لیکن یہ چھوٹے چھوٹے بچے آپ بھائیوں کے پیسوں سے پرورش پاتے ہیں۔ جہاں آپ سینکڑوں روپے اپنے بچوں کے لئے خرچ کرتے ہیں، دو چار آنے تو آپ پان بیڑی کھا کر تھوک دیتے ہیں، اِن بچوں کو ایشور کے نام پر کچھ دینا بڑی بات نہیں" وہ لڑکا گراموفون کے ریکارڈ کی طرح چلّائے جا رہا تھا۔ ایک طرّے دار پگڑی والے بلوچ نے اُسے چلّانے سے پہلے بھی روکا تھا۔ اب اُسنے ہاتھ بڑھا کر اُس کا کان مروڑا اور طمانچہ دکھا کر اُسے خاموش رہنے کے لئے کہا۔ یہ سب کچھ اس نے اتنے دہشت خیز طریقے سے کیا کہ یتیم لڑکا سہم کر خاموش ہوگیا۔

دائیں طرف دروازے کے قریب پھر جھڑپ شروع ہوئی۔ وہی ٹرنک کے اوپر رکھنے کا جھگڑا تھا۔ اس دفعہ ایک دو گھونسوں کا تبادلہ بھی ہوا۔ ایک شخص نے کہا "اس ٹرنک کو بیت الخلا کیوں نہیں رکھ دیتے، بالکل خالی ہے" ٹرنک والا معترض نظروں سے اس کی طرف گھورنے لگا۔ اُس شخص نے دُہرایا "اس میں خفا ہونے کی کوئی بات نہیں، یہ پاخانہ گھر کے پاخانوں کی طرح گندہ نہیں"

قریب ہی بیٹھے ہوئے ایک اور مسافر نے اضافہ کیا "یہ ریل گاڑیوں کے پاخانے ہمارے گھروں کے پاخانوں سے تو کیا ہندوستان کے نوّے فی صدی گھروں سے زیادہ صاف اور صحت افزا ہیں" ایک ذرا پرے کھڑے مسافر نے آگے بڑھ کر چمڑے کا سوٹ کیس اُٹھا کر اوپر رکھدیا اور وہ بھاری ٹرنک اسکی جگہ نیچے۔

ایک کرسٹی ٹوپی والا مسافر دروازے کے ساتھ کھڑا تھا ہمارے قریب آبیٹھا اور بیشتر اس کے کہ کوئی اعتراض کرے وہ بڑھیا سے پوچھنے لگا کہ وہ کہاں جارہی ہے۔

"دہلی۔ سہارنپور گاڑی بدلنا ہے نا" بڑھیا نے جواب دیا۔

اس کے پوچھنے پر وہ اپنی کہانی سنانے لگی کہ اس کا لڑکا دہلی کی کسی مل میں ملازم ہے۔ پچھلے چار مہینوں سے اُسے تنخواہ نہیں ملی اور اب وہ سخت بیمار ہے۔ نہ گھر لوٹ آنے کے لئے اسکے پاس کرایہ ہے اور نہ کوئی اور نوکری ملتی ہے۔ اب مجھ سے نہیں رہا گیا۔ خود ہی چلی آئی ہوں۔

یہ کہتے کہتے بڑھیا کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔

"اس کا باپ کیوں نہ آیا؟" اس نے پھر ہمدردی کا اظہار کیا۔

بڑھیا اپنے آنسو روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اب نہ روک سکی۔ اور وہ ان ٹپکتے آنسوؤں میں رُک رُک کر بڑبڑانے لگی "شہید گنج کا فساد ہوا تھا نا۔ تین دن کام پر نہ گئے۔ آخر جانا پڑا خوانچہ لگائے بیٹھے ہوئے تھے کہ کسی نے چھرا گھونپ دیا۔"

ہڈیوں کے ڈھانچے نے ایک چھوٹی سی پڑیا کو مُنہ میں ڈالتے ہوئے کرسٹی ٹوپی والے سے کہا "جانتے ہو یہ کیا ہے؟ اس سے کوڑی کا پان پانچ روپے کا بن جاتا ہے" ابھی وہ جواب دینے ہی والا تھا کہ ہڈیوں کے ڈھانچے نے پھر اُس کی گردن پر لٹکتے ہوئے سے مسّے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سوال کیا "یہ کیا ہے؟"

"چھوٹی عمر میں غلطی سے ایک گائے کی گردن پر تھوک دیا تھا۔ اس کی وجہ سے ہے۔"

میرے پیچھے بیٹھا ہوا مسلمان نوجوان اپنے دوست سے کہہ رہا تھا کہ کل لاہور میں مولانا حمید الدین کا بڑا شاندار جلوس نکلا۔

ہڈیوں کے ڈھانچے نے جلدی سے گردن اُدھر گھمائی اور بڑے جوش سے بولا: جلوس تو بھئی سب کے نکلتے ہیں۔ کسی کا مرنے سے پہلے کسی کا مرنیکے بعد" اور پھر اسی کھوکھلی مذاق سے خالی ہنسی میں ہچکولے کھانے لگا۔

کرسٹی ٹوپی والے نے پٹیالوی پگڑی والے سکھ نوجوان سے سوال کیا" سردار جی آپ کیا کام کرتے ہیں؟"

"تلاش روزگار" سکھ نوجوان نے ذرا پس وپیش کے بعد کہا: کوئی جگہ خالی نہیں۔ ابھی سول سرجن لاہور کے دفتر میں ۲۷ روپے ماہوار کی نوکری کے لئے انٹرویو کرکے نا اُمید لوٹ رہا ہوں"

"آپ شکل ولباس سے تو خوشحال معلوم ہوتے ہیں کوئی کاروبار کیوں نہیں کر لیتے؟"

"میرا یہی انٹرویو کیلئے مخصوص سوٹ شاید میری کُل پونجی ہے"

دوسری طرف کی نشستوں پر بیٹھا ہوا ایک مسافر یکایک بول اُٹھا: "کاروبار کی بھلی کہی۔ یہ بھی ایک جوا ہے۔ کاروبار کرنے والے کنگال ہوتے جاتے ہیں اور کاروبار کرنیوالے لکھ پتی کروڑ پتی بنتے جاتے ہیں" پھر وہ اپنی آپ بیتی سنانے لگا۔ کیسے وہ لاہور میں دو سال میں سات ہزار روپیہ اس کاروبار کے جوئے میں اجاڑ کر آ رہا ہے۔ کیسے وہ ہمیشہ بد قسمت ہی رہا ہے کیسے اُس سے بے انصافی ہی ہوتی رہی ہے۔

ایک قریب بیٹھے ہوئے مسافر نے اُسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا: پرماتما پر بھروسہ رکھو۔ اسکے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں"

سادھو نے جو اُسکے قریب سرک آیا تھا آہستہ سے کہا" جس ملک میں بھگ منتوں کو پیٹ بھر روٹی نہیں ملتی اُس میں اور کون سکھی ہوگا"

میرے دائیں طرف بیٹھی ہوئی غریب عورت جس کی گود میں اُسکے دو بچے لیٹے تھے، اپنی پچھلی سیٹ پر بیٹھی ایک عورت کو اپنی رام کہانی سنا رہی تھی کہ کس طرح مہتروں کی ہڑتال میں اُسکے خاوند کو بلوہ کرنے کے الزام میں پانچ سال قید ہوئی اور کیسے اُس نے چھ مہینے کی محنت مزدوری کے بعد اس سے لاہور ملنے جانے کیلئے کرایہ کے پیسے اکٹھے کئے اور کیسے وہ اب بھوک اور دُکھ کے دن گذار رہی ہے"

دائیں طرف کھڑکی کے قریب پھر گالیوں چیخوں کی آوازیں آنے لگیں۔ چمڑے کا سوٹ کیس نیچے گر پڑا تھا اور نیچے بیٹھے ہوئے مسافر کے سر پر سخت چوٹ آئی تھی۔

جالندھر کا اسٹیشن قریب آتا جا رہا تھا۔ یتیم لڑکے نے طرّے دا پگڑی والے کی منت سماجت سے گانے کی اجازت لی اور پھر اپنا پرانا سبق زور زور سے جلدی جلدی رٹنے لگا اور بعد میں صندوقچی کھٹکھٹا کر رسید بک ہاتھ میں پکڑ چندہ مانگنے لگا۔

جب وہ یتیم لڑکا اُس مسافر کے قریب پہونچا جسکے چوٹ لگی تھی تو وہ اُس سے بڑے روکھے پن سے پوچھنے لگا" کیا بات ہے؟"

"بالو یتیم ہوں" اُس لڑکے نے التجا کی۔

"تو کیا ہم یتیم نہیں، دیکھتے نہیں ہو ہماری حالت، پیسے خرچ گئے ہیں پھر بھی کوئی پوچھنے والا نہیں" اُس نے کرخت لہجہ میں کہا: بھئیا ہم چالیس کروڑ غلام سب یتیم ہیں" اسکی آواز دفعتاً نرم ہوگئی۔

میں اس غریب عورت کی گود میں لیٹے ہوئے دو بچوں اور چودہ روپے ماہوار تنخواہ پانے والے قلی کے سات بچوں کی طرف دیکھکر سوچنے لگا کہ ماں باپ کے زندہ ہوتے ہوئے بھی یہ لڑکے یتیم ہی تو ہیں۔ انکے والدین غیر والدین کی طرح اپنے بچوں کیلئے کر ہی کیا سکتے ہیں۔

سنجیدہ نوجوان کی خاموشی کو توڑتے ہوئے کرسٹی ٹوپی والے نے پوچھا" جناب کہاں جا رہے ہیں؟"

"انبالے!"

"اور یہ آپ کی بیوی اتنی غمگین کیوں ہیں؟"

"میری بہن ہے، بیوہ بہن" یہ کہتے کہتے اس کی آنکھیں بھیگ گئیں اور لڑکی کی آنکھوں سے زار وقطار آنسو ٹپکنے لگے۔ اور اُس نے اپنے آنچل سے مُنہ کو چھپالیا" نوکری چھوٹ جانے کے بعد اس کا خاوند گھبرایا ہوا گھر لوٹ رہا تھا۔ ایک شراب میں مدہوش پولیس آفیسر کی موٹر کے نیچے آکر اتنا زخمی ہوا کہ ہسپتال پہونچنے سے پہلے جان نکل گئی" اُس نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔

"کیا نام تھا اُس کا؟" میرے مُنہ سے اضطراراً نکل گیا۔

"راجندر کمار کھنہ"

"راجندر کھنہ —" میری نبض کی دھڑکن رُک گئی۔ ناگہانی غم نے مجھے بالکل بے حس و ساکت بنا دیا۔ آنکھوں سے آنسو پھوٹ پڑے اور میں نے اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں چھپالیا۔ پے در پے ضربیں۔ باپ، ماں، بہن، اب یہ دُکھ سکھ کا دوست — شدّتِ غم سے میرا دل تلملا اُٹھا۔

اس المناک نیم حسی سے مجھے گیبرڈین کی پتلون والے نوجوان نے بیدار کیا" بڑا دردناک فسانہ ہے" اُس نے میری کتاب واپس کرتے ہوئے کہا۔

شمشیر سنگھ نرولا۔

جہیز

سُنتے ہیں کہ اگلے زمانہ میں بہت سے وحشی قبیلے اپنی لڑکیوں کو مار ڈالتے یا زندہ دفن کر دیتے ____ وہ آخر ایسا کیوں کرتے؟

____ اس زمانہ میں تو جہیز کی رسم نہ تھی! کیسے احمق تھے وہ لوگ؟ اور کیسے خونخوار اور ظالم تھے وہ باپ جو کہ ایسا کرتے؟ لیکن خیر اب زمانہ بدل گیا ہے اور لوگ زیادہ عقلمند ہو گئے ہیں ____ کیسے کچھ! ____ اور اب پرانے قسم کے خونخوار اور ظالم باپ نہیں رہے ____ شاید!

ایک روز میں دفتر سے آکر پلنگ پر لیٹا بیڑی پی رہا تھا کہ دفعتاً میری لڑکی موہنی دوڑتی ہوئی آئی اور مجھ سے کہنے لگی "پاپا! ایک کتاب میں لکھا ہے کہ پرانے زمانہ میں لوگ اپنی لڑکیوں کو مار ڈالتے تھے! کیا یہ سچ ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم!" میں نے لاپرواہی سے کہا۔

"کیسے ظالم تھے وہ باپ؟" موہنی نے پھر کہا "کیوں پاپا؟ وہ ایسا کیوں کرتے؟"

"اپنی لاج رکھنے کے لئے کرتے ہوں گے۔ لڑکی خاندان بھر کی عزت ہوتی ہے نا؟" میں نے کہا۔

"تو اپنی لڑکیوں کو مار ڈالتے وقت ان لوگوں کو ذرا بھی دکھ نہ ہوتا"

"دکھ کیوں نہ ہوتا؟ لیکن انہیں اپنی لڑکیوں سے زیادہ اپنی لاج پیاری تھی" میں ابھی یہ کہہ ہی رہا تھا کہ مٹی میں ہاتھ سانے دھوئیں سے چہرہ کو لال چقندر بنائے میری بیوی سندری باورچی خانہ سے بوکھلائی ہوئی آئی اور چیخنے لگے "ارے کیا ہوا؟ کس نے اپنی لڑکی کو مار ڈالا!"

میں اور موہنی بے اختیار قہقہہ مار کر ہنسنے لگے۔ سندری جھینپ سی گئی اور غصہ سے ہم دونوں کو گھورتی ہوئی اپنے کام پر واپس چلی گئی۔

:.

میں کہتا "رمیش کے ہاتھ کی گھڑی کیسی خوبصورت ہے۔ دفتر میں کام کرنے والے ہر شخص کے پاس ایک ایسی گھڑی ہونی چاہئے۔ اور سندر بابو کا وہ گرم کوٹ کتنا عمدہ ہے۔ اس کو دیکھتے ہی جاڑا چلا جاتا ہے!"

موہنی کہتی "پاپا! اب چپلوں کا زمانہ نہیں رہا اس سے پیر بھدے ہو جاتے ہیں۔ سب لوگ جنکے پاس پیسہ ہے اونچی ایڑی کا جوتا پہنتے ہیں۔ اور آپ نے وہ سیتا کا ہار دیکھا؟ موتیوں والا! چاہے کوئی زیور نہ ہو بس ویسا ایک ہار ضرور ہونا چاہئے!"

سندری بولتی "جارجیٹ کی پرانی ساری تو پھٹ کر چیتھڑا ہو گئی اب تو ایسا بھی نہیں کہ کہیں برادری میں مُنہ دکھا سکوں؟"

ہم تینوں پر ایک مایوس کن خاموشی طاری ہو جاتی اور نہ معلوم کتنی دیر قائم رہتی ____

پھر میں کہتا "اگلے مہینہ میں موہنی کے لئے ایک اونچی ایڑی کا جوتا ضرور آجائے!"

سندری منہ بناتی۔

موہنی کہتی "نہیں پاپا پہلے آپ کا ایک گرم کوٹ بن جائے! جو کوٹ آپ پہنتے ہیں کیسا میلا ہے میں تو اس میں پیوند لگاتے لگاتے عاجز آگئی ہوں"۔

سندری پھر منہ بناتی اور خفا ہو کر کہتی "ہاں سب آجائے اور میں جو دو برس سے کہتے کہتے تھک گئی کہ ایک گت کی ساری آجائے تو وہ ہرگز نہ آنے پائے۔ آخر مجھے بھی برادری میں مُنہ دکھانا ہے یا نہیں؟"

تھوڑی دیر کے لئے پھر خاموشی طاری ہو جاتی لیکن پھر سندری کا غصہ دیکھ کر مجھے اور موہنی کو بے اختیار ہنسی آجاتی اور ہم لوگ قہقہہ مار کر ہنسنے لگتے ____ ہم لوگ پہلے ہنستے لیکن سندری بعد میں! اور اُسی کی ہنسی اصل ہنسی رہتی۔

مہینہ کی پندرہ تاریخ سے لیکر تیس یا اکتیس تاریخ تک ہم تینوں باپ بیٹی اور ماں اپنے لیئے خوشنما خواب بنایا کرتے اور ان ہی خوابوں میں ایک دوسرے کیلئے ایثار بھی کرتے اور ایک دوسرے سے خفا بھی ہوتے لیکن پھر ____ گھڑی۔ گرم کوٹ۔ اونچی ایڑی کا جوتا۔ موتیوں کا ہار۔ ساری۔ یہ سب پرچھائیاں اور اسی قسم کی بہت سی دوسری پرچھائیاں مہینہ کی پہلی تاریخ کو جب میں دفتر سے اپنی تنخواہ لاکر سندری کے ہاتھ پر دھر دیتا ہوا میں تحلیل ہو جاتیں۔ میں اور موہنی ایک دوسرے کا مُنہ تکتے اور سندری کی فیصلہ کن آواز ہوا میں گونجتی ہوئی سنائی دیتی "ہائے رام! گیہوں روپیہ کے آٹھ سیر۔ ماش روپیہ کے تین سیر۔ اور روئی روپیہ کی ڈیڑھ سیر! باپ رے باپ! میں کہتی ہوں آخر یہ کیسے گھر کا دھندا پار لگے گا۔ پاگل ہوئی جا رہی ہوں پاگل!"

:.

میرا خاندان نہایت مختصر تھا۔ میں۔ میری بیوی اور میری لڑکی موہنی ____ جو واقعی موہنی ہی تھی۔ میں قصبہ کے چھوٹے سے ڈاکخانہ میں پوسٹ ماسٹر تھا ____ بیس سال سے ____ اور مجھے سینتالیس روپیہ پندرہ آنہ تنخواہ ملتی۔ ایک آنہ تنخواہ کی رسید کے ٹکٹ میں کٹ جاتا۔ مہینہ کی

پہلی تاریخ کو میں اپنی تنخواہ لاکر سندری کے سپرد کر دیتا اور وہ دوسرے دن مجھے بیڑی کے تیس بنڈل یکمشت منگا دیتی۔ پھر مجھے نہیں معلوم ہوتا کہ میری تنخواہ کیا ہوتی اور گھر کا خرچ کیسے چلتا البتہ کچھ نہ کچھ تنگی ہمیشہ رہتی۔ میری بیوی ہمیشہ مجھ سے یہی شکایت کیا کرتی کہ آخر میری تنخواہ کیوں نہیں بڑھتی؟ جب سے گرانی آگئی تھی اس وقت سے ہم لوگوں کی حالت اور بھی خراب ہوگئی تھی اور اب یہ دستور ہوگیا تھا کہ ہر چوتھے پانچویں روز کوئی نہ کوئی قرضخواہ ہمارے دروازہ پہ کھڑا رہتا۔

ایک چھوٹے سے مقام پہ پوسٹ ماسٹر کی حیثیت بھی مضحکہ خیز ہوتی ہے۔ سمجھا تو یہ جاتا کہ وہ گورنمنٹ کا ایک بڑا عہدہ دار ہے اور حالت یہ ہوتی کہ اس کی تنخواہ اس کی زندگی کی اولین ضروریات کے لئے بھی کافی نہ ہو سکتی۔ لوگ مجھ سے توقع تو یہ رکھتے کہ میں بہت صاف اور اچھے کپڑے پہن کر چمکدار جوتوں اور خوبصورت سی گھڑی کی معیت میں بڑی شان و شوکت سے سائیکل پہ ڈاکخانہ آؤں لیکن میری کیفیت یہ تھی کہ میں سچے کوٹ۔ ٹوٹے جوتے اور میلی ٹوپیاں استعمال کرتا اور ڈیڑھ میل پیدل چلکر ہانپتا ہوا دفتر میں داخل ہوتا۔ چھٹے چھ ماہے قصبہ کے لوگ مجھے دعوتوں میں بھی بلا لیتے لیکن ایسے موقعوں پہ میری موجودگی صرف ایک مرقع عبرت ثابت ہوتی۔

تب بھی لوگ مجھ پہ رحم نہ کھاتے!—— میرے سننے میں آتا کہ لوگ مجھے کنجوس کہتے ہیں، منحوس سمجھتے ہیں، کمینہ قرار دیتے ہیں۔ اور ذلیل تصور کرتے ہیں۔ میرے دور کے رشتہ دار طرح طرح کے قصہ کہانیاں میرے خلاف مشہور کرتے۔ لوگوں کو دوڑ غلاتے کہ وہ سویرے اٹھ کر میرا منہ نہ دیکھیں۔ غرضیکہ ہر جگہ میرا مذاق اُڑتا اور مجھے مطعون اور بدنام کیا جاتا۔ لوگوں کو مجھ سے عام شکایت یہ تھی کہ وہ اپنے اندازہ کے مطابق سمجھتے کہ مجھے کوئی بڑی لمبی چوڑی تنخواہ ملتی ہے اور میں اس سے دوگنی رشوت لیتا ہوں اور یہ سب رقمیں جوڑ رہا ہوں یا سود پہ چلا رہا ہوں اور نہ کھانا کھاتا ہوں نہ پیتا ہوں نہ لوگوں کی دعوتیں کرتا ہوں اور نہ ان کو قرض دیتا ہوں اور نہایت بھیلچڑ حالت بنائے گھومتا رہتا ہوں اور دل ہی دل میں دوسرے لوگوں کی مفلسی یا فضول خرچی پہ خوش ہوتا ہوں۔ جب لوگ مجھے میرے پیوند لگے ہوئے بوسیدہ کوٹ اور منہ پھاڑے ہوئے جوتوں اور تیل سی چیکٹی ہوئی ٹوپی میں دیکھتے تو طعنہ دیتے "کیوں یار! کس کے لئے جوڑ رہے ہو یہ سب دولت؟" "دوسروں کو نہ دو خود تو کھا پی لو"!

اپنے گرد و پیش ناحق خدا واسطے کی یہ سازش دیکھ کر میرا دل جل بھن کر کباب ہو جاتا اور جوش انتقام سے میرا جی یہ چاہتا کہ میں اپنے خلاف ہر فضول بکنے والے کو پھانسی دیدوں لیکن کیا کرتا!—— مجبور تھا۔ انتہی اند طوفان اٹھتے زلزلے آتے لیکن—— غصہ میں دو چار بیڑیاں اور زیادہ پی جاتا اور بس!—— اتنا ہی نہ ہوتا کہ کبھی تنخواہ سے اس قدر پس انداز ہو جاتا کہ میں ایک نیا گرم کوٹ بنوا لیتا یا ایک چمکدار جوتا خرید لیتا۔ گھڑی کا تو ذکر ہی کیا! گھڑی کی تمنا تو اس وقت سے میرے دل میں کھٹک رہی تھی جبکہ میں صرف دس برس کا تھا۔

میری لڑکی موہنی پچیس برس کی ہو چکی تھی ابھی تک اس کی شادی نہیں ہوئی تھی، شادی کی بات چیت کئی جگہ سے ہوئی لیکن پھر نہیں معلوم کیا ہوتا کہ وہ لگ لگ کر چھوٹ جاتی۔ مجھے اس بات کی بڑی فکر اور پریشانی تھی اور واقعی یہ بات بھی ایسی ہی تھی لیکن اس فکر اور پریشانی نے سندری کو تو بالکل ہی پاگل اور بدحواس کر دیا تھا۔ جس روز سے موہنی نے پندرہویں سال میں قدم رکھا تھا اس کی ماں اس کی شادی کے لئے بے چین ہوگئی تھی اور جیسے جیسے دن گذرتے گئے اور موہنی بڑھتی گئی اس کی ماں کی بےچینی اور اضطراب میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ دو چار جگہ کے پیغاموں کی ناکامی نے تو اسے اور انگاروں پر لٹا دیا اور وہ دن رات موہنی کی شادی کے لئے ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگی جب اس کا اور کوئی بس نہ چلتا تو وہ مجھے پکڑ پکڑ کر جھنجوڑتی "اندھے ہو۔ دیوانے ہو۔ احمق ہو۔ دیکھتے نہیں جوان لڑکی گھر میں بیٹھی ہے اور تمہیں شادی کی کوئی فکر نہیں۔ آخر کیسے ہوتی ہے۔ دنیا میں شادی! کون سی کمی ہے ہماری لڑکی میں صورت شکل کی گن کی ڈھنگ کی۔ پھر آخر کیوں نہیں ہوتی اس کی شادی۔ محض تمہاری وجہ سے! تم تو دن رات بیٹھے بیڑی پیا کرتے ہو۔ ڈاکخانہ سے چرائی ہوئی کتابیں پڑھا کرتے ہو۔ تمہیں تو عشق و محبت کے جھوٹے سچے قصوں ہی سے نہیں فرصت! ایسے ہوتی ہے کہیں شادی! نہ کسی سے ملنا نہ جلنا۔ ہر وقت دم دبائے گھر میں گھسے رہتے ہو۔ کیا آسمان سے کود دے گا کوئی داماد! سنتے نہیں محلہ والے کیا کہتے ہیں؟ سارا قصبہ تم پہ تھوک رہا ہے! میں نے اسی وجہ سے تو کہیں نکلنا چھوڑ دیا ہے۔ آخر کیا سوچ رہے ہو تم؟ بولتے کیوں نہیں میں بھی تو سنوں کیا ٹھان رکھی ہے تم نے؟ نرے احمق!" اور جب اور زیادہ بوکھلا جاتی تو کہتی "مجھ سے تو اب یہ بے غیرتی نہیں دیکھی جاتی۔ دیکھ لینا کسی دن کچھ کھا کر سو رہونگی"!

مجھے سندری پر بڑا رحم آتا۔ میں سب کچھ دیکھتا اور سنتا لیکن آخر کیا کرتا۔ کہاں جاتا اور کس سے کہتا؟ سب سے بڑی بات جہیز کی تھی۔ بھولا بھٹکا اگر کوئی شادی کی بات چیت کرنے والا مل بھی جاتا تو وہ جہیز اس قدر مانگتا جو میں کیا میری سات پشتیں بھی نہ ادا کر سکتیں۔ مجھ پر تو ایک مایوسی کا سا عالم طاری ہوگیا تھا۔ لیکن میں اس کو سندری سے چھپائے رکھتا ورنہ وہ اپنی جان ہی دیدیتی۔

ایک روز مجھے اپنے دفتر کے کسی کلرک سے معلوم ہوا کہ قصبہ میں ایک بھاسکر بابو رہتے ہیں جو یوں تو دلالی کا ہر ایک قسم کا کام بڑی خوبی اور سلیقہ سے کرتے ہیں لیکن شادی بیاہ کرا دینے میں انہیں خاص ملکہ اور مہارت حاصل ہے۔ ان کی لگائی ہوئی بات کبھی پھٹ نہیں پڑتی اور اپنی حکمت عملی سے انہوں نے بعض ایسی ناکامیاب ہستیوں کے ایسے کامیاب جوڑے لگوا دئے ہیں کہ وہ دور دور تک مشہور ہوگئے ہیں اور آس پاس کے شہروں تک کے آدمی ان کے پاس مشورہ اور صلاح لینے آتے ہیں۔ ابھی حال ہی میں انہوں نے

ایک ایسے معرکہ کی شادی کرائی کہ قصبہ کے سارے لوگ ان کی ہوشیاری اور رسائی پر عش عش کرتے رہ گئے۔ قصبہ کے ایک تعلقدار نے ایک رئیس کی لڑکی سے شادی کرنے سے انکار کردیا تھا اور ایک معمولی تاجر کی لڑکی سے شادی کرلی تھی۔ رئیس جذبہ انتقام میں جل بھن کر کباب ہوگیا اور اس نے بدلہ لینے کی کوئی ترکیب نکالنے کے لئے سبھا شنکر بابو کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ سبھا شنکر بابو نے اسے تسلی و تشفی دی اور اس کی حمایت میں کمرِ ہمت باندھ کر تیار ہو گئے۔ تین ہی مہینہ میں انہوں نے کوئی ایسا منتر پھونکا کہ تعلقدار نے تاجر کی لڑکی کو تو طلاق دیدی اور الٹے خوشامد کر کے اور گڑگڑا کر رئیس کی لڑکی کو بیاہ لے گیا۔

میں نے سبھا شنکر بابو کی یہ کرامات اور فضائل سُنے تو میرے مُنہ میں پانی بھر آیا۔ پہلے تو میری ہمت پڑی نہیں کہ اپنے ایسے ہیچمداں وجود کو ایسی مقتدر اور عقل کل ہستی کے حضور میں لے جاؤں لیکن پھر مجھے جانا ہی پڑا۔ سبھا شنکر بابو ملے اور بہت اچھی طرح ملے۔ انہوں نے بڑے اخلاق اور ہمدردی سے میری پوری کہانی سنی اور پھر نہایت محبت سے فرمانے لگے "بس اتنی سی بات! تم نے مجھ سے پیشتر کیوں نہیں کہا؟ منٹوں میں بنائے دیتا ہوں منٹوں میں" اظہار احسانمندی میں میرے آنسو نکل پڑے "سبھا شنکر بابو میں آپ کے رحم و کرم پر ہوں۔ آپ کے سوا میرا کوئی نہیں۔ میری لاج آپ کے ہاتھوں میں ہے" سبھا شنکر بابو نے مجھے تسلی و تشفی دی اور میری پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "بابو جی ہمت چاہیئے ہمت۔ بس پھر تو بیڑا پار ہے۔ مجھ سے آپ کی جو کچھ سیوا ہو سکیگی میں اٹھا نہ رکھونگا۔ آپ کی لڑکی میری لڑکی ہے"

سبھا شنکر بابو موٹے بھدے اور پستہ قد انسان تھے۔ ان کی توند ذرا ضرورت سے زیادہ آگے بڑھی ہوئی تھی۔ ان کا سر بڑا اور ماتھا چوڑا تھا لیکن آنکھیں بہت چھوٹی تھیں اور بڑی تیزی سے جلدی جلدی حرکت کرتیں۔ مجھے یہ سب عقلمندی اور ہوشیاری کے قرائن معلوم ہوئے۔ ان کی طوطے نُما بھدی سی ٹیڑھی ناک اپنے اندر بڑی جاذبیت رکھتی۔ میں نے پہلے ہی سے سن رکھا تھا کہ بڑی ناک والے بڑی ہوشیاری اور ہمت والے انسان ہوتے ہیں، اور ان سب باتوں کے علاوہ میں سب سے زیادہ سبھا شنکر بابو کے حسن اخلاق سے متاثر ہوا۔ ان سے ملنے کے بعد مجھے کچھ ایسا معلوم ہوا جیسے مجھے میرا نجات دہندہ مل گیا اور میری ذمہ داری کا بوجھ دفعتاً میرے کاندوں پر سے اتر گیا۔

میں خوشی خوشی گھر پہونچا اور سبھا شنکر بابو سے اپنی ملاقات کا اور ان کے جملہ گذشتہ کارناموں کا کچا چٹھا بہت کچھ نمک مرچ لگا کر سندری کو سنایا۔ وہ مارے خوشی کے پھولے نہ سمائی۔ بار بار کہنے لگی "میں تو پہلے ہی کہتی تھی کہ آدمی کوشش کرے تو کیا نہیں ہو سکتا؟ کوشش سے بھگوان تک تو مل ہی جاتا ہے۔ میں اگر مرد ہوتی تو ایک کیا سات لڑکیوں کی شادی کر چکی ہوتی" اس نے یہ تمام باتیں نہایت نیک نیتی سے کہیں اور اس کا مطلب مجھے کوئی طعنہ دینا ہرگز نہ تھا بلکہ اس وقت تو اس نے مجھے کچھ ایسی نظروں سے دیکھا کہ ——— ان نظروں سے پچیس برس پیشتر ہی دیکھا ہو تو دیکھا ہو۔ اس روز سندری بڑی رات گئے تک جاگتی رہی اور نہ معلوم کیا کچھ بکتی رہی۔ میں اسے اس سے پیشتر اتنا باتونی کبھی بھی نہیں سمجھتا تھا۔ اس نے شیخ چلی کی طرح ہوائی قلعے بنانا شروع کئے تو ان کو آسمان تک اٹھاتی ہی چلی گئی حتیٰ کہ اپنے آئندہ ہونے والے نواسوں کے مونڈنوں تک کی تفصیلات طے کر دیں اور اگر میں سو نہ جاتا تو وہ نہ معلوم کیا کچھ کر ڈالتی۔

دوسرے روز میں ابھی اچھی طرح سو کر بھی نہیں اٹھا تھا کہ سندری نے مجھے کریدنا شروع کیا "جاؤ سبھا شنکر بابو سے مل آؤ۔ غرض اپنی ہے کوئی ان کی تھوڑی ہی ہے۔ تم یاد نہیں دلاتے رہو گے تو وہ بھول جائیں گے" شام کو میں دفتر سے واپس آیا تو ایک کشتی میں چنے کا حلوہ جس پر بڑی دریا دلی سے میوہ چھڑکا ہوا تھا اور چاندی کے ورق لگے ہوئے تھے ایک تولیہ میں لپٹا رکھا تھا۔ میں نے ابھی گھر میں قدم ہی رکھا تھا کہ سندری کہنے لگی "ذرا یہ حلوہ سبھا شنکر بابو کے یہاں تک پہونچوا دو" مجبوراً مجھے جانا ہی پڑا۔

سندری کا دستور سا ہو گیا تھا کہ ہر تیسرے چوتھے روز کوئی حلوہ یا مٹھائی بناتی اور سبھا شنکر بابو کے یہاں بھیجتی۔ سبھا شنکر بابو بھی ریشہ خطمی بنے ہوئے تھے۔ میں جب ملتا تو فوراً محبت سے لپٹ جاتے اور ہر دفعہ ایک نئی امید دلاتے۔ ان کی باتوں میں کچھ عجیب جادو سا ہوتا اور میں ان کی زبان کا نکلا ہوا ہر لفظ فوراً یاد کر لیتا۔ رفتہ رفتہ وہ خود ہمارے یہاں آنے لگے۔ تیسرے چوتھے روز وہ ضرور آتے اور سندری کا پکایا ہوا پکوان خود اپنی معرفت لیجاتے۔ جب وہ آتے تو سندری دروازہ کی آڑ سے لگ کر کھڑی ہو جاتی اور جبتک وہ بیٹھے رہتے وہ کھڑی ان کی باتیں سنا کرتی۔ سبھا شنکر بابو ہر دفعہ اپنے ساتھ کوئی شادی کا پیغام ضرور لاتے لیکن پھر خود ہی اس کو یہ کہہ کر رد کر دیتے۔ "جگہ تو اچھی ہے لڑکا بھی ہونہار ہے لیکن میری طبیعت کچھ جمتی نہیں۔ موہنی کے لئے تو کوئی سچ مچ کا موہن چاہیئے۔ اور پھر موہنی کے لئے کہیں بر کی کمی ہے۔ چھانٹ کر کرونگا بابو جی چھانٹ کر! جب تم بھی تماشہ ہی دیکھتے رہ جاؤ۔ ایسی اچھی لڑکی جو ایسے ایسے مزیدار پکوان پکاتی ہو۔ روز روز نہیں ملتی!"

سبھا شنکر بابو کی باتوں میں مجھکو اور سندری کو کچھ ایسا مزا آتا کہ ان کے چلے جانے کے گھنٹوں بعد تک ہم دونوں آپس میں وہی باتیں دہرایا کرتے۔ ہمیں ان پر پورا پورا اعتماد تھا اور ہم یہ سمجھتے کہ اب موہنی کی شادی ہوئی رکھی ہے۔ زیادہ فکر کی ضرورت نہیں۔ ناامیدی میں امید جھلکنے لگی اور مایوسیوں کی جگہ

آرزوؤں اور تمناؤں نے لے لی۔ سچ پوچھئے تو ہماری زندگی کی تاریک رات میں بھاشنکر بابو نور سحر بن کر جھلملانے لگے۔!

اپنی پیاری موہنی کو بھی میں خوش دیکھتا۔ جب اس کی شادی کی باتیں ہوتیں تو شرم کے مارے دوشیزگی کی سرخی اس کے رخساروں پہ دوڑ جاتی اور وہ دبک کر ایک کونے میں بیٹھ جاتی اور اکثر اپنی آنکھیں بھی بند کر لیتی لیکن ـــــ میں جانتا کہ وہ بھی خوش ہے! کبھی کبھی وہ کنکھیوں سے مجھے مسکرا کر دیکھتی اور میں دفور محبت سے اُسے اپنے سینہ سے لگا لیتا۔ اس کے دلہن بنے کی تصویریں ہر وقت میری آنکھوں میں ناچا کرتیں۔ سندری نے بھی اس کے لاڈ دپیار میں اضافہ کر دیا تھا۔ اب وہ اس پہ کبھی بھی کسی بات پہ ناراض نہیں ہوتی۔ اگر موہنی کوئی کام بگاڑ بھی دیتی تو وہ صرف یہی کہہ کر چپ ہو جاتی "موہنی اب تو تو دوسرے گھر جا رہی ہے۔ کب تک کرے گی یہ بیڈھنگی باتیں؟" اکثر اوقات موہنی کو چڑھانے کے لئے میں کہتا "اب تو خوب پہنے گی اونچی ایڑی کے جوتے اور چمکیلے چمکیلے ہار" موہنی کا چہرہ جھینپ سے تلملا جاتا اور وہ "نا بابا! ایسی باتیں نہ کیجئے" کہتی ہوئی اپنا رخ دوسری طرف کر لیتی۔

ــــــــــ

ایک روز بھاشنکر بابو آئے تو اپنی ناک مروڑتے ہوئے اور ہنستے ہوئے کہنے لگے "لو مبارک! بات پکی ہو گئی۔ آخر ڈھونڈھ ہی نکالا نہ میں نے؟"

میں نے کہا "آخر کیا؟ کچھ میں بھی تو سنوں"

کہنے لگے "بات سنئے گا بعد میں پہلے سیدھے ہاتھ سے مٹھائی منگائیے"

میں نے پوچھا "کچھ بتائیے تو سہی!"

فرمایا "ایسا تیر نشانہ پہ بیٹھا ہے کہ بس میں کیا کہوں؟ میری خود لڑکی ہوتی تو میں اس سے بہتر جگہ نہ ڈھونڈھ سکتا۔ موہنی کے تو بھاگ کھل گئے۔ بڑی بھاگوان لڑکی ہے"

"...... فرمائیے نا!"

"ارے پنڈت اودھ بہاری مہاجن کو تو تم جانتے ہی ہو گے؟ مہاجن کیا ہیں ساہوکار ہیں ساہوکار! لاکھوں کا لین دین کرتے ہیں! ان ہی کے سالے کے ساتھ۔ پنڈت دھنی رام ہے نام ان کا۔ بیس سال سے قصبہ کی تحصیل میں وکالت کرتے ہیں۔ گھر ہے۔ جائیداد ہے۔ آدمی تمیز دار ہیں با سلیقہ ہیں با عزت ہیں۔ گھرانا مشہور ہے اور پرانا۔ ماں باپ کوئی نہیں ہیں لڑکا خود مختار ہے۔ اور کیا چاہئے؟ اور پھر چار پانچ سو روپیہ مہینہ کی وکالت! ہزاروں میں ایک ہیں ہزاروں میں!"

"اور عمر کیا ہے ان کی؟" میں نے دبی زبان سے پوچھا۔

"یہی بس تمہارے لگ بھگ"

"میری عمر تو قریب پینتالیس سال کی ہوگی"

"تو ان کی عمر زیادہ سے زیادہ چھیالیس کی ہوگی۔ ابھی جوان آدمی ہیں بالکل جوان! پار سال تک تو ان کے لڑکے ہوئے ہیں"

"کیا لڑکے بھی ہیں ان کے؟"

قہقہہ مار کر بھاشنکر بابو بولے "ارے یہی تو مزا ہے۔ موہنی کی دلچسپی کا سامان وہاں پہلے ہی سے موجود ہے۔ ایک لڑکا ہے کوئی پندرہ برس کا اور دو چھوٹی چھوٹی لڑکیاں ہیں۔ ابھی چار ہی مہینہ تو ہوئے ان کی بیوی کو مرے ہوئے"

میں تھوڑی دیر کے لئے شش و پنج میں پڑ گیا۔ میرے دماغ میں کچھ اس قسم کے بے ربط خیالات آنے لگے ــــ چھیالیس سال کی عمر ــــ تحصیل کی وکالت ــــ ایک لڑکا دو لڑکیاں ــــ گرم کوٹ ــــ ہاتھ کی گھڑی ــــ اونچی ایڑی کا جوتا ــــ موتیوں کا ہار!

اندر کے دروازہ کی آڑ سے سندری کی آواز سنائی پڑی "اب سوچ بچار کس بات کا؟ بھگوان پر بھروسہ کر کے جو کچھ کہنا ہو کہہ دو۔ ہم تو اپنی لڑکی بھاشنکر بابو کے سپرد کر چکے جیسا ان کے من میں آئے ویسا بر ڈھونڈھ کر کریں۔ اب اچھے اور برے کے وہی مالک ہیں"

میں نے کہا "بھاشنکر بابو لڑکی آپ کی ہے۔ آپ سوچ سمجھ لیں"

بھاشنکر بابو نے نہایت سنجیدہ ہو کر بڑی ذمہ داری سے کہا "پوسٹ ماسٹر صاحب آپ کچھ خوف نہ کریں میں نے صرف لڑکے کو نہیں بلکہ اس کی سات پشتوں تک کو خوب ٹھونک بجا لیا ہے۔ ذات پات میں چوکس۔ گھر گرہستی میں بڑھیا۔ اور اس گھرانے کی عزت اور شان تو پوچھنا (ہی) بیکار۔ اب اور کیا رہ گیا۔ آپ مجھ پہ وشواش کریں۔ اگر آپ کی لڑکی دودھوں نہ نہائے اور پوتوں نہ پھلے تو میرا ذمہ جو چور کی سزا وہ میری۔ اور پھر سب سے بڑی بات یہ ــــ ذرا کان لائیے گا ادھر!"

میں نے حسب الحکم اپنا کان پیش کیا۔ رازدارانہ لہجہ میں کہنے لگے "اور خرچ کم!"

میں نے گھبرا کر پوچھا "اور وہ کیا؟"

فرمانے لگے "بس صرف تین ہزار! دو ہزار نقد اور ایک ہزار کی ٹیم ٹام یعنی اوپر کا صرفہ"

"تین ہزار" میں نے چیخ کر کہا۔ سارا کمرہ اور اس کے اندر گرم کوٹ ــــ ہاتھ کی گھڑی ــــ اونچی ایڑی کا جوتا ــــ موتیوں کا ہار ــــ مجھے رقص کرتے ہوئے نظر آئے۔

نہایت معصومیت سے کہنے لگے "تو بھائی اس سے کم میں کیا ہو سکتا ہے؟ شادی کیا یہ تو ایک مونڈن کا بھی خرچ نہیں۔ اور پھر موہنی کے علاوہ

تمہارا اور کون بیٹھا ہے"

میرے منہ سے بمشکل آواز نکل سکی "لیکن اتنا روپیہ تو ہو" دروازہ کی آڑ سے بھی کچھ پریشانی کے آثار نمودار ہوئے وہ چر چرانے لگا۔

سبھا شنکر بابو خلاف توقع مسکرائے "ہمت کیجئے بابو جی ہمت بگھرانے کی کوئی بات نہیں۔ آپ کی ایسی حیثیت کے آدمی کے لئے تین ہزار کیا تیس ہزار بھی مشکل نہیں۔ میں نے دولھا والوں سے چھ مہینہ کی مہلت لی ہے۔ آپ سب انتظام مجھ پر چھوڑ دیجئے۔ دیکھ لیجئے گا اگر بھگوان کی مرضی ہوئی تو سب کام چٹکیوں میں بن جائے گا"

میں نے دردناک لہجہ میں کہا "سبھا شنکر بابو! بھگوان کا واسطہ مجھ پر دیا کرو۔ تم میری حالت دیکھتے نہیں۔ گت کے کپڑے تک تو نصیب نہیں۔ برسوں سے ارمان ہے کہ ایک گرم کوٹ بنواؤں۔ ایک جیبی گھڑی خریدوں اور قاعدہ کی ٹوپی اور جوتا پہنوں لیکن نہیں جڑتا۔ آخر کہاں سے لاؤں میں تین ہزار! تین سو پر تو میرا دم نکلتا ہے"

"سب ٹھیک ہو جائے گا تمہاری کرپا سے۔ تو میں منظوری دئے دیتا ہوں پنڈت دھنی رام کو! تم سب خاطر جمع رکھو" یہ کہتے ہوئے سبھا شنکر بابو نے اپنی توند سنبھالی اور چلتے بنے ——— ٹھیک ہو گئی موہنی کی شادی! تین چار روز میں ابتدائی رسمیں بھی ہونے لگیں۔

"چاہے کچھ بھی ہو موہنی کی شادی ضرور ہو جائے" سندری نے تحکمانہ لہجہ سے کہا اور کانپتی ہوئی گئی اور کوٹھری سے مٹی کی ایک ہانڈی اٹھا لائی اور اس کو میرے سامنے الٹ دیا۔ کھن کھن۔ کھن۔ کھن۔ میرے سامنے روپوں کا ایک چھوٹا سا انبار لگ گیا "لو یہ میں نے اپنا پیٹ کاٹ کاٹ کر اسی دن کیلئے جمع کیا تھا۔ اب تم جانو تمہارا کام۔ میں نے عورت ذات ہو کر اتنا کیا ہے اب تم مرد مانس ہو جو تم سے ہو سکے تم کرو! آخر لڑکی کو بیاہنا ہی ہے سار ی عمر تو گھر میں بٹھائے نہیں رکھنا؟"

تعجب سے میری آنکھیں پھٹ گئیں۔ میں نے روپیوں کو شمار کیا۔ پورے بارہ سو تھے۔ میں نے ہکلاتے ہوئے کہا "لیکن باقی اٹھارہ سو کہاں سے آئیں گے؟" سندری کو جاڑا سا آگیا تھا اور وہ اپنی پھٹی ساری میں بری طرح کانپ رہی تھی۔ کچھ نہ بول سکی۔

میں سبھا شنکر بابو سے جا کر ملا اور انہیں بتایا کہ بارہ سو کا انتظام تو ہو گیا ہے لیکن اب اٹھارہ سو کہاں سے آئے؟ انہوں نے دنیا بھر کی ناممکن العمل ترکیبیں بتا ڈالیں۔ میں نے بڑی خوشامد کی۔ ہاتھ جوڑے۔ پاؤں پڑا۔ کہ کسی صورت سے یہ تین ہزار روپیہ جہیز کی رقم کم ہو جائے لیکن وہ ایک نہ مانے جھلا کر کہنے لگے "معاف کیجئے گا پوسٹ ماسٹر صاحب آپ تو بچوں جیسی باتیں کرتے ہیں۔ دولھا والوں سے اگر ایک پائی بھی کم کرنے کے لئے کہا گیا تو وہ شادی کرنے سے صاف انکار کر دیں گے۔ وہ تو کسی صورت سے دس ہزار روپیہ سے کم پر راضی نہیں ہوتے میں نے ہزار منت سماجت سے ان کو سمجھایا کہ بھائی تین ہزار اس وقت لے لو اور پھر تو پوسٹ ماسٹر صاحب کی ساری دولت تمہاری ہی ہے۔ موہنی کے علاوہ ان کے کوئی اولاد نہیں۔ نہ معلوم کس وقت سے تو راضی ہوئے ہیں۔ اب آپ اگر تین ہزار کا بھی انتظام نہیں کر سکتے تو آپ کی خوشی۔ پھر مجھ سے کبھی کچھ نہ کہئے گا؟ ذرا غور تو کیجئے پچیس برس کی آپ کی لڑکی اور اس کے لئے ایسا چھٹا ہوا دولھا اور آپ تین ہزار دینے میں بھی کنائی کاٹتے ہیں!"

قصہ مختصر بڑی ہائے تہیا کے بعد سبھا شنکر بابو اور سندری نے شادی کا یہ بجٹ بنوایا کہ بارہ سو روپیہ تو سندری دے ایک ہزار روپیہ کا مکان فروخت کیا جائے۔ چار سو روپیہ میں اپنے محکمہ سے قرض لوں جس کے عوض ماہ بماہ پندرہ روپیہ میری تنخواہ سے کٹے (اس سے زیادہ میں قرض لے بھی نہ سکتا) اور بقیہ چار سو روپیہ کے لئے میں کوئی دوسرا انتظام کروں گھر کی گرہستی بیچوں۔ اڈا بڈا نیلام کروں ——— چاہے چوری کروں۔ ڈاکہ ڈالوں غبن کروں کچھ بھی کروں! ——— میری لڑکی کی شادی ہو رہی تھی یا میں پھانسی کے تختہ پر لٹکایا جا رہا تھا؟ لیکن اب فیصلہ ہو چکا تھا اور سوائے گردن جھکا دینے کے اور کوئی چارہ نہ تھا۔ میں تو اس دن کے تصور ہی سے کانپتا جب میری تنخواہ صرف بتیس روپیہ پندرہ آنہ رہ جاتی اور موروثی مکان فروخت کر کے مجھے کسی کرایہ کے مکان میں منتقل ہونا پڑتا اور ماہ بماہ اس کا کرایہ ادا کرنا پڑتا اور گھر کے برتن تک بازار میں بک جاتے اور میری گرم کوٹ اور ہاتھ کی گھڑی کی خواہش ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتی۔ سندری یوں تو میری کم ہمتی اور بزدلی پر غصہ کرتی ناک بھوں چڑھاتی لیکن جب مجھے حد سے زیادہ مایوس دیکھتی تو کہتی "بھگوان سب دیکھتا اور سنتا ہے وہی مدد کریگا" لیکن میرے دل میں کوئی چٹکیاں لے لے کر کہتا بھگوان ——— اندھا ——— بہرا ——— ظالم کو فتحمند اور مظلوم کو شکست خوردہ دیکھنے والا ——— ذلیل کو ذلیل تر مایوس کو مایوس تر کر دینے والا ——— وہ کچھ نہیں دیکھے گا کچھ نہیں سنے گا کچھ نہیں کریگا!!

تین مہینے گذر گئے ——— اب شادی کے اور شاید میری زندگی کے صرف تین مہینے باقی تھے!! سب انتظام نامکمل تھا اور میں پہلے سے کہیں زیادہ بدحواس تھا۔

موہنی کو ڈبل نمونیہ ہو گیا۔ اس کی حالت بہت زیادہ خراب ہو گئی۔ بچنے کی

کوئی امید نہیں رہی۔ ڈاکٹروں نے قریب قریب جواب دیدیا یا بالکل مایوسی کی حالت ہوگئی۔ میری اور سندری کی کیفیت ناگفتہ بہ تھی۔ پاگلوں اور دیوانوں کی طرح سندری رات دن موہنی کے پلنگ کے گرد گھومتی اور میں دواخانوں اور شفاخانوں کے چکر کاٹتا۔ خدا خدا کرکے آٹھویں روز موہنی کی طبیعت سنبھلی۔ دوائیں اپنا اثر دکھانے لگیں اور صحت کے آثار نمودار ہوتے۔ ڈاکٹروں نے اطمینان دلا دیا۔ اور میں نے اور سندری نے کہنا شروع کر دیا "بچ گئی ہماری موہنی!" موہنی جہاں پہلے آنکھ نہ کھول سکتی اور بات نہ کر سکتی اب آنکھ بھی کھولنے لگی اور بات بھی کرنے لگی۔

ڈاکٹروں نے موہنی کے لئے دو دوائیں دے رکھی تھیں۔ ایک سینہ پہ مالش کی جس کی کہ شیشی پر سرخ جلی حرفوں میں 'زہر' لکھا ہوا تھا اور دوسرے پینے کی جو دن رات میں ہر تیسرے گھنٹہ پر پلائی جاتی۔ سینہ پہ مالش سندری کرتی اور دوا پلاتا میں تھا۔ میں نے ڈاکخانہ سے ایک ماہ کی چھٹی لے رکھی تھی اور ہر وقت موہنی کی تیمارداری میں لگا رہتا۔

رات کے آٹھ بجے تھے۔ میں دواخانہ سے مالش کی اور پینے کی دونوں دوائیں بنوا کر لایا۔ موہنی اس وقت غافل تھی اور اس کے پیروں پہ سندری جو کئی راتوں کی جاگی ہوئی تھی بے خبر سو رہی تھی۔ میں نے سندری کو جگایا اور اس سے کہا کہ وہ علیحدہ پلنگ پہ جا کر سو رہے۔ میں دن میں سو چکا ہوں رات کو جاگتا رہونگا اور وقت سے موہنی کو دوا پلا دونگا۔ سندری نے پوچھا "اور مالش کون کریگا؟" میں نے اسے ڈاکٹر صاحب کا ارشاد بتا دیا کہ رات کو مالش نہ ہوگی اور وہ اطمینان سے جا کر سو رہی۔ میں ایک کرسی گھسیٹ کر موہنی کے سرہانے بیٹھ گیا۔ پہلے تو میں نے ایک رسالہ اٹھا لیا اور اس کو پڑھنے کی کوشش کی لیکن پھر میرے خیالات منتشر ہوگئے اور میں نے اس کو بند کر دیا۔ بھاشنکر بابو کے یہاں سے جو میں ایک چھوٹی سی ٹائم پیس مانگ لایا تھا وہ سامنے میز پر رکھی ہوئی ٹک ٹک۔ کر رہی تھی۔

میں نے موہنی کی طرف دیکھا اس کے زرد رخساروں پہ صحت کی ہلکی ہلکی مدہم سرخی آ رہی تھی۔ میں نے اس دریافت پہ خوش ہونے کی کوشش کی لیکن میں خوش نہ ہو سکا۔ مجھے موہنی کی شادی کی لٹکتی ہوئی تلوار اپنے سر سے قریب تر ہوتی ہوئی نظر آئی۔ میں نے کچھ ایسا محسوس کیا جیسے موہنی از سر نو زندہ ہو رہی ہو اور اس کی زندگی کی بتدریج ترقی کے ساتھ میری زندگی بتدریج زائل ہو رہی ہو ـــــــ موہنی کی شادی کے اب صرف دو ماہ پندرہ یوم رہ گئے تھے۔ میرے دل پہ ایک ٹوکری سی ہی پڑی ـــــــ

گھڑی نے نو بجائے اور میں نے ایک خوراک دوا موہنی کو پلا دی۔

موہنی دھیرے دھیرے سے کراہ رہی تھی۔ مجھے کچھ ایسا معلوم ہوتا جیسے موہنی کے ساتھ ساری انسانیت کراہ رہی ـــــــ کیسی دکھی تھی یہ دنیا!

ـــــــ مظلوم کا کوئی نہیں ـــــــ بھگوان بھی نہیں! ـــــــ سماج! کیسا کمینہ تھا سماج! ـــــــ تین ہزار روپیہ جہیز! ـــــــ ارے بھگوان! ـــــــ

ـــــــ دلال ـــــــ بھاشنکر بابو ـــــــ بنئے ـــــــ مہاجن ـــــــ

ـــــــ آخر کیا تھا یہ سارا گورکھ دھندا ـــــــ لڑکی ـــــــ شادی ـــــــ غلامی ـــــــ غلامی کی قیمت ـــــــ جہیز ـــــــ غلام خود غلامی کی قیمت ادا کرے؟ ـــــــ دولھا کو رشوت؟ ـــــــ اپنی لڑکی کی عصمت لے لینے کا محنتانہ! میں گڑبڑا کر چونک پڑا شاید میں اونگھ گیا تھا۔ گھنٹہ نے بارہ کا گجر بجایا اور میں نے موہنی کو دوا کی دوسری خوراک پلا دی۔

چند منٹ کے بعد موہنی نے آنکھ کھولی۔ اس کے گلے میں خرخراہٹ ہوئی سارا جسم کپکپایا اور پھر بےچینی کے یہ سب آثار موہنی کے چہرہ پہ ایک ہلکے سے تبسم میں تحلیل ہوگئے! اس نے آنکھ بند کر لی گلے کی خرخراہٹ خاموش ہوگئی اور اس کا جسم بالکل ہی بے حس و حرکت ہوگیا۔ یہ سب آنکھ جھپکتے ہی ہوگیا! میں نے لپک کر موہنی کے ماتھے پہ ہاتھ رکھا ـــــــ

ـــــــ میری بچی۔ میرا کلیجہ۔ میری روح۔ میری زندگی۔ میری موہنی اس دنیا میں نہ تھی!۔

میری ایک اجڑے ہوئے باپ کی چیخ سنکر دکھیاری ماں سندری دوڑتی ہوئی آئی۔ پھر کیا ہوا؟ ـــــــ میں اپنی بوٹیاں نوچتا سندری اپنا سینہ کوٹتی۔ لاچار اور مظلوم والدین کی آہ و زاری نالہ و شیون ایک طرف تھا اور قدرت کا اٹل سب سے زیادہ اٹل قانون دوسری طرف ـــــــ وہ کسی صورت سے بھی بدل نہ سکتا۔ موہنی مر چکی تھی!

زندگی کی سب سے بڑی مایوسی جب ہوتی ہے جب انسان مرنا چاہے اور مر نہ سکے یا جب وہ دنیا سے بھاگنا چاہے اور بھاگ نہ سکے اور وہ پھر پکڑ کر اس کی زنجیروں میں جکڑ دیا جائے۔ مجھے اور سندری کو اسی قسم کی مایوسی تھی۔ ساری دنیا آنکھوں میں اندھیری تھی اور ہم لوگ سسک سسک کر اپنی جانیں دے رہے تھے لیکن ـــــــ کمبخت دنیا سے چھٹکارا نہ ملتا۔ کھانا بھی کھانا پڑتا۔ کام بھی کرنا پڑتا۔ غرضیکہ کسی نہ کسی صورت سے زندہ رہنا پڑتا۔

موہنی کی موت کو ایک ماہ گذر چکا تھا۔ بیٹھے بٹھائے میرے دل میں نہیں معلوم کیا سمائی کہ میں سندری سے کہنے لگا "لاؤ کچھ روپیہ لاؤ بازار سے تھوڑا سامان خریدنا ہے"۔ سندری جو پیشتر ایک ایک پیسہ کو دانتوں سے پکڑتی موہنی کے بعد روپیوں کو مٹی کے برابر بھی نہ سمجھتی۔ واقعی جب انسان زندگی ہی سے بیزار ہو تو اس کے لئے کسی چیز کی قدر و قیمت ہی کیا؟ اس نے بارہ سو روپیوں والی تھیلی لا کر نہایت بے تعلقی سے میرے سامنے رکھدی۔

میں نے دونوں شمعیوں میں روپے بھر کر اپنی جیب میں ڈال لئے اور اپنا غم بھلانے بازار چلا گیا۔

میں نے ایک سلا سلایا گرم کوٹ خریدا۔ ایک بہت خوشنما گھڑی اپنی کلائی پر بندھائی۔ سندری کے لئے ایک ریشمی ساری لی اور پھر غیر اختیاری طور سے ایک اونچی ایڑی کا جوتا اور ایک نہایت چمکدار موتیوں کا ہار خریدا۔ میرا ارادہ تھا کہ اس جوتے اور ہار کو میں اپنی موہنی کی یادگار کے طور پر ہمیشہ اپنے پاس رکھوں گا!

میری گھڑی خوب چلتی تھی۔ ٹک۔ ٹک۔ ٹک۔ میں نے اُسے اپنے کان سے لگایا۔ کس تیز رفتاری سے بہی چلی جارہی تھی وہ؟ جیسے دریا کی لہریں! آہ! جن لہروں پر میری موہنی دولہن بنی جارہی تھی دور ——— بہت دور ——— جہاں جہیز کی رسم نہ تھی۔

موہنی کا خیال آتے ہی میں بلبلا اٹھا اور اپنے گھر کے دروازہ سے لگ کر بچوں کی طرح سسکیاں بھر بھر کر رونے لگا۔

میں نے بڑی احتیاط سے جوتے اور ہار کو ایک چھوٹے سے بکس میں رکھ کر اپنے کمرہ کی الماری میں رکھدیا۔ دفعتاً کھلی ہوئی الماری میں میری نظر موہنی کی دواؤں کی شیشیوں پر پڑی ——— میری آنکھیں پتھرا گئیں۔ سر چکرا گیا اور ایک ہیبتناک چیخ کے ساتھ میں بیہوش ہو کر تڑاخ سے زمین پر گر پڑا ———

پینے والی دوا کی سب خوراکیں پوری تھیں اور مالش کرنے والی دوا کی جس کی کہ شیشی پر سرخ جلی حرفوں سے 'زہر' لکھا ہوا تھا دو گم!!

وجاہت سندیلوی

اے میری محبوبہ!

نامہ بر جب یہ خط تم کو دیگا اس سے کہیں پہلے تمہارا عاشق نامراد اس دنیا سے رفوچکر ہو چکا ہوگا!

تم کو افسوس ہوگا؟ شاید۔ البتہ تعجب ضرور ہوگا کیونکہ تم کبھی یہ باور نہ کر سکوگی کہ مجھ جیسا بے حیا انسان خودکشی کرنے پر کسطرح آمادہ ہوگیا۔ بیحیا میں بے شک ہوں، سچ پوچھو تو ہر ایک عاشق اسی طرح بے حیا ہوتا ہے جس طرح معشوق بے وفا، انگریز بنیا خصلت، ہندوستانی ریل سست اور قلی چُست۔ مجھے خود تعجب ہے کہ میں کس طرح اتنے عرصہ تک تمہاری بے وفائی، بدقسمتی کی وفاداری اور خدا کی فراموشی سے تنگ نہ آکر اس سے پہلے ہی اس جہانِ فانی سے فنا نہ ہوگیا!!

ہاں امید، یہ امید ہی تھی جس نے مجھے اب تک زندہ رکھا۔ ہاں ہم پیدا ہی اُمید کے ماحول میں ہوئے تھے۔ والدین نے امید کی ہوگی کہ لڑکی ہوگی، دائی نے اس امید میں کہ زیادہ انعام ملے فوراً خبر دی ہوگی کہ لڑکا ہے، ڈاکٹر نے امید کی ہوگی کہ ماں اور بچہ جلد ہی صحت مند ہو جائیں گے، پھر ماں باپ کے دلوں میں اس امید نے جگہ لی ہوگی کہ لڑکا بڑا ہوگا اور حسب معمول چاند سی دلہن بیاہ لائیگا، ڈپٹی کلکٹر نہیں تو ڈاکٹر یا بیرسٹر تو ضرور بنے گا۔ یعنی ہونہار نکلے گا اور خاندان کا نام ایسا روشن کرے گا کہ یا تو دیکھنے والوں کی آنکھیں چکاچوند ہو جائیں اور یا ڈھونڈنے والوں کو چراغ لیکر تلاش کرنے پر بھی ایسی مثال نہ مل سکے۔ مگر جان من! ہم ایسے نکلے کہ جگہ جگہ سے نکال دئے گئے۔ بچپنے میں رسوئی خانے سے، لڑکپن میں جماعت سے، کالج کے زمانے میں ریل گاڑیوں سے (بلا ٹکٹ سفر کرنے پر) پھر کوچہ جاناں سے، انٹرویو کے کمروں سے، معزز افسروں کے دفتروں سے، یہاں تک کہ اب خود اپنے آپ کو اس جہاں سے نکال رہے ہیں۔

تو اس طرح امید کے ماحول میں پیدا ہونے کے بعد بڑی امیدوں سے پالے گئے اور جب ہم دُنیا سمجھنے لگے اور جب چاند سی دلہن آنے کے خیالات والدین کے دلوں میں پیدا ہونا شروع ہوئے تو اور امیدوں کے ساتھ ساتھ تم ہماری اُمید بن چکی تھیں.........

ماں باپ نے بہت کوششیں کیں کہ ہم ان کے لئے گھوڑے پر چڑھکر اور ننگی تلوار کاندھے پر رکھے چھوٹی بہو کو گھر لے آئیں مگر یہ کس طرح ہو سکتا تھا جبکہ ہم سائیکل پر چڑھے ہوئے اور ننگی تلوار کے بجائے بستہ بغل میں دبائے تمہاری ترچھی نگاہوں کے گھائل ہوگئے۔ اس لمبی چوڑی تشریح کا مطلب صرف اتنا ہے کہ ہم تمہارے عشق میں گرفتار ہوگئے، یعنی آزاد نہ رہے اور جب کوئی انسان اپنی سدھ بدھ کھو بیٹھے تو وہ کس طرح اپنی زندگی میں کوئی شریک حیات بنا سکتا ہے!

تم واقعی حسین ہو، میں نے اپنی مختصر سی زندگی میں بہت خوبرو دیکھے ہیں مگر تمہاری شان کسی میں نہیں پائی۔ شاید یہ کہنا ٹھیک ہوگا کہ ہماری نظروں میں کوئی نہیں جچا، مگر تم یہ سُنکر اترانا نہیں کیونکہ ہر ایک عاشق کی نظر میں صرف اس کا معشوق ہی خوبرو ہوتا ہے۔ یقین نہ آئے تو مجنوں کی روح سے پوچھ لو یا پھر ڈیوک آف ونڈزر کی رائے دریافت کرلو......

مگر تم کہوگی کہ تمہارے چاہنے والے بہت ہیں اور اس طرح تم صرف مجھ ایک کی نظروں ہی میں خوبصورت نہیں بلکہ بہتوں کی، اور تمہارا یہ کہنا درست ہوگا۔ لیکن تمہاری اس دلیل کو اس طرح رَد کیا جا سکتا ہے کہ جس سرزمین یا دھرتی کی تم پیداوار ہو وہ ہندوستان ہے، اور ہندوستان ایک ایسی جگہ ہے جہاں بیکاری شغل اتفاقی یا دھندہ تعطیل نہیں بلکہ نتیجہ مجبوری ہے، اس ملک کے اکثر سپوت بیکار رہنے پر مجبور ہیں، اور جہاں بیکاروں کی اکثریت ہو وہاں زمانہ بیکاری میں فرقہ داری فساد بپا کرنے یا پھر عاشق بن جانے کے سوا اور دھرا ہی کیا ہے.........

یہ ایک وجہ ہے جانِ من تمہارے عاشقوں کی تعداد زیادہ ہونے کی، اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ ہندوستانی سماج میں عورتوں کو مردوں سے حتی الوسع دور رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے، اس لئے ہر ایک ہندوستانی مرد چاہے وہ زاہد طبع ہو یا رندانہ مزاج، جب کسی عورت کی بُو سونگھ لیتا ہے تو اس کے رگ و ریشہ میں بجلی سی دوڑ جاتی ہے اور جسم کا ایک ایک بال اس طرح کھڑا ہو جاتا ہے جس طرح انگریز عہدہ دار کے آنے پر ہندوستانی ماتحت کلرک یا "گوڈ سیو دی کنگ" کا ترانہ بجنے پر وردی پوش ٹامی۔ ایسی صورت میں تم خود ہی بتاؤ تمہارے عاشق کیوں نہ زیادہ ہوں؟ ان عام وجوہات کے علاوہ تمہارے مقبول عام ہونے کی ایک خاص وجہ یہ ہے کہ تم اول درجہ کی ہرجائی ہو، تمہاری ہمیشہ یہ آرزو رہی ہے کہ تمہارے سب عاشق مجنوں کی طرح صادق ہوں مگر تم خود ایک زمانے کی جان بنی رہو، تمہاری یہ خصوصیت ہندوستانی عورت کا شیوہ نہیں ہے بلکہ مغربی عورتوں کی وضعداری کا نمونہ، ان کی طرح تم یہ چاہتی ہو کہ اس دور روزہ زندگانی میں جس قدر پروانے تمہارے گرد منڈلائیں کم ہیں، ایسے ہی پروانوں میں سے ایک میں ہوں، جان دینے پر تُلا ہوا۔

موت!!!

کیسا بھیانک خیال ہے۔ اس کے آتے ہی میرے دل میں لرزہ سا پیدا ہو رہا ہے، میں نہیں سمجھ سکتا کہ مجھے خوف کس بات کا ہے، اب میں اس دل کو کس طرح سمجھاؤں.

کہ زندگی اور موت لازم اور ملزوم ہیں۔ جو پیدا ہوتا ہے اُسے ایک دن مرنا ہی ہوگا۔ یہ وہ نکتہ ہے جو ہر ایک مذہبی مجلس میں سُننے والوں کے کانوں میں بار بار ڈالا جاتا ہے تاکہ موت کے ڈر سے وہ بُرے کام چھوڑ خدا کی عبادت کریں اور مذہبی اداروں کی مالی مدد ـــــ تاکہ مذہبی پنڈتوں اور مجتہدین کو گناہ کرنے میں آسانی ہو!

مجھے موت سے کسی قسم کا ڈر نہیں ہونا چاہئے کیونکہ میں نے گناہ کئے ہی نہیں یا یوں کہنا درست ہوگا کہ گناہ کرنے کے مجھے مواقع ہی میسر نہیں ہوئے۔ مگر شاید میں موت سے نہیں گھبراتا بلکہ مرتکب خودکشی ہونے سے خوف کھا رہا ہوں۔ بے شک یہ ایک سنگین جرم ہے۔ انسان کے بنائے ہوئے قانون کے مطابق اگر اسکا ارتکاب کرتے ہوئے کوئی شخص پکڑا جائے تو اسے حبس دوام کی سزا دی جاتی ہے مگر ایک مرتبہ ارتکاب ہو جانے پر کوئی سزا نہیں دی جا سکتی۔ خدا کے دربار میں شاید سزا ملتی ہو، یقیناً ملتی ہوگی کیونکہ اس خدا کے پیدا کئے ہوئے کو اپنی طبعی موت سے پہلے جان دیدینے کا کیا اختیار ہے ؟

اس تشریح سے تو یہ ہی معلوم ہوتا ہے کہ میں خودکشی کرنے سے گھبرا رہا ہوں ـــ مگر کیوں، کس لئے ؟ میں خوب جانتا ہوں کہ موجودہ زندگی میں میرے لئے کوئی دلچسپی نہیں، عمدہ تعلیم حاصل کرنے کے باوجود بیکار ہوں، جو غذا گھر میں ملتی ہے اُسے کسی پالتو جانور کی طرح کھاجاتا ہوں، والدین کا شرمندہ احسان ہوں مگر کیا کروں کوئی ملازمت نہیں ملتی، کسی صنعتی کام کرنے کے قابل نہیں ہوں اور مزدوری کرنے کی جراءت نہیں ہو سکتی، سماج کی نظروں میں میرا درجہ نجیبوں کا ہے، مزدوری کا کام نچلے طبقہ والوں کا ہے، چاہے فاقہ کشی ہی کیوں نہ کرنی پڑے اور وہی والدین جن کے ضعیف کندھوں پر میں بار نا واجب ثابت ہو رہا ہوں کیا کہینگے ـــــ یہی کہ اس عمر میں مزدوری کرکے تم نے برادری میں ہماری ناک کٹوادی! یہی دنیا کا دستور ہے، ناک سلامت رہے۔ خواہ قرض کے نیچے دب کر انسان کی ہڈیاں کیوں نہ چور ہو جائیں !!

اسی بیکاری کے سلسلے میں تمہاری زلف پُرپیچ میں جا پھنسا، اس سے چھٹکارا کیسے ہو سکتا ہے اور پھر بیکار آدمی چھٹکارا چاہتا ہی کب ہے، چنانچہ ہم اس میں خوب پھنسے اور پھنستے گئے، مگر غور سے دیکھنے پر اپنی زلفوں کے دیگر پیچوں میں ہم نے اپنے جیسے، اپنے سے اچھے اور اپنے سے خراب اور بہت سے گرفتار دیکھے جب یہ راز ہم پر ظاہر ہوا تو اس مشغلے میں بھی دل نہیں لگا اور ہم نے بہت سوچ بچار کے بعد خود کو نیست و نابود کر دینے کا فیصلہ کر دیا۔ اور اب جبکہ اس ارادے کو تکمیل دینے کا وقت قریب آ پہنچا ہے تو دل نے ڈگمگانا شروع کر دیا......

میں اپنے دل سے پھر پوچھتا ہوں کہ "میاں کس لئے ؟"

اوہو حضرت دل بولنے لگے ہیں۔ سُنیئے

"اے بیوقوف جوانمرد مجھے ہرگز معلوم نہ تھا کہ تو اس قدر شدید الوہے ـــــ زندگی سے تو بیزار ہو گیا ہے، بے شک جس ماحول میں تو زندہ ہے وہ بہت پریشان کن ہے، انسان کی طبع کامیابی چاہتی ہے مگر کیا تو نے کبھی اس امر پر بھی غور کیا ہے کہ دنیا میں کتنے انسان کامیاب ہیں؟ کامیاب ظاہراً اور دُنیا کی نظروں میں نہیں بلکہ اپنے من کی آنکھوں میں۔ تو نے شیکسپیئر کے ڈرامے پڑھے ہیں، کیا تجھے یاد نہیں کہ

" وہ سر جو تاج پہنتا ہے پریشان رہتا ہے "

ذرا سوچ، تاجپوش سر بھی پریشان رہتا ہے اور تو بھی پریشان ہے۔ اس طرح اپنی اپنی من کی آنکھوں میں ہر دو ایک جیسے ہیں یا نہیں؟ بطرف دیگر تجھ کو بہت سے ایسے گداگر اور فقیر ملیں گے جو اپنی اپنی کھالوں میں مست نظر آئیں گے۔ اس دنیا میں اچھا اور بُرا کچھ بھی نہیں، جس نقطہ نظر سے کسی معاملے پر غور کیا جائے وہ اسی طرح خیالات کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے........

کیا تو سمجھ رہا ہے میری باتوں کو؟ ـــــ مجھے تیری سمجھ پر اس لئے شک ہو رہا ہے کیونکہ زندگی کے متعلق تیرا نقطہ نظر غلط ہو گیا ہے۔ تو دراصل کسر نفسی کے چکر میں پھنس کر خود کو پہچان نہیں سکا۔ بیکاری نے تجھے عشق بازی پر مجبور کیا اور عشق بازی میں حسب معمول تجھے بھی مایوسی کا مُنہ دیکھنا پڑا ـــــ اور خودکشی پر اتر آیا.....

خودکشی! ـــــ دیوانہ کہیں کا، بیوقوف، گیدی، چغد، بُزدل ..... ہاں ہاں بُزدل! بُزدل!! بُزدل!!! تو یقیناً بزدل ہے کسی کُس بھرے تھیلے یا گیلے آٹے کی طرح، ریڑھ کی ہڈی کے بغیر اور موجودہ جنگ میں اطالوی بہادروں کی مانند ـــــ ذرا شرم کر، چند دشواریوں سے گھبرا کر جان دینے کی ٹھان رہا ہے..... ارے پاگل، زندگی نام ہے مشکلوں کا اور مشکلوں کا سر توڑ مقابلہ کرنا ہی زندگی کا مقصد ہے، شرم آنی چاہئے تجھے، یاد رکھ جو پھر کبھی قصد خودکشی کیا..... کہ دنیا میں تیرے لئے کوئی کام نہیں مگر یہ تیری بھول ہے۔ جب غور کریگا تو تجھے معلوم ہوگا کہ تیری یہ چھوٹی سی زندگی تیرے کسی ایک کام کو بھی انجام دینے کے لئے کافی نہیں.......

اور پھر بھول گیا تو ان رس گلوں کو جو تیرے معشوق کے گالوں سے زیادہ گول اور اس کے ہونٹوں سے زیادہ میٹھے ہوتے ہیں، بھنے ہوئے مُرغ کو جس کی لذت خستہ نان کے ساتھ ہزار برس اور جینے کی تمنا پیدا کرتی ہے اور صبح کا وہ گرم گرم چائے کا پیالہ جس کے انتظار میں رات گزارنا مشکل ہو جاتا ہے۔ خبردار جو آئندہ خودکشی کا نام بھی لیا....."

اے میرے حسین گلاب کے پھول! سُن لیا تو نے میرے دل کی آواز کو ـــ

——— یہ آواز کانوں کی یاد دلاتی ہے ممکن ہے ریڈیو کی آواز کی طرح اس میں بھی مبالغہ آرائی، شاعری اور پروپیگنڈہ شامل ہو مگر باوجود اس کے میرا دماغ یہ سمجھتا ہے کہ اس میں حقیقت کے عناصر بھی بکثرت موجود ہیں اور میں جو اس سے قبل آمادہ خودکشی تھا اب اپنا ارادہ بدل چکا ہوں۔ مگر اب سوچنا یہ ہے کہ میری بیکار زندگی کو مشغول رکھنے کے لئے وہ کونسے ایسے کام ہو سکتے ہیں جنہیں میں کرنے کی کوشش شروع کروں اور بقول دل ختم نہ کر پاؤں؟

ایسے کام جنہیں انجام تک پہونچاتے ہوئے عمریں صرف ہو جائیں کیا نہیں سوچ سکیں؟ سماج کے فضول روایات کے خلاف پرچار اور سوسائٹی کی بُری عادتوں کو مٹانے کی کوششیں ——— تو اب گویا میں پرچارک بن جاؤنگا [illegible] رام موہن رائے یا مارٹن لیوتھر کی طرح۔ آنے والی نسلیں میرا نام عزت سے لیا کرینگی اور اگر کسی ادیب کے دل میں میری سوانح عمری لکھنے کا شوق کود پڑا تو میرے ساتھ ساتھ تمہارا نام بھی اجل تک زندہ رہنے کی امید کی جاسکتی ہے ورنہ ہم کو ہے

کون پوچھے گا مری جاں حُسن ڈھل جانے کے بعد

تم میری ان باتوں کو شیخی بھلاوا یا سچل نسنے کی ترکیب نہ سمجھو میں یقیناً جلد مشہور ہو جاؤنگا۔ لوگ مجھے دور دور سے دیکھنے آئینگے اور اگر کبھی کبھار مجھے ریل کا سفر کرنے کا اتفاق ہوگا تو مجھے پھولوں کے ہار پہنائے جائینگے اخباروں میں میری تصویریں شائع ہوں گی۔ رپورٹر میرے خیالات حاصل کرنے کے لئے میرے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا کریں گے اور تم میری جان بھی چاہوگی کہ میری ہو کر رہو اس لئے قبل اس کے کہ میں شہرت حاصل کر لوں اور پھر اپنے شرائط پیش کروں [illegible] گا کہ تم ابھی سے میری بن جانے کی کوشش کرو اور غیروں سے قطع [illegible] بھوں والے چھیل اور پہلوان نما انسان سے [illegible] پھر اکڑتا ہے جیسے پہرہ پر ٹنگا ہوا سنتری [illegible] پسند نہیں، نہ معلوم تھا اس کی کونسی چیز پر [illegible] گئیں کیا اس شہرت اور پرچارک والے [illegible] بھول ہے ہندوستانی سماج میں کئی ایسی خامیاں ہیں [illegible] جانے پر شہرت انسان کی لونڈی بن سکتی ہے۔ تم کو [illegible] سنو۔

[illegible] احات پر میں زور دونگا اُن پر آج تک کسی ہندوستانی نے [illegible] لئے وہ فوراً ہندوستانیوں کے دل و دماغ پر تسلط جمالینگی [illegible] ہندوستانیوں کو اپنے گھروں پر نظر ڈالنی ہوگی۔ ہندوستانی مشترکہ خاندان کے اکٹھا رہنے کا شکار بن چکا ہے۔ خاندان کے تمام اراکین کے اکٹھا رہنے کا خیال شاید اس ابتدائی زمانے میں پیدا ہوا تھا جب انسانی زندگی خانہ بدوشانہ حیثیت رکھتی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کسی خاندان کے تمام اراکین کا اکٹھا رہنا اس لئے ضروری تھا کہ تہذیب و تمدن ابھی پیدا نہ ہوا تھا۔ قانون، عدالت اور حکومت سے سب ناآشنا تھے۔ جو قانون اس زمانے میں تسلیم کیا جاتا تھا وہ جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا تھا۔ خاندان میں مناقشے رہتے تھے اور دشمنوں اور قبیلوں کی مدافعت کے لئے خاندان کے سب افراد ایک ہی جگہ یعنی ایک ہی احاطہ میں مل جل کر رہتے تھے۔ بعد میں ہندوستانی تہذیب اور تمدن میں ارتقا کے ساتھ ساتھ رسوم و رواجات میں ہزاروں تبدیلیاں ہوئیں۔ خانہ بدوشی نے اپنی ہستی جو بدلی تو گاؤں اور شہر بس گئے مگر ہمارے دیس میں ان تبدیلیوں کے باوجود خاندان کے اراکین کا ایک جگہ رہنے کا خیال نہیں بدل سکا۔ اس زمانہ میں جبکہ پولیس، عدالت، قانون اور حکومت ہر فرد و بشر کی حفاظت کے لئے اپنے اپنے ہتھیار سنبھالے مستعد ہیں، ہندوستانی ارکان خاندان پھر بھی ایک ہی گھر میں زندگی گزارتے ہیں چاہے ان کی تعداد ان کے خاندان کے گھر کی مکانیت سے ہزار گنا بڑھ گئی ہو۔ چنانچہ ہوتا یہ ہے کہ گھر کے سب چھوٹے بڑے قطار باندھ کر سوتے ہیں، قطار باندھ کر کھاتے ہیں اور باری باری سے مکان ضعیف بیت الخلا میں گرانباری اور آبیاری کرتے ہیں۔ اس طریق رہائش کے نقصانات ظاہر ہیں۔

اول تو جگہ کم ہونے کی وجہ سے گھر گندگی کا پٹارہ بنا رہتا ہے۔ صفائی جس پر مغربی تہذیب لٹو ہے اور جس کو ہندوستانی سائنس کی نظروں سے دیکھتے ہیں، قائم نہیں رہ سکتی۔ گندہ رہنے کی وجہ سے گھر میں ایک اور رکن یعنی بیماری کا اضافہ ہو جاتا ہے ——— آج بڑی بہو بیمار ہے تو کل چھوٹا دیور، آج بھتیجے کے پیٹ میں درد ہے تو بھتیجی کا سر مسوڑوں کے پھولنے سے کپا ہوا پڑا ہے۔ اس طرح گھر میں کوئی نہ کوئی ہمیشہ بیمار رہتا ہے۔

دوسری خرابی جو تمام کنبے کے اکٹھا رہنے سے پیدا ہو جاتی ہے وہ آزادی کی قیمت ہے۔ ہر ایک چھوٹا درجہ وار اپنے سے بڑوں کا محکوم رہتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ سارے گھر میں غلامی کی فضا پھیلی رہتی ہے کیونکہ بزرگ خاندان بھی آزاد نہیں ہوتا ——— وہ ہر ہندوستانی کی طرح غیر ملکی حاکموں کا غلام ہے۔ ایسی فضا میں پرورش پا کر کوئی نوجوان کس طرح آزادانہ پر پھیلا کر اڑ سکتا ہے؟ نئے خیالات پیدا ہونے سے قبل ہی مر جاتے ہیں اور اگر کسی رکن خاندان میں کسی نئے کام کے کرنے کا مادہ موجود بھی ہو تو اس کے نشو و نما پانے کی کوئی صورت نہیں رہتی کیونکہ ہر رکن خاندان کا فرض ہے کہ پدر خاندان کے پیشہ کو ہی اختیار کرے۔

اس کے علاوہ میاں بیوی کی آزادی میں بھی خلل واقع ہوتا ہے۔ کیا یہ صریح ظلم نہیں ہے کہ ایک مرد اور عورت جن کو قانون، مذہب اور